(احمدی احباب کی تعلیم وتربیت کے لئے)

آنحضرتؐ پر ہونے والے اعتراضات

اور

اُن کے جوابات

از

افاضات حضرت مسیح موعود علیہ السلام وخلفاء سلسلہ

محمد محمود طاہر

مجلس انصار اللہ پاکستان

نام کتاب	آنحضرتؐ پر ہونے والے اعتراضات اور ان کے جوابات
مرتب	محمد محمود طاہر
ناشر	مجلس انصار اللہ پاکستان
سن اشاعت	2014ء
پبلشر	عبد المنان کوثر
تعداد	1000
کمپوزنگ	ریاض احمد بٹ، فرحان احمد ذکاء
مطبع	ضیاء الاسلام پریس چناب نگر (ربوہ)

فہرست عناوین

پیش لفظ

ہمارے نبی حضرت سید و مولیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر جہاں خدا تعالیٰ کے اور بے انتہا فضل اور احسان ہیں وہاں اس رحمت دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک فضل خاص یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے غلاموں کے دل میں ایسی سچی محبت اور عشق پیدا کر دیا کہ وہ دیوانہ وار آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر فدا تھے۔انہوں نے آڑے وقت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں کی طرح آپ سے یہ نہیں کہا کہ فَاذْهَبْ أَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا إِنَّا هَاهُنَا قَاعِدُونَ (المائدة:24) ترجمہ: پس جاتُو اور تیرا رب دونوں لڑو ہم تو یہیں بیٹھے رہیں گے۔بلکہ یہ نعرہ بلند کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ہم آپ کے دائیں بھی لڑیں گے اور بائیں بھی۔آگے بھی لڑیں گے اور پیچھے بھی۔اور دشمن ہماری لاشیں روندے بغیر آپ تک نہیں پہنچ سکتا۔

یہی کیفیت ہر مخلص اور وفا شعار صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تھی۔سردار منافقین عبداللہ بن ابی نے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں خود کو معزز ترین انسان قرار دیا۔اس پر ان کے بیٹے عبداللہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! مجھے اجازت دیں میں اس کا سر قلم کر دوں۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف اس کی اجازت نہیں فرمائی۔بلکہ فرمایا کہ لوگ کیا کہیں گے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھیوں کو بھی قتل کر دیتا ہے۔

(صحيح مسلم كتاب البر والصلة والادب باب نَصْرِ الْأَخِ ظَالِمًا أَوْ مَظْلُومًا)

مگر اس وفا شعار اور مخلص صحابی عبداللہؓ کے دل کو تسکین نہ ہوئی جب تک اس سفر سے واپسی پر مدینہ میں داخل ہوتے ہوئے اس نے اپنے باپ کو روک کر یہ اقرار نہ کروا لیا کہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہی مدینہ کے معزز ترین انسان ہیں اور وہ خود مدینہ کا ذلیل ترین انسان ہے۔اس اقرار کے بعد ہی اس عاشق صادق نے اپنے والد کو مدینہ میں داخل ہونے دیا۔

بلاشبہ ان عشاق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا مذہب ہی یہ تھا کہ کوئی شخص حقیقی مومن نہیں ہو سکتا۔جب تک اپنے والدین، اولاد اور تمام رشتہ داروں سے زیادہ خدا کا رسول اسے پیارا نہ ہو۔وہ خدا کے رسول کی حفاظت اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت و ناموس کے لئے ہمیشہ کمر بستہ رہتے تھے۔حضرت سعد بن ربیعؓ نے احد کے میدان میں شہید ہوتے ہوئے اپنی قوم کو آخری پیغام یہی دیا تھا کہ "رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں میرا اسلام عرض

کرنا کہ اگر آج خدانخواستہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہو گئے اور تم میں سے کوئی ایک بھی زندہ بچا تو اللہ کو ہرگز منہ نہ دکھا سکو گے اور اس کے سامنے تمہارا کوئی عذر قبول نہ ہو گا۔" (طبقات ابن سعد جلد اول)

یہی جذبہ عشق و وفا دیگر اصحاب رسول کا تھا۔ میدان احد میں حضرت طلحہ نے اپنا ہاتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ کے آگے کر دیا کہ کہیں کوئی تیر آ کر آپ کو نہ لگ جائے۔ انہوں نے اپنا ہاتھ تو ٹنڈا کروا لیا لیکن رسول اللہؐ کے چہرہ پر (جو دراصل اسلام کا چہرہ تھا) آنچ نہ آنے دی۔

دوسری طرف حضرت ابوطلحہؓ انصاری اپنے آقا و مولیٰ کے آگے یہ کہتے ہوئے سینہ سپر تھے کہ یا رسول اللہ میرا سینہ آپ کے سینہ کے آگے ڈھال ہے۔ آپ سر اونچا کر کے نہ دیکھئے کہیں کوئی تیر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو آ کر نہ لگ جائے۔

اگر دشمنان اسلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات کے خلاف کوئی نکتہ چینی کرتے یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو کرتے تو اہل زبان مسلمان شعراء حضرت حسانؓ، حضرت عبداللہؓ بن رواحہ اور حضرت کعبؓ بن مالک نہایت جرأت اور مستعدی سے اپنے آقا و مولیٰ کا دفاع کرتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص طور پر قریش مکہ کی شاعرانہ تعلیوں کا جواب دینے کے لئے حضرت حسانؓ سے فرمایا کہ تم ان دشمنوں کو جواب دو۔ روح القدس (حضرت جبرائیل امین) تمہارے ساتھ ہے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اس فدائی صحابی کے لئے یہ دعا کرتے تھے کہ اے اللہ! روح القدس کی تائید سے اس کی مدد فرما۔ کسی نے حضرت حسانؓ سے پوچھا کہ تم قریش کی ہرزہ سرائی اور طعنہ زنی کا جواب کس طرح دو گے جبکہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی قریش سے ہی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان سے اسی طرح الگ کر دوں گا جیسے مکھن سے بال۔ اس طرح انہوں ایسی فصاحت اور قادر الکلامی سے رسول اللہؐ پر ہونیوالے حملوں کا جواب دیا کہ رہتی دنیا تک یادر ہے گا۔ ان کا قابل قدر دلی جذبہ یہ تھا کہ:

فَاِنَّ اَبِیْ وَ وَالِدَہٗ وَ عِرْضِیْ   لِعِرْضِ مُحَمَّدٍ مِّنْکُمْ وِقَاءٗ

کہ میرے والدین اور میری اولاد اور میری عزت و ناموس محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت کے لئے قربان ہے۔ یوں صحابہ کرامؓ نے اللہ اور اس کے رسول کی محبت اور رضا کی خاطر اپنے آقا و مولیٰ کی ہر میدان میں وہ حفاظت کر کے دکھائی۔ جس کے آداب اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں تعلیم فرمائے تھے۔ دجال اور یاجوج ماجوج کے دور حاضر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات کو جب ایک بار پھر ان حملوں کا نشانہ نہ

بنایا گیا تو کیفیت یہ ہوگئی کہ ؎

ہر طرف کفر است جوشاں ہمچو افواج یزید ۔۔۔۔ دین حق بیمار و بیکس ہمچو زین العابدین

اسلام اور بانی اسلام، مخالف عیسائی پادریوں اور آریوں کے حملوں میں گھر کر رہ گئے اور خدا تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے عاشق حضرت مرزا غلام احمد قادیانی کو آپ ﷺ کی دفاع کیلئے کھڑا کیا۔ حضرت مرزا صاحب نے اس راہ میں اپنی جان کی بازی لگانے سے بھی دریغ نہ کیا۔ آپ کی دلی کیفیت یہ تھی کہ ؎

دریں رہ گر کُشندم ور بسوزند ۔۔۔۔ نتابم رُوز ایوان محمدؐ

کہ اگر میں اپنے آقا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی راہ میں مارا جاؤں یا جلا کر راکھ کیا جاؤں تو بھی میں اپنا چہرہ دارِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جدا کرنے والا نہیں۔ حضرت بانی جماعت احمدیہ کس محبت اور غیرت سے فرماتے ہیں:

”جو لوگ ناحق خدا سے بے خوف ہو کر ہمارے بزرگ نبی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو بُرے الفاظ سے یاد کرتے اور آنجناب پر ناپاک تہمتیں لگاتے اور بدزبانی سے باز نہیں آتے ان سے ہم کیونکر صلح کریں۔ میں سچ سچ کہتا ہوں کہ ہم شورہ زمین کے سانپوں اور بیابانوں کے بھیڑیوں سے صلح کر سکتے ہیں، لیکن ان لوگوں سے ہم صلح نہیں کر سکتے جو ہمارے پیارے نبی پر جو ہمیں اپنی جان اور ماں باپ سے بھی پیارا ہے ناپاک حملے کرتے ہیں۔ خدا ہمیں اسلام پر موت دے ہم ایسا کام کرنا نہیں چاہتے جس میں ایمان جاتا رہے“

(پیغام صلح، روحانی خزائن جلد نمبر 23 صفحہ 30)

عشق رسول کا یہی جذبہ آپ نے اپنے جانشینوں اور اپنے ماننے والوں کو عطا کیا ہے۔ چنانچہ آپ کے زمانہ میں بے شمار پادریوں اور آریوں کی طرف سے بے شمار اعتراضات کیے گئے جن کا آپ نے منقولی و معقولی رنگ میں اپنی کتابوں میں جواب دیا۔ اور ہر ایسے موقع پر جب دشمنان اسلام نے آپ پر حملہ کیا خواہ وہ امہات المومنین کی بدنام زمانہ کتاب ہو یا رنگیلا رسول یا اہانت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی اور موقع۔ جماعت احمدیہ اور اس کے رہنماؤں نے قرآنی تعلیم کے مطابق صبر اور تقویٰ کے نمونے دکھاتے ہوئے بانی اسلام کا دفاع کیا۔ انہوں نے کبھی ہڑتالوں، جلاؤ گھیراؤ، مار دھاڑ کے ردعمل سے اپنے عشق کا ثبوت نہیں دیا بلکہ دلائل و براہین کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت و ناموس کی حفاظت کی اور درود شریف کے کثرت سے ورد کے ساتھ آپ کے گرد ایک ایسا دفاعی حصار بنا ڈالا کہ دشمن کی کوئی ہرزہ سرائی ہمارے آقا و مولیٰ تک پہنچنے نہ پائے۔

چنانچہ خلافت خامسہ کے دور میں بھی 2012ء میں امریکہ میں ایک خبیث الطبع امریکن عیسائی نکولا بسیلے (Nakaula Basseley) نے جب قرآن کریم پر ایک فلم بنا کر اسلامی تعلیمات کو نہ صرف توڑ مروڑ کر پیش کیا بلکہ بانی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر گندے الزام بھی لگائے۔ اس پر دیگر عالم اسلام نے تو حسب معمول جلوسوں اور ہڑتالوں سے احتجاج کیا۔ صرف ایک عالمگیر جماعت احمدیہ کے امام حضرت مرزا مسرور احمد صاحب خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز تھے جنہوں نے مورخہ 21 ستمبر، 28 ستمبر اور 5 اکتوبر 2012ء کے خطبات جمعہ میں دین حق کا بھرپور دفاع فرماتے ہوئے اپنی عالمگیر جماعت کو توجہ دلائی کہ وہ نہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا مضمون اور کتب کثرت سے دنیا میں پھیلائیں بلکہ رحمت دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخوت و محبت اور امن و آشتی کے پاک نمونوں پر عمل کر کے دنیا کو بتلا دیں کہ ہمارا نبی کس شان کا حامل تھا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کثرت سے درود بھیجیں۔ آپ نے مزید فرمایا:

> ”آج یہ کام ایک لگن کے ساتھ صرف جماعت احمدیہ ہی کر سکتی ہے۔ اس کے لئے ہر طرح کے پروگرام کی پہلے سے بڑھ کر کوشش کریں۔ سیمینار بھی ہوں، جلسے بھی ہوں اور ان میں غیروں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں بلائیں“

اس ارشاد کی روشنی میں مجلس انصاراللہ پاکستان نے اپنی شوریٰ کے فیصلہ کے مطابق 2013ء کا سال سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سال کے طور پر منایا۔ جس میں منعقد ہونے والے سیمینارز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت و عظمت کے بیان کرنے کے علاوہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس پر ہونے والے اعتراضات کے دندان شکن جواب دیئے گئے۔ زیر نظر کتاب بھی دراصل اسی بابرکت سکیم کے تسلسل کی ایک کڑی ہے۔ جس میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام اور خلفاء سلسلہ احمدیہ کے زمانہ میں جو اعتراضات ہمارے آقا و مولیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر ہوئے ان کے جوابات مکرم و محترم محمد محمود طاہر صاحب مربی سلسلہ نے بڑی محنت سے ایک جگہ اکٹھے کر دیئے ہیں۔ جس سے آئندہ اس موضوع پر کام کرنے والوں کو بہت سہولت ہوگئی ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں اس کی احسن جزاء عطا فرمائے۔ آمین

حافظ مظفر احمد

حافظ مظفر احمد
صدر مجلس انصاراللہ پاکستان

عرض ناشر

یہ امر مشاہدہ میں آیا ہے کہ اسلام اور بانی اسلام سیدنا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکت پر حملے اتنی شدت اتنی کثرت کے ساتھ اس قسم کے دجل کے ساتھ اس سے قبل نہیں ہوئے۔ جس قدر عاشق رسول حضرت مرزا غلام احمد قادیانی مسیح موعود و مہدی معہود علیہ السلام کے زمانہ میں ہوئے اور اس کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔

اسی طرح کی ایک سازش اسلام کے خلاف 2012ء میں امریکہ میں ایک خبیث الطبع امریکن عیسائی نکولا بسیلے (Nakaula Basseley) نے کی جب اس نے قرآن کریم پر ایک فلم بنائی جس میں نہ صرف اسلامی تعلیمات کو توڑ مروڑ کر پیش کیا بلکہ بانی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر گندے الزام بھی لگائے۔ جس پر جماعت احمدیہ کے امام حضرت مرزا مسرور احمد صاحب خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز نے مورخہ 21؍ستمبر، 28؍ستمبر اور 5؍اکتوبر کو تین خطبات ارشاد فرمائے۔ جن میں حضور نے جہاں اسلامی تعلیمات کا بھرپور دفاع فرمایا وہاں عالمگیر جماعت کو اس کا جواب دینے کے لئے جامع لائحہ عمل بھی پیش فرمایا۔ آپ فرماتے ہیں:

”جہاں ایک احمدی مسلمان اس بیہودہ گوئی پر کراہت اور غم و غصہ کا اظہار کرتا ہے وہاں ان لوگوں کو بھی اور اپنے اپنے ملکوں کے ارباب حل وعقد کو بھی ایک احمدی اس بیہودہ گوئی سے باز رہنے اور روکنے کی طرف توجہ دلاتا ہے اور دلانی چاہئے۔ دنیاوی لحاظ سے ایک احمدی اپنی سی کوشش کرتا ہے کہ اس سازش کے خلاف دنیا کو اصل حقیقت سے آشنا کرے اور اصل حقیقت بتائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے خوبصورت پہلو دکھائے۔ اپنے ہر عمل سے آپ کے خوبصورت اُسوہ حسنہ کا اظہار کرکے اور اسلام کی

تعلیم اور آپؐ کے اسوہ حسنہ کی عملی تصویر بن کر دنیا کو دکھائے۔ہاں ساتھ ہی یہ بھی جیسا کہ مَیں نے کہا کہ دُرود و سلام کی طرف بھی پہلے سے بڑھ کر توجہ دے۔مرد، عورت، جوان، بوڑھا، بچہ اپنے ماحول کو، اپنی فضاؤں کو دُرود و سلام سے بھر دے۔اپنے عمل کو اسلامی تعلیم کا عملی نمونہ بنا دے۔پس یہ خوبصورت ردِّ عمل ہے جو ہم نے دکھانا ہے۔" (الفضل انٹرنیشنل 12/اکتوبر 2012ء)

پھر آپ 28/ستمبر 2012ء کے خطبہ میں جماعت کو لائحہ عمل دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

"آج یہ کام ایک لگن کے ساتھ صرف جماعت احمدیہ ہی کر سکتی ہے۔اس کے لئے ہر طرح کے پروگرام کی پہلے سے بڑھ کر کوشش کریں۔سیمینار بھی ہوں، جلسے بھی ہوں اور ان میں غیروں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں بلائیں......پس ہمیں ان لوگوں کا منہ بند کرنے کے لئے اور کم از کم شرفاء اور پڑھے لکھے لوگوں کو بتانے کے لئے بھرپور کوشش کرنے کی ضرورت ہے کہ یہ غلط طریق دنیا کا امن برباد کر رہا ہے، تاکہ جس حد تک ممکن ہو ان کے ظالمانہ رویے کی حقیقت سے ہم دنیا کو آگاہ کر سکیں......ہم احمدی مسلمان جن کو خدا تعالیٰ نے مسیح موعود اور مہدی موعود کے ہاتھ پر جمع کر دیا ہے، ہمارا بہرحال کام ہے کہ دنیا کو ہدایت کے راستے دکھائیں، امن اور سلامتی کے طریق بتائیں۔تاکہ دنیا کو حقیقی اسلامی تعلیم کا پتہ چل سکے۔دنیا داروں کو یہ پتہ ہی نہیں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام ہمارے دل میں اور حقیقی مسلمان کے دل میں کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اور آپؐ کا اسوہ حسنہ کس قدر خوبصورت ہے اور اس میں کیا حسن ہے؟ ایک حقیقی مسلمان کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کس قدر عشق اور محبت ہے، اس کا یہ لوگ اندازہ ہی نہیں کر سکتے" (الفضل انٹرنیشنل 19/اکتوبر 2012ء)

ان ارشادات کی روشنی میں مجلس انصار اللہ پاکستان نے شوریٰ 2012ء منعقدہ 9,8/دسمبر میں یہ فیصلہ کیا کہ 2013ء کا سال سیرت النبیؐ کے طور پر منایا جائے۔جس میں ہر پندرھواڑے میں سیرت

النبیؐ پر سیمینارز میں علماء کے لیکچرز ہوں نیز حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر کیے جانے والے حملوں کے ردّ میں قیادت اصلاح وارشاد درج ذیل عناوین پر دو کتب تیار کروائے۔

- **"آنحضرتؐ پر کیے جانے والے اعتراضات اور ان کے جوابات"**

(از افاضات حضرت مسیح موعود علیہ السلام اور خلفاء سلسلہ)

- **"ناموس رسالت پر حملوں کا دفاع"**

(حضرت مسیح موعود علیہ السلام اور خلفاء سلسلہ کے ارشادات کی روشنی میں)

اوّل الذکر کتاب کی تیاری مکرم محمد محمود طاہر صاحب قائد تعلیم القرآن کو مکرم شبیر احمد ثاقب صاحب (قائد اصلاح وارشاد۔2013ء) کے ذریعہ تفویض ہوئی جب کہ ثانی الذکر کتاب کی تیاری خاکسار کے سپرد ہوئی۔

ان مسودات کی تیاری وتکمیل ایک محنت طلب کام تھا اس لئے مواد اکٹھا کرنے میں کچھ وقت لگا اور اب یہ کتب 2014ء میں منظر عام پر آرہی ہیں۔ ہر دو کتب کو پہلے مکرم شبیر احمد ثاقب صاحب نے مطالعہ کر کے مفید آراء دیں۔ سال رواں میں پہلی اشاعت کمیٹی کے اجلاس منعقدہ 25/مارچ 2014ء میں یہ مسودے پیش ہونے پر فیصلہ ہوا کہ اشاعت سے قبل دونوں مسودے مکرم عبدالسمیع خان صاحب قائد اصلاح وارشاد کے علاوہ اوّل الذکر کتاب کا خاکسار اور ثانی الذکر کا مکرم محمد محمود طاہر صاحب قائد تعلیم القرآن ایک بار جائزہ لے لیں۔ چنانچہ تینوں حضرات کے مفید مشوروں اور آراء کے بعد یہ مفید کتب شائع کی جارہی ہیں۔ جس کے بارہ میں مکرم عبدالسمیع خان صاحب کی رائے ہے کہ **"ماشاء اللہ اچھا مواد اکٹھا ہوگیا ہے۔"** نظارت اشاعت سے ان کتب کی اشاعت کی منظوری لی گئی۔ مکرم سید مبشر احمد ایاز صاحب نے لکھا۔ **"ماشاء اللہ ایک منفرد اور انتہائی اہمیت کی حامل کتب ہوں گی اور وقت کی ضرورت**

بھی۔مجموعی طور پر کتب بہت اعلیٰ انتخاب پر مشتمل ہیں"

اوّل الذکر کتاب کی پروف ریڈنگ میں مکرم مظفر احمد درانی صاحب معاون صدر اور اشاریہ میں مکرم محمد محمود طاہر صاحب نے معاونت فرمائی۔جب کہ ثانی الذکر کتاب میں مکرم نذیر احمد خادم صاحب نے پروف ریڈنگ میں اور مکرم سعید احمد رشید صاحب مربی سلسلہ نے اشاریہ تیار کرنے میں معاونت فرمائی ہے۔اللہ تعالیٰ ان تمام دوستوں کو جزاء عطا فرمائے اور یہ کتب افادہ عام کے ساتھ ہمارے آقا و مولیٰ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت وعظمت اور محبت دلوں میں بڑھانے کا موجب ہوں۔آمین

حنیف احمد محمود

قائد اشاعت مجلس انصاراللہ پاکستان

4/نومبر 2014ء

تعارف

جہاں اللہ اوراس کے رسول کا غالب آنا ایک تقدیر مبرم ہے وہاں ماموریں من اللہ کی مخالفت ،انکا استہزا اور ان پر مخالفین کی طرف سے طرح طرح کے اعتراضات بھی ایک سنت مستمرہ ہے۔ یہ مخالفت اور استہزاء انبیاء کی سچائی کی علامت ہے۔حضرت مسیح موعود علیہ السلام اس کی حقیقت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''دنیا میں کوئی رسول نہیں آیا جس سے ٹھٹھا نہیں کیا گیا۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

یٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ مَا يَأْتِيهِم مِّن رَّسُولٍ إِلَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ (یٰس:۳۱)

یعنی بندوں پر افسوس! کہ کوئی رسول ان کے پاس ایسا نہیں آیا جس سے انہوں نے ٹھٹھا نہیں کیا'' (چشمہ معرفت، روحانی خزائن جلد۲۳ صفحہ۳۲۴)

پھر فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے جو اس میں مَا کے ساتھ حصر کیا ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جو سچا ہے اسکے ساتھ ہنسی اور ٹھٹھا ضرور کیا جاتا ہے۔اگر یہ نہ کیا جائے تو خدا تعالیٰ کا کلام صادق نہیں ٹھہرتا۔صادق کی یہ بھی ایک نشانی ٹھہری'' (الحکم ۱۷/اگست ۱۹۰۱ء)

مخالفین و معاندین انبیاء نے اپنی سنت برقرار رکھتے ہوئے آنحضرتﷺ کی ذاتِ بابرکات اور آپؐ کی پاکیزہ تعلیمات پر نہ صرف اعتراضات کئے ہیں بلکہ انہوں نے بدنیتی اور تعصب کی بناپر جھوٹے الزامات لگانے سے بھی دریغ نہیں کیا۔بعثت کے بعد کفارِ مکہ، یہود و نصاریٰ اور منافقین نے آپؐ پر جو اعتراضات اٹھائے ان میں سے بعض کا تذکرہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں بھی فرمایا ہے اور ان کے جوابات بھی دیئے۔اعتراضات اور الزامات کا یہ سلسلہ چودہ سو سالوں سے مسلسل جاری ہے اور آج کے الیکٹرانک دور میں اس میں بعض لحاظ سے شدت آگئی ہے۔

آنحضرتﷺ کو نعوذباللہ مفتری، ساحر، مجنون، مسحور، ضآل، جابر، ظالم، ابتر اور نہ جانے کن کن الفاظ کے ساتھ مطعون کیا گیا ہے اور آپؐ کی آفاقی اور پاکیزہ تعلیمات اور اسوۂ حسنہ پر طرح طرح کے اعتراضات کا سلسلہ روزِ اول سے تا امروز جاری ہے۔مثلاً یہ آپؐ اپنی وحی اور رسالت کے بارہ میں متشکک تھے اور یہ وحی رحمانی نہیں بلکہ شیطانی تھی، آپؐ نے علماءِ

یہود و نصاریٰ کی معاونت سے قرآنی تعلیم مرتب کی اور آپؐ اُمّی نہ تھے، آپؐ کو جنون تھا، آپؐ پر جادو نے اثر کیا، آپؐ نے مذہب کے نام پر لڑائیاں کیں اور اپنے مخالفین کا ناحق قتل کیا۔ آپؐ نعوذباللہ مسِ شیطان سے پاک نہ تھے بلکہ گناہ گار تھے۔ آپؐ کی تعلیم میں نقائص تھے، آپؐ کو معجزات اور تائیدِ الٰہی نہیں ملی۔ آپؐ نے تعدد ازدواج کو رائج کیا اور نعوذباللہ شہوت پرستی کو فروغ دیا۔ الغرض اس قسم کے بےہودہ، بےسروپا اور ناحق اعتراضات اور الزامات آپؐ کی ذاتِ والا صفات پر لگائے گئے اور آج بھی کسی نہ کسی رنگ میں انہیں کو دہرایا جاتا ہے۔

مخالفینِ اسلام کی طرف سے جب آپؐ پر مختلف الزامات لگانے کی جسارت کی گئی تو اس کے ردّعمل میں بعض ایسی حرکات اہلِ اسلام کی طرف سے سرزد ہوتی رہیں یا ہو رہی ہیں جس کے نتیجہ میں معاندینِ اسلام کو مزید اعتراضات کا موقع ملتا رہا۔ نتیجۃً بعض لوگ ان اعتراضات کے زیرِ اثر نہ صرف مخالفت میں مزید بڑھ جاتے ہیں بلکہ بعض ارتداد کا راستہ بھی اختیار کر گئے۔ اندریں صورت یہ بات انتہائی اہمیت کی حامل ہے کہ معترض کے اس سے آنکھیں بند نہ کی جائیں بلکہ اصل اعتراض کا جواب دیا جائے اور اسے حق و باطل کی پہچان کا موقع فراہم کیا جائے۔ آنحضرتؐ کا حقیقی اور خوبصورت چہرہ دنیا کو دکھانا ہمارا فرض ہے۔ اس امر کی ضرورت کی طرف متوجہ کرتے ہوئے حضرت مسیح موعود علیہ السلام فرماتے ہیں:

>''قرآن کریم کی تعلیم کے موافق ہمارا فرض یہ تھا کہ ہم بدزبان شخص کی بدزبانی کو الگ کر کے اس کے اصل اعتراضات کا جواب دیتے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ: اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ کیونکہ یہ امر نہایت پُرخطر اور خوفناک ہے کہ ہم معترض کے اعتراضوں کو اپنی حالت پر چھوڑ دیں اور اگر ایسا کریں تو وہ اعتراضات طاعون کے کیڑوں کی طرح روز بروز بڑھتے جائیں گے اور ہزارہا شبہات لوگوں کے دلوں میں پیدا ہو جائیں گے اور اگر گورنمنٹ ایسے بدزبان کو کچھ سزا بھی دے تو وہ شبہات اس سزا سے کچھ کم نہیں ہو سکتے۔ دیکھو یہ لوگ جو اسلام پر اعتراض کرتے ہیں مثلاً جیسے مصنف امہات المومنین اور عماد الدین اور

صفدر علی وغیرہ ان کے مرتد ہونے کا بھی یہی سبب ہے کہ اُس وقت نرمی اور ہمدردی سے کام نہیں لیا گیا بلکہ اکثر جگہ تیزی اور سختی دکھلائی گئی اور ملائمت سے ان کے شبہات دور نہیں کئے گئے۔اس لئے ان لوگوں نے اسلامی فیوض سے محروم رہ کر ارتداد کا جامہ پہن لیا۔اب اکثر اسلام پر حملہ کرنے والے یہی لوگ ہیں جو قوم کی کم توجہی سے پریشان خاطر ہو کر عیسائی ہو گئے......

یہ وہ زمانہ ہے جس میں وہی دین اور دینوں پر غالب ہوگا جو اپنی ذاتی قوت سے اپنی عظمت دکھاوے۔پس جیسا کہ ہمارے مخالفوں نے ہزاروں اعتراض کر کے یہ ارادہ کیا ہے کہ اسلام کے نورانی اور خوبصورت چہرہ کو بدشکل اور مکروہ ظاہر کریں ایسا ہی ہماری تمام کوششیں اسی کام کے لئے ہونی چاہئیں کہ اس پاک دین کی کمال درجہ کی خوبصورتی اور بے عیب اور معصوم ہونا بپایۂ ثبوت پہنچاویں“ (البلاغ۔فریاد درد۔روحانی خزائن جلد ۱۳ صفحہ ۳۸۲،۳۷۸)

مندرجہ بالا اقتباس ہمیں ہماری ذمہ داریوں کی طرف متوجہ کر رہا ہے کہ مخالف کے اعتراض کا جواب دینا ہمارا فرض ہے۔اور یہ آنحضورؐ سے سچا محبت کا اظہار ہے۔جیسا کہ حضرت مصلح موعودؓ فرماتے ہیں:

”اگر ہم رسول کریمؐ سے محبت رکھتے ہیں تو ہماری خوشی اس میں ہونی چاہئے کہ ہم دنیا سے رسول کریم ﷺ کی نسبت شکوک وشبہات کو دور کرنے میں کامیاب ہوں۔سچی محبت قربانی کا مطالبہ کرتی ہے“ (خطبات محمود جلد ۱۱ صفحہ ۱۴)

ہمارے موجودہ امام سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز بھی ہمیں متعدد بار اس فریضہ کی طرف متوجہ فرما چکے ہیں۔

سال ۲۰۱۳ء کو انصار اللہ پاکستان نے اپنی شوریٰ کے فیصلہ کے مطابق سیرت النبیؐ کے سال کے طور پر منایا ہے۔اس کی سکیم کا ایک حصہ یہ بھی تھا کہ آنحضورؐ پر ہونے والے اعتراضات اور ان کے جوابات از حضرت مسیح موعود علیہ السلام و خلفاءِ سلسلہ کو یکجائی طور پر کتابی صورت میں مرتب کر کے شائع کیا جائے۔اس کام کو کرنے کی سعادت خاکسار کے حصہ میں آئی ہے۔محض

اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی توفیق سے سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ السلام اور خلفاءِ سلسلہ کی تحریرات سے استفادہ کرتے ہوئے خاکسار کو یہ مجموعہ مرتب کرنے کی سعادت نصیب ہو رہی ہے۔

یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ آنحضرت ﷺ کے عاشقِ صادق امام الزمان حضرت مسیح موعود علیہ السلام اور آپؑ کے خلفاءِ کرام نے نہ صرف ہمارے دلوں میں عشقِ مصطفیٰ ﷺ کی مشعل کو روشن کیا ہے بلکہ آنحضورؐ پر ہونے والے اعتراضات کے مسکت اور مدلل جوابات دے کر عشقِ حقیقی کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ انہی افاضات کو موضوعاتی لحاظ سے ترتیب دے کر دس ابواب میں تقسیم کر کے احباب کی خدمت میں پیش کرنے کی توفیق مل رہی ہے۔ اس سلسلہ میں مطبوعہ مواد سے ہی استفادہ کیا گیا ہے۔ اعتراضات کے جوابات سے قبل جماعت احمدیہ اور عشقِ رسولؐ کے عنوان سے ایک باب باندھا گیا ہے جس میں جماعت احمدیہ کے عشقِ رسولؐ کی چند مثالیں درج کی گئی ہیں۔

ضمناً یہ ذکر کرنا بھی مناسب ہوگا کہ آنحضورؐ پر ہونے والے اعتراضات کے جوابات کے لئے حضرت مسیح موعود علیہ السلام اور خلفائے کرام کی تحریرات کے علاوہ قمر الانبیاء حضرت مرزا بشیر احمد صاحب کی تحریر فرمودہ سیرت خاتم النبیینؐ کا مطالعہ بھی انتہائی مفید ہے۔

آخر میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کاوش کو نافع الناس اور نیک اثرات پیدا کرنے والی نیز میرے لئے حصولِ شفاعت کا ذریعہ بھی بنا دے۔ آمین

جان و دلم فدائے جمالِ محمدؐ است
خاکم نثار کوچۂ آلِ محمدؐ است

محمد محمود طاہر
مؤلف

جماعت احمدیہ اور عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم

بعد از خدا بعشقِ محمدؐ مخمرم
گر کفر ایں بود بخدا سخت کافرم

اللہ تعالیٰ کی ذات وحدہٗ لاشریک کے بعد میں عشقِ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم میں دیوانہ ہو چکا ہوں۔ اگر اس عشق اور دیوانگی کا نام کوئی کفر رکھتا ہے تو خدا کی قسم مَیں ایک سخت کافر انسان ہوں۔

قارئین کرام یہ ہے سیدنا حضرت اقدس بانی جماعت احمدیہ مرزا غلام احمد قادیانی علیہ السلام کا عشقِ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں عقیدہ ۔ اسی عقیدہ کے مطابق آپ کی ساری عمر گزری۔ آپ کی تحریرات میں، آپ کے ملفوظات میں، آپ کے نثریہ کلام میں، آپ کے منظوم کلام میں محبتِ الٰہی کے بعد عشقِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہی نظر آتا ہے۔ عشقِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم میں ہی آپ نے خدمتِ اسلام کی ۔ آپؑ کی خاطر اسلام اور بانیٔ اسلام پر ہونے والے ہر اعتراض کا جواب مردانہ وار دیا، ہر حملہ پر کاری ضرب لگائی اور اسلام اور بانی اسلام کے چہرہ کو زخمی نہیں ہونے دیا۔

یہ شخص رسول اللہؐ سے محبت رکھتا ہے

حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا عشقِ رسولؐ اس حد تک پہنچا ہوا تھا کہ عرشِ الٰہی سے اس کی سند آپؑ کو ان الفاظ میں عطا کی گئی:

هٰذَا رَجُلٌ يُحِبُّ رَسُوْلَ اللّٰهِ (تذکرہ صفحہ ۳۴ ایڈیشن ۲۰۰۴ء)

یعنی یہ وہ آدمی ہے جو رسول اللہؐ سے محبت رکھتا ہے ۔اس کے بارہ میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام وضاحت فرماتے ہیں کہ ’’اور اس قول سے یہ مطلب تھا کہ شرطِ اعظم اس عہدہ کی محبتِ رسولؐ ہے سو وہ اس شخص میں متحقق ہے‘‘ (روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۵۹۸)

نور کی مشکیں

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے محبت رسولؐ کی وجہ سے آپ کا گھر برکتوں سے بھر دیا اور نور سے منور کر دیا۔ عشقِ رسولؐ میں مخمور ہو کر اور درود شریف میں استغراق کے نتیجہ میں آپؑ کو کشفی حالت میں دکھایا گیا کہ دو سقے یعنی ماشکی آئے اور ایک اندرونی راستے اور ایک بیرونی راہ سے میرے گھر میں داخل ہوئے ہیں اور ان کے کاندھوں پر نور کی مشکیں ہیں اور کہتے ہیں:

هٰذا بِمَا صَلَّيْتَ عَلٰى مُحَمَّدٍ (حقیقۃ الوحی روحانی خزائن جلد ۲۲ صفحہ ۱۳۱)

یعنی یہ سب کچھ آپ کو جو حاصل ہوا ہے اور نور کی مشکیں انڈیلی جا رہی ہیں یہ آنحضورؐ پر درود بھیجنے کا نتیجہ ہے۔

ذیل میں نمونہ کے طور پر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سیرتِ مبارکہ سے عشقِ رسولؐ کے چند واقعات اور تحریرات پیش کی جا رہی ہیں ورنہ آپؑ کی تو ساری زندگی عشقِ رسولؐ میں ہی مخمور ہو کر گزری ہے۔

کاش یہ شعر میری زبان سے نکلتا

حضرت مسیح موعود علیہ السلام اپنے آقا و مولیٰ حضرت محمد مصطفی ﷺ سے کس قدر محبت اور عشق کرتے تھے اس کا اظہار اس واقعہ سے ہوتا ہے کہ ایک دفعہ آپ مسجد مبارک میں اکیلے ٹہل رہے تھے اور گنگنا رہے تھے اور ساتھ ساتھ آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی چل رہی تھی۔ ایک دوست نے باہر سے آکر سنا تو آپ حضرت حسان بن ثابتؓ کا وہ شعر پڑھ رہے تھے جو انہوں نے آنحضرتؐ کی وفات پر کہا تھا:

كُنْتَ السَّوَادَ لِنَاظِرِيْ فَعَمِيَ عَلَيْكَ النَّاظِرُ
مَنْ شَآءَ بَعْدَكَ فَلْيَمُتْ فَعَلَيْكَ كُنْتُ اُحَاذِرُ

"یعنی اے خدا کے پیارے رسول تو تو میری آنکھ کی پُتلی تھا جو آج تیری وفات کی

وجہ سے اندھی ہوگئی ہے۔اب تیرے بعد جو چاہے مرے مجھے تو صرف تیری موت کا ڈر تھا جو واقع ہوگئی"۔

راوی کہتے ہیں آپؑ یہ شعر پڑھتے جاتے اور آنکھوں سے آنسو رواں ہیں۔میں نے پوچھا حضرت! کیا معاملہ ہے، کونسا صدمہ پہنچا ہے؟ آپؑ نے فرمایا حسان بن ثابتؓ کا یہ شعر پڑھ رہا تھا اور میرے دل میں آرزو پیدا ہو رہی تھی کہ "کاش یہ شعر میری زبان سے نکلتا"

(سیرتِ طیبہ از حضرت مرزا بشیر احمد صاحب صفحہ ۲۷۔۲۸)

محبوب کے لئے غیر معمولی غیرت

سچا عاشق اپنے معشوق کے لئے غیرت بھی رکھتا ہے اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام اپنے آقا اور محبوب کے لئے غیر معمولی غیرت رکھتے تھے اور اس کا کئی لحاظ سے اظہار ہوتا تھا۔ایک دفعہ آپ سفر میں تھے۔لاہور اسٹیشن پر وضو فرما رہے تھے۔دشمنِ اسلام اور معاند بانی اسلامؐ پنڈت لیکھرام آیا اس نے آپؑ کو سلام عرض کیا مگر آپ نے جواب نہ دیا۔اس خیال سے کہ شائد سنا نہ ہو دوسری طرف سے آ کر پھر سلام کیا مگر آپ نے توجہ نہ کی۔اس کے بعد حاضرین میں سے کسی نے کہا پنڈت لیکھرام نے سلام کیا تھا۔آپؑ نے کمال غیرت کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا

"ہمارے آقا کو تو گالیاں دیتا ہے اور ہمیں سلام کرتا ہے!" (سیرت طیبہ صفحہ ۳۰۔۳۱)

بدن لرزتا اور دل روتا ہے

معاندینِ اسلام اور دشمنانِ اسلام نے آنحضورؐ کی شان میں جو ہرزہ سرائی کی ہے اس کی وجہ سے آپؑ انتہائی کرب میں مبتلا ہو جاتے تھے۔اس کا اظہار ان الفاظ میں فرماتے ہیں جو عشقِ رسولؐ میں ڈوبی ہوئی تحریر ہے۔فرمایا:

" اور اس قدر بد گوئی اور اہانت اور دُشنام دہی کی کتابیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں چھاپی گئیں اور شائع کی گئیں کہ جن کے سننے سے بدن پر لرزہ پڑتا اور دل رو

رو کر یہ گواہی دیتا ہے کہ اگر یہ لوگ ہمارے بچوں کو ہماری آنکھوں کے سامنے قتل کرتے اور ہمارے جانی اور دلی عزیزوں کو جو دنیا کے عزیز ہیں ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتے اور ہمیں بڑی ذلت سے جان سے مارتے اور ہمارے تمام اموال پر قبضہ کر لیتے تو واللہ ثم واللہ ہمیں رنج نہ ہوتا اور اس قدر کبھی دل نہ دکھتا جو ان گالیوں اور اس توہین سے جو ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی کی گئی دُکھا"۔ (آئینہ کمالاتِ اسلام روحانی خزائن جلد ۵ صفحہ ۵۲،۵۱)

آپؐ کے دشمنوں سے کیونکر صلح کریں

آنحضورؐ کی محبت اور غیرت میں آپؑ فرماتے ہیں:

"جو لوگ ناحق خدا سے بے خوف ہو کر ہمارے بزرگ نبی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو بُرے الفاظ سے یاد کرتے اور آنجناب پر ناپاک تہمتیں لگاتے اور بدزبانی سے باز نہیں آتے ہیں ان سے ہم کیونکر صلح کریں۔ میں سچ سچ کہتا ہوں کہ ہم شورہ زمین کے سانپوں اور بیابانوں کے بھیڑیوں سے صلح کر سکتے ہیں۔ لیکن ان لوگوں سے ہم صلح نہیں کر سکتے جو ہمارے پیارے نبی پر جو ہمیں اپنی جان اور ماں باپ سے بھی پیارا ہے ناپاک حملے کرتے ہیں۔ خدا ہمیں اسلام پر موت دے۔ ہم ایسا کام کرنا نہیں چاہتے جس میں ایمان جاتا رہے"۔ (پیغام صلح روحانی خزائن جلد ۲۳ صفحہ ۴۵۹)

اعلیٰ درجہ کا نور اور انسانِ کاملؐ

اپنے آقا و مطاع حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ارفع شان کا بیان ان خوبصورت الفاظ میں یوں بیان کرتے ہیں:

"وہ اعلیٰ درجہ کا نور جو انسان کو دیا گیا یعنی انسان کامل کو وہ ملائک میں نہیں تھا نجوم میں نہیں تھا قمر میں نہیں تھا آفتاب میں بھی نہیں تھا وہ زمین کے سمندروں اور دریاؤں میں بھی نہیں تھا۔ وہ لعل اور یاقوت اور زمرد اور الماس اور موتی میں بھی نہیں تھا غرض وہ

کسی چیز ارضی اور سماوی میں نہیں تھا صرف انسان میں تھا یعنی انسان کامل میں۔اس کا اتم اور اکمل اور اعلیٰ اور ارفع فرد ہمارے سیّد و مولیٰ سیّد الانبیاء سیّد الاحیاء محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں"۔

(آئینہ کمالاتِ اسلام روحانی خزائن جلد۵ صفحہ ۱۶۰۔۱۶۱)

عالی مرتبہ کا نبیؐ

آنحضور کی بلند شان اور علوِ مرتبت کا اظہار ان خوبصورت الفاظ میں فرماتے ہیں:

"مَیں ہمیشہ تعجب کی نگہ سے دیکھتا ہوں کہ یہ عربی نبی جس کا نام محمد ہے (ہزار ہزار درود اور سلام اُس پر) یہ کس عالی مرتبہ کا نبی ہے۔اس کے عالی مقام کا انتہا معلوم نہیں ہو سکتا اور اس کی تاثیر قدسی کا اندازہ کرنا انسان کا کام نہیں۔افسوس کہ جیسا حق شناخت کا ہے اُس کے مرتبہ کو شناخت نہیں کیا گیا۔وہ توحید جو دنیا سے گم ہو چکی تھی وہی ایک پہلوان ہے جو دوبارہ اس کو دنیا میں لایا۔اُس نے خدا سے انتہائی درجہ پر محبت کی اور انتہائی درجہ پر بنی نوع کی ہمدردی میں اس کی جان گداز ہوئی اِس لئے خدا نے جو اُس کے دل کے راز کا واقف تھا اُس کو تمام انبیاء اور تمام اوّلین وآخرین پر فضیلت بخشی اور اُس کی مرادیں اُس کی زندگی میں اُس کو دیں"۔ (حقیقۃ الوحی روحانی خزائن جلد۲۲ صفحہ ۱۱۸۔۱۱۹)

تمام مرسلوں کا سرتاج

اپنی کتاب سراجِ منیر میں آنحضور کی فضیلت ان الفاظ میں تحریر فرماتے ہیں:

"ہم جب انصاف کی نظر سے دیکھتے ہیں تو تمام سلسلہ نبوت میں سے اعلیٰ درجہ کا جوانمرد نبیؐ اور زندہ نبیؐ اور خدا کا اعلیٰ درجہ کا پیارا نبیؐ صرف ایک مرد کو جانتے ہیں یعنی وہی نبیوں کا سردار رسولوں کا فخر تمام مرسلوں کا سرتاج جس کا نام محمد مصطفیٰ واحمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہے جس کے زیر سایہ دس دن چلنے سے وہ روشنی ملتی ہے جو پہلے اس

سے ہزار برس تک نہیں مل سکتی تھی“۔ (سراج منیر روحانی خزائن جلد۱۲صفحہ۸۲)

عربی منظوم کلام

حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اپنے عربی منظوم کلام میں انتہائی خوبصورت انداز اور محبت بھرے الفاظ میں اپنے آقا و مولیٰ کے عشق میں محبت کے ترانے لکھے ہیں۔نمونہ کے طور پر صرف چند اشعار پیش ہیں:۔

یَا رَبِّ صَلِّ عَلٰی نَبِیِّکَ دَائِمًا

فِی ھٰذِہِ الدُّنْیَا وَ بَعْثٍ ثَانٍ

یَا حِبِّ اِنَّکَ قَدْ دَخَلْتَ مَحَبَّۃً

فِی مُھْجَتِی وَ مَدَارِکِی وَ جَنَانِی

جِسْمِی یَطِیْرُ اِلَیْکَ مِنْ شَوْقٍ عَلَا

یَا لَیْتَ کَانَتْ قُوَّۃُ الطَّیَرَانِ

(آئینہ کمالات اسلام روحانی خزائن جلد۵صفحہ۵۹۳و۵۹۴)

اپنے حمدیہ اور نعتیہ کلام میں فرمایا:

اِنِّی اَمُوْتُ وَلَوْ یَمُوْتُ مَحَبَّتِی

یُدْرٰی بِذِکْرِکَ فِی التُّرَابِ نِدَائِی

(منن الرحمان روحانی خزائن جلد۹صفحہ۱۶۹)

ترجمہ: (۱) اے میرے رب تو اپنے نبیؐ پر اس جہان میں بھی درود نازل فرما اور دوسرے جہان میں بھی درود نازل فرما۔

(۲) اے میرے محبوبؐ تیری محبت میری جان اور میرے حواس اور میرے دل میں سرایت کر چکی ہے۔

(۳) اے میرے معشوقؐ تیرے عشق میں میرا جسم تیری طرف اُڑا جاتا ہے۔ کاش مجھے قوتِ پرواز ہوتی تو میں اُڑ کر تیرے پاس آجاتا۔

(۴) میں تو اس دنیا سے کوچ کر جاؤں گا لیکن تیرے لئے میری محبت پر کبھی موت نہیں آئے گی۔ کیونکہ میری قبر کی مٹی سے بھی تیری یاد میں آوازیں بلند ہوں گی۔

فارسی منظوم کلام کے نمونے

حضرت مسیح موعودعلیہ السلام کا پُر کیف فارسی منظوم کلام عشقِ مصطفیؐ سے بھرا ہوا ہے۔ نمونہ کے طور پر چند اشعار درج ہیں:

بعد از خدا بعشقِ محمدؐ مخمرم
گر کفر ایں بود بخدا سخت کافرم

اللہ کے بعد میں عشقِ محمدؐ میں دیوانہ ہو چکا ہوں۔ اگر اس دیوانگی کا نام کوئی کفر رکھتا ہے تو خدا کی قسم میں سخت کافر ہوں۔

ہر تار و پود من بسراید بعشق او
از خود تہی و از غم آں دلستاں پرم

آپؐ کا عشق میرے وجود کے ہر رگ و ریشہ میں سرایت کر چکا ہے اور میں اپنے آپ سے خالی اور اس محبوب کے غم سے پُر ہوں۔

جان و دلم فدائے جمالِ محمدؐ است
خاکم نثار کوچۂ آلِ محمدؐ است

میری جان اور دل محمدؐ کے جمال پر فدا ہے۔ میری خاک رسول کریمؐ کی آل کے کوچہ پر قربان ہے۔

عجب نوریست در جانِ محمدؐ
عجب لعلیست در کانِ محمدؐ

محمد ﷺ کی جان میں عجیب قسم کا نور ہے اور آپؐ کی کان میں حیرت انگیز لعل ہیں۔

ندانم ہیچ نفسے در دو عالم
کہ دارد شوکت و شانِ محمدؐ

مَیں دونوں جہانوں میں کوئی ایسا فرد نہیں پاتا جو محمد ﷺ جیسی شان و شوکت رکھتا ہو۔

دگر استاد را نامے ندانم
کہ خواندم در دبستانِ محمدؐ

مجھے کسی اور استاد کا نام معلوم نہیں کیونکہ میں نے محمد ﷺ کے مدرسہ سے تعلیم پائی ہے۔

در رہِ عشقِ محمدؐ ایں سر و جانم رود
ایں تمنا ایں دعا ایں در دلم عزم صمیم

حضرت محمد ﷺ کے عشق کی راہ میں میرا سر اور جان قربان ہو جائیں۔یہی مری تمنا ہے اور یہی میری دعا ہے اور یہی میرے دل میں پختہ ارادہ ہے۔

اردو منظوم کلام

حضرت بانی جماعت احمدیہ علیہ السلام کا پاکیزہ اردو منظوم کلام بھی عشقِ مصطفی ﷺ سے لبریز ہے۔چند اشعار بطور نمونہ درج ہیں۔

وہ پیشوا ہمارا جس سے ہے نور سارا
نام اس کا ہے محمدؐ دلبر مرا یہی ہے
اس نور پر فدا ہوں اس کا ہی میں ہوا ہوں
وہ ہے ، میں چیز کیا ہوں بس فیصلہ یہی ہے
ربط ہے جانِ محمدؐ سے مری جاں کو مدام

دل کو وہ جام لبالب ہے پلایا ہم نے

مصطفیٰؐ پر تیرا بے حد ہو سلام اور رحمت

اس سے یہ نور لیا بارِ خدایا ہم نے

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلیٰ مُحَمَّدٍ وَ آلِ محمدٍ وَ بَارِک وَ سَلِّمْ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مجیدٌ ۔

قارئین کرام! یہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے عشقِ مصطفیٰ ﷺ کی چند جھلکیاں تھیں جو آپ نے ملاحظہ کیں ۔آپؑ کا عشقِ رسولؐ لازوال تھا اور یہ عشقِ حقیقی دراصل تاقیامت تابندہ رہے گا۔آپؑ نے سچ فرمایا تھا کہ میں اس دنیا سے کوچ کر جاؤں گا لیکن میری محبتِ رسولؐ پر موت نہیں آئے گی ۔آپؑ نے عشقِ مصطفیٰؐ کی جو شمع جلائی وہ روشن سے روشن تر ہوتی چلی جا رہی ہے۔آپؑ کی جسمانی وفات کے بعد یہ عشقِ رسولؐ کی لو آپؑ کے خلفاء اور متبعین میں جل رہی ہے اور دنیا بھر میں اس کا نور پھیل رہا ہے اور عشقِ رسولؐ کی یہ داستان چار دانگِ عالم میں پھیلتی جارہی ہے اور دنیا کے ہر کونے میں محمدؐ پر درود بھیجنے والے آپؐ سے سچا پیار کرنے والے اور آپؐ کی طرف پھینکے جانے والے ہر تیر کو اپنے سینوں پر لینے والے موجود ہیں اور پیدا ہوتے چلے جارہے ہیں۔

عشقِ رسولؐ کی اس جاری داستان میں خلفاء احمدیت کے چند اقتباسات و واقعات بطور نمونہ ہدیۂ قارئین کئے جارہے ہیں کہ کس طرح یہ شمع روشن ہوتی چلی جارہی ہے جس کو حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اپنے سینہ میں روشن کیا تھا۔

حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ

حضرت حکیم مولانا نورالدین خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ کی تمام عمر اسلام، بانیٔ اسلام اور قرآن کے عشق اور خدمت میں گزری۔علمِ حدیث کے سیکھنے کا جنون آپ کو حرمین شریفین لے گیا

اور پھر تمام عمر قرآن کے علاوہ حدیث سیکھنے اور سکھانے میں گزاری۔ حضرت مسیح موعودؑ آپؓ کے عشقِ رسولؐ کی گواہی ان الفاظ میں دیتے ہیں:

”وہ پسند کرتا ہے کہ اپنا خون پانی کی طرح اعلائے دینِ رسولؐ کے لئے بہادے اور وہ تمنا رکھتا ہے کہ اس کی جان خاتم النبیینؐ کی تائید کی راہ میں صرف ہو جائے“۔

(عربی عبارت کا ترجمہ حمامۃ البشریٰ روحانی خزائن جلد ۷ صفحہ ۱۸)

دینِ مصطفیٰ ؐ کی تائید ونصرت اور مخالفینِ بانی اسلام کے اعتراضات کے دندان شکن جوابات آپ نے اپنی کتب فصل الخطاب، نورالدین اور تصدیق براہین احمدیہ ودیگر تحریرات میں دیئے ہیں جو آپؓ کے عشقِ رسولؐ کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

مقامِ محمد رسول اللہ ﷺ کے بارہ میں آپ نے ایک انتہائی خوبصورت، نرالا اور عشقِ رسولؐ میں ڈوبا استدلال فرمایا ہے۔ آپؓ بیان فرماتے ہیں:

”ایک شخص نے مجھ سے کہا کہ تم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح کیوں کرتے ہو؟ میں نے کہا تم یہ بتاؤ تم کسی بات کے قائل بھی ہو جو کسی مذہب نے مانی ہے؟ کہا کہ ہاں دعا کا قائل ہوں۔ میں نے کہا کہ زمین گول ہے۔ نماز کا وقت زمین پر ہر جگہ ہوتا ہے۔ مسلمان دنیا کے ہر حصہ میں پائے جاتے ہیں یعنی ہر وقت سینکڑوں ہزاروں لوگ نمازیں پڑھتے ہیں۔ پھر ہر نماز میں درود پڑھی جاتی ہے اور یہ سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہوتا۔ تو بتاؤ کہ کوئی رسول بھی ایسا ہے جس کے لئے اس قدر دعائیں مانگی جاتی ہوں اور مانگی گئی ہوں“

(مرقاۃ الیقین فی حیات نورالدین صفحہ ۲۶۵)

حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ

حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد خلیفۃ المسیح الثانیؓ کی تمام عمر حمایتِ اسلام اور بانیٔ اسلام حضرت محمد مصطفی ﷺ کی شان بلند کرنے میں گزری۔ آنحضورؐ کی ناموس کی حفاظت کیلئے آپؓ ننگی تلوار تھے۔ آپ اپنے منظوم کلام میں اپنے عشقِ رسولؐ کا اظہار ان الفاظ میں فرماتے ہیں:

محمدؐ میرے تن میں مثلِ جاں ہے
یہ ہے مشہور جاں ہے تو جہاں ہے
محمدؐ پر ہماری جاں فدا ہے
کہ وہ کوئے صنم کا رہنما ہے
میرا دل اس نے روشن کر دیا ہے
اندھیرے گھر کا میرے وہ دیا ہے
ہو اس کے نام پر قربان سب کچھ
کہ وہ شاہنشہِ ہر دو سرا ہے

حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ کی کتب وتحریرات جو انوار العلوم کے نام سے شائع ہو رہی ہیں، آپؓ کے خطبات جمعہ جو خطباتِ محمود کے نام سے شائع ہو رہے ہیں اور آپؓ کی معرکۃ الآراء تفسیرِ قرآن جو تفسیرِ کبیر کے نام سے دس جلدوں میں شائع شدہ ہے یہ دشمنانِ اسلام کے لئے ننگی تلوار کی صورت میں ہمارے پاس ہیں۔ یہ عشقِ رسولؐ کی طویل داستان پر مشتمل مواد ہے۔ عیسائیوں، ہندوؤں، آریوں اور نادان اہلِ دین کی طرف سے ناموسِ رسالت پر ہونے والے حملوں کا فاضلانہ، مدبرانہ، حکیمانہ اور انگشت بدنداں کرنے والا جواب ہے۔ اس کی جھلکیاں زیرِ نظر کتاب میں جابجا مختلف اعتراضات کے جوابات کی صورت میں نظر

آئیں گی۔ عشق رسولؐ میں ڈوبی ہوئی یہ تحریر نمونہ کے طور پر پیش ہے۔

جب امرتسر کے ہندو رسالہ **"ورتمان"** نے مئی ۱۹۲۷ء کی اشاعت میں ایک دل آزار مضمون شائع کیا تو حضرت مصلح موعود نے اس اشتعال انگیز مضمون کو دیکھتے ہی ایک پوسٹر شائع فرمایا جس کا عنوان تھا **"رسول کریمؐ کی محبت کا دعویٰ کرنے والے کیا اب بھی بیدار نہ ہوں گے"** اس میں آپ تحریر فرماتے ہیں:

"کیا ہمارے ہمسائیوں کو یہ معلوم نہیں کہ ہم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فَدَتْهُ نَفْسِيْ وَ اَهْلِيْ کو اپنی ساری جان اور سارے دل سے پیار کرتے ہیں اور ہمارے جسم کا ذرہ ذرہ ان پاکبازوں کے سردار کی جوتیوں کی خاک پر بھی فدا ہے۔ اگر وہ اس امر سے واقف ہیں تو پھر اس قسم کی تحریرات سے سوائے اس کے اور کیا غرض ہو سکتی ہے کہ ہمارے دلوں کو زخمی کیا جائے اور ہمارے سینوں کو چھیدا جائے اور ہماری ذلت اور بے بسی کو نہایت بھیانک صورت میں ہماری آنکھوں کے سامنے لایا جائے اور ہم پر ظاہر کیا جائے کہ مسلمانوں کے احساسات کی ان لوگوں کو اس قدر بھی پرواہ نہیں جس قدر کہ ایک امیر کبیر کو ایک ٹوٹی ہوئی جوتی کی ہوتی ہے۔ لیکن میں پوچھتا ہوں کہ کیا مسلمانوں کو ستانے کے لئے ان لوگوں کو کوئی اور راستہ نہیں ملتا۔ ہماری جانیں حاضر ہیں۔ ہماری اولادوں کی جانیں حاضر ہیں، جس قدر چاہیں ہمیں دکھ دے لیں لیکن خدا را نبیوں کے سردار محمد مصطفیٰ ﷺ کو گالیاں دے کر آپ کی ہتک کر کے اپنی دنیا اور آخرت تباہ نہ کریں کہ اس ذات بابرکات سے ہمیں اس قدر تعلق اور وابستگی ہے کہ اس پر حملہ کرنے والوں سے ہم کبھی صلح نہیں کر سکتے۔ ہماری طرف سے بار بار کہا گیا ہے اور میں پھر دوبارہ ان لوگوں کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ ہماری جنگل کے درندوں اور بن کے سانپوں سے صلح ہو سکتی ہے۔ لیکن ان لوگوں سے ہرگز نہیں ہو سکتی۔ جو رسول کریم ﷺ کو گالیاں دینے

والے ہیں۔ بیشک وہ قانون کی پناہ میں جو کچھ چاہیں کرلیں اور پنجاب ہائیکورٹ کے تازہ فیصلہ کی آڑ میں جس قدر چاہیں ہمارے رسول کریم ﷺ کو گالیاں دے لیں۔ لیکن وہ یاد رکھیں کہ گورنمنٹ کے قانون سے بالا ایک اور قانون بھی ہے اور وہ خدا کا بنایا ہوا قانون فطرت ہے۔ وہ اپنی طاقت کی بنا پر گورنمنٹ کے قانون کی زد سے بچ سکتے ہیں لیکن قانون قدرت کی زد سے نہیں بچ سکتے اور قانون قدرت کا یہ اٹل اصل پورا ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ جس کی ذات سے ہمیں محبت ہوئی ہے اسے برا بھلا کہنے کے بعد کوئی شخص ہم سے محبت اور صلح کی توقع نہیں رکھ سکتا''۔

(انوارالعلوم جلد ۹ صفحہ ۵۵۲،۵۵۴)

۲؍ مارچ ۱۹۲۷ء کو بریڈ لاء ہال لاہور میں جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے آپ نے مخالفین اسلام کو مخاطب کرتے ہوئے عشق رسولؐ کا اظہار ان پرشوکت الفاظ میں فرمایا:

''ہمیں سزا دے لو، ہمارے ساتھ سختی کرلو، ہمیں گالیاں چھوڑ گولیاں مارلو لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گالیاں نہ دو، اس کو برا نہ کہو، اس کی شان میں گستاخی نہ کرو۔ **ہم سب کچھ برداشت کر سکتے ہیں لیکن نہیں اگر برداشت کر سکتے تو اس مقدس ہستی کی توہین نہیں برداشت کر سکتے**۔ اس پاک وجود کے متعلق گالیاں نہیں برداشت کر سکتے۔ ہاں وہ جس نے دنیا میں امن قائم کیا امن کی تعلیم دی وحشی انسانوں کو انسان بنا دیا اور دنیا کو اندھیرے سے نکال کر روشنی میں کھڑا کر گیا اس کے متعلق یہ نہ کہو کہ وہ ظالم اور مفسد تھا اور یہ فعل اس کی تعلیم کا نتیجہ ہے۔

یاد رکھو ہم وہ لوگ ہیں جن کے ایک آدمی کو مخالفین پکڑ کر لے گئے اس کو سخت ایذائی پہنچائیں تکلیفیں دیں یہاں تک کہ اس کے جسم میں سوئیاں چبھوئی گئیں اس کے سامنے

ایک سولی لٹکائی گئی اور اسے بتایا گیا یہ تمہارے لئے ہے۔ان تکلیفوں کے درمیان اس سے پوچھا گیا کیا تم چاہتے ہو کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس کے سبب تمہیں یہ تکلیفیں پہنچ رہی ہیں یہاں ہوتا اور ان تکلیفوں میں مبتلا ہوتا اور تم گھر میں آرام کرتے؟ یہ بات سن کر وہ نہایت اطمینان اور سکون سے مسکراتا ہوا کہتا اے تم تو کہتے ہو کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہاں ہوں اور یہ کہ کیا میں پسند کر سکتا ہوں کہ تکالیف ان کو پہنچ رہی ہوں اور میں اپنے گھر آرام سے بیٹھا ہوا ہوں۔لیکن مجھے تو یہ بھی پسند نہیں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاؤں میں کانٹا چبھے اور میں گھر میں آرام سے بیٹھا رہوں۔

(اسد الغابۃ جلد ۲ صفحہ ۲۲۹ مطبوعہ بیروت)

غرض ہمارے جسم کا ہر ذرہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قربان ہونے کا متمنی ہے۔ہماری جان بھی اسی کے لئے ہے،ہمارا مال بھی اسی کے واسطے ہے ہم اس پر راضی ہیں۔بخدا راضی ہیں پھر کہتا ہوں بخدا راضی ہیں کہ ہماری آنکھوں کے سامنے ہمارے بچے بھی قتل کر دو،ہمارے دیکھتے دیکھتے ہمارے اہل وعیال کو جان سے مار دو لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کو گالیاں نہ دو ہمارے مال لوٹ لو،ہمیں اس ملک سے نکال دو،لیکن ہمارے سردار حضرت نبی کریم کی ہتک اور توہین نہ کرو۔ انہیں گالیاں نہ دو۔اگر یہ سمجھتے ہو کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گالیاں دینے سے تم جیت سکتے ہو اور سمجھتے ہو کہ گالیاں دینے سے تم رک نہیں سکتے تو پھر **یہ یاد رکھو کہ کم از کم ہم تمہارا اپنے آخری سانس تک مقابلہ کریں گے۔جب تک ہمارا ایک آدمی بھی زندہ ہے وہ اس جنگ کو ختم نہیں کرے گا۔**

(انوار العلوم جلد ۹ صفحہ ۴۷۷،۴۷۸)

حضرت خلیفۃ المسیح الثالث رحمہ اللہ تعالیٰ

حضرت حافظ مرزا ناصر احمد صاحب خلیفۃ المسیح الثالث رحمہ اللہ تعالیٰ کو اپنے دورِ خلافت میں متعدد بار یورپ، امریکہ اور افریقہ کے دوروں پر جانے کا موقع ملا۔ حضرت محمد مصطفیٰؐ کے سچے غلام اور خادم ہونے کے ناطے آپ کو مستشرقین اور اہلِ مغرب کے غلط خیالات اور ان کے ذہنوں میں آنحضورؐ کی غلط تصویر کو درست کرنے کے مواقع ملے اور آنحضورؐ کا حقیقی اور خوبصورت چہرہ اہلِ یورپ کو آپؒ نے دکھایا۔

آنحضورؐ کی بلند شان کا اظہار کرتے ہوئے اپنی تقریر فرمودہ ۲۸ر جنوری ۱۹۶۷ء میں فرماتے ہیں:۔

"کسی ماں نے آنحضرتؐ سے افضل بچہ نہیں جنا۔ آپ نے خدا تعالیٰ کی راہ میں وہ تکالیف برداشت کیں جن کے تصور سے بھی رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ نیز دنیا میں کوئی اور ایسا انسان نہیں جس کو خدا تعالیٰ کے نام پر اور مذہب کی وجہ سے اور عقائد کے نتیجہ میں اس قدر دکھ پہنچایا گیا ہو۔ اس قدر ایذا دی گئی ہو اور اس قدر تکالیف پہنچائی گئی ہوں اور دنیا میں آپ کے سوا کوئی انسان ایسا بھی پیدا نہیں ہوا جس نے آستانہ الوہیت پر اپنی روح کو اس طرح گداز کر دیا ہو اور بہا دیا ہو کہ نبی کریم ﷺ کی روح اپنے رب کے حضور جھکی اور بالکل گداز ہو گئی"۔

(خطابات ناصر جلد اوّل صفحہ ۱۳۹)

جماعت احمدیہ کے ذریعہ جو دنیا میں انقلاب برپا ہو رہا ہے اس کے نتیجہ میں لوگ احمدی ہو کر عشقِ محمدؐ میں گرفتار ہو جاتے ہیں اس بارے میں حضور رحمہ اللہ نے افریقہ میں ہونے والے احمدیوں کی مثال بیان فرمائی۔ آپ فرماتے ہیں:

''احمدیت کو وہ قبول کر رہے ہیں بڑی تیزی کے ساتھ اور پہلی خوشکن تبدیلی ان کے اندر یہ پیدا ہوتی ہے کہ احمدیت کو قبول کرنے کے ساتھ ہی وہ عاشقِ محمد ﷺ بن جاتے ہیں یعنی اس طرح عشق کے ساتھ درود بھیجتے ہیں کہ ان کو چین نہیں آتا درود پڑھے بغیر۔ اپنی لاریوں کے اوپر لاؤڈ سپیکر لگائے شہروں کے گلی کوچوں میں صَلِّ عَلٰی نَبِیِّنَا صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ گاتے پھر رہے ہوتے ہیں۔ (بے دھڑک، بے فکر) اور بڑی برکتیں جماعت وہاں حاصل کر رہی ہے اور ہر وہ جو احمدیت میں داخل ہو گا خلوصِ دل کے ساتھ محمد ﷺ پر درود بھیجنے والا ہو گا''۔

(خطاباتِ ناصر جلد دوم صفحہ ۵۲۶)

حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ کے دل میں عشقِ رسولؐ ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کی طرح موجزن تھا۔ ۱۹۷۴ء میں قومی اسمبلی میں جب جماعت احمدیہ کی طرف سے مؤقف پیش کرنے کے لئے آپ تشریف لے گئے وہاں آنحضورؐ کے بلند مقام خاتم النبیین کا بیان آپ نے فرمایا اور جماعت آنحضورؐ کے ساتھ جو عشق رکھتی ہے اس کا اظہار باآواز بلند فرمایا۔ اٹارنی جنرل کے سوالات ختم ہوئے تو اس نے کہا کہ آپ کچھ کہنا چاہیں تو کہہ سکتے ہیں۔ چنانچہ آخر پر آپ نے جن الفاظ میں قومی اسمبلی میں اپنے دل کا حال بیان کیا وہ وجد آفریں اور عشقِ مصطفیٰؐ میں ڈوبا ہوا ہے۔ آپ نے فرمایا:

''میں صرف ایک بات آپ کی اجازت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ **اگر دل کی گہرائیاں چیر کر میں آپ کو دکھا سکوں** تو وہاں میرے اور میری جماعت کے دل میں اللہ تعالیٰ جبکہ اسلام نے اسے پیش کیا ہے دنیا کے سامنے اور **حضرت خاتم الانبیاء محمد ﷺ کی محبت اور عشق کے سوا کچھ نہیں پائیں گے**۔ شکریہ''

(خصوصی کمیٹی میں کیا گزری۔ از ڈاکٹر مرزا سلطان احمد صفحہ ۴۴۰)

حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ تعالیٰ

حضرت مرزا طاہر احمد صاحب خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ تعالیٰ کا دل عشقِ مصطفیٰ ﷺ سے لبریز تھا۔اسی عشق کو آپ اپنی جماعت میں پیدا کرنا چاہتے تھے۔خلافت کا بیشتر عرصہ مغرب میں گزرا۔وہاں آنحضرتؐ کی ارفع اور اکمل شان اور اس کی سربلندی کے لئے تحریر و تقریر کے ذریعہ کوشاں رہے۔شاتمین رسول،سلمان رشدی اور اس کے ہم نواؤں کے آپ نے دلیرانہ انداز میں جواب دیئے اور آنحضورؐ کا سچا اور خوبصورت چہرہ دنیا کو دکھایا اور اپنے آقا کی طرف اٹھنے والے ہر تیر کو اپنے اوپر لے کر دشمن کی طرف واپس کیا۔آپ اپنے منظوم کلام میں اپنی محبتِ رسولؐ کا اظہار ان الفاظ میں فرماتے ہیں:۔

اے شاہِ مکی و مدنی سیدالوریٰ
تجھ سا مجھے عزیز نہیں کوئی دوسرا
تیرا غلامِ در ہوں ترا ہی اسیرِ عشق
تو میرا بھی حبیب ہے محبوبِ کبریا
تیرے جلو میں ہی مرا اٹھتا ہے ہر قدم
چلتا ہوں خاکِ پا کو تیری چومتا ہوا
تو میرے دل کا نور ہے اے جانِ آرزو
روشن تجھی سے آنکھ ہے اے نیرِ ہدیٰ
ہیں جان و جسم ،سو تری گلیوں پہ ہے نثار
اولاد ہے سو وہ تیرے قدموں پہ ہے فدا
تو وہ کہ میرے دل سے جگر تک اتر گیا

میں وہ کہ میرا کوئی نہیں ہے ترے سوا
اے میرے والے مصطفیٰؐ اے سیدالوریٰ
اے کاش ہمیں سمجھتے نہ ظالم جدا جدا

اسی منظوم کلام میں آپ اپنے عشقِ رسولؐ اظہار اس خوبصورت انداز سے کرتے ہیں:

ہر لحظہ بڑھ رہا ہے مرا تجھ سے پیار دیکھ
سانسوں میں بس رہا ہے ترا عشق دم بدم
میری ہر ایک راہ تری سمت ہے رواں
ترے سوا کسی طرف اٹھتا نہیں قدم
اے کاش مجھ میں قوتِ پرواز ہو تو میں
اڑتا ہوا بڑھوں تری جانب سوئے حرم

محبت رسولؐ ہمیں ہماری گھٹی میں پلائی گئی ہے چنانچہ آپ فرماتے ہیں کہ:

"کوئی دنیا کی طاقت ہمیں اس محبت سے باز نہیں رکھ سکتی۔ اگر اس محبت کے جرم میں گستاخی رسول کی چھری سے ہی ہمیں ٹکڑے ٹکڑے کیا جائے تو میں آج تمام جماعت کی طرف سے ببانگ دہل یہ اعلان کرتا ہوں کہ جو چاہو کرتے پھرو۔ محبت محمد مصطفیٰ ﷺ کو ہمارے دلوں سے نہیں نوچ سکتے اور نہیں نوچ سکتے اور میں یہ بھی بتاتا ہوں کہ یہ محبت زندگی کی ضامن ہے۔ یہ محبت رکھنے والوں کو کبھی تم دنیا میں ناکام و نامراد نہیں کر سکو گے۔ تمہاری ہر کوشش خائب و خاسر رہے گی۔ تمہارا ہر ذلیل الزام تمہارے منہ پہ لوٹایا جائے گا اور محبت محمد مصطفیٰ ﷺ زندہ رہنے کے لئے بنائی گئی ہے اور زندہ رکھنے کے لئے بنائی گئی ہے۔ اس سے جو زندگی ہم حاصل کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے کوئی تمہاری طاقت نہیں، کوئی تمہاری استطاعت نہیں ہے کہ اس زندگی کے دل پر پنجہ مار سکو"۔

(خطبات طاہر جلد ۵ صفحہ ۵۱۹، ۵۲۰)

شاتم رسول سلمان رشدی کی بدنام زمانہ کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے شاتم رسول کے بارہ میں آپ نے فرمایا:

''محمد مصطفی ﷺ کی جو غیرت ہمارے خدا کے دل میں ہے، خدا رکھتا ہے محمد مصطفیؐ کی غیرت ۔ وہ کبھی ایسے خبیث کو معاف نہیں کرے گا جس نے اس بے باکی اور بے حیائی کے ساتھ دنیا کے سب سے مقدس انسان پر سب سے غلیظ حملے کئے''۔

احباب جماعت کو ان ناپاک حملوں کا جواب دینے کے لئے تیار رہنے اور محمد مصطفیؐ کے ساتھ عشقِ حقیقی کا عملی مظاہرہ کرنے کی تلقین کرتے ہوئے آپ نے فرمایا:

''محمد مصطفی ﷺ کا سارا زمانہ غلام ہے ۔ اپنے پہلے زمانے کے بھی وہ بادشاہ تھے اور آئندہ زمانوں کے بھی وہ بادشاہ ہیں ۔ اس لئے ہمیشہ کے لئے جماعت احمدیہ ایسی کوششوں میں وقف ہو جائے جس کے نتیجے میں دشمن کے ہر ناپاک حملے کو ناکام بنایا جائے...... احمدیت کو چاہئے کہ وہ ہمیشہ کے لئے آنحضور ﷺ کے سامنے سینے تان کے کھڑی ہو جائے جس طرح حضرت طلحہؓ نے کیا تھا کہ جو تیر حضرت محمد مصطفی ﷺ پر برسائے جارہے تھے وہ اپنے ہاتھ پر لئے اور ہمیشہ کے لئے وہ ہاتھ بے کار ہو گیا ۔ اس طرح اپنا سینہ سامنے تان کر کھڑا ہو جائے ۔ **تمام تیر جو ہمارے آقا محمد رسول اللہ ﷺ پر چلائے جارہے ہیں اپنے سینوں پر لیں** ۔ یہ اسلام ہے، یہ اسلام کی محبت ہے اس طرح اسلام کا دفاع ہونا چاہئے .... ہر میدانِ جنگ میں جہاں اسلام کا دفاع ضروری ہے، ہر اس سرحد پر جہاں اسلام پر حملے ہو رہے ہیں **ہمیشہ احمدی صف اوّل پر آنحضرت ﷺ اور اسلام کے دفاع میں سینہ تانے کھڑے رہیں اور کسی شیطان کو یہ طاقت نہ ہو کہ کسی نام پر بھی وہ حضرت اقدس محمد مصطفی ﷺ اور اس پاک مذہب پر حملے کر سکے**''

(خطباتِ طاہر جلد ۸ صفحہ ۱۲۹ تا ۱۳۲ ناشر طاہر فاؤنڈیشن)

حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز

حضرت مرزا مسرور احمد صاحب خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز مسند خلافت پر متمکن ہونے کے بعد اپنے آقا و مطاع حضرت محمد مصطفی ﷺ کے سچے عاشق اور خادم کے طور پر ناموسِ رسالت کی حفاظت کے لئے، آنحضورؐ کی بلند شان کو تمام ادیان پر ظاہر کرنے کے لئے اپنی تمام تر کوششیں فرما رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت سے آنحضورؐ کے خوبصورت چہرے، آپؐ کی پیاری تعلیمات اور آپؐ کے اسوۂ حسنہ سے دنیا کو روشناس کروانے کیلئے ہمارے پیارے امام حضرت مرزا مسرور احمد صاحب خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز اپنے خطبات، اپنے خطابات، امن کانفرنسز، پریس کانفرنسز، انٹرویوز اور عالمی لیڈروں سے ملاقاتوں کے ذریعہ کوشاں ہیں۔ خلافتِ خامسہ میں ناموسِ رسالت کی حفاظت کے لئے اٹھنے والی آواز کیپٹل ہل واشنگٹن امریکہ میں گونجی، یہ آواز آنحضورؐ کے خوبصورت چہرہ کو دنیا کو دکھانے کے لئے برطانوی پارلیمنٹ میں بلند ہوئی۔ یہ آواز یوروپین پارلیمنٹ میں بھی سنائی دی اور گلڈ ہال برطانیہ بھی اس صدا سے گونج اٹھا۔

عشقِ محمد ﷺ کا حقیقی اظہار تو تب ہوتا ہے جب دشمن ناموسِ رسالت پر حملے کرتا ہے تو پھر اس کا حقیقی جواب دیا جائے۔ اس دور میں توہین آمیز کارٹونز کے ذریعہ، اہانت پر مبنی فلموں کے ذریعہ آنحضورؐ کی ذات بابرکات پر دشمنانِ اسلام نے حملے کئے ہیں۔ ان مواقع پر حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ نے سچے خادمِ رسول اور عاشقِ رسولؐ کا کردار ادا فرمایا اور دنیا کی راہنمائی کرتے ہوئے آنحضورؐ کا خوبصورت چہرہ اور پاکیزہ حیات کے بارہ میں آگاہ فرمایا اور دشمن کے اعتراضات کے جوابات دیئے۔ توہین آمیز واقعات کے موقع پر ایک احمدی کا دل چھلنی ہونا ایک بدیہی امر ہے۔

حضرت مرزا مسرور احمد خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ توہین آمیز فلم کے حوالہ سے اپنے

عشقِ رسولؐ کا اظہار ۲۱ ستمبر ۲۰۱۲ء کے خطبہ جمعہ میں ان الفاظ میں فرماتے ہیں:

"اس عظیم محسنِ انسانیت کے بارے میں ایسی اہانت سے بھری ہوئی فلم پر یقیناً ایک مسلمان کا دل خون ہونا چاہئے تھا اور ہوا اور سب سے بڑھ کر ایک احمدی مسلمان کو تکلیف پہنچی کہ ہم آنحضرت ﷺ کے عاشقِ صادق اور غلامِ صادق کے ماننے والوں میں سے ہیں جس نے ہمیں آنحضرت ﷺ کے عظیم مقام کا اِدراک عطا فرمایا۔ **پس ہمارے دل اس فعل پر چھلنی ہیں۔ ہمارے جگر کٹ رہے ہیں۔** ہم خدا تعالیٰ کے حضور سجدہ ریز ہیں کہ ان ظالموں سے بدلہ لے۔ اُنہیں وہ عبرت کا نشان بنا جو رہتی دنیا تک مثال بن جائے۔ ہمیں تو زمانے کے امام نے عشقِ رسول ﷺ کا اس طرح اِدراک عطا فرمایا ہے کہ جنگل کے سانپوں اور جانوروں سے صلح ہوسکتی ہے لیکن ہمارے آقا و مولیٰ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ حضرت خاتم الانبیاءؐ کی توہین کرنے والے اور اس پر ضد کرتے چلے جانے والے سے ہم صلح نہیں کرسکتے"۔ (خطباتِ مسرور جلد ۱۰ صفحہ ۵۶۲)

بے ہودہ کارٹونز کی اشاعت کے موقع پر حضور انور ایدہ اللہ نے ۱۰ فروری ۲۰۰۶ء کے خطبہ جمعہ میں احباب جماعت کو عشقِ رسولؐ کی خاطر اپنے حقیقی ردِّ عمل کا اظہار ان الفاظ میں بیان فرمایا:

"آپ میں سے ہر بچہ، ہر بوڑھا، ہر جوان، ہر مرد اور ہر عورت بیہودہ کارٹون شائع ہونے کے ردِّ عمل کے طور پر اپنے آپ کو ایسی آگ لگانے والوں میں شامل کریں جو کبھی نہ بجھنے والی آگ ہو، جو کسی ملک کے جھنڈے یا جائیدادوں کو لگانے والی آگ نہ ہو جو چند منٹوں میں یا چند گھنٹوں میں بجھ جائے۔ اب بڑے جوش سے لوگ کھڑے ہیں (پاکستان کی ایک تصویر تھی) آگ لگا رہے ہیں جس طرح کوئی بڑا معرکہ مار رہے ہیں۔ یہ پانچ منٹ میں آگ بجھ جائے گی، ہماری آگ تو ایسی ہونی چاہئے جو ہمیشہ لگی رہنے والی آگ ہو۔ **وہ آگ ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عشق و محبت کی آگ**

جو آپؐ کے ہر اسوہ کو اپنانے اور دنیا کو دکھانے کی آگ ہو۔ جو آپ کے دلوں اور سینوں میں لگے تو پھر لگی رہے۔ یہ آگ ایسی ہو جو دعاؤں میں بھی ڈھلے اور اس کے شعلے ہر دم آسماں تک پہنچتے رہیں۔

پس یہ آگ ہے جو ہر احمدی نے اپنے دل میں لگانی ہے اور اپنے درد کو دعاؤں میں ڈھالنا ہے۔ لیکن اس کے لئے پھر وسیلہ حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی بننا ہے۔ اپنی دعاؤں کی قبولیت کے لئے اور اللہ تعالیٰ کے پیار کو کھینچنے کے لئے، دنیا کی لغویات سے بچنے کے لئے، اس قسم کے جو فتنے اٹھتے ہیں ان سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کو دلوں میں سلگتا رکھنے کے لئے، اپنی دنیا و آخرت سنوارنے کے لئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر بے شمار درود بھیجنا چاہئے۔ کثرت سے درود بھیجنا چاہئے"۔

(خطباتِ مسرور جلد ۴ صفحہ ۸۶ و ۸۷)

اپنے خطبہ جمعہ ۲۴ رفروری ۲۰۰۶ء میں حضور انور ایدہ اللہ نے مکدر شدہ عالمی فضا کے ماحول میں احباب جماعت کو آنحضورؐ کی ذات سے عشق کے اظہار کے لئے بکثرت درود بھیجنے اور امت محمدیہ کی خاطر دعائیں کرنے کی تحریک فرمائی۔ آپ فرماتے ہیں:

"پس جہاں ایسے وقت میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ایک طوفان بدتمیزی مچا ہوا ہے یقیناً اللہ تعالیٰ کے فرشتے آپ پر دُرود بھیجتے ہوں گے، بھیج رہے ہوں گے، بھیج رہے ہیں۔ ہمارا بھی کام ہے جنہوں نے اپنے آپ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عاشق صادق اور امام الزمان کے سلسلے اور اس کی جماعت سے

منسلک کیا ہوا ہے کہ اپنی دعاؤں کو درود میں ڈھال دیں اور فضا میں اتنا درود صدق دل کے ساتھ بکھیریں کہ فضا کا ہر ذرہ درود سے مہک اٹھے اور ہماری تمام دعائیں اس درود کے وسیلے سے خدا تعالیٰ کے دربار میں پہنچ کر قبولیت کا درجہ پانے والی ہوں۔ یہ ہے اس پیار اور محبت کا اظہار جو ہمیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے ہونا چاہئے اور آپؐ کی آل سے ہونا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ امت مسلمہ کو بھی عقل دے، سمجھ دے کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرستادے کو پہچانیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس روحانی فرزند کی جماعت میں شامل ہوں جو صلح، امن اور محبت کی فضا کو دوبارہ دنیا میں پیدا کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام کو بلند کر رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو عقل دے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہونے کے باوجود آج پھر دیکھ لیں چودہ سو سال کے بعد بھی اسی مہینے میں جب محرم کا مہینہ ہی چل رہا ہے اور اسی سر زمین میں پھر مسلمان مسلمان کا خون بہا رہا ہے مگر سبق کبھی بھی نہیں سیکھا اور ابھی تک خون بہاتے چلے جا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو عقل دے اور اس عمل سے باز آئیں اور اپنے دل میں خدا کا خوف پیدا کریں اور اسلام کی سچی تعلیم پر عمل کرنے والے ہوں۔ یہ سب کچھ جو یہ کر رہے ہیں زمانے کے امام کو نہ پہچاننے کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے انکار کی وجہ سے ہو رہا ہے۔

پس آج ہر احمدی کی ذمہ داری ہے، بہت بڑی ذمہ داری ہے کہ جس نے اس زمانے کے امام کو پہچانا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے جذبے کی وجہ سے

بہت زیادہ درُود پڑھیں، دعائیں کریں، اپنے لئے بھی اور دوسرے مسلمانوں کے لئے بھی تا کہ اللہ تعالیٰ امت مسلمہ کو تباہی سے بچالے"۔

(خطبات مسرور جلد ۴ صفحہ ۱۱۵، ۱۱۶)

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وعَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ۔ اَللّٰھُمَّ بَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وعَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ کَمَا بَارَکْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ۔

یَا رَبِّ صَلِّ عَلٰی نَبِیِّکَ دَائِمًا
فِی ھٰذِہِ الدُّنْیَا وَبَعْثٍ ثَانٍ

باب اوّل

آنحضورؐ کی وحی ونبوت پر اعتراضات

یہ الزام ہے کہ آپؐ اپنی نبوت پر متشکی تھے

ایک عیسائی عبداللہ جیمز نے اعتراض کیا کہ آنحضورؐ اپنی نبوت اور قرآن کریم کے کلام اللہ ہونے پر متشکی تھے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ رسول اللہؐ نہ تھے۔

اس کے جواب میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام تحریر فرماتے ہیں کہ:

معترض نے پہلے اپنے دعویٰ کی تائید میں سورۂ بقرہ میں سے ایک آیت پیش کی ہے جس کے پورے پورے لفظ یہ ہیں۔ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ (البقرہ:۱۴۸) اس آیت کا سیاق سباق یعنی اگلی پچھلی آیتوں کے دیکھنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس جگہ نبوت اور قرآن شریف کا کوئی ذکر نہیں۔ صرف اس بات کا بیان ہے کہ اب بیت المقدس کی طرف نہیں۔ بلکہ بیت کعبہ کی طرف منہ پھیر کر نماز پڑھنی چاہئے۔ سو اللہ جل شانہٗ اس آیت میں فرماتا ہے کہ یہ ہی حق بات ہے یعنی خانہ کعبہ کی طرف ہی نماز پڑھنا حق ہے جو ابتدا سے مقرر ہو چکا ہے اور پہلی کتابوں میں بطور پیشگوئی اس کا بیان بھی ہے سو تو (اے پڑھنے والے اس کتاب کے) اس بارے میں شک کرنے والوں سے مت ہو ☆

پھر اس آیت کے آگے بھی اسی مضمون کے متعلق آیتیں ہیں چنانچہ فرماتا ہے: وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَإِنَّهُ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ (البقرہ: ۱۵۰) یعنی ہر ایک طرف سے جو تو نکلے تو خانہ کعبہ کی ہی طرف نماز پڑھ یہی تیرے ربّ کی طرف سے حق ہے غرض صاف ظاہر ہے کہ یہ تمام آیات خانہ کعبہ کے بارے میں ہیں نہ کسی اور تذکرہ کے متعلق اور چونکہ یہ حکم جو خانہ کعبہ کی طرف نماز پڑھنے کے لئے صادر ہوا ایک عام حکم ہے جس میں سب مسلمان داخل ہیں لہٰذا بعموم منشاء حکم بعض وسوسے والی طبیعتوں کا وسوسہ

☆ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ پہلی کتابوں میں اور نیز انجیل میں بھی تحویل کعبہ کے بارے میں بطور پیشگوئی اشارات ہو چکے ہیں۔ دیکھو یوحنا ۴۔۲۱ تا ۲۴ یسوع نے اُس سے کہا کہ اے عورت! میری بات کو یقین رکھو وہ گھڑی آتی ہے کہ جس میں تم نہ اس پہاڑ پر اور نہ یروشلم میں باپ کی پرستش کرو گے۔

دور کرنے کے لئے ان آیات میں اُن کو تسلی دی گئی کہ اس بات سے متردد نہ ہوں کہ پہلے بیت المقدس کی طرف نماز پڑھتے پڑھتے اب اُس طرف سے ہٹ کر خانہ کعبہ کی طرف نماز پڑھنا کیوں شروع کر دیا سو فرمایا کہ یہ کوئی نئی بات نہیں بلکہ یہ وہی مقرر شدہ بات ہے جس کو خدائے تعالیٰ نے اپنے پہلے نبیوں کے ذریعے سے پہلے ہی سے بتلا رکھا تھا اس میں شک مت کرو۔

دوسری آیت میں جو معترض نے بتائید دعویٰ خود تحریر کی ہے وہ سورہ انعام کی ایک آیت ہے جو معہ اپنی آیات متعلقہ کے اس طرح پر ہے اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِىْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِىْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا ؕ وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْلَمُوْنَ اَنَّهٗ مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ (الانعام: ۱۱۵) یعنی کیا بجز خدا کے میں کوئی اور حَکَم طلب کروں اور وہ وہی ہے جس نے مفصل کتاب تم پر اُتاری اور جن لوگوں کو ہم نے کتاب یعنی قرآن دیا ہے مراد یہ ہے کہ جن کو ہم نے علمِ قرآن سمجھایا ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ وہ منجانب اللہ ہے سواے پڑھنے والے تو شک کرنے والوں میں سے مت ہو۔

اب اِن آیات پر نظر ڈالنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مخاطب اس آیت کے جو فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ہے ایسے لوگ ہیں جو ہنوز یقین اور ایمان اور علم سے کم حصہ رکھتے ہیں بلکہ اوپر کی آیتوں سے یہ بھی کھلتا ہے کہ اِس جگہ یہ حکم فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ کا پیغمبر خدا ﷺ کا قول ہے جس کا قرآن شریف میں ذکر کیا گیا ہے کیونکہ شروع کی آیت میں جس سے یہ آیت تعلق رکھتی ہے آنحضرت ﷺ کا ہی قول ہے یعنی یہ کہ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِىْ حَكَمًا سو اِن تمام آیات کا بامحاورہ ترجمہ یہ ہے کہ میں بجز خدائے تعالیٰ کے کوئی اور حَکَم جو مجھ میں اور تم میں فیصلہ کرے مقرر نہیں کر سکتا وہ وہی ہے جس نے تم پر مفصل کتاب نازل کی سو جن کو اس کتاب کا علم دیا گیا ہے وہ اس کا منجانب اللہ ہونا خوب جانتے ہیں سو تو (اے بے خبر آدمی) شک کرنے والوں میں سے مت ہو۔

اب تحقیق سے ظاہر ہے کہ آنحضرت ﷺ خود شک نہیں کرتے بلکہ شک کرنے والوں کو بحوالہ شواہد و دلائل منع فرماتے ہیں پس باوجود ایسے کھلے کھلے بیان کے آنحضرت ﷺ کی طرف

شک فی الرسالت کو منسوب کرنا بے خبری و بے علمی یا محض تعصب نہیں تو کیا ہے۔

پھر اگر کسی کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ اگر شک کرنے سے بعض ایسے نَومسلم یا مترد ّد منع کئے گئے تھے جو ضعیف الایمان تھے تو اُن کو یوں کہنا چاہیے تھا کہ تم شک مت کرو نہ یہ کہ تو شک مت کر کیونکہ ضعیف الایمان آدمی صرف ایک ہی نہیں ہوتا بلکہ کئی ہوتے ہیں بجائے جمع کے واحد مخاطب کا صیغہ کیوں استعمال کیا گیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس وحدت سے وحدت جنسی مراد ہے جو جماعت کا حکم رکھتی ہے اگر تم اوّل سے آخر تک قرآن شریف کو پڑھو تو یہ عام محاورہ اُس میں پاؤ گے کہ وہ اکثر مقامات میں جماعت کو فرد واحد کی صورت میں مخاطب کرتا ہے مثلاً نمونہ کے طور پر اِن آیات کو دیکھو۔ لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَقْعُدَ مَذْمُوْمًا مَّخْذُوْلًا ۝ وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۭ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ۝ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ۝ (بنی اسرائیل:۲۳ تا ۲۵)

یعنی خدائے تعالیٰ کے ساتھ کوئی دوسرا خدا مت ٹھہرا اگر تو نے ایسا کیا تو مذموم اور مخذول ہو کر بیٹھے گا۔ اور تیرے خدا نے یہی چاہا ہے کہ تم اسی کی بندگی کرو اُس کے سوا کوئی اور دوسرا تمہارا معبود نہ ہو اور ماں باپ سے احسان کر اگر وہ دونو یا ایک اُن میں سے تیرے سامنے بڑی عمر تک پہنچ جائیں تو تُو اُن کو اُف نہ کر اور نہ اُن کو جھڑک بلکہ اُن سے ایسی باتیں کہہ کہ جن میں اُن کی بزرگی اور عظمت پائی جائے اور تذلل اور رحمت سے ان کے سامنے اپنا بازو جھکا اور دعا کر کہ اے میرے ربّ تو ان پر رحم کر جیسا اُنہوں نے میرے بچپن کے زمانے میں میری پرورش کی۔

اب دیکھو کہ ان آیات میں یہ ہدایت ظاہر ہے کہ یہ واحد کا خطاب جماعت اُمت کی طرف ہے جن کو بعض دفعہ انہیں آیتوں میں تم کر کے بھی پکارا گیا ہے۔ اور آنحضرت ﷺ ان آیات میں مخاطب نہیں کیونکہ ان آیتوں میں والدین کی تعظیم و تکریم اور اُن کی نسبت برّ و احسان کا حکم ہے اور ظاہر ہے کہ آنحضرت ﷺ کے والدین تو صغرسنی کے زمانے میں بلکہ جناب ممدوح

کی شیر خوارگی کے وقت میں ہی فوت ہو چکے تھے سو اس جگہ سے اور نیز ایسے اور مقامات سے بوضاحت ثابت ہوتا ہے کہ جماعت کو واحد کے طور پر مخاطب کر کے پکارنا یہ قرآن شریف کا ایک عام محاورہ ہے کہ جو ابتدا سے آخر تک جا بجا ثابت ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہی محاورہ توریت کے احکام میں بھی پایا جاتا ہے کہ واحد مخاطب کے لفظ سے حکم صادر کیا جاتا ہے اور مراد بنی اسرائیل کی جماعت ہوتی ہے جیسا کہ خروج باب ۳۳، ۳۴ میں بظاہر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مخاطب کر کے فرمایا ہے۔ (۱۱) آج کے دن میں جو حکم تجھے کرتا ہوں تو اُسے یاد رکھیو۔ (۱۲) ہوشیار رہ تا نہ ہووے کہ اُس زمین کے باشندوں کے ساتھ جس میں تو جاتا ہے کچھ عہد باندھے۔ (۱۷) تو اپنے لئے ڈھالے ہوئے معبودوں کو مت بنائیو۔

اب ان آیات کا سیاق سباق دیکھنے سے صاف ظاہر ہے کہ اگرچہ ان آیات میں حضرت موسیٰ علیہ السلام مخاطب کئے گئے تھے مگر دراصل حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان احکام کا نشانہ نہیں بنایا گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نہ کنعان میں گئے اور نہ بت پرستی جیسا بُرا کام حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے مردِ خدا بت شکن سے ہو سکتا تھا جس سے ان کو منع کیا جاتا کیونکہ موسیٰ علیہ السلام وہ مقربُ اللہ ہے جس کی شان میں اسی باب میں خدائے تعالیٰ فرماتا ہے کہ تو میری نظر میں منظور ہے اور میں تجھ کو بنام پہچانتا ہوں دیکھو خروج باب ۳۳ آیت (۱۷)

سو یاد رکھنا چاہئے کہ یہی طرز قرآن شریف کی ہے توریت اور قرآن شریف میں اکثر احکام اسی شکل سے واقعہ ہیں کہ گویا مخاطب اُن کے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور جناب رسول اللہ ﷺ ہیں مگر دراصل وہ خطاب قوم اور اُمت کے لوگوں کی طرف ہوتا ہے لیکن جس کو ان کتابوں کی طرز تحریر معلوم نہیں وہ اپنی بے خبری سے یہی خیال کر لیتا ہے کہ گویا وہ خطاب وعتاب نبی منزل علیہ کو ہو رہا ہے مگر غور اور قرائن پر نظر ڈالنے سے اُس پر کھل جاتا ہے کہ یہ سراسر غلطی ہے۔

پھر یہ اعتراض اُن آیات پر نظر ڈالنے سے بھی بکلّی مستاصل ہوتا ہے جن میں اللہ جل شانہٗ نے آنحضرت ﷺ کے یقین کامل کی تعریف کی ہے جیسا کہ وہ ایک جگہ فرماتا ہے۔ قُلْ اِنِّيْ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ (الانعام: ۵۸) س نمبر ۷ یعنی کہہ کہ مجھے اپنی رسالت پر کھلی کھلی دلیل اپنے ربّ کی طرف سے ملی ہے اور پھر دوسری جگہ فرماتا ہے قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ

اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۣ عَلٰى بَصِيْرَةٍ نمبر ۱۳ (یوسف: ۱۰۹) یعنی کہہ کہ یہ میری راہ ہے میں اللہ کی طرف بصیرت کاملہ کے ساتھ بُلا تا ہوں اور پھر ایک جگہ فرماتا ہے...... وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ۭ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا نمبر ۵ (النساء: ۱۱۴) یعنی خدا نے تجھ پر کتاب اُتاری اور حکمت یعنی دلائل حقیت کتاب و حقیت رسالہ تجھ پر ظاہر کئے اور تجھے وہ علوم سکھائے جنہیں تو خود بخود جان نہیں سکتا تھا اور تجھ پر اُس کا ایک عظیم فضل ہے پھر سورہ نجم میں فرماتا ہے۔

مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى (النجم: ۱۲) مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى (النجم: ۱۹،۱۸) یعنی آنحضرت ﷺ کے دل نے جو اپنی صداقت کے آسمانی نشان دیکھے تو اُس کی کچھ تکذیب نہ کی یعنی شک نہیں کیا اور آنکھ چپ و راست کی طرف نہیں پھیری اور نہ حد سے آگے بڑھی یعنی حق پر ٹھہر گئی اور اِس نے اپنے خدا کے وہ نشان دیکھے جو نہایت بزرگ تھے۔

اب اے ناظرین! ذرا انصافاً دیکھو اے حق پسندو ذرا منصفانہ نگہ سے غور کرو کہ خدائے تعالیٰ کیسے صاف صاف طور پر بشارت دیتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کو بصیرتِ کاملہ کے ساتھ اپنی نبوت پر یقین تھا اور عظیم الشان نشان ان کو دکھلائے گئے تھے۔

اب خلاصہ جواب یہ ہے کہ تمام قرآن شریف میں ایک نقطہ یا ایک شعشہ اس بات پر دلالت کرنے والا نہیں پاؤ گے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی نبوت یا قرآن شریف کے منجانب اللہ ہونے کی نسبت کچھ شک تھا بلکہ یقینی اور قطعی بات ہے کہ جس قدر یقین کامل و بصیرت کامل و معرفت اکمل کا آنحضرت ﷺ نے اپنی ذات بابرکات کی نسبت دعویٰ کیا ہے اور پھر اُس کا ثبوت دیا ہے ایسا کامل ثبوت کسی دوسری موجودہ کتاب میں ہرگز نہیں پایا جاتا۔ فَهَلْ مَنْ يَّسْمَعُ فَيُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَيَكُوْنُ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ الْمُخْلِصِيْنَ۔ واضح رہے کہ انجیلوں☆ میں حضرت مسیح کے بعض اقوال ایسے بیان کئے گئے ہیں

☆ یہ شبہات چاروں انجیلوں سے پیدا ہوتے ہیں خاص کر انجیل متی تو اول وجہ کی شبہ اندازی میں ہے۔

جن پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام اپنی عمر کے آخری دنوں میں اپنی نبوت اور اپنے مؤیّد من اللہ ہونے کی نسبت کچھ شبہات میں پڑ گئے تھے جیسا کہ یہ کلمہ کہ گویا آخری دم کا کلمہ تھا یعنی **ایلی ایلی لماسبقتنی** جس کے معنی یہ ہیں کہ اے میرے خدا اے میرے خدا تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا۔ عین دنیا سے رخصت ہونے کے وقت میں کہ جو اہل اللہ کے یقین اور ایمان کے انوار ظاہر ہونے کا وقت ہوتا ہے آنجناب کے منہ سے نکل گیا۔ پھر آپ کا یہ بھی طریق تھا کہ دشمنوں کے بد ارادہ کا احساس کر کے اُس جگہ سے بھاگ جایا کرتے تھے حالانکہ خدائے تعالیٰ سے محفوظ رہنے کا وعدہ پا چکے تھے ان دونوں امور سے شک اور تحیّر ظاہر ہے پھر آپ کا تمام رات رو رو کر ایسے امر کے لئے جس کا انجام بد آپ کو پہلے سے معلوم تھا بجز اس کے کیا معنی رکھتا ہے کہ ہر ایک بات میں آپ کو شک ہی شک تھا۔ یہ باتیں صرف عیسائیوں کے اس اعتراض اُٹھانے کی غرض سے لکھی گئی ہیں ورنہ ان سوالات کا جواب ہم تو احسن طریق سے دے سکتے ہیں اور اپنے پیارے مسیح کے سر سے جو بشری ناتوانیوں اور ضعفوں سے مستثنیٰ نہیں تھے ان تمام الزامات کو صرف ایک نفی الوہیت و ابنیت سے ایک طرفۃ العین میں اُٹھا سکتے ہیں مگر ہمارے عیسائی بھائیوں کو بہت دقت پیش آئے گی۔

(ایک عیسائی کے تین سوال اور ان کے جوابات، روحانی خزائن جلد نمبر ۴ صفحہ ۴۴۱ تا ۴۴۷)

☆

اس سوال کا جواب حضرت حکیم مولانا نورالدین خلیفۃ المسیح الاوّل نے بھی ارشاد فرمایا تھا۔ آپ اس اعتراض کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"**ہادی اسلام** خیر خواہ کافہ انام علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اپنی رسالت اور نبوت پر اپنی صداقت اور کامیابی پر پورا یقین اور پرلے درجہ کا علم و اعتقاد تھا۔ کبھی کسی قسم کا تردد و شک حضور علیہ السلام کے قلب مطہر اور منشرح پر نہیں آیا۔ آپ کا کیا ذکر آپ کے ساتھ والے اور میرے جیسے اتباع بھی آپ کی صداقت اور نبوت پر اعلیٰ درجہ کا یقین رکھتے ہیں۔

ثبوت

هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۣ عَلٰي بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ۭ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (یوسف:۱۰۹) یہی میری راہ ہے بلاتا ہوں اللہ (اللہ قرآنی محاورہ میں ایسی ذات پاک کا نام ہے جو ہر ایک کاملہ صفت سے موصوف اور ہر ایک برائی سے منزہ ہو۔نورالدین۔) کی طرف پہلے درجہ کی سمجھ اور بوجھ پر میں اور میرے ساتھ والے بھی ایسے ہیں۔اور ہر بُرائی اور نقص سے پاک ہے اللہ۔اور میں اللہ کے ساتھ کسی امر میں کبھی کسی مخلوق کو ساجھی سمجھنے والا نہیں۔

دُوسری دلیل حضور علیہ السلام کے متردد نہ ہونے پر

قُلْ اِنِّىْ عَلٰي بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَكَذَّبْتُمْ بِهٖ ۭمَا عِنْدِيْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ ۭ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۭ يَقُصُّ الْحَقَّ وَهُوَ خَيْرُ الْفٰصِلِيْنَ (الانعام:۵۸) بے شک وشبہ میں اعلیٰ درجہ کے کھلے نشان اپنی راستی اور صداقت پر اپنے رب کی طرف سے رکھتا ہوں اور تم اس راستی کی تکذیب کر چکے۔میری تکذیب کے بدلہ جو عذاب تم پر آنے والا ہے تم چاہتے ہو وہ عذاب تم پر جلد آ جاوے سو اس عذاب کا تم پر لانا میرے قبضہ قدرت میں نہیں۔اللہ کے سوا کسی کی حکومت نہیں مگر یادرکھو منکر دکھ پاویں گے۔اللہ ظاہر کرتا رہے گا۔اس حق کو جو میں لایا ہوں اور بے شک وریب وہ (اللہ تعالیٰ) ہے بہت ہی بڑا جھوٹ اور سچ میں فیصلہ کرنے والا۔جھوٹے کو ذلیل سچے کو فتح مند کرے گا۔

تیسری دلیل

قُلْ اِنَّنِيْ هَدٰىنِيْ رَبِّيْٓ اِلٰي صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ڬ دِيْنًا قِيَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا

(الانعام:۱۶۲)

بے شک وریب مجھے راہ بتائی میرے رب نے سیدھی راہ۔ٹھیک اور درست دین کی جس کا نام ابراہیمی دین ہے (اسلام) ایک طرف کا دین ہر طرح کے شرک سے بالکل پاک۔

چوتھی دلیل

الٓمّٓ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ (البقرۃ:۲،۲)

یہ سورت جس کا نام الم ہے وہ کتاب ہے (جس کے اُتارنے کا موسیٰ علیہ السلام کی کتاب استثناء کے باب ۱۸ میں وعدہ ہو چکا) اس میں شک وریب کی جگہ نہیں۔

پانچویں دلیل

اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا ۙ شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا (المزمل:۱۶) بیشک وریب ہم نے (اللہ تعالےٰ فرماتا ہے) تمہاری طرف بھیجا بڑا اعظمت والا رسول نگران تم پر۔اور یہ رسُول اس رسُول کی مانند ہے جس کو ہم نے فرعون کے پاس بھیجا۔

فَكَيْفَ تَتَّقُوْنَ اِنْ كَفَرْتُمْ (المزمل:۱۸) منکرو! بتاؤ تو تم کیسے بچو گے عذاب سے اگر تم نے اس رسول کا انکار کیا۔کیا معنی اگر فرعون موسیٰ علیہ السلام کے انکار سے سزایاب ہؤا تو تم منکرو! کیونکر بچ سکتے ہو۔

یہ آیت شریف کتاب استثنا کے ۱۸ باب ۱۸ کی طرف راہنمائی فرماتی ہے۔

غرض اسی طرح کی بہت آیات قرآن کریم میں موجود ہیں اوران آیات سے صاف ظاہر ہوتا ہے حضور علیہ السلام کو اپنی رسالت، نبوت، راستی اور راستبازی پر پورا اور اعلیٰ درجہ کا یقین تھا اور اولڈ ٹیسٹمنٹ اور نیو ٹیسٹمنٹ کے ماننے والا بعد انصاف ہرگز انکار نہیں کرسکتا کیونکہ استثناء ۱۸ باب ۱۸ میں اور اعمال ۳ باب میں صاف لکھا ہے کہ ایک نبی موسیٰ علیہ السلام کی مانند آنے والا ہے اور توریت میں یہ بھی لکھا ہے کہ جھوٹا نبی جو از راہ کذب وافترا اپنے آپ کو موسیٰ علیہ السلام کی مانند کہے مارا جاوے گا۔

حضور (فِدَاهُ اَبِيْ وَاُمِّيْ) نبی عرب نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مانند رسول ہونے کا دعویٰ فرمایا جیسا گزرا۔اور آیت شریف وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ (المائدۃ:۶۸) جس کے معنی ہیں اللہ تعالیٰ تجھے لوگوں سے بچالے گا پڑھ کر پہرہ اور حفاظت کو بھی دور کر دیا۔مدینہ کے

یہود اور عیسائی قوم کو صاف صاف سنا دیا کہ میں قتل نہ کیا جاؤں گا اور اللہ کے فضل سے قتل سے بچ رہے صلی اللہ علیہ وسلم۔

عیسائی صاحبان! اگر نبی عرب اس دعویٰ نبوت میں (اور نبوت کا بھی وہ دعویٰ جو كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا فرما کر استثنا ۱۵ باب ۱۸ اور اعمال ۳ باب والا دعویٰ ہے۔اور بالکل ظاہر ہے کہ نبی عرب قتل نہیں کیے گئے) **کاذب ہیں (معاذ اللہ)** تو توریت کتاب مقدس نہیں بلکہ بالکل غلط اور کذب ہے۔کیونکہ کتاب استثنا کے ۱۸ باب ۱۸ میں لکھا ہے جھوٹا نبی مارا جاوے گا۔لاکن توریت شریف اگر الہام الٰہی سے ہے اور سچ تو ہمارے ہادی صلی اللہ علیہ وسلم سچے رسول اور فی نفس الامر استثنا ۱۸ باب والے رسول ہیں۔

اسی واسطے قرآن کریم بار بار حضرت احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰؐ اور اپنے آپ کو مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ (ال عمران:۸۲) فرماتا ہے۔کیا معنی قرآن کریم اور نبی عرب نے اپنے ظہور اور حفاظت اور قتل سے بچ کر توریت کو سچا کر دکھایا۔

اب آگے سنو۔قرآن کریم نے دعویٰ فرمایا ہے ''قرآن میں اختلاف نہیں''

وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا (النساء:۸۳)

قرآن کریم اگر اللہ تعالیٰ کا کلام نہ ہوتا تو اس میں ضرور اختلاف ہوتا اور بہت اختلاف ہوتا۔کیونکہ اختلاف دو طرح کا ہوسکتا ہے۔

اوّل یہ کہ قرآن کریم کے مضامین کو قانون قدرت تکذیب کرے اور قرآنی مطالب الٰہی انتظام اور فطری قوانین کے مخالف ہوں۔یا ہمارے فطری قویٰ ان کو برداشت نہ کرسکیں۔

دوسری صورت اختلاف کی یہ ہے۔قرآنی مضامین باہم متعارض ہوں۔

غور کرو! اَن پڑھ عرب کے اَن پڑھ عربی نے (**اَللّٰهُمَّ فَرِّجْ عَنِّيْ مَا اَسْاَلُكُمْ**) یہ قرآن لوگوں کو سنایا۔پھر تیرہ سو برس کی سرتوڑ نیچرل فلاسفی کی تحقیقات نے حضرت قرآن کلام الرحمٰن کے کسی مضمون کو یقینی طور پر نہ جھٹلایا اور اس تجربہ سے یقین ہوگیا کہ آئندہ بھی کبھی نہ جھٹلائے۔

دُوسری صورت اختلاف کی نسبت عرض ہے

قرآن کریم تیئیس برس میں لوگوں کو سنایا گیا اور اس مدت دراز میں حضور علیہ السلام کبھی تن تنہا ہیں اور کبھی ہزاروں ہزار خدام پر حکمران۔ کبھی دشمنوں پر حملہ آور اور کبھی احباب کے درمیان۔ گاہے گھر میں بیبیوں سے معاشرت۔ کسی وقت اعدا سے مباشرہ۔ کبھی عرب کی بے دین اور جاہل قوم سے مکالمہ اور کبھی نصاریٰ اور یہود کے علما سے مناظرہ۔ ایک وقت فقر ہے اور دوسرے وقت غنیٰ وغیرہ وغیرہ۔

ایسی مختلف حالتوں میں کمزور انسان کے خیالات ہرگز ہرگز یکساں نہیں رہ سکتے ان میں تغیر اور اختلاف ضرور آجاتا ہے مگر قرآن مجید میں کوئی اختلاف نہیں باآنکہ تیئیس برس اور مختلف حالتوں میں اترا۔ اور قرآن مجید نے اپنی صفت میں یہ بھی فرمایا ہے

كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا جب میں نے قرآن مجید سے ثابت کر دیا کہ نہ تو حضور علیہ السلام کو کوئی شک وشبہ ہے اور نہ قرآن میں اختلاف۔ تو اب سائل کے سوال پر توجہ کرتا ہوں۔

کیوں؟ اس لئے کہ مجھ کو کتاب مجید اور فرقان حمید سے جیسے گزرا ثابت ہوا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یقین کے اعلیٰ درجہ پر تھے اور قرآن میں اختلاف نہیں، پھر سائل کہتا ہے کہ قرآن سے معلوم ہوتا کہ ہادی اسلام **مُتَشَكِّك** تھے۔ بڑی دلیل سائل کی سورۂ بقرہ کی آیت ذیل ہے اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ (البقرۃ:۱۴۸)

سو اس کا پہلا جواب یہ ہے لَا تَكُوْنَنَّ نفی کا صیغہ ہے نہ نہی کا اور تاکید کے واسطے نون مشدد اس کے آخر زیادہ کیا گیا تو لَا تَكُوْنَنَّ ہو گیا۔ مشدد نون ماضی اور حال پر نہیں آسکتا۔ پس لَا تَكُوْنَنَّ استقبال کا صیغہ ہوگا۔ اب اس تحقیق پر آیت کے یہ معنے ہوں گے:۔

یہ حق ہے تیرے رب کی طرف سے (چونکہ الٰہی الہام اور دلائل سے یہ حق ثابت ہو گیا تو) تو کبھی شک والوں میں سے نہ ہوگا۔

دوسرا جواب۔ ہم نے مانا لَا تَكُوْنَنَّ نفی نہیں نہی کا صیغہ ہے۔ مگر ہم کہتے ہیں نہی دو قسم ہوتی ہے۔ ایک طلب ترک فعل۔ دوم طلب عدم فعل۔ سائل کا اعتراض اس صورت میں ہے کہ

یہاں نہی کو بغرض طلب ترک فعل لیا جاوے۔جس کا یہ مطلب ہے کہ مخاطب فعل شک کو ترک کر دیوے۔مگر ہم کہتے ہیں یہاں شک معدوم ہے اور نہی کا منشاء یہ ہے کہ جیسے شک معدوم ہے آئندہ بھی معدوم رہے۔

تیسرا جواب۔سائل! یہاں آیت فَلَا تَكُونَنَّ میں ایسا کونسا امر ہے جس کے باعث ہم کو خواہ مخواہ ماننا پڑے کہ لَا تَكُونَنَّ کے مخاطب ہادی اسلام ہیں صلی اللہ علیہ وسلم۔ہم کہہ سکتے ہیں بدلائل مذکورہ سابقہ حضور علیہ السلام کو اپنی رسالت پر یقین تھا اور قرآن کریم میں اختلاف نہیں۔

اس لئے ثابت ہوا لَا تَكُونَنَّ کا مخاطب کوئی متردد اور شک کرنے والا آدمی ہے نہ حضور علیہ السلام۔

چوتھا جواب۔ہم نے مانا اس جملہ لَا تَكُونَنَّ کے مخاطب ہمارے پاک ہادی علیہ السلام ہیں مگر عبری اور عربی کا طرز کلام باہم قریب قریب ہے اور کتب مقدسہ کا غیر محرف حصہ اور قرآن کریم دونوں ایک ہی متکلم کے کلمات ہیں اور دونوں ایک ہی مخرج سے نکلے ہیں اور دونوں کا محاورہ ہے کہ اعلیٰ مورث کو مخاطب کیا جاتا ہے اور مراد اس مورث کی قوم ہوتی ہے۔کسی کو خطاب کرتے ہیں اور کسی دوسرے کو مقصود بالخطاب رکھتے ہیں۔

دیکھو یرمیا۔ہائے کہ وہ دن بڑا ہے یہاں تک کہ اس کی مانند کوئی نہیں وہ یعقوب کی مصیبت کا وقت ہے......یرمیا ۳۰ باب ۷ تا ۱۰۔اے میرے بندہ یعقوب ہراسان مت ہو۔

(یرمیا ۴۶ باب ۲۸)

خداوند کا یہوداہ کے ساتھ بھی ایک جھگڑا ہے اور یعقوب کو جیسے اس کی روشیں ہیں ویسی سزا دے گا۔ہوسیع ۱۲ باب ۲۔

دلاوری سے لبالب ہوں کہ یعقوب کو اس کا گناہ اور اسرائیل کو اس کی خطا جتادوں میکا ۳ باب ۸۔یعقوب کی رونق کو اسرائیل کی رونق کی مانند پھر بحال کرے گا۔نحوم ۲ باب ۲۔اے گرازین (یہ ایک گاؤں کا نام ہے جو افسوس اور ملامت کے قابل نہیں) تجھ پر افسوس ہے اے

بیت صیدا (یہ بھی گاؤں ہے) تجھ پر افسوس متی ۱۱ باب ۲۱۔ اے یروشلم! اے یروشلم! (یہ بیت المقدس ہے) جو نبیوں کو مار ڈالتی ہے متی ۲۳ باب ۳۷۔ ایسی صدہا کتب مقدسہ صدہا جگہ دیکھ لو۔

اب اس طرح کے محاورات قرآن کریم سے سنو۔

(۱) يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ (الطلاق:۲) اے نبی! جب تم لوگو! عورتوں کو طلاق دو۔

(۲) يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللّٰهَ وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا (الاحزاب:۲) اے نبی خدا سے ڈر اور کفار کی فرمانبرداری اور منافقوں کی اطاعت مت کر بیشک اللہ تعالےٰ جو کچھ تم (عام لوگوں کو خطاب) کرتے ہو اس پر خبردار ہے۔

(۳) وَسْـَٔلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَآ (الزخرف:۴۶) پوچھ اُن رسولوں سے جو تجھ سے پہلے گزرے۔

ان مقامات میں دیکھ لو "یا" کے لفظ سے مخاطب کون ہے اور **طَلَّقْتُمْ** سے کون۔ اِلٰی کے لفظ میں مخاطب کون اور **تَعْمَلُوْنَ** کے لفظ سے کون معلوم ہوتا ہے۔ مَنْ سے مراد کون ہے اور **قَبْلِکَ** کس کا پتہ دیتا ہے۔

پانچواں جواب۔ میں نے مانا لَا تَكُوْنَنَّ نہی کا صیغہ ہے اور نہی بھی بمعنی طلب ترک ہے اور یہاں مخاطب بھی سرور کائنات اور فخر موجودات ہیں ﷺ اور مرد بھی وہی ہیں۔ مگر میں کہتا ہوں جب لَا تَكُنْ نہی کے صیغہ پر نون مشددہ تاکید کے لئے آیا اور نون تاکید مشدد ماضی اور حال پر ہرگز آتا نہیں۔ جس فعل پر آتا ہے اس کو استقبالی فعل کر دیتا ہے۔ پس لَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ کے معنے یہ ہوں گے:۔

اے محمد تو زمانہ ماضی اور حال میں شک کرنے والا نہیں رہا۔ اب آگے زمانہ استقبال میں بھی متردد اور متشکک نہ رہیو۔ گویا یہ الٰہی دعا ہے جو یقیناً قبول ہے یا جس حالت میں تیری جبلت بھی ایسی تعلیم پر تردد والی نہیں تو اب تو میرے مطالب دلائل سے مدلل ہو چکے۔

چھٹا جواب۔ میں نے بفرض محال مان لیا تردد واقع ہوا تو کیا ایسا تردد حسب مسلمات

عیسائیوں کے نبوت کے عہدہ سے معزول کر سکتا ہے ہرگز ہرگز نہیں۔ دیکھو موسیٰ علیہ السلام کی توریت کتاب خروج اور کتاب قاضی۔ موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی نجات کے لئے منتخب فرمایا۔ تو حضرت موسیٰ فرماتے ہیں:۔ میں کون ہوں جو فرعون کے پاس جاؤں اور بنی اسرائیل کو مصر سے نکالوں۔ خروج ۳ باب ۱۱۔ پھر موسیٰ علیہ السلام لگے عذر کرنے کہ میں اچھی طرح بول نہیں سکتا اور پھر اللہ تعالیٰ نے بتاکید کہا کہ تو جا میں تیرے ساتھ ہوں۔ پھر اپنی کمزوری پر ان سب باتوں پر بقول عیسائیوں کے اطمینان نہ ہوا تو عرض کیا کہ کسی اور کو مصر میں بھیج۔ تب باری تعالیٰ (موجودہ توریت کہتی ہے) کا غصہ موسیٰ پر بھڑکا دیکھو۔ تب خداوند کا قہر موسیٰ پر بھڑکا۔ خروج ۴ باب ۱۴۔

اور جدعون نے جو کچھ کیا ہے وہ کتاب قاضی ۶ باب ۳۶ تا ۴۰ ورس سے ظاہر ہے۔ کیسے امتحانات کرتا رہا۔ ذرا منصف عیسائی اس پر پھر غور کریں۔

(ایک عیسائی کے تین سوال اور ان کے جوابات از حضرت حکیم مولانا نورالدینؓ)

آپؐ کا اپنی وحی پر شک کرنے اور بدءالوحی پر دیگر اعتراضات

بدءالوحی کے حوالہ سے مخالفین نے اس وحی پر اور آنحضرت ﷺ پر مختلف اعتراضات کئے ہیں۔

حضرت مصلح موعودؓ نے سورۃ العلق کی تفسیر میں ان اعتراضات کے مسکت جوابات تحریر فرمائے ہیں۔ آپ بیان فرماتے ہیں:۔

”ابتداء وحی ایک نہایت ہی اہمیت رکھنے اور جذبات میں ہیجان پیدا کرنے والی چیز ہے۔ اسی وجہ سے دشمنوں کی بھی اس پر خاص طور پر نظر پڑی ہے اور انہوں نے ان آیات اور ابتداء وحی سے تعلق رکھنے والے واقعات سے قسم قسم کے استدلال کرتے ہوئے رسول کریم ﷺ اور آپ کی وحی کی تنقیص کرنے کی کوشش کی ہے۔ کوئی کہتا ہے وحی ایک ڈھکونسلا ہے۔ کوئی کہتا ہے وحی ایک بیماری کا حملہ تھی۔ چنانچہ آپ کا زَمِّلُوْنِیْ زَمِّلُوْنِیْ کہنا اس پر شاہد ہے۔ کئی کہتے

ہیں یہ بیماری اور جھوٹ دونوں کا اجتماع تھا۔ پھر واقعہ پر بھی اعتراض کیا جاتا ہے۔ آپ کے گھبرانے پر بھی اعتراض ہے کہ آپ کو وحی پر شک تھا یا یہ اعتراض ہے کہ اپنی قابلیت پر شک تھا یا یہ کہ آپؐ نے خدا تعالیٰ کا حکم ماننے سے پہلو تہی کی۔ یہ بھی اعتراض ہے کہ اس وحی کی نوعیت کیا تھی۔ آیا یہ مادی نظارہ یا خواب تھی جو رسول کریم ﷺ کو نظر آئی۔ غرض مختلف دشمنوں نے اپنے اپنے رنگ میں استدلال کیا ہے۔ غیر مسلم مصنفین کی اصل غرض یہ ہوتی ہے کہ کوئی ایسی بات اٹھائیں جس سے قرآن کریم پر حملہ ہو سکے۔ چنانچہ بعض نے یہ طریق اختیار کیا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ یہ وحی ایک نظارہ تھا جو رسول کریم ﷺ نے دیکھا۔ اور چونکہ انسانی دماغ اس قسم کا نظارہ دیکھنے کے قابل نہیں ہوتا اس لئے یہ غیر معمولی اور مافوق الطبیعات نظارہ درحقیقت علامت تھی اس بات کی کہ نعوذ باللہ رسول کریم ﷺ کے دماغ میں خشکی پیدا ہو کر جنون رُونما ہو گیا تھا۔ لیکن بعض دوسرے مخالفین کا دماغ اس طرف گیا ہے کہ ممکن ہے کہ کچھ لوگ جنون کی تھیوری کو تسلیم نہ کریں اور وہ اس بات کو مان لیں کہ سچ مچ اس قسم کا واقعہ ہو سکتا ہے اور اگر انہوں نے مان لیا تو فرشتے دیکھنے یا اللہ تعالیٰ سے ہمکلام ہونے میں وہ رسول کریم ﷺ کو بنی اسرائیل کے نبیوں کے مشابہ قرار دے دیں گے اور یہ بڑی تکلیف دِہ بات ہوگی۔ پس انہوں نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ یہ کوئی نظارہ نہیں تھا جو رسول کریم ﷺ نے دیکھا بلکہ ایک خواب تھی جو آپ کو آئی اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ بات ہماری روایات میں بھی بیان ہوئی ہے۔ چنانچہ ابن ہشام لکھتے ہیں:

حَتّٰی اِذَا کَانَتِ اللَّیْلَۃُ الَّتِیْ اَکْرَمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی فِیْھَا بِرِسَالَتِہٖ وَ رَحِمَ الْعِبَادَ بِھَا جَاءَہٗ جِبْرِیْلُ عَلَیْہِ السَّلَامِ بِاَمْرِ اللّٰہِ تَعَالٰی۔ یعنی جب وہ رات آ گئی جس میں اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو اپنی رسالت سے مشرّف فرمایا اور اپنے بندوں پر رحم کیا تو جبریل اللہ تعالیٰ کا حکم لے کر رسول کریم ﷺ کے پاس آئے۔ آگے لکھا ہے: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَجَآءَنِیْ جِبْرِیْلُ وَاَنَا نَائِمٌ بِنَمَطٍ مِّنْ دِیْبَاجٍ فِیْہِ کِتَابٌ فَقَالَ اقْرَأْ۔ قَالَ قُلْتُ مَا اَقْرَأُ۔

یعنی رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں میرے پاس جبریل آیا وَاَنَا نَائِمٌ اور اس وقت میں سو رہا تھا۔ ایک ریشمی کپڑا ان کے پاس تھا جس میں کچھ لکھا ہوا تھا۔ انہوں نے کہا پڑھو۔ میں نے

کہا مجھے تو پڑھنا نہیں آتا۔ قَالَ فَغَطَّنِیْ بِہٖ حَتّٰی ظَنَنْتُ اَنَّہُ الْمَوْتَ ۔انہوں نے مجھے خوب بھینچا یہاں تک کہ میں نے سمجھا میں مرنے لگا ہوں۔ ثُمَّ اَرْسَلَنِیْ فَقَالَ اقْرَأ قَالَ قُلْتُ مَا اَقْرَأُ پھر انہوں نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا پڑھو۔ میں نے کہا میں تو پڑھنا نہیں جانتا۔ فَغَطَّنِیْ بِہٖ حَتّٰی ظَنَنْتُ اَنَّہُ الْمَوْتُ ۔انہوں نے پھر مجھے ڈھانپ لیا یہاں تک کہ میں نے سمجھا میں اب مرنے لگا ہوں۔ ثُمَّ اَرْسَلَنِیْ فَقَالَ اقْرَأْ قُلْتُ مَاذَا اَقْرَأُ ۔پھر انہوں نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا پڑھو۔ میں نے کہا میں کیا پڑھوں؟ مَا اَقُوْلُ ذَالِکَ اِلَّا افْتِدَاءً مِّنْہُ اَنْ یَّعُوْدَلِیْ بِمِثْلِ مَا صُنِعَ بِیْ۔ رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں میں نے یہ فقرہ کہ میں کیا پڑھوں اس لئے کہا تھا تا اس ذریعہ سے میں اس صدمہ سے بچ جاؤں جو ان کے بھینچنے سے مجھے پہنچا تھا۔ اس پر انہوں نے کہا: اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ. خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ. اِقْرَأْ وَرَبُّکَ الْاَکْرَمُ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ. عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ. قَالَ فَقَرَأْتُھَا. رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں اس پر میں نے یہ فقرے دہرائے۔ ثُمَّ انْتَھٰی فَانْصَرَفَ عَنِّیْ وَ ھَبَبْتُ مِنْ نَّوْمِیْ ۔پھر انہوں نے بس کر دیا اور مجھ سے لوٹ کر چلے گئے اور میں اپنی نیند سے بیدار ہو گیا۔ فَکَاَنَّمَا کُتِبَتْ فِیْ قَلْبِیْ کِتَابًا۔ اس وقت مجھے یوں معلوم ہوا کہ میرے دل پر یہ تمام الفاظ نقش کر دئے گئے ہیں۔

اس حوالہ میں صاف طور پر نیند کا لفظ آتا ہے۔ وہ کہتے ہیں ہم اس روایت پر بنیاد رکھتے ہوئے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ درحقیقت یہ ایک خواب تھی جو رسول کریم ﷺ نے دیکھی۔ اس تاویل سے ان کا منشاء یہ ہے کہ بائبل کا دعویٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فرشتے انسان کو بالمشافہ نظر آتے ہیں اور وہ اسے اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچاتے ہیں۔ اگر ہم یہ ثابت کر دیں گے کہ رسول کریم ﷺ کو فرشتہ نظر نہیں آیا بلکہ ایک خواب تھی جو آپ نے دیکھی تو بائبل کے نبیوں سے آپ کی مشابہت ثابت نہیں ہو سکے گی۔ گو بخاری اور مسند احمد بن حنبل میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی جو حدیث آتی ہے اس میں صاف طور پر یہ ذکر آتا ہے کہ رسول کریم ﷺ نے اپنی آنکھوں کے سامنے جبریل کو دیکھا۔ مگر چونکہ یہ حدیث ان کے منشاء کے خلاف ہے اس لئے وہ بخاری یا مسند احمد بن حنبل کی حدیث کی بجائے ابن ہشام کی اس روایت پر اپنے دعویٰ کی بنیاد رکھتے ہیں اور

کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ کو کوئی فرشتہ اپنی آنکھوں سے نظر نہیں آیا۔صرف ایک خواب تھی جو حرا میں آپ کو آئی۔اگر اس خواب کو درست بھی تسلیم کر لیا جائے تب بھی انبیاء بنی اسرائیل سے آپ کی مشابہت ثابت نہیں ہو سکتی کیونکہ ان کو خدا تعالیٰ کے فرشتے آمنے سامنے نظر آتے تھے اور رسول کریم ﷺ نے جو کچھ دیکھا یہ ایک خواب تھی۔

جن لوگوں نے اس بات پر زور دینا چاہا ہے کہ رسول کریم ﷺ کے دماغ میں نعوذ باللہ کوئی نقص واقعہ ہو گیا تھا انہوں نے ابن ہشام کی روایت کو نظر انداز کر کے بخاری اور مسند احمد بن حنبل کی وہ حدیث لے لی ہے جس میں یہ ذکر آتا ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرشتہ کو دیکھا۔وہ کہتے ہیں چونکہ انسانی دماغ اس قسم کا نظارہ نہیں دیکھ سکتا اس لئے یہ نظارہ علامت تھی اس بات کی کہ آپ کا دماغ نعوذ باللہ خراب ہو گیا تھا۔

میرے نزدیک یورپین مصنفین کی نیت خواہ کچھ ہو اس بارہ میں اختلاف کی اصل وجہ یہ ہے کہ وہ نظارۂ کشف کی حقیقت کو سمجھتے ہی نہیں۔وہ اس قدر مذہب سے دور جا پڑے ہیں کہ کشفی نظارے ان کو بہت ہی کم نظر آتے ہیں بلکہ خوابیں بھی ان کو بہت کم آتی ہیں۔گو خدائی سنت یہ ہے کہ ہر قسم کے طبقہ کو خوابیں دکھائی جاتی ہیں مگر پھر بھی یوروپین لوگوں میں سے بعض ایسے ہیں جن کو ساری عمر میں بھی کبھی کوئی خواب نہیں آئی اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ دن کو کام کرتے ہیں اور رات کو ناچتے ہیں پھر شراب پی کر یا نیند کی دوائیں کھا کر سو جاتے ہیں۔اس وجہ سے انہیں ایسی خوابیں بھی نہیں آتیں جن کے متعلق حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے لکھا ہے کہ وہ کنچنیوں کو بھی آجاتی ہیں کیونکہ شراب کا نشہ ان کے دماغ کو بالکل معطّل کر دیتا ہے۔پس میرے نزدیک اس بارہ میں اختلاف نظارۂ کشف کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ہوا ہے اور مغربی لوگ اس علم سے بے بہرہ ہونے کی وجہ سے دھوکا کھا جاتے ہیں۔

بات یہ ہے کہ جب کشف کی حالت انسان پر طاری ہوتی ہے تو جیسا کہ صاحب تجربہ لوگ جانتے ہیں اس وقت انسان اپنے آپ پر ایک ربودیت کی حالت محسوس کرتا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ مجھے اس دنیا سے کھینچ کر کسی اور دنیا میں لے جایا گیا ہے۔اسے اپنے اردگرد کی سب چیزیں

نظر آتی ہیں۔ مکان کی دیواریں نظر آتی ہیں۔ گھر کا سامان نظر آتا ہے مگر اس کے باوجود وہ محسوس کرتا ہے کہ کوئی اور حالت اس پر طاری ہوگئی ہے جو اسے اس دنیا سے الگ لے گئی ہے۔ اسی طرح اس حالت کے جاتے وقت بھی انسان یوں معلوم کرتا ہے کہ وہ گویا ایک غیر معمولی حالت سے پھر حواس میں آ گیا ہے۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہوتی ہے جیسے ریڈیو کو ایک میٹر سے دوسرے میٹر پر تبدیل کر دیا جاتا ہے۔ پہلے وہ محسوس کرتا ہے کہ اسے اس دنیا سے کھینچ کر کسی اور دنیا میں لے جایا گیا ہے اور جب وہ حالت جاتی ہے تو وہ یکدم محسوس کرتا ہے کہ اسے کسی اور دنیا سے اس دنیا میں واپس لوٹا دیا گیا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو انسان کو یہ معلوم ہی نہ ہو سکے کہ اس نے جو کچھ دیکھا ہے وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ہے یا اس کے نفس کا خیال ہے۔ پس بوجہ اس کے کہ وہ حالت کامل نیند کی نہیں ہوتی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ میں نے جاگتے ہوئے ایسا دیکھا اور بوجہ اس کے کہ جاگنے کی حالت پر ایک خاص تصرّف کیا جاتا ہے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ نیند طاری ہوئی اور اس میں یہ یہ دیکھا اور میں نے خود اس کا تجربہ کیا ہے اس لئے مجھے اس میں کوئی اچنبھے کی بات نظر نہیں آتی۔ پس یہ مادی نظارہ نہیں تھا جو رسول کریم ﷺ نے دیکھا مگر بوجہ اس کے کہ آپ کے حواس ظاہری کام کر رہے تھے ہم اسے یقظہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ درحقیقت کشف ایک **ما بین النوم و الیقظہ** کی کیفیت کا نام ہے۔ چونکہ وہ حالت کامل نیند کی نہیں ہوتی اس لئے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جاگتے ہوئے فلاں نظارہ دیکھا گیا اور چونکہ جاگنے کی حالت پر خاص تصرّف کیا جاتا ہے۔ اس لئے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ نیند کی حالت میں ہم نے ایسا نظارہ دیکھا۔ پس رسول کریم ﷺ نے بھی کسی موقع پر یہ فرما دیا کہ میں نے جاگتے ہوئے ایسا نظارہ دیکھا تھا اور کسی موقع پر آپ نے یہ فرما دیا ہوگا کہ میں نے نیند کی حالت میں ایسا نظارہ دیکھا۔ جو لوگ صاحب کشوف ہیں وہ ہمیشہ ایسے الفاظ استعمال کرتے رہتے ہیں۔ کبھی کہتے ہیں مَیں یہ نظارہ دیکھ کر جاگ پڑا اور مراد یہ ہوتی ہے کہ میں ربودگی کی کیفیت سے عام حالت میں آ گیا اور کبھی کہتے ہیں مَیں نے جاگتے ہوئے فلاں نظارہ دیکھا اور مراد یہ ہوتی ہے کہ میرے حواس ظاہری بھی اس وقت کام کر رہے تھے۔ پس یہ دونوں باتیں آپس میں کوئی اختلاف نہیں رکھتیں۔ محض کشف کی

حقیقت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے یوروپین مصنفین کو یہ غلطی لگی ہے۔

مسند احمد بن حنبل اور بخاری کی حدیث کو یوں بھی حل کیا جا سکتا ہے کہ بعض دفعہ خواب کا لفظ نہیں بولا جاتا جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں قرآن کریم حضرت یوسف علیہ السلام کی رؤیاء کی نسبت فرماتا ہے کہ یوسف نے اپنے باپ سے کہا:

اِنِّیْ رَاَیْتُ اَحَدَ عَشَرَ کَوْکَبًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَاَیْتُھُمْ لِیْ سٰجِدِیْنَ (یوسف:۵) کہ میں نے گیارہ ستاروں اور سورج اور چاند کو دیکھا ہے کہ وہ مجھے سجدہ کر رہے ہیں۔ یہاں خواب کا کوئی لفظ نہیں صرف اتنا ذکر ہے کہ میں نے دیکھا۔ مگر اگلی آیت میں ہی حضرت یعقوب علیہ السلام یہ بات سن کر فرماتے ہیں قَالَ یٰبُنَیَّ لَا تَقْصُصْ رُءْیَاکَ عَلٰٓی اِخْوَتِکَ (یوسف:۶) اے میرے بیٹے تو اس رویا کو اپنے بھائیوں کے سامنے بیان نہ کیجیؤ۔ اب دیکھو ایک آیت میں اسے ظاہری نظارہ قرار دیا گیا ہے اور دوسری میں اسے رویا قرار دیا گیا ہے۔ پس یہ ایک طریق بیان ہے جو عربی زبان میں رائج ہے۔ اس سے کسی اختلاف کا ثبوت نہیں نکل سکتا۔

اصل بات یہ ہے کہ مختلف زبانوں میں الگ الگ محاورات رائج ہوتے ہیں۔ عربی زبان میں ایسے نظاروں کے لئے رویا کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے جس کے معنے دیکھنے کے ہیں۔ کو محاورہ میں ایسے نظارہ کے لئے بھی یہ لفظ استعمال کیا جاتا ہے جو نیند کی حالت میں دیکھا جائے۔ لیکن فارسی نے اس کے لئے خواب کا لفظ تجویز کیا ہے۔ جس کے معنے نیند کے ہیں۔ یہ بھی ایک فرق ہے جو عربی زبان کی فضیلت پر دلالت کرتا ہے۔ قرآن کریم نے ہر جگہ رؤیا کا لفظ ہی خواب کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ جس میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ درحقیقت وہی حالت اصل بیداری کی ہوتی ہے جس میں انسان خدا تعالیٰ سے ہمکلام ہو۔ کو ظاہری طور پر اس پر نیند یا ربودگی کی کیفیت طاری ہو۔ لیکن ایرانی لوگ چونکہ ماہر نہیں تھے انہوں نے خواب کا لفظ ایجاد کر لیا۔ حالانکہ خواب کے معنے محض نیند کے ہیں۔ پس رسول کریم ﷺ نے اگر کسی جگہ یہ فرمایا ہے کہ میں نیند سے بیدار ہو گیا اور دوسری جگہ آپ نے صرف اتنا فرمایا ہے کہ میں نے ایسا نظارہ

دیکھا۔تو اس میں اختلاف کی کوئی بات نہیں ۔یہ ایسی ہی بات ہے جیسے حضرت یوسف علیہ السلام نے جب یہ ذکر کیا کہ میں نے گیارہ ستاروں اور سورج اور چاند کو سجدہ کرتے دیکھا ہے تو اس میں خواب کا کوئی لفظ استعمال نہیں کیا۔مگر حضرت یعقوب علیہ السلام نے اسی نظارہ کے متعلق رؤیا کا لفظ استعمال کر دیا جو محاورہ میں نیند کی حالت میں دیکھے ہوئے نظارہ کے متعلق بولا جاتا ہے۔

چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بھی ان معنوں میں رویا کا لفظ استعمال کیا ہے۔ آپ فرماتی ہیں: اَوَّلُ مَابُدِئَ بِهٖ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ الْوَحْيِ الرُّؤْيَا الصَّادِقَةُ فِي النَّوْمِ فَكَانَ لَا يَرٰى رُؤْيَا اِلَّا جَاءَتْ مِثْلَ فَلَقِ الصُّبْحِ یعنی رسول کریم ﷺ پر وحی الٰہی کا آغاز رؤیا صالحہ سے ہوا۔یہاں رؤیا کا لفظ صرف انہی نظاروں کے لئے استعمال کیا گیا ہے جو انسان سوتے ہوئے دیکھتا ہے۔پس یوروپین مصنفین کی طرف سے جو اختلاف پیش کیا جاتا ہے وہ درحقیقت اختلاف نہیں بلکہ محاورہ زبان کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے۔اگر یہ رؤیا ہی تھی جو رسول کریم ﷺ نے دیکھی تو بہر حال جیسا کہ ہمیں یقین اور وثوق ہے یہ رؤیا اس قسم کی نہیں تھی جس میں انسان پر کامل نیند طاری ہوتی ہے۔چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بھی فرق کرتی ہیں آپ ایک طرف تو یہ فرماتی ہیں کہ: اَوَّلُ مَا بُدِئَ بِهٖ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ الْوَحْيِ الرُّؤْيَا الصَّادِقَةُ فِي النَّوْمِ رسول کریم ﷺ پر وحی کی ابتدا رویا صادقہ سے ہوئی جو آپ سوتے ہوئے دیکھتے مگر اس دوسری وحی کے متعلق جس میں جبریل رسول کریم ﷺ کے پاس آئے آپ فرماتی ہیں فَجَآءَهُ الْمَلَكُ رسول کریم ﷺ کے پاس فرشتہ آیا۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں نظاروں میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرق کر رہی ہیں جس کے صاف معنے یہ ہیں کہ غارِ حرا میں آپ کو جو نظارہ دکھایا گیا وہ گہری نیند والا نہ تھا بلکہ کشفی نیند والا تھا۔اور ابن ہشام والی روایت کے معنے گہری نیند کے نہیں بلکہ کشفی نیند کے ہیں اور آپ کے ان الفاظ کا کہ پھر میں جاگ اٹھا صرف اتنا مفہوم ہے کہ پھر میری کشفی حالت جاتی رہی ۔پس ابن ہشام کی روایت اور بخاری و مسند احمد بن حنبل کی حدیث میں کوئی اختلاف نہیں بلکہ دونوں کا مفہوم ایک ہی ہے۔

دوسرا سوال یہ کیا جاتا ہے کہ رسول کریم ﷺ کو اپنی رویا پر شک تھا۔ اس سوال کی بنیاد اس امر پر رکھی جاتی ہے کہ:

الف: رسول کریم ﷺ گھبرائے ہوئے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئے۔

باء: آپ نے حضرت خدیجہؓ سے فرمایا قَدْ خَشِيْتُ عَلٰى نَفْسِيْ ۔ مجھے تو اپنے نفس کے متعلق ڈر پیدا ہو گیا ہے۔

ج: فترۃ وحی پر آپ نے اپنے آپ کو ہلاک کرنا چاہا جیسا کہ بخاری اور مسند احمد بن حنبل دونوں میں اس واقعہ کا ذکر آتا ہے۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ گھبرانا اور خَشِيْتُ عَلٰى نَفْسِيْ کہنا تو اس وجہ سے تھا کہ ہر انسان کامل کے اندر یہ احساس ہوتا ہے کہ میں اپنے فرض کو ادا کر سکوں گا یا نہیں۔ جو شخص چھچھورا ہوتا ہے یا ادنیٰ طبقہ سے تعلق رکھنے والا ہوتا ہے اس کے سپرد جب کوئی کام کیا جاتا ہے تو بغیر اس کے کہ وہ عواقب پر نگاہ دوڑائے اور اپنے کام کی اہمیت کو سمجھے کہہ دیتا ہے کہ اس کام کی کیا حقیقت ہے میں اسے فوراً کر لوں گا۔ لیکن عقلمند انسان کی یہ حالت ہوتی ہے کہ اس کے دل میں فوراً گھبراہٹ پیدا ہونی شروع ہو جاتی ہے کہ نہ معلوم میں اپنے فرض کو ادا کر سکوں گا یا نہیں۔ قابل اور نا قابل میں یہی فرق ہوتا ہے کہ قابل کو فوراً اپنے کام کا فکر پڑ جاتا ہے مگر نا قابل کو کوئی احساس نہیں ہوتا۔ وہ سمجھتا ہے کہ کام بالکل آسان ہے۔ میں سمجھتا ہوں موجودہ جنگ میں ہی جو کام جنرل الیگزنڈر یا جنرل منٹگمری یا لارڈ مونٹ بیٹن کے سپرد کیا گیا ہے اگر یہی کام کسی ہندوستانی صوبیدار کے سپرد کیا جاتا اور اس سے پوچھا جاتا کہ تم فوجوں کی کمان کر سکو گے؟ تو بغیر سوچے سمجھے وہ فوراً جواب دیتا ہے کہ میں اس کام کو اچھی طرح سر انجام دے سکوں گا۔ مگر یہ وہ لوگ تھے جن کے سپرد جب کام ہوا تو ذمہ داری کا احساس رکھنے کی وجہ سے ان کے دلوں میں خوف پیدا ہوا کہ نہ معلوم ہم اپنے فرائض کو کماحقہٗ ادا کر سکیں گے یا نہیں۔ پس کسی کام کے سپرد ہونے پر دل میں گھبراہٹ پیدا ہونا علم کامل کی علامت ہوتی ہے نہ اس بات کی علامت کہ وہ کام کی اہلیت نہیں رکھتا۔ رسول کریم ﷺ کا بھی نزول وحی پر گھبرانا اور آپ کا حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے اپنی

گھبراہٹ اور اضطراب کا اظہار کرنا درحقیقت یہی معنے رکھتا ہے کہ آپ اپنے کام کی اہمیت کو سمجھتے تھے۔ جب اللہ تعالیٰ نے دنیا کی اصلاح کا کام آپ کے سپرد کیا تو فوراً آپ کو فکر شروع ہو گیا کہ اتنا بڑا کام جو میرے سپرد کیا گیا ہے نہ معلوم میں اس کو الٰہی منشاء کے مطابق سرانجام دے سکوں گا یا نہیں۔ آپ کے سپرد جو کام کیا گیا اور جس کا پہلی وحی میں ہی بڑی تفصیل کے ساتھ ذکر کر دیا گیا تھا وہ یہ تھا کہ: اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ۝ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ۝ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ۝ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ۝

ان آیات کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول کریم ﷺ سے فرمایا آج جن لوگوں کے ہاتھوں میں قلمیں ہیں، جو بڑے بڑے علوم کے ماہر سمجھے جاتے ہیں جن کو اپنے تجربہ اور اپنی علمی نگاہ کی وسعت پر ناز ہے۔ تُو ان کو وہ علم سکھا جو ان کے ذہن کے کسی گوشہ میں بھی نہیں۔ اور ان علوم اور معارف سے انہیں بہرہ ور فرما جو آج دنیا کی کسی کتاب میں بھی نہیں ملتے۔ یہ سیدھی بات ہے کہ جب ایک اُمّی کو یہ کہا جائے گا کہ دنیا نے کتابیں لکھیں مگر بے کار ثابت ہوئیں اور وہ دنیا کی ہدایت کا موجب نہ بن سکیں۔ اب اے شخص ہم تیرے سپرد یہ کام کرتے ہیں کہ جو علوم آج تک بڑی بڑی کتابیں لوگوں کو سکھا نہیں سکیں وہ علوم تو ہمارے حکم سے لوگوں کو سکھا۔ تو لازماً اس کے جسم پر کپکپی طاری ہو جائے گی کہ اتنا بڑا کام میں کس طرح کر سکوں گا۔ بے شک ایک پاگل کو جب یہ کہا جائے گا تو وہ خوش ہو جائے گا اور کہے گا یہ کونسا بڑا کام ہے۔ مگر عقلمند کا دل خوف سے بھر جائے گا اور وہ کہے گا اتنا بڑا کام میں کس طرح کر سکوں گا۔ پس رسول کریم ﷺ کا یہ فرمانا کہ قَدْ خَشِيْتُ عَلٰى نَفْسِي آپ کے علم کامل پر ایک زبردست گواہ ہے۔ وہ لوگ جو اس واقعہ سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ نعوذ باللہ رسول کریم ﷺ کے دماغ میں نقص واقع ہو گیا تھا انہیں غور کرنا چاہئے کہ کیا پاگل بھی کبھی گھبراتا ہے؟ اسے تو اگر کہا جائے کہ کیا تم ساری دنیا فتح کر سکتے ہو تو فوراً کہہ دے گا کہ یہ کونسی مشکل بات ہے۔ مگر وہ جسے اپنی ذمہ واری کا احساس ہوتا ہے جو کام کی اہمیت کو سمجھتا ہے جو فرائض کی بجا آوری کے لئے ہر قسم کی قربانی کرنے کے لئے تیار رہتا ہے وہ کام کے سپرد ہونے پر لرز جاتا ہے۔ اس کا جسم کانپ اٹھتا ہے اور اس کے دل میں بار بار یہ

خیال شروع ہو جاتا ہے کہ ایسا نہ ہو میں اپنی کسی غفلت کی وجہ سے ناکام ہو جاؤں اور جو کام میرے سپرد کیا گیا ہے اس کو سرانجام دینے سے قاصر رہوں۔

تاریخ اسلام میں اس کی ایک موٹی مثال موجود ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنی خلافت کے آٹھ سالہ عرصہ میں دنیا کی کایا پلٹ دیتے ہیں، روم اور ایران کو شکست دے دیتے ہیں، عرب کی سرحدوں پر اسلامی فوجیں بھجوا کر اسے ہر قسم کے خطرات سے محفوظ کر دیتے ہیں، اسلام اور مسلمانوں کے مفاد کے لئے وہ کام کرتے ہیں جو قیامت تک ایک زندہ یادگار کی حیثیت میں قائم رہنے والا ہے۔ مگر جب آپ روم کو شکست دے دیتے ہیں، جب ایران کو شکست دے دیتے ہیں جب یہ دو زبردست ایمپائر اسلامی فوجوں کے متواتر حملوں سے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی ہیں، جب عمرؓ کا نام ساری دنیا میں گونجنے لگتا ہے، جب دشمن سے دشمن بھی تسلیم کرتا ہے کہ عمرؓ نے بہت بڑا کام کیا۔ اس وقت خود عمرؓ کی کیا حالت تھی۔ تاریخ میں لکھا ہے کہ جب آپ وفات پانے لگے تو اس وقت آپ کی زبان پر بار بار یہ الفاظ آتے تھے کہ رَبِّ لَا عَلَیَّ وَلَا لِیْ اے میرے رب! میں سخت کمزور اور خطا کار ہوں۔ میں نہیں جانتا مجھ سے اپنے کام کے دوران کیا کیا غلطیاں سرزد ہو چکی ہیں۔ الٰہی میں اپنی غلطیوں پر نادم ہوں۔ میں اپنی خطاؤں پر شرمندہ ہوں اور میں اپنے آپ کو کسی انعام کا مستحق نہیں سمجھتا۔ صرف اتنی التجا کرتا ہوں کہ تو اپنے عذاب سے مجھے محفوظ رکھ۔

غور کرو اور سوچو کہ ان الفاظ سے حضرت عمرؓ کی کتنی بلند شان ظاہر ہوتی ہے۔ آپ کے سپرد اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک کام کیا گیا اور آپ نے اس کو ایسی عمدگی سے سرانجام دیا کہ یورپ کے شدید سے شدید دشمن بھی اس کام کی اہمیت کا اقرار کئے بغیر نہیں رہ سکے مگر چونکہ آپ کے دل پر خدا کا خوف طاری تھا آپ نے سمجھا کہ بے شک میں نے کام کیا ہے مگر ممکن ہے اللہ تعالیٰ اس سے بھی زیادہ کام چاہتا ہو اور میں جس کام کو اپنی خوبی سمجھتا ہوں وہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں خوبی نہ ہو۔ اس لئے باوجود اتنا بڑا کام کرنے کے وفات کے وقت آپ تڑپتے تھے اور بار بار آپ کی زبان پر یہ الفاظ جاری ہوتے تھے کہ رَبِّ لَا عَلَیَّ وَلَا لِیْ۔ خدایا میں تجھ سے کسی انعام کا

طالب نہیں صرف اتنی درخواست کرتا ہوں کہ تُو مجھے اپنی سزا سے محفوظ رکھ۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ میں نے کوئی کام نہیں کیا۔ مجھے خدمت کا حق جس رنگ میں ادا کرنا چاہئے تھا اس رنگ میں ادا نہیں کیا۔ اسی طرح رسول کریم ﷺ پر نزول وحی کے بعد جو گھبراہٹ طاری ہوئی اس کی وجہ درحقیقت یہی تھی کہ آپ کے دل میں خوف پیدا ہوا کہ میرے سپرد اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو عظیم الشان کام کیا گیا ہے نہ معلوم میں اس کو ادا کرسکتا ہوں یا نہیں۔ پس رسول کریم ﷺ کا یہ فعل وحی الٰہی پر شک کی وجہ سے نہ تھا بلکہ خدا تعالیٰ کی شان کے انسانی دماغوں سے بالاتر ہونے پر یقین کامل کے نتیجہ میں تھا۔ اور آپ کو یہ فکر لگ گیا تھا کہ میں اس کام کے لئے خواہ کتنی بھی قربانی کروں نہ معلوم اللہ تعالیٰ کے ارادوں کے مطابق میں بلند ہوسکوں گا یا نہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کی بلند شان سے خوف کرنا جرم نہیں بلکہ اعلیٰ درجہ کی نیکی ہے۔ اور خدا تعالیٰ کے عُلوِ مرتبت کو مدنظر رکھتے ہوئے برا نہیں بلکہ اس بے نظیر خشیت الٰہی کا ایک بین ثبوت ہے جو رسول کریم ﷺ کے قلب مطہر میں پائی جاتی تھی۔

باقی رہا یہ کہ آپ نے خودکشی کا ارادہ کیا۔ سو اوّل تو دوسری احادیث سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی لیکن اگر اسے تسلیم بھی کرلیا جائے تو صاف پتہ لگتا ہے کہ آپ نے جو فعل کیا وہ وحی الٰہی کے رکنے کے بعد کیا۔ اگر آپ کے دل میں یہ خیال ہوتا کہ نعوذ باللہ مجھ پر شیطان نے اپنا کلام نازل کیا ہے یا کلام الٰہی کے بارہ میں آپ کو کوئی شبہ ہوتا تو چاہئے تھا کہ اس وحی کے نزول کے وقت آپ خودکشی کا ارادہ فرماتے۔ مگر حدیث میں ذکر آتا ہے کہ آپ نے فترت کے بعد خودکشی کا ارادہ کیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی گھبراہٹ یہ تھی کہ کیا میرے کسی فعل کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوکر مجھ سے بولنا چھوڑ بیٹھا ہے۔ اتنا عرصہ گزر گیا اور مجھ پر اس کا کلام نازل نہیں ہوا۔ اگر وحی کے متعلق آپ کو شبہ ہوتا تو چاہئے تھا کہ جب کچھ عرصہ کے لئے وحی کا نزول رُک گیا تھا آپ خوش ہوتے اور کہتے الحمدللہ میں ایک بلا سے بچ گیا۔ مگر تمام حدیثیں متفقہ طور پر یہ واقعہ بیان کرتی ہیں کہ وحی کے رُک جانے پر رسول کریم ﷺ کو گھبراہٹ پیدا ہوئی۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو وحی یا الہامات کی صداقت میں شبہ نہیں تھا۔ آپ کو صرف یہ خوف تھا کہ

میرے کسی فعل کی وجہ سے اللہ تعالیٰ مجھ سے ناراض نہ ہو گیا ہو۔ پس یہ واقعہ بھی وحی الٰہی کے متعلق آپ کے کسی شبہ کو ظاہر نہیں کرتا۔

میں اس جگہ یہ بھی ذکر کر دینا چاہتا ہوں کہ گو اس واقعہ کی میں نے ایک توجیہ کی ہے اور اس اعتراض کو رڈ کیا ہے جو یوروپین مصنفین کی طرف سے رسول کریم ﷺ پر کیا جاتا ہے مگر میرے نزدیک چونکہ صحیح احادیث میں یہ ذکر آتا ہے کہ رسول کریم ﷺ نے کئی دفعہ پہاڑ کی چوٹیوں سے اپنے آپ کو گرانا چاہا اس لئے ہم اس واقعہ سے کلّیۃً انکار نہیں کر سکتے۔ مگر اس کے ساتھ ہی میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ لوگوں کو اس واقعہ کے سمجھنے میں سخت غلطی لگی ہے۔ وہ خیال کرتے ہیں کہ یہ ایک ظاہری واقعہ ہے جس کا احادیث میں ذکر آتا ہے۔ رسول کریم ﷺ نعوذ باللہ خودکشی کا ارادہ سے پہاڑ پر چڑھ جاتے اور اپنے آپ کو نیچے گرانا چاہتے مگر معاً جبریل آپ کو آواز دیتا کہ آپ ایسا نہ کریں۔ آپ واقعہ میں خدا کے رسول ہیں۔ اس پر رسول کریم ﷺ رُک جاتے اور اپنے گھر میں واپس آجاتے۔ لوگ اس واقعہ کو ظاہر پر محمول کرتے ہیں اور اس طرح خود بھی ٹھوکر کھاتے اور دوسروں کے لئے بھی ٹھوکر کا موجب بنتے ہیں۔ حالانکہ یہ ظاہری واقعہ نہیں بلکہ کشفی واقعہ ہے۔ کشف میں رسول کریم ﷺ یہ دیکھتے تھے کہ میں پہاڑوں پر پھر رہا ہوں اور اپنے آپ کو گرانا چاہتا ہوں مگر فرشتہ مجھے آواز دیتا ہے کہ ایسا مت کریں آپ واقعہ میں خدا تعالیٰ کے رسول ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ چونکہ رسول کریم ﷺ کے دل میں بار بار یہ خیالات اٹھتے تھے کہ میں اتنا بڑا کام کس طرح کر سکوں گا۔ ایسا نہ ہو کہ میں خدا تعالیٰ کی ناراضگی کا مورد بن جاؤں اس لئے اللہ تعالیٰ نے آپ کے ان خیالات کو کشفی صورت میں اس رنگ میں ظاہر کیا کہ آپ پہاڑ کی چوٹیوں سے اپنے آپ کو نیچے گرانا چاہتے ہیں مگر فرشتہ آواز دیتا ہے یَا مُحَمَّدُ اِنَّکَ رَسُوْلُ اللّٰہِ حَقًّا۔ اے محمد ﷺ آپ تو اللہ تعالیٰ کے سچے رسول ہیں۔ آپ اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہوں گے کیونکہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے اس مقصد کے لئے کھڑا کیا ہے۔ پس میرے نزدیک یہ کوئی ظاہری واقعہ نہیں بلکہ ایک کشف ہے جس میں رسول کریم ﷺ کے خیالات کی ترجمانی کی گئی ہے۔ درحقیقت رویا میں اگر کوئی شخص دیکھے کہ وہ پہاڑ سے اپنے آپ کو گرا رہا ہے تو

اگر وہ دیکھے کہ وہ پہاڑ سے گر گیا ہے تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ کوئی بری بات ظاہر ہوگی اور وہ تباہ ہو جائے گا۔ لیکن اگر وہ رویا میں پہاڑ سے گرا تو ہے مگر مرا نہیں تو اس کے یہ معنے ہوں گے کہ اس سے کوئی بڑی بھاری غلطی ہوگی یا کوئی بڑا بھاری کام کرے گا۔ جس کے نتیجہ میں اسے صدمہ پہنچے گا مگر اس کے باوجود وہ ہلاک نہیں ہوگا اور اگر کوئی شخص دیکھے کہ وہ پہاڑ سے گرنے لگا تھا مگر فرشتہ نے اسے کہا کہ گھبراتے کیوں ہو تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ وہ کوئی بڑا کام کرنے والا ہے جس میں بظاہر تباہی ہوگی مگر وہ تباہ نہیں ہوگا بلکہ کامیاب و بامراد ہوگا۔

اگر ہم اس واقعہ کو ظاہری قرار دیں تب بھی یہ اس خشیت الٰہی کا ثبوت ہے جو رسول کریم ﷺ کے دل میں پائی جاتی تھی کیونکہ آپ نے ایسا فعل نزول وحی پر نہیں کیا بلکہ وحی کے رکنے پر کیا۔ جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو یہ گھبراہٹ تھی کہ کیا میرے کسی فعل کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ناراض ہو کر مجھ سے بولنا تو ترک نہیں کر دیا۔ لیکن میرے نزدیک یہ ظاہری واقعہ نہیں جس کا ایک ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ ہر دفعہ فرشتہ ظاہر ہو جاتا اور وہ آپ کو آپ کی کامیابی کی بشارت دیتا۔ فرشتہ کا آنا خود اپنی ذات میں اس بات کی ایک دلیل ہے کہ ہم اسے ظاہری واقعہ قرار نہیں دے سکتے۔ دوسری دلیل اس کی یہ ہے کہ قرآن کریم نے اس واقعہ کا سرے سے ذکر ہی نہیں کیا۔

اب رہا وحی کا سوال۔ دشمن کہتا ہے کہ آپ کا اس وقت زَمِّلُوْنِیْ زَمِّلُوْنِیْ کہنا اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ ایک بیماری کا حملہ تھا۔ ہسٹیریا کا دورہ آپ کو ہوا اور آپ نے اپنے گھر والوں سے کہا کہ جلدی مجھ پر کپڑا ڈال دو۔ مگر یہ سوال بھی وحی الٰہی سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ جیسا کہ اصحابِ وحی جانتے ہیں وحی الٰہی کے نزول کے وقت اس قدر خشیت کا نزول ہوتا ہے کہ جوڑ جوڑ ہل جاتا ہے کیونکہ یہ مقامِ قرب ہے۔ دربار کی شمولیت کا حال تو درباری ہی جانتا ہے۔ دوسرے کو کیا خبر ہو سکتی ہے۔ پس یہ حالت اس قرب کی وجہ سے تھی جو اللہ تعالیٰ کے حضور آپ کو حاصل تھا مگر اس حقیقت کو وہ لوگ نہیں سمجھ سکتے جو روحانیت کے اس کوچہ سے قطعی طور پر ناآشنا ہیں اور جو اللہ تعالیٰ کے قرب سے ویسے ہی دور ہیں جیسے مشرق سے مغرب

دور ہوتا ہے۔

پھر سوال یہ ہے کہ جن لوگوں کو جنون ہوتا ہے کیا ان کا حال صرف کپڑا اوڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کیا یہ بھی کوئی طبّی مسئلہ ہے کہ جو شخص کپڑا اوڑھ لے وہ پاگل ہوتا ہے؟ یا کیا ڈاکٹر یہ پوچھا کرتا ہے کہ فلاں نظارہ کے وقت تم کپڑا اوڑھتے ہو یا نہیں؟ پس محض زَمِّلُوْنِیْ زَمِّلُوْنِی کے الفاظ سے مخالفین اسلام کا یہ استدلال کہ رسول کریم ﷺ کے دماغ میں نعوذ باللہ نقص واقعہ ہو گیا تھا، بالکل احمقانہ استدلال ہے۔ بے شک اس وقت آپ پر گھبراہٹ طاری ہوئی مگر گھبراہٹ کا طاری ہونا ہرگز آپ کے اندر روحانی، دماغی یا جسمانی نقص کے پائے جانے کا ثبوت نہیں۔ بلکہ اس خشیت الٰہی کا ثبوت ہے جو آپ کے دل میں پائی جاتی تھی۔ ہم نے تو دیکھا ہے معمولی دنیوی واقعات پر بعض لوگ دوسروں سے اس قدر مرعوب ہوتے ہیں کہ ان کا پسینہ بہنے لگ جاتا ہے۔ افسر کسی غلطی پر تنبیہ کرے یا کسی معاملہ کے متعلق ان سے باز پُرس کی جائے تو اس قدر ان پر رُعب طاری ہوتا ہے کہ ہاتھ پاؤں کانپنے لگ جاتے ہیں اور بعض دفعہ تو پسینہ جاری ہو جاتا ہے۔ جب معمولی افسروں کے رُعب کی وجہ سے انسان کی یہ حالت ہو جاتی ہے تو سوچنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کی عظمت اور اس کے جلال اور اس کی جبروت کا آپ پر کس قدر اثر ہو سکتا تھا۔ **پس آپ نے اگر زَمِّلُوْنِیْ زَمِّلُوْنِی کہا تو اس کی وجہ درحقیقت یہی تھی کہ آپ پر الٰہی کلام کا رعب طاری ہو گیا۔**

آپ نے چاہا کہ تھوڑی دیر کے لئے آپ لیٹ جائیں تا کہ آپ کے قویٰ کو سکون حاصل ہو جائے۔ وہ لوگ جو اس کو جنون کا نتیجہ قرار دیتے ہیں ان سے ہم پوچھتے ہیں کہ کیا کپڑا اوڑھنا جنون کی علامت ہوتی ہے؟ ہم نے تو کبھی نہیں سنا کہ کوئی ڈاکٹر کسی ایسے مریض کے پاس گیا ہو جس میں جنون کے آثار پائے جاتے ہوں تو اس نے مریض کے لواحقین سے یہ سوال کیا ہو کہ کیا یہ مریض کبھی کپڑا بھی اوڑھتا ہے یا نہیں؟ اگر کپڑا اوڑھتا ہے تو ضرور پاگل ہے اور اگر کپڑا نہیں اوڑھتا تو پاگل نہیں۔

ایسا سوال آج تک کبھی کسی ڈاکٹر نے نہیں کیا۔ پس محض کپڑا اوڑھنے سے مخالفین

اسلام کا یہ نتیجہ نکالنا کہ رسول کریم ﷺ کو نعوذ باللہ جنون ہو گیا تھا خود ان کے مجنون ہونے کی علامت ہے۔ دیکھنے والی بات تو یہ ہے کہ کیا رسول کریم ﷺ کی باقی حالتیں بھی مجنونانہ تھیں یا نہیں۔ یہ بات ظاہر ہے کہ ہر غیر معمولی قابلیت والے شخص کی حالت دوسروں سے الگ ہوتی ہے۔ ایک شخص جو غیر معمولی طور پر حساب کی قابلیت رکھتا ہے وہ ان دوسرے لوگوں سے جو معمولی حساب جانتے ہیں بالکل ممتاز طور پر نظر آتا ہے۔ ایک شخص جو غیر معمولی طور پر تاریخ کی واقفیت رکھتا ہے وہ ان دوسرے لوگوں سے جو معمولی تاریخ جانتے ہیں بالکل علیحدہ نظر آتا ہے۔ ایک شخص جو غیر معمولی طور پر طب کی واقفیت رکھتا ہے وہ ان دوسرے لوگوں سے جو معمولی طب جانتے ہیں اپنے فن میں ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ بعض دفعہ مرض معمولی معلوم ہوتا ہے، عام ڈاکٹر اس کا عام علاج کرتا ہے مگر ماہر فن ڈاکٹر اس مرض کی شدت کو سمجھ کر فوراً اس کا دوسرا علاج بتاتا ہے یا عام ڈاکٹر مرض کو شدید بتاتا ہے مگر ماہر فن اس کے معمولی مرض ہونے کو فوراً بھانپ جاتا ہے۔

یہی حال سائنس کے مسائل کا ہے۔ ایک شخص معمولی مسائل جانتا ہے مگر دوسرا شخص سائنس کی بڑی بڑی باریکیوں تک پہنچ جاتا اور دنیا میں کئی اہم ایجادات کا موجب بن جاتا ہے۔ غرض الگ الگ قابلیتیں ہیں جو الگ الگ لوگوں میں پائی جاتی ہیں۔ کسی شخص کی قابلیت بہت معمولی ہوتی ہے اور کسی شخص کی قابلیت بالکل غیر معمولی ہوتی ہے اور وہ دوسروں سے اپنے کام میں بالکل علیحدہ نظر آتا ہے۔ مگر بہر حال کسی شخص میں غیر معمولی قابلیت کا پایا جانا یہ معنے نہیں رکھتا کہ اسے جنون ہو گیا ہے۔ اسی طرح غیر معمولی صحت والے کی حالت بھی دوسروں سے بالکل الگ ہوتی ہے۔ پس محض غیر معمولی قابلیت کے نتیجہ میں کسی کی الگ حالت ہونے سے اس پر مجنون ہونے کا فتویٰ نہیں لگایا جا سکتا اور جو ایسا کرتا ہے وہ اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ دنیا کی تمام ترقی مجنونوں سے وابستہ ہے کیا ایسا شخص خود پاگل نہیں؟

سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان میں عقل کس لئے رکھی ہے۔ اگر عقل کی غرض کوئی اعلیٰ کام کرنا ہے تو پھر اعلیٰ کام کرنا تو عقل کی علامت ہوا نہ کہ جنون کی علامت۔ اگر کسی شخص کی

حالت دوسروں سے غیر ہے تو دیکھا یہ جائے گا کہ اس شخص کے حالات بنی نوع انسان کی ترقی کا موجب ہیں یا تنزل کا۔ اگر اس کا اپنی قابلیت میں غیر معمولی ہونا بنی نوع انسان کی ترقی کا موجب ہو تو ماننا پڑے گا کہ اس کے حالات کا تغیر عقل کی زیادتی کی وجہ سے ہے اور اگر اس کے حالات بنی نوع انسان کی تباہی اور خرابی کا موجب نظر آئیں تو ماننا پڑے گا کہ اس کا تغیر جنون کی وجہ سے ہے۔ بہر حال محض کسی کے حالات کا تغیر یا کسی میں غیر معمولی قابلیت کا پایا جانا اس کے جنون کی علامت نہیں ہوسکتا۔

پھر یہ بھی دیکھو کہ دشمن نے تو آج یہ اعتراض کیا ہے کہ نزول وحی کے واقعات ظاہر کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ کے دماغ میں نعوذ باللہ نقص واقعہ ہوگیا تھا مگر قرآن کریم نے اپنی ابتدائی آیات میں ہی اس سوال کا جواب پوری تفصیل کے ساتھ دے دیا تھا اور دنیا کو بتا دیا تھا کہ اس کا یہ اعتراض سراسر حماقت پر مبنی ہے۔ چنانچہ سورۂ نون والقلم میں اس اعتراض کا جواب موجود ہے۔ یہ بتایا جا چکا ہے کہ مفسّرین اس امر کو تسلیم کرتے ہیں کہ سورۂ علق کی ابتدائی آیات کے نزول کے معاً بعد سورۂ نون والقلم کی کی آیات رسول کریم ﷺ پر نازل ہوئیں اور یہ آیات اسی مضمون کی حامل ہیں کہ رسول کریم ﷺ کے متعلق لوگوں کا خیال کرنا بالکل غلط ہے کہ ان کے دماغ میں کوئی نقص واقعہ ہوگیا ہے۔

یہ قرآن کریم کا ایک ایسا اعجاز ہے کہ جس پر غیر مسلم اگر دیانتداری کے ساتھ غور کریں تو انہیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ کلام کسی انسانی دماغ کا نتیجہ نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ کلام ہے۔ دیکھو ابھی دنیا نے یہ اعتراض نہیں کیا تھا کہ نزولِ وحی کے واقعات رسول کریم ﷺ کے جنون کی علامت ہیں مگر اللہ تعالیٰ نے عرش سے دیکھ لیا کہ ایک دن آنے والا ہے جب دشمن نزولِ وحی کی کیفیت کو نہ سمجھتے ہوئے یہ اعتراض کرے گا کہ رسول کریم ﷺ نعوذ باللہ مجنون تھے۔ چنانچہ دوسری وحی جو رسول کریم ﷺ پر نازل ہوئی اس میں اللہ تعالیٰ نے اس شبہ کا ازالہ کیا اور فرمایا:۔

نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ ۝ مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ ۝ (القلم:۲،۳)

ہم قسم کھا کر پیش کرتے ہیں دوات اور قلم کو اور ان تمام تحریروں کو جو قلم اور دوات سے لکھی گئی ہیں کہ اگر دنیا کی تمام تحریروں کو جمع کیا جائے تو ان سے نتیجہ یہ نکلے گا کہ مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ تو اپنے رب کی نعمت سے پاگل نہیں ہے۔ یہ دوسری سورۃ ہے جو رسول کریم ﷺ پر نازل ہوئی اور جس کے ابتداء میں ہی اس اعتراض کا اللہ تعالیٰ نے جواب دے دیا ہے جو پہلی وحی سے لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوسکتا تھا اور وہ جواب یہ ہے کہ قلم اور دوات نے جس قدر علوم لکھے ہیں وہ سب اس امر کے شاہد ہیں کہ تُو مجنون نہیں۔ یعنی اگر علوم عالموں کے لکھے ہوئے ہیں تو تُو ان سے بڑھ کر علم بیان کرتا ہے۔

اگر وہ ادنیٰ علوم سے عالم کہلاتے ہیں تو تُو اعلیٰ علم سے مجنون کیوں کہلانے لگا۔ بہرحال ان سے بڑا عالم کہلائے گا اور تیرا ان سے اختلاف علم کی زیادتی کی وجہ سے کہلائے گا نہ کہ علم کی کمی کی وجہ سے۔

تیرے مجنون نہ ہونے کی علامت یہ ہے کہ دنیا میں جس قدر روحانی ترقیات یا دین سے تعلق رکھنے والے علوم پائے جاتے ہیں ان سب کے مقابلہ میں تُو دنیا کو وہ کچھ سکھائے گا جو اس نے پہلے نہیں سیکھا اور یہ ثبوت ہوگا اس بات کا کہ تُو پاگل نہیں۔ تیرے دماغ میں کوئی نقص نہیں اور اگر تجھے پاگل قرار دیا جاسکتا ہے تو ان سب لوگوں کو پاگل قرار دینا پڑے گا جنہوں نے دنیا میں علوم کو پھیلایا اور بنی نوع انسان پر علمی اور روحانی رنگ میں احسان عظیم کیا۔ لیکن اگر وہ ان کو پاگل قرار نہیں دیتے تو تجھے کس منہ سے پاگل کہہ سکتے ہیں۔ کیا وہ نہیں دیکھتے کہ دنیا میں جب کوئی شخص کسی علم پر کوئی کتاب لکھتا ہے تو لوگ اس کو پاگل قرار نہیں دیتے بلکہ کہتے ہیں وہ بڑا فاضل ہے، بڑا عالم اور سمجھدار ہے، اس نے اس علم کی باریکیوں پر بڑی عمدگی سے روشنی ڈالی ہے۔ مگر تُو وہ ہے جو ہر علم کے ایسے نکات کو بیان کرتا ہے جن کی طرف اس علم کے بڑے بڑے ماہرین کی بھی آج تک نظر نہیں گئی۔ پھر اگر وہ ایک علم پر معمولی روشنی ڈال کر عالم سمجھے جاسکتے ہیں تو تُو تمام روحانی، اخلاقی، اقتصادی، قضائی، سیاسی، عائلی علوم کے متعلق ان کے ماہرین سے زیادہ روشنی ڈال کر مجنون کیونکر سمجھا جائے گا۔ آخر مجنون کہنے کی کوئی وجہ ہونی چاہئے۔ اگر تُو کام

وہ کر رہا ہے جو بڑے بڑے عالموں نے بھی نہیں کیا تو تجھے مجنون کس طرح کہا جا سکتا ہے۔ اور لوگوں کی کیسی حماقت ہے کہ وہ اتنی موٹی بات کو بھی نہیں سمجھتے کہ عقل اور جنون میں اور علم اور جہالت میں بُعد المشرقین ہے۔ جب دنیا میں تُو علوم کے وہ خزانے تقسیم کر رہا ہے جو بڑے بڑے عالموں کے واہمہ میں بھی کبھی نہیں آئے تو بہر حال اسے یہی کہنا پڑے گا کہ تو بڑا عالم ہے۔ وہ یہ نہیں کہہ سکتی کہ تُو مجنون ہے یا تیرے دماغ میں فتور واقعہ ہو گیا ہے۔ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ ۙ مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ ۚ (القلم:۲،۳)

اے لوگو آج تک قلم اور دوات سے جو کچھ لکھا گیا ہے اسے ہم محمد رسول اللہ ﷺ کی صداقت اور اس کے مجنون نہ ہونے کے ثبوت کے طور پر تمہارے سامنے پیش کرتے ہیں۔ تم جانتے ہو کہ جب دنیا میں علم الاخلاق پر کوئی کتاب لکھتا ہے تو تم کہتے ہو وہ بڑا عالم ہے۔ جب علم العقائد پر کوئی کتاب لکھتا ہے تو تم کہتے ہو وہ بڑا عالم ہے۔ جب علم سیاست میں کوئی شخص نئی راہ پیدا کرتا ہے تو تم کہتے ہو وہ بڑا عالم ہے جب علم الاقتصاد میں کوئی شخص نیا مسئلہ نکالتا ہے تو تم کہتے ہو وہ بڑا عالم ہے۔ جب علم العائلہ پر کوئی شخص نئے رنگ میں روشنی ڈالتا ہے تو تم کہتے ہو وہ بڑا عالم ہے۔ مگر محمد رسول اللہ ﷺ تو وہ شخص ہیں کہ آج تک جس علم میں بھی کوئی کتاب لکھی گئی ہے وہ ان کے علم کے مقابل میں بالکل ہیچ ہے۔ قلمیں انکے مقابلہ میں ٹوٹ چکی ہیں۔ عالم ان کے مقابلہ میں گُنگ ہو چکے ہیں۔ معارف کا ایک سمندر ہے جو انہوں نے دنیا میں بہا دیا ہے اور علوم کا ایک نہ ختم ہونے والا ذخیرہ ہے جو انہوں نے دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ ایسی صورت میں اگر تم تعصّب سے کام نہ لو تو بآسانی اس نتیجہ پر پہنچ سکتے ہو کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی غیر معمولی قابلیت ان کے غیر معمولی علم اور آسمانی تائید اور ہدایت کے نتیجہ میں ہے نہ کہ نعوذ باللہ غیر معمولی جہالت کے نتیجہ میں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ پاگل اور غیر معمولی عقلمند اور بڑے عالم اور بڑے جاہل میں یہ اشتراک ہوتا ہے کہ یہ بھی اپنے اندر غیر معمولی طاقت رکھتا ہے اور وہ بھی اپنے اندر غیر معمولی طاقت رکھتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ فرق ہوتا ہے کہ ایک شخص نیچے کی طرف غیر

معمولی طور پر گرتا ہے اور دوسرا شخص اوپر کی طرف غیر معمولی علم رکھنے والا وہ باتیں بتاتا ہے جو بڑے بڑے عالموں کو بھی نہیں سوجھتیں۔ اور غیر معمولی جہالت رکھنے والا وہ باتیں بتاتا ہے جو بڑے بڑے بے وقوفوں اور جاہلوں سے بھی صادر نہیں ہوتیں۔ بہرحال محض کسی غیر معمولی قابلیت کی وجہ سے دوسروں سے الگ ہونا اس کے جنون کی علامت نہیں ہوتا بلکہ دیکھا یہ جاتا ہے کہ اس کے حالات کا تغیر بنی نوع انسان کے فائدہ کا موجب ہوا ہے یا نقصان کا موجب ہوا ہے۔ اگر فائدہ کا موجب ہو تو کوئی شخص اس تغیر کو جنون کا نتیجہ قرار نہیں دے سکتا۔

یہ کتنی سچی اور پختہ دلیل ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیش کی گئی اور پیش بھی ایسے موقع پر کی گئی جب ابھی وحی کے نزول کا ابتداء ہی ہوا تھا۔ میں تو سمجھتا ہوں یہ بھی قرآن کریم کا ایک زبردست معجزہ ہے کہ اس نے ابتداءِ وحی میں ہی اس اعتراض کا جواب دے دیا جو دشمنانِ اسلام نے رسول کریم ﷺ کی وحی کے متعلق کرنا تھا اور ایسی حالت میں دے دیا جبکہ خود مکّہ والوں کے سامنے بھی ابھی آپ نے اپنا دعویٰ پیش نہیں کیا تھا۔ سب لوگ تسلیم کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے سورۃ المدثر کی ابتدائی آیات کے نزول کے بعد مکہ والوں کے سامنے اپنا دعویٰ پیش کیا ہے۔ مگر نٓ وَالْقَلَمِ کی ابتدائی آیات وہ ہیں جو اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ کے معاً بعد نازل ہوئیں۔ گویا ابھی رسول کریم ﷺ کی طرف سے اپنی نبوت کا اعلان بھی نہیں ہوا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے قبل از وقت یہ خبر دے دی کہ رسول کریم ﷺ پر مجنون ہونے کا اعتراض کیا جائے گا۔ اور اگر پہلی وحی کے بعد کسی نے یہ اعتراض کیا بھی تھا تب بھی قرآن کریم نے پہلی وحی کے بعد سب سے پہلا کام یہ کیا کہ دشمنوں کے اس اعتراض کا جواب دے دیا کہ رسول کریم ﷺ کو نعوذ باللہ جنون ہو گیا ہے اور جواب بھی ایسا زبردست دیا کہ جس کا انکار نہیں ہو سکتا۔

آج کل کے سائیکالوجسٹ کہتے ہیں کہ غیر معمولی قابلیت جنون کی علامت ہوتی ہے۔ میں اس کا جواب اوپر دے چکا ہوں لیکن اگر اس جواب سے کسی کی تسلی نہ ہو تو میں کہتا ہوں اگر غیر معمولی قابلیت جنون سے حاصل ہوتی ہے تو پھر ہم بھی خواہش کرتے ہیں کہ خدا کرے ہم بھی ایسے پاگل بن جائیں کیونکہ جب دنیا کی ترقی غیر معمولی قابلیت سے وابستہ ہے اور

غیر معمولی قابلیت جنون کی علامت ہے تو پھر دنیا کی ترقی عقلمندوں سے نہیں بلکہ پاگلوں سے وابستہ ہے اور وہی لوگ اس قابل ہیں کہ ان کا نمونہ بننے کی کوشش کی جائے۔

میور نے اس موقع پر اعتراض کیا ہے کہ جب اس سورۃ میں اِقْرَاْ کہا گیا ہے تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ محادثہ بالنفس والی سورتیں اس سے پہلے نازل ہو چکی تھیں۔ اس کا استدلال یہ ہے کہ جب رسول کریم ﷺ کو یہ کہا گیا کہ **اقْـرَا** یعنی پڑھ تو ضروری ہے کہ ہم تسلیم کریں کہ اس سے پہلے کچھ سورتیں نازل ہو چکی تھیں جن کے متعلق رسول کریم ﷺ کو یہ حکم دیا گیا کہ آپ انہیں لوگوں کو پڑھ کر سنا دیں۔ وہ محادثہ بالنفس والی سورتیں سورۃ الّیل اور سورۃ الضحیٰ کو قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ قوم کے حالات پر غور کرتے کرتے جب ان سورتوں میں آپ نے اپنی قوم کا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا تو اس کے بعد آپ کو یہ خیال ہوا کہ یہ سورتیں درحقیقت الہامی ہیں اور میرا فرض ہے کہ میں یہ سورتیں لوگوں کو پڑھ کر سناؤں۔ اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ یہ ایک تاریخی سوال ہے اس کا قیاس سے تعلق نہیں۔ تاریخی امور میں ہمیشہ تاریخ کا حوالہ چاہئے نہ کہ قیاس کا۔ اگر تاریخ سورۃ الیل اور سورۃ الضحیٰ کو بعد کی نازل شدہ قرار دیتی ہے تو قیاس کا اس میں کیا دخل ہے۔ بے شک کچھ لوگ اِقْـــرَا کے بعد سورۃ ن والقلم پھر مزمّل اور پھر مدثر کا نزول بتاتے اور کچھ لوگ اِقْـــرَا کے بعد سورہ کی ابتدائی آیات کا نازل ہونا بتاتے ہیں۔ مگر وہ سورتیں جن کو سر میور محادثہ بالنفس والی سورتیں قرار دیتے ہیں ان کا نزول کسی ایک شخص نے بھی اِقْرَا سے پہلے قرار نہیں دیا۔

دوسرے خود ان سورتوں میں کوئی ایسی بات نہیں کہ ان کو پہلے کی قرار دیا جائے۔ کیا وہ خیالات جو ان سورتوں میں مذکور ہیں بعد میں ظاہر نہیں کئے جا سکتے تھے؟

حقیقت یہ ہے کہ تاریخ کے خلاف قیاس اسی مقام پر پیش کیا جا سکتا ہے جہاں تاریخی واقعہ ناممکن نظر آئے۔ مگر جہاں تاریخی واقعہ چسپاں ہو سکتا ہو وہاں قیاس سے کام لینا محض ایک زبردستی ہے اور اس زبردستی کی علم اجازت نہیں دیتا۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ گو سر میور کہتے ہیں کہ یہ سورۃ بعد کی ہے اور محادثہ بالنفس والی سورتیں پہلے کی ہیں اور بعض نے گو محادثہ بالنفس والی (بقول

سرمیور) سورتوں کو مخصوص نہیں کیا، صرف اتنا کہا ہے کہ یہ سورۃ بعد کی معلوم ہوتی ہے کیونکہ اس میں اِقْــــرَأْ کہا گیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کہ اس سے پہلے بعض سورتیں نازل ہوچکی تھیں۔لیکن نولڈکے وغیرہ نے تسلیم کیا ہے کہ یہ سورۃ سب سے پہلے نازل ہوئی ہے۔وہ کہتے ہیں جب تاریخ سے ثابت ہے کہ سب سے پہلے اس سورۃ کی آیات رسول کریم ﷺ پر نازل ہوئی تھیں تو ہم تاریخ کے مقابلہ میں قیاس سے کس طرح کام لے سکتے ہیں۔

میں اس موقع پر یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ مستشرقین یورپ کو زیادہ تر دھوکا اس بات سے لگا ہے کہ بعض جگہ کفّار کی مخالفت کی جو خبریں آجاتی ہیں ان سے وہ سمجھتے ہیں کہ چونکہ الہام واقعہ کے بعد ہونا چاہئے اس لئے جس زمانہ میں مخالفت نہیں تھی اس زمانہ میں کسی سورۃ کے اس حصہ کا نزول تسلیم نہیں کیا جا سکتا جس میں مخالفت کی خبر دی گئی ہو۔ گویا ان کے نزدیک جن سورتوں میں مخالفت کا ذکر ہو وہ ہمیشہ مخالفت کے بعد کی ہوتی ہیں۔

اس خیال پر بنیاد رکھتے ہوئے وہ بعض دفعہ مکّی سورتوں کو مدنی قرار دے دیتے ہیں یا ابتداء میں نازل ہونے والی آیات کو بعد کے زمانہ میں نازل ہونے والی آیات قرار دے دیتے ہیں۔ جب اسلام اور مسلمانوں کی پُر زور مخالفت شروع ہوگئی تھی۔ مگر اس زمانہ میں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وجود نے اس خیال کا بطلان خوب اچھی طرح ظاہر کر دیا ہے۔ جب قرآن کریم نازل ہو رہا تھا اس وقت تو نہ صحابہ کے دل میں یہ خیال آسکتا تھا اور نہ کسی اور مسلمان کے دل میں کہ کل دشمن قرآن کریم کے متعلق کیا کیا اعتراض کرے گا۔ اکثر اعتراضات موجودہ زمانہ میں ہوئے ہیں جن کے ہم جواب دیتے ہیں۔ ان میں سے بعض باتیں ایسی ہیں جو صحابہؓ کے زمانہ میں کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھیں۔ مثلاً سورتوں کے نزول کی ترتیب معلوم کرنے میں اس وقت کوئی دقّت پیش نہیں آسکتی تھی۔ صحابہؓ زندہ موجود تھے اور اگر کسی کے دل میں یہ سوال پیدا ہوتا تو اسے کہا جا سکتا تھا کہ زید سے پوچھ لو، بکر سے دریافت کر لو، عمرو اور خالد سے اپنی اپنی تسلّی کرالو۔ مگر جب جواب دینے والے فوت ہوگئے تو اس وقت قدرتی طور پر بعض لوگوں کے دلوں میں یہ سوال پیدا ہونا شروع ہوا کہ فلاں سورۃ کب اُتری تھی یا فلاں سورۃ کا فلاں حصہ کب نازل

ہوا تھا۔اس وقت دشمن نے اس قسم کے خیالات سے فائدہ اٹھانا شروع کر دیا کہ جہاں کسی پیشگوئی کا ذکر آتا وہ کہہ دیتا کہ یہ حصہ تو وقوعہ کے بعد کا ہے حالانکہ وہ حصہ وقوعہ سے مدتوں پہلے نازل ہو چکا تھا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطور پیشگوئی ان میں یہ خبریں موجود ہوتی تھیں کہ کفار مکہ میں سے کوئی فرعون کا مثیل ہوگا۔کوئی ہامان کا قائم مقام ہوگا اور نبی کریمؐ کی مثال یوسفؑ کی سی ہوگی۔جس طرح یوسف کو اس کے اپنے بھائیوں نے نکال دیا تھا اسی طرح آپ کے بھائی آپ کو اپنے شہر میں سے نکال دیں گے۔غرض کئی قسم کی پیشگوئیاں تھیں جو اللہ تعالیٰ کے اس کلام میں موجود تھیں جو رسول کریم ﷺ پر نازل ہوا اور جو بعد میں حرف بحرف پوری ہوگئیں مگر چونکہ صحابہ کا زمانہ گزر چکا تھا اور وہ لوگ فوت ہو چکے تھے جن کے سامنے قرآن کریم کا نزول ہوا۔اس لئے دشمن نے اس رنگ میں فائدہ اٹھانا شروع کر دیا کہ جہاں کہیں کوئی امر بطور پیشگوئی ملتا وہ جھٹ کہہ دیتا کہ یہ حصہ وقوعہ کے بعد کا ہے جب واقعات ظاہر ہو چکے تھے۔یہی طریق یوروپین مصنفین نے اختیار کیا ہے۔وہ قرآن کریم کی ہر پیشگوئی کو واقعہ کے بعد نازل شدہ بتاتے ہیں اور دلیل یہ دیتے ہیں کہ دیکھو لوگ کہتے ہیں یہ آیت مکی ہے۔حالانکہ اس میں فلاں واقعہ کی خبر ہے جو مدینہ میں ہوا اور یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ یہ آیت مکی نہیں مدنی ہے۔اس سے ان کی اصل غرض یہ ہوتی ہے کہ مسلمانوں کی طرف سے جو کہا جاتا ہے کہ رسول کریم ﷺ نے کئی پیشگوئیاں کیں اور وہ وقت پر پوری ہوئیں یہ دعویٰ بالکل غلط ہے۔آپ نے کوئی پیشگوئی نہیں کی بلکہ واقعہ کے بعد آپ نے اس رنگ کی آیات ڈھال کر قرآن کریم میں شامل کر دی تھیں۔

اس اعتراض کا جواب صحابہؓ تو دے نہیں سکتے کیونکہ وہ فوت ہو چکے ہیں اور صحابہؓ کے زمانہ میں یہ سوال نہیں اٹھا کہ وہ اس پر کوئی روشنی ڈال جاتے۔مگر چونکہ اس اعتراض کا جواب ضروری تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی بعثت سے جہاں اسلام کے اور بہت سے مسائل کو حل کیا وہاں اس ترتیب کے سوال کو بھی اللہ تعالیٰ نے بالکل حل کر دیا ہے۔

جب قرآن کریم نازل ہوا ہے اس وقت ساتھ ہی ساتھ اس رنگ میں کتابت نہیں ہوتی تھی کہ جس سے یہ ظاہر ہوتا کہ فلاں آیت کس سال میں نازل ہوئی ہے اور فلاں آیت کس سال

میں ۔لیکن حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اللہ تعالیٰ نے ایک ایسے زمانہ میں پیدا کیا جب کتابت کا زور تھا۔ پریس جاری تھے اور ہر چیز شائع ہو کر فوراً لوگوں کی نظروں کے سامنے آجاتی تھی اور یہ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ چونکہ الہام میں فلاں واقعہ کا ذکر ہے جو اتنے سال بعد پورا ہوا۔ اس لئے یہ الہام اس واقعہ کے بعد کا ہے پہلے کا نہیں ۔غرض حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا وجود اس اعتراض کے باطل ہونے پر ایک زبردست گواہ ہے ۔چنانچہ میں اس کے ثبوت میں ''براہین احمدیہ'' کے بعض الہامات پیش کرتا ہوں۔

براہین احمدیہ انگریزی مطبع میں چھپی ہے ۔۱۸۸۰ء میں اس کی پہلی جلد شائع ہوئی تھی اور ۱۸۸۴ء میں چوتھی جلد چھپنے کے بعد اس کتاب کی دو جلدیں قانون کے مطابق گورنمنٹ کو بھجوا دی گئی تھیں بلکہ لنڈن میوزیم میں بھی اس کی کاپیاں محفوظ ہیں اس لئے دشمن یہ نہیں کہہ سکتا کہ براہین احمدیہ میں جو باتیں لکھی گئی ہیں وہ ۱۸۸۴ء کے بعد کی ہیں۔

جب یہ کتاب شائع ہوئی ہے اس وقت حضرت مسیح موعود علیہ السلام بے شک لوگوں میں معروف تھے مگر صرف بطور مباحث کے۔ ہزار دو ہزار آدمی آپ کو جانتے تھے مگر اس لئے کہ آپ عیسائیوں یا ہندوؤں وغیرہ کے ان مضامین کا جواب دیتے رہتے تھے جو وہ اسلام کے خلاف لکھتے تھے ۔یا ایسے لوگ جانتے تھے جو آپ کے تقویٰ کے قائل تھے اور آپ سے محبت اور اخلاص رکھتے تھے ۔مثلاً لالہ بھیم سین صاحب سیالکوٹ کے ایک وکیل تھے ۔وہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام سے اس قدر تعلق رکھتے تھے کہ جب آپ پر کرم دین والا مقدمہ ہوا تو اس وقت ان کے بیٹے لالہ کنور سین صاحب ایم اے جو لاء کالج لاہور کے پرنسپل بھی رہے ہیں اور بعد میں جموں ہائیکورٹ کے جج بن گئے تھے ولایت سے بیرسٹری کا امتحان پاس کر کے آئے تھے۔ لالہ بھیم سین صاحب کو جب کرم دین والے مقدمہ کا علم ہوا تو انہوں نے اپنے بیٹے کو لکھا کہ تمہاری پڑھائی کا کوئی فائدہ ہونا چاہئے ۔مرزا صاحب بڑے مہاتما ہیں ان پر اس وقت ایک مقدمہ دائر ہے تم جاؤ اور اس مقدمہ کی مفت پیروی کرو تا کہ مرزا صاحب کی برکت سے تمہاری زندگی سنور جائے ۔ اب دیکھو ایک شخص ہندو ہے وہ یہ جانتا ہے کہ آپ ہندوؤں سے ہمیشہ مباحثات کرتے رہتے

ہیں ۔مگر اس کے باوجود وہ آپ سے محبت رکھتا ہے ۔آپ سے عقیدت اور اخلاص رکھتا ہے اور اپنے بیٹے کو آپ کے مقدمہ کی مفت پیروی کرنے کا حکم دیتا ہے اور لکھتا ہے کہ اگر تم نے ایسا کیا تو مرزا صاحب کی برکت سے تمہاری زندگی سنور جائے گی ۔اسی طرح کو عیسائیوں سے آپ مباحثے کرتے رہتے تھے مگر ان میں بھی ہم یہ رنگ دیکھتے ہیں کہ باوجود بحث مباحثہ کے وہ آپ سے محبت اور اخلاص رکھتے ۔اس کا ثبوت اس واقعہ سے ملتا ہے کہ جن دنوں آپ سیالکوٹ میں ملازم تھے ایک بہت بڑے انگریز پادری سے جس کا نام پادری ٹیلر تھا آپ اکثر مباحثات کیا کرتے تھے ۔ایک دن وہ پادری کچہری میں آیا ورچونکہ اس زمانہ میں پادریوں کا خاص طور پر احترام کیاجاتا تھا۔ڈپٹی کمشنر نے سمجھا کہ پادری صاحب مجھ سے ملنے کے لئے آئے ہیں۔ چنانچہ وہ اٹھا، بڑے احترام سے اس کے ساتھ مصافحہ کیااور پھر کہا کہ فرمایئے میرے لائق کونسی خدمت ہے ۔پادری صاحب نے کہا میں آپ سے ملنے نہیں آیا میں تو مرزا صاحب سے ملنے آیا ہوں۔ میں اب ولایت جارہاہوں اور چونکہ میرے ساتھ ان کے اکثر مباحثات ہوتے رہے ہیں ۔میرے دل میں ان کی بڑی عقیدت ہے ۔میں نے چاہا کہ ولایت جانے سے پہلے ان سے آخری ملاقات کرلوں ۔ چنانچہ اس کے بعد حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام جہاں تشریف رکھتے تھے پادری وہیں چلا گیا ۔فرش پر بیٹھ گیا اور دیر تک آپ سے باتیں کرتا رہا۔اب دیکھو ایک انگریز پادری جس سے ملنے میں ڈپٹی کمشنر تک اپنی عزت محسوس کرتا تھا ہندوستان سے رخصت ہونے سے پہلے آپ سے رخصت ہونے کے لئے کچہری گیا۔جبکہ آپ ایک معمولی کلرکی کا کام کرتے تھے اور جبکہ آپ کی عمر اس پادری کے پوتوں سے زیادہ نہ ہوگی۔

پھر مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی مسلمانوں کے چوٹی کے علماء میں سے تھے ۔حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے براہین احمدیہ لکھی تو مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی نے اس پر ریویو لکھا:۔

”ہماری رائے میں یہ کتاب اس زمانہ میں اور موجودہ حالت کی نظر سے ایسی کتاب ہے جس کی نظیر آج تک اسلام میں تالیف نہیں ہوئی اور آئندہ

کی خبر نہیں۔ لعلّ اللّٰہ یحدث بعد ذالک امراً ۔ اور اس کا مؤلف بھی اسلام کی مالی، جانی و قلمی و لسانی و حالی و قالی نصرت میں ایسا ثابت قدم نکلا ہے جس کی نظیر پہلے مسلمانوں میں بہت کم پائی گئی ہے۔"

لوگ جب کسی کتاب کے متعلق تعریفی ریویو لکھتے ہیں تو کہتے ہیں اس سال کی یہ عظیم الشان کتاب ہے اور وہ کتاب بڑی بھاری سمجھی جاتی ہے۔ اگر کہہ دیا جائے کہ دس سال میں ایسی کوئی کتاب نہیں لکھی گئی تو اس کی شہرت اور بھی بڑھ جاتی ہے اور اگر کہا جائے کہ ایک صدی کے اندر اندر ایسی عظیم الشان کتاب اور کوئی نہیں لکھی گئی تو یہ اس کتاب کی انتہائی تعریف سمجھی جاتی ہے۔ مگر مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی یہ لکھتے ہیں کہ اس کتاب کی نظیر آج تک اسلام میں تالیف نہیں ہوئی۔ گویا ایک صدی کا سوال نہیں، دو صدیوں کا سوال نہیں، تیرہ سو سال میں مسلمانوں کی طرف سے اسلام کے فضائل کے متعلق ایسی شاندار کتاب اور کوئی نہیں لکھی گئی۔

غرض مسلمان کیا اور ہندو کیا اور عیسائی کیا سب براہین احمدیہ کی اشاعت کے وقت حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی تعریف کرتے تھے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس کتاب کے شائع ہونے کے بعد ہندوؤں میں مخالفت کا کچھ چرچا شروع ہو گیا تھا مگر اس سے پہلے ہندوؤں میں بھی آپ کی کوئی مخالفت نہیں تھی بلکہ ان میں سے کئی آپ سے بہت اخلاص رکھتے تھے، جیسے لالہ بھیم سین صاحب۔ اسی طرح اور بہت سے ہندو تھے جو آپ سے خط و کتابت رکھتے تھے اور آپ کی نیکی اور تقویٰ کو تسلیم کرتے تھے۔ اس زمانہ میں یہ احتمال ہی نہیں ہو سکتا تھا کہ کوئی شخص آپ کی مخالفت کرے گا کیونکہ سب کے سب لوگ خواہ وہ کسی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں آپ کے مدّاح تھے اور جس طرح رسول کریم ﷺ کو دعویٔ نبوت سے پہلے لوگ امین اور صدیق کہا کرتے تھے اسی طرح لوگ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی راستبازی کے قائل تھے اور سمجھتے تھے کہ یہ شخص کبھی جھوٹ نہیں بول سکتا۔ غرض مسلمانوں، ہندوؤں اور عیسائیوں تینوں میں سے جو لوگ آپ کے واقف تھے وہ آپ کا ادب اور احترام کرتے تھے اور جو لوگ واقف نہیں تھے وہ نہ دوستی کا اظہار کرتے تھے نہ دشمنی کا۔ ایسی حالت میں براہین احمدیہ شائع ہوئی۔ اب ہم دیکھتے ہیں

کہ ایسے زمانہ میں جب نہ آپ کی مخالفت کا کوئی سوال تھا نہ موافقت کا۔ نہ آپ پر ایمان لانے والے دنیا میں موجود تھے اور نہ مخالفت کرنے والے۔ براہین احمدیہ میں اللہ تعالیٰ کے کیا الہامات شائع ہوئے اور وہ کس قسم کی اخبار غیبیہ پر مشتمل تھے۔ اس غرض کے لئے جب ہم براہین احمدیہ کا سرسری مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں اس میں ایک الہام یہ نظر آتا ہے کہ: قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَ يَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ذَالِكَ اَزْكٰى لَهُمْ ۔ (براہین احمدیہ صفحہ ۵۰۵) یعنی تو اپنے مومنوں سے کہہ دے کہ وہ اپنی آنکھیں نیچی رکھا کریں اور اپنے سوراخوں کی حفاظت کیا کریں۔ یہ پاکیزگی کے لحاظ سے ان کے لئے بہتر ہوگا۔ اگر یہ کتاب چھپی ہوئی نہ ہوتی یا اس پر اشاعت کی تاریخ درج نہ ہوتی اور یہ سوال اٹھتا کہ یہ الہام کب کا ہے؟ تو پادری وہیری کا کوئی بھائی کہتا کہ یہ الہام ۱۹۰۱ء کا معلوم ہوتا ہے۔ جب ایک جماعت آپ پر ایمان لا چکی تھی۔ حالانکہ یہ ۱۸۸۴ء کی کتاب ہے اور گورنمنٹ کے پاس بھی اس کی کاپی موجود ہے۔ پھر اس زمانہ میں جب دنیا میں آپ کی نہ کوئی مخالفت تھی اور نہ مخالفت کا کوئی امکان تھا حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو قرآن کریم کی یہ آیت بہ تغیر قلیل الہام ہوئی کہ: لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتَابِ وَالْمُشْرِكِيْنَ مُنْفَكِّيْنَ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ وَكَانَ كَيْدُهُمْ عَظِيْمًا۔ (صفحہ: ۵۰۶) یعنی اے شخص لوگ تیری مخالفت کریں گے اور اس مخالفت میں اہل کتاب اور مشرکین دونوں شریک ہوں گے یعنی یہودی بھی تیری مخالفت کریں گے، عیسائی بھی تیری مخالفت کریں گے، مسلمان بھی تیری مخالفت کریں گے اور وہ اس مخالفت سے کبھی باز نہیں آئیں گے۔ جب تک کہ ہماری طرف سے نشان پر نشان ظاہر نہ ہوں۔ ان نشانوں کے ظاہر ہونے کے بعد ان کو معلوم ہوگا کہ تُو ہماری طرف سے کھڑا کیا گیا ہے۔ وَكَانَ كَيْدُهُمْ عَظِيْمًا اور جن مکروں اور فریبوں سے وہ تجھے مغلوب کرنا چاہیں گے وہ بڑے عظیم الشان ہوں گے مگر ہم ان کے تمام منصوبوں کو باطل کر دیں گے اور تجھے غلبہ اور کامیابی عطا کریں گے۔

اس الہام میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کیسی زبردست مخالفت کی خبر دی گئی ہے حالانکہ واقعہ یہ تھا کہ اس وقت ہندو آپ کی عزت کرتے تھے، عیسائی آپ کی عزت کرتے تھے، مسلمان

آپ کی عزت کرتے تھے مگر اللہ تعالیٰ نے قبل از وقت فرما دیا کہ یہودی اور عیسائی اور مسلمان اور ہندو اور سکھ سب کے سب تیری مخالفت کریں گے اور تیرے خلاف بڑے بڑے منصوبے کریں گے۔ وہ چاہیں گے کہ تجھے مٹا دیں، تیرے نام کو دنیا سے ناپید کر دیں مگر ہم تیری تائید میں اپنے عظیم الشان نشان دکھائیں گے اور آخر نتیجہ یہ نکلے گا کہ تُو غالب آجائے گا اور تیرے مخالف مغلوب ہو جائیں گے۔ حالانکہ یہود اور دوسرے غیر ملکی مذاہب کے لوگوں کو آپ کے متعلق کوئی علم ہی نہ تھا۔ پھر فرمایا: **واذا قیل لھم لا تفسدوا فی الارض قالوا انما نحن مصلحون۔ الا انھم ھم المفسدون۔ قل اعوذ برب الفلق من شر ما خلق ومن شر غاسق اذا وقب۔** (ایضاً صفحہ ۵۰۶ وصفحہ ۵۰۷) یہ مدنی آیات ہیں اور منافقوں کے متعلق قرآن کریم میں بیان ہوئی ہیں اور منافق اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب ایک طرف جماعت کے غلبہ کے آثار ہوں اور دوسری طرف دشمن بھی ابھی طاقتور ہو۔ اس حالت کے نتیجہ میں جو پیدائش ہوتی ہے اس کا منافق نام ہوتا ہے۔ جس طرح ہر زمین کی پیداوار الگ الگ ہوتی ہے اسی طرح دینی منافقت کی پیداوار اُس موسم میں ہوتی ہے جب دین دنیا کے ایک حصہ پر غالب آجاتا ہے مگر کفر ابھی پوری طرح مغلوب نہیں ہوتا۔ انہیں کفر کا بھی ڈر ہوتا ہے اور دین کا بھی ڈر ہوتا ہے...... اور چونکہ اس وقت دو کشتیاں تیار ہو جاتی ہیں۔ منافق چاہتا ہے کہ دونوں کشتیوں میں سوار ہو کر سفر کرتا چلا جائے۔ نہ وہ پوری طرح دین کی طرف آتا ہے اور نہ وہ پوری طرح کفر کی طرف جاتا ہے۔ یہ بھی جرأت نہیں کرسکتا کہ مسلمانوں کا مقابلہ کرے کیونکہ ڈرتا ہے کہ وہ جیت نہ جائیں اور یہ بھی جرأت نہیں کرسکتا کہ کفار کا مقابلہ کرے۔ کیونکہ ان کے متعلق بھی اسے خوف ہوتا ہے کہ ایسا نہ ہو وہ جیت جائیں۔ پس فرماتا ہے ایک زمانہ ایسا آنے والا ہے جب تیری جماعت ترقی کرتے کرتے کفار کے مقابلہ میں ایک ترازو پر آجائے گی۔ جیسے اس وقت قادیان میں حالت ہے اس وقت تیری جماعت میں منافقوں کا ایک گروہ پیدا ہو جائے گا جو اِدھر تجھ سے تعلق رکھے گا اور اُدھر کفار سے تعلق رکھے گا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ میں نفاق کی کوئی صورت ہی نہیں تھی۔ قادیان

میں وہی شخص آتا تھا جو لوگوں سے ماریں کھانے کے لئے تیار ہوتا تھا۔ مگر اب چونکہ جماعت ترقی کر کے دشمن کے مقابلہ میں ترازو کے تول کی مانند ہے اس لئے منافقین کا بھی ایک عنصر پیدا ہو گیا ہے۔ چنانچہ ۱۹۳۴ء میں جب احرار نے شورش برپا کی اور گورنمنٹ کے بعض افسروں نے بھی ان کی پیٹھ ٹھونکنی شروع کر دی تو اس وقت ہماری جماعت میں سے بعض منافق احرار سے جا کر ملتے تھے اور ہمیں ان کی نگرانی کرنی پڑتی تھی۔ اور ابھی تو یہ پیشگوئی صرف قادیان میں پوری ہوئی ہے جب بیرونی مقامات پر بھی جماعت نے ترقی کی اور کفر کے مقابلہ میں اس نے طاقت پکڑنی شروع کر دی تو اس وقت وہاں بھی ایسے لوگ پیدا ہو جائیں گے۔ پھر اور ترقی ہوگی تو بیرونی ممالک میں اس پیشگوئی کا ظہور شروع ہو جائے گا۔ کبھی یورپ میں یہ پیشگوئی پوری ہوگی، کبھی امریکہ میں یہ پیشگوئی پوری ہوگی، کبھی چین اور جاپان میں یہ پیشگوئی پوری ہوگی اور کبھی مصر اور شام اور فلسطین وغیرہ میں یہ پیشگوئی پوری ہوگی۔ غرض ۱۸۸۴ء میں جب نہ لوگوں کی مخالفت کا کوئی خیال تھا نہ یہ خیال تھا کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ذریعہ کسی دن دنیا میں ایک بہت بڑی جماعت قائم ہو جائے گی۔ اللہ تعالیٰ نے اعلان فرمادیا کہ تیرے ذریعہ جماعت قائم ہوگی۔ وہ جماعت ترقی کرے گی اور جب وہ کفار کے مقابل میں ایک ترازو کے تول پر آجائے گی تو اس وقت بعض منافق پیدا ہو جائیں گے۔ حالانکہ یہ باتیں اس وقت کسی کے وہم اور گمان میں بھی نہیں آسکتی تھیں۔

پھر فرماتا ہے تَلَطَّفْ بِالنَّاسِ وَتَرَحَّمْ عَلَیْهِمْ اَنْتَ فِیْهِمْ بِمَنْزِلَةِ مُوْسٰی وَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ (ایضاً صفحہ ۵۰۷) تو لوگوں کے ساتھ رفق اور نرمی سے پیش آ اور تو ان پر رحم کر تُو ان میں ایسا ہے جیسے موسیٰ اپنی قوم میں تھا اور جو کچھ یہ لوگ کہتے ہیں اس پر صبر کر۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ جو حالات موسیٰ کے ساتھ پیش آئے تھے وہی تیرے ساتھ پیش آنے والے ہیں۔ تیری مخالفت میں بھی لوگوں کی طرف سے بہت کچھ کہا جائے گا تیرا فرض ہے کہ تُو صبر سے کام لے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر الہامات واقعہ کے بعد بنا لئے جاتے ہیں تو براہین احمدیہ میں یہ بات کس طرح چھپ گئی۔

پھر الہام ہے: اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْا اَنْ یَّقُوْلُوْا اٰمَنَّا وَھُمْ لَا

یُفۡتَنُوۡنَ (ایضاً صفحہ ۵۰۹) کیا تیرے ماننے والے یہ سمجھتے ہیں کہ وہ محض اتنی بات پر چھوڑ دیئے جائیں گے کہ ہم ایمان لے آئے ہیں اور وہ آزمائش میں نہیں ڈالے جائیں گے۔ اگر وہ ایسا خیال کرتے ہیں تو یہ بالکل غلط ہے۔ ان پر بڑے بڑے مظالم کئے جائیں گے، بڑے بڑے مصائب ان کو برداشت کرنے پڑیں گے اور جب وہ ان امتحانات میں پورے اتریں گے تب انہیں خدا تعالیٰ کے حضور مومن سمجھا جائے گا۔

یہ تمام الہامات جن کو اوپر پیش کیا گیا ہے ان میں سے کوئی ایک الہام بھی ایسا نہیں جو ۱۸۸۴ء کے واقعات پر چسپاں ہو سکتا ہو بلکہ یہ تمام الہامات وہ ہیں جن میں آئندہ رونما ہونے والے واقعات کی خبر دی گئی ہے۔ اسی طرح اور بھی کئی الہامات ہیں جو آئندہ واقعات پر مشتمل ہیں۔ مثلاً حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ۱۹۰۳ء میں رویاء میں دیکھا کہ: ''زار روس کا سونا میرے ہاتھ میں ہے'' (تذکرہ صفحہ ۳۷۷، ایڈیشن ۲۰۰۴ء) اب اگر یوروپین مستشرقین کی یہ بات صحیح ہے کہ الہامات ہمیشہ واقعات کے بعد گھڑ لئے جاتے ہیں تو اس الہام کی بناء کن واقعات پر ہے؟ ۱۹۰۳ء میں کونسے ایسے حالات تھے جن کی بناء پر یہ کہا جا سکتا تھا کہ روس کی حکومت ہمارے قبضہ میں آجائے گی۔ اس وقت تو ظاہری حالات کی بناء پر یہ کہنا بھی مشکل تھا کہ گورداسپور کے ضلع میں ہمیں غلبہ حاصل ہو جائے گا۔ کجا یہ کہ روس کی حکومت ملنے کا دعویٰ کیا جاتا۔ اور یہ وہ پیشگوئی ہے کہ اب تک بھی اس کا خفیف سے خفیف اثر نہیں ظاہر ہوا۔ لیکن جب یہ پوری ہوگی۔ دشمن ہزاروں بہانے یہ ثابت کرنے کے لئے بنائے گا کہ یہ بعد میں بنائی گئی۔

غرض حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی کتاب براہین احمدیہ ان تمام اعتراضات کا جواب ہے جو مستشرقین یورپ قرآن کریم کے متعلق کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ آیات جس میں پیشگوئیوں کا ذکر پایا جاتا ہے۔ اس زمانہ کی ہیں جب وہ واقعات دنیا میں ظاہر ہو چکے تھے۔ ہم کہتے ہیں اگر تمہارا یہ دعویٰ صحیح ہے تو تم حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے متعلق ثابت کرو کہ آپ نے جو پیشگوئیاں کی ہیں وہ واقعات کے ظہور کے بعد کی ہیں۔ اور اگر تم یہ ثابت نہیں کر سکتے تو تمہیں غور کرنا چاہئے کہ اگر ایک شخص جو اپنے آپ کو رسول کریم ﷺ کا غلام کہتا ہے

اللہ تعالیٰ سے الہام پا کر قبل از وقت غیب کی خبروں سے دنیا کو اطلاع دے سکتا ہے تو اس کا آقا کیوں ایسی خبریں نہیں دے سکتا تھا؟ اگر حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے الہامات میں دنیا کی تمام مخالفتوں، منصوبوں اور شرارتوں کا ایسی حالت میں ذکر کر دیا گیا ہے جب سب دنیا آپ کی تائید میں تھی تو قرآن کریم میں کیوں ایسے مضامین قبل از وقت نہیں آ سکتے تھے؟ پس اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وجود سے ان تمام حملوں کا ایسا جواب دے دیا ہے کہ اب دشمن کو منہ کھولنے کی جرأت نہیں ہو سکتی۔

اب میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ رسول کریم ﷺ کی بدء وحی اور پہلے انبیاء کی بدء وحی میں کیا فرق ہے۔ مستشرقین یورپ نے رسول کریم ﷺ کی ابتدائی وحی پر تو اعتراض کر دیا مگر انہوں نے یہ کبھی نہیں سوچا کہ جن انبیاء کو وہ خود تسلیم کرتے ہیں ان کی کیفیت وحی الٰہی کے نزول کے وقت کیا ہوئی۔ بنی اسرائیل میں سب سے بڑے نبی حضرت موسیٰ علیہ السلام ہوئے ہیں۔ ان کے متعلق بائبل میں لکھا ہے کہ وہ اپنے خسر یترو کے گلہ کی نگہبانی کر رہے تھے کہ انہوں نے حُورب پہاڑ پر ایک درخت آگ میں روشن دیکھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام حیران ہوئے کہ یہ عجیب بات ہے کہ درخت کے اردگرد آگ بھی ہے اور وہ جلتا بھی نہیں۔ چنانچہ وہ اس نظارہ کو دیکھنے کے لئے آگے بڑھے۔ تب:

> ”خدا نے اسی بُوٹے کے اندر سے پکارا اور کہا کہ اے موسیٰ، اے موسیٰ! وہ بولا میں یہاں ہوں۔ تب اس نے کہا یہاں نزدیک مت آ۔ اپنے پاؤں سے جُوتا اتار کیونکہ یہ جگہ جہاں تو کھڑا ہے مقدس زمین ہے۔ پھر اس نے کہا میں تیرے باپ کا خدا اور ابراہام کا خدا اور اسحاق کا خدا اور یعقوب کا خدا ہوں۔ موسیٰ نے اپنا منہ چھپایا کیونکہ وہ خدا پر نظر ڈالنے سے ڈرتا تھا۔“

(خروج باب ۳ آیت ۴ تا ۷)

اب دیکھو رسول کریم ﷺ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بدء وحی میں کتنا بڑا فرق ہے۔ رسول کریم ﷺ کے متعلق اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے کہ جب انہوں نے خدا تعالیٰ کو دیکھا تو دَنَا فَتَدَلّٰی (النجم:۹) محمد رسول اللہ ﷺ خدا تعالیٰ کی طرف دوڑے اور خدا تعالیٰ محمد

رسول اللہ ﷺ کی طرف دوڑا اور یہی عشق کامل کی علامت ہوتی ہے۔ایک شاعر کہتا ہے۔

ع بعد مدّت کے گلے ملتے ہوئے آتی ہے شرم
اب مناسب ہے یہی کچھ میں بڑھوں کچھ تُو بڑھے

محبت صادق میں یہی ہوتا ہے کہ کچھ وہ بڑھتا ہے اور کچھ یہ بڑھتا ہے۔اسی طرح محمد رسول اللہ ﷺ کے متعلق فرماتا ہے کہ جب انہیں اللہ تعالیٰ کی رویت ہوئی تو آپ اللہ تعالیٰ کی طرف دوڑے اور اللہ تعالیٰ آپ کی طرف دوڑا۔مگر موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کیا واقعہ ہوا جب انہوں نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا تو خدا تعالیٰ نے ان سے کہا: ''یہاں نزدیک مت آ'' یہ الفاظ بتا رہے ہیں کہ موسیٰ کی تجلّی اور محمد رسول اللہ ﷺ کی تجلّی میں کتنا بڑا فرق تھا۔محمد رسول اللہ ﷺ کے متعلق تو اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا ہے کہ وہ میری طرف بڑھے اور میں ان کی طرف بڑھا تا کہ ہم دونوں آپس میں جلدی مل جائیں۔مگر موسیٰ علیہ السلام کو کہا گیا: ''یہاں نزدیک مت آ'' اور پھر ساتھ ہی یہ حکم دیا گیا کہ: ''اپنے پاؤں سے جُوتا اتار کیونکہ یہ جگہ جہاں تو کھڑا ہے مقدس زمین ہے''۔مگر محمد رسول اللہ ﷺ کو جُوتا اتارنے کا حکم نہیں دیا گیا۔اس کی ایسی ہی مثال ہے جیسے راجاؤں سے کوئی بڑا آدمی ملنے کے لئے جاتا ہے تو وہ جُوتا پہنے رہتا ہے۔لیکن اگر کوئی زمیندار ان سے ملنے کے لئے جائے تو اسے دروازہ میں ہی جُوتا اتارنے کا حکم دیا جاتا ہے۔چونکہ موسیٰؑ کا مقام وہ نہیں تھا جو محمد رسول اللہ ﷺ کا تھا اس لئے محمد رسول اللہ ﷺ سے یہ نہیں کہا گیا کہ تو اپنا جوتا اتار۔مگر موسیٰ علیہ السلام کو جیسے معمولی زمینداروں کو ڈانٹ کر جوتا اتارنے کا حکم دیا جاتا ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم دیا گیا کہ: ''اپنے پاؤں سے جُوتا اتار کیونکہ یہ جگہ جہاں تو کھڑا ہے مقدس زمین ہے''۔پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اس وقت جو کچھ کہا گیا وہ یہ ہے کہ: ''میں تیرے باپ کا خدا اور ابراہام کا خدا اور اسحاق کا خدا اور یعقوب کا خدا ہوں''

اس میں کون سا معرفت کا نکتہ بیان ہے؟ یا کون سا کمال ہے جو اس کلام میں پایا جاتا ہے؟ ایک موٹی بات ہے جو ہر شخص جانتا ہے مگر محمد رسول اللہ ﷺ کو جو کچھ کہا گیا اس کے متعلق آگے چل کر بتایا جائے گا کہ وہ کلام اپنے اندر کس قدر خوبیاں رکھتا تھا۔

پھر وہیری اور اس کے ساتھی یہ تو اعتراض کرتے ہیں کہ محمد رسول اللہ ﷺ پر وحی نازل ہوئی تو وہ ڈر گئے اور ان کے کندھے کانپنے لگ گئے مگر وہ یہ نہیں دیکھتے کہ یہاں صاف لکھا ہے کہ: ''موسیٰ نے اپنا منہ چھپایا کیونکہ وہ خدا پر نظر ڈالنے سے ڈرتا تھا''۔ اگر رسول کریم ﷺ پر آپ کے ڈرنے کی وجہ سے اعتراض کیا جا سکتا ہے تو موسیٰ علیہ السلام پر بھی یہ اعتراض وارد ہوتا ہے۔ بلکہ موسیٰ علیہ السلام پر جو اعتراض وارد ہوتا ہے وہ زیادہ سخت ہے کیونکہ ان کے متعلق لکھا ہے کہ انہوں نے ڈر کر اپنا منہ چھپا لیا لیکن رسول کریمؐ کے متعلق صرف اتنا لکھا ہے کہ آپ کے کندھے کانپنے لگ گئے اور یہ امر ظاہر ہے کہ بڑا آدمی اگر کسی بات سے گھبراتا ہے تو اس کے کندھے کانپنے لگ جاتے ہیں۔ لیکن بچے جب کسی بات سے ڈرتے ہیں تو اپنا منہ چھپا لیتے ہیں۔ یہ کبھی نہیں ہوتا کہ کوئی بڑا آدمی ڈرے تو وہ اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لے۔ لیکن بچوں کو تم روزانہ دیکھو گے کہ جب وہ ڈرتے ہیں فوراً اپنا منہ چھپا لیتے ہیں۔ یہی بچوں والی حرکت حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کی کہ خدا تعالیٰ کو دیکھا تو ڈر کر اپنا منہ چھپا لیا۔ یا کبوتر والی حرکت کی جو بلی سے ڈر کر اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ لیکن محمد رسول اللہ ﷺ چونکہ روحانی لحاظ سے ایک جوان اور مضبوط آدمی کی حیثیت رکھتے تھے اس لئے آپ نے اپنی آنکھیں کھلی رکھیں۔ صرف گھبراہٹ سے آپ کے کندھے ملنے شروع ہو گئے۔ پس جو اعتراض مستشرقین یورپ کی طرف سے رسول کریم ﷺ پر کیا جاتا ہے وہی حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وارد ہوتا ہے اور وارد بھی زیادہ بھیانک اور خطرناک شکل میں ہوتا ہے۔ پھر لکھا ہے: ''موسیٰ نے خدا کو کہا میں کون ہوں جو فرعون کے پاس جاؤں اور بنی اسرائیل کو مصر سے نکالوں؟'' (خروج باب ۳ آیت ۱۱)

عیسائی اعتراض کرتے ہیں کہ محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنی وحی پر شک کیا اور وہ یہ نہیں دیکھتے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کیا حال تھا۔ اللہ تعالیٰ ان کو فرعون کی طرف جانے کا حکم دیتا ہے مگر بجائے اس کے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کریں اس کی نصرت اور تائید پر بھروسہ رکھیں اور سمجھیں کہ جب اللہ تعالیٰ مجھے اس کام کے لئے بھیج رہا ہے تو وہ مجھے اکیلا نہیں چھوڑے گا۔ اس قدر شک کا اظہار کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے کہتے ہیں کہ میری حیثیت ہی کیا ہے کہ میں فرعون

کے پاس جاؤں۔ میں ایک غریب آدمی ہوں اور فرعون بڑا بادشاہ ہے۔ میں تو اس کے پاس نہیں جا سکتا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام خدا تعالیٰ کے حکم کا اس قدر انکار کرنے کے باوجود مسیحی پادریوں کے نزدیک اللہ تعالیٰ کے مقرب ہی رہتے ہیں۔ لیکن محمد رسول اللہ ﷺ اگر صرف اتنا فرماتے ہیں کہ قَدْ خَشِيْتُ عَلٰى نَفْسِيْ ۔ مجھے تو اپنے نفس کے متعلق ڈر پیدا ہو گیا ہے تو عیسائی یہ کہنا شروع کر دیتے ہیں کہ ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو وحی الٰہی پر یقین نہیں تھا۔

پھر لکھا ہے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ جا اور اپنی قوم کو مصر سے نکال کر اس پہاڑ پر عبادت کرنے کے لئے لا مگر موسیٰؑ نے اس کا بھی انکار کیا۔ چنانچہ لکھا ہے:

''تب موسیٰ نے جواب دیا اور کہا کہ دیکھو وے مجھ پر ایمان نہ لائیں گے، نہ میری بات سنیں گے۔ وہ کہیں گے کہ خداوند تجھے دکھائی نہیں دیا'' (خروج باب ۴ آیت ۱)

محمد رسول اللہ ﷺ کا واقعہ جو بالکل عقل کے مطابق ہے اس کے متعلق تو عیسائی اعتراض کرتے ہیں کہ آپ نے وحی الٰہی کے متعلق شک کا اظہار کیا۔ مگر موسیٰ علیہ السلام کے متعلق نہیں دیکھتے کہ انہوں نے کس طرح اللہ تعالیٰ کے واضح احکام کا انکار کیا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں کہا کہ اپنی قوم کو یہاں عبادت کرنے کے لئے لا۔ اب بجائے اس کے کہ وہ اس حکم کی فوری طور پر تعمیل کرتے اللہ تعالیٰ سے یہ کہنے لگ گئے کہ وہ مجھ پر ایمان نہیں لائیں گے، نہ میری بات سنیں گے، وہ کہیں گے کہ خداوند تجھے دکھائی نہیں دیا۔ اس لئے میں ان کے پاس کس طرح جا سکتا ہوں؟

> ''تب خدا نے موسیٰ سے کہا کہ یہ تیرے ہاتھ میں کیا ہے وہ بولا عصا۔ پھر اس نے کہا اسے زمین پر پھینک دے۔ اس نے زمین پر پھینک دیا اور وہ سانپ بن گیا اور موسیٰ اس کے آگے سے بھاگا'' (خروج باب ۴ آیت ۲و۳)

کیسی عجیب بات ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سانپ کو دیکھا تو ڈر کر بھاگنے لگ گئے۔ حالانکہ سانپ کو ہر شخص مار سکتا ہے یہ نہیں ہوتا کہ کوئی سمجھدار طاقتور انسان سانپ دیکھے تو ڈر کر بھاگنا شروع کر دے۔ وہ فوراً لاٹھی اٹھاتا اور اسے مار ڈالتا ہے۔ مگر حضرت موسیٰ

علیہ السلام نے سانپ دیکھا تو ڈر کر بھاگنا شروع کر دیا۔ عیسائی اس واقعہ کو پڑھتے ہیں مگر اس کے باوجود ان کے نزدیک حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت میں کوئی نقص واقع نہیں ہوتا۔ لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھاگتے نہیں۔ وحی کے نازل ہونے پر صرف اتنا فرماتے ہیں کہ نہ معلوم میں اس اہم ذمہ واری کو ادا کر سکوں گا یا نہیں۔ تو عیسائی کہتے ہیں آپ نے وحی الٰہی کے متعلق شک اور تردّد کا اظہار کر دیا۔ پھر لکھا ہے:

> ”تب موسیٰ نے خداوند سے کہا کہ اے میرے خداوند میں فصاحت نہیں رکھتا۔ نہ تو آگے سے اور نہ جب سے کہ تُو نے اپنے بندے سے کلام کیا اور میری زبان اور باتوں میں لُکنت ہے“ (خروج باب ۴ آیت ۱۰)

دیکھو کتنا بڑا نشان تھا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دیکھا کہ ان کا عصا سانپ بن گیا اور جب انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے سانپ کو پکڑا تو وہ پھر عصا بن گیا۔ اتنا بڑا معجزہ دیکھنے کے بعد بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام ابھی اڑے ہوئے ہیں اور کہتے ہیں میری زبان میں فصاحت نہیں۔ نہ پہلے فصاحت تھی اور نہ اب تجھے دیکھنے کے بعد میری زبان میں کوئی فرق پیدا ہوا ہے۔ یعنی پہلے تو میں بے شک ایک معمولی آدمی تھا مگر میں دیکھتا ہوں کہ تیرے جلال کو دیکھنے کے بعد بھی میری زبان ویسی کی ویسی ہے۔ جس طرح پہلے میری زبان میں لُکنت تھی اسی طرح اب ہے۔ جس طرح پہلے غیر فصیح تھا اسی طرح اب غیر فصیح ہوں۔

> ”تب خدا نے اسے کہا کہ آدمی کو زبان کس نے دی اور کون گونگا یا بہرا یا بینا یا اندھا کرتا ہے۔ کیا میں نہیں کرتا جو خداوند ہوں۔ پس اب تو جا اور میں تیری بات کے ساتھ ہوں اور تجھ کو سکھاؤں گا جو کچھ تُو کہے گا“

(خروج باب ۴ آیت ۱۱، ۱۲)

اس حکم اور نصیحت کو سن کر بھی موسیٰ علیہ السلام کے طریق میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہوئی۔ چنانچہ آگے لکھا ہے: ”تب اس نے کہا کہ اے میرے خداوند! میں تیری منت کرتا ہوں جس کو چاہے تُو اس وسیلہ سے بھیج“ (خروج باب ۴ آیت ۱۳)

یعنی میں جانے کے لئے تیار نہیں۔ میری جگہ کسی اور کو بھیج دیجئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خدا تعالیٰ کے حکم کا بار بار انکار کیا پھر بھی مسیحی علماء کے نزدیک ان کے عظیم الشان نبی ہونے میں کوئی شک پیدا نہیں ہوا۔ مگر رسول کریم ﷺ کے صرف اتنا کہنے پر کہ نہ معلوم میں اس ذمہ واری کو ادا کر سکوں گا یا نہیں، انہیں رسول کریم ﷺ کے ایمان میں یا عقل میں شبہ نظر آنے لگا۔ حالانکہ موسیٰ کا واقعہ ان کی الہامی کتاب میں مذکور ہے اور رسول کریم ﷺ کا فقرہ قرآن کریم میں نہیں بلکہ صرف حدیث میں بیان ہے جو کلام اللہ کے برابر شہادت نہیں ہو سکتا۔

تورات میں آگے چل کر لکھا ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بار بار خدا تعالیٰ کا حکم ماننے سے انکار کیا۔ "تب خداوند کا غصہ موسیٰ پر بھڑکا"۔ (خروج باب ۴ آیت ۱۴)

یعنی اللہ تعالیٰ نے یہ دیکھ کر کہ وہ انکار پر اصرار ہی کئے جاتے ہیں انہیں ڈانٹا۔ پھر لکھا ہے: "کیا نہیں ہے لاویوں میں سے ہارون تیرا بھائی؟ میں جانتا ہوں کہ وہ فصیح ہے اور دیکھ کہ وہ بھی تیری ملاقات کو آتا ہے اور تجھے دیکھ کے دل میں خوش ہوگا اور تُو اسے باتیں بتائے گا اور میں تیری اور اس کی بات کے ساتھ ہوں گا اور تم جو کچھ کرو گے تم کو بتاؤں گا" (خروج باب ۴ آیت ۱۴ و ۱۵)

غرض رسول کریم ﷺ کی بدءوحی پر عیسائیوں کی طرف سے جو اعتراضات کئے جاتے ہیں وہ تمام کے تمام اعتراضات اس وحی پر بھی واقعہ ہوتے ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی۔ ہم تو عیسائیوں کے اعتراضات کو درست تسلیم نہیں کرتے اور ان کے جوابات بھی اوپر درج کئے جا چکے ہیں لیکن پھر بھی الزامی رنگ میں ہم عیسائیوں سے کہتے ہیں اگر تمہیں رسول کریم ﷺ کے متعلق یہ اعتراض ہے کہ وحی کے متعلق آپؐ نے تردّد کا اظہار فرمایا تو یہ اعتراض بدرجۂ اتم حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وارد ہوتا ہے اور وارد بھی ایسی صورت میں ہوتا ہے کہ اس کی کوئی تاویل نہیں کی جا سکتی۔

اس کے بعد ہم **حضرت مسیح علیہ السلام کی بدءوحی کے واقعات** کو دیکھتے ہیں۔ متی باب ۳ میں لکھا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام یوحنا کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ مجھے بپتسمہ دو۔ پہلے تو انہوں نے انکار کیا مگر آخر مان لیا اور حضرت مسیح نے یوحنا سے بپتسمہ پایا۔ اس کے بعد جو

کچھ ہوا اس کے متعلق انجیل کہتی ہے:

”اور یسوع بپتسمہ پا کے وہیں پانی سے نکل کے اوپر آیا اور دیکھو کہ اس کے لئے آسمان کھل گیا اور اس نے خدا کی روح کو کبوتر کی مانند اترتے دیکھا۔ اور دیکھو کہ آسمان سے ایک آواز یہ کہتی آئی کہ یہ میرا پیارا بیٹا ہے جس سے میں خوش ہوں“۔ (متی باب ۳ آیت ۱۶ و ۱۷)

اس نظارہ کو رسول کریم ﷺ کی بدءوحی کے مقابلہ میں رکھو اور پھر سوچو کہ کیا ان دونوں واقعات میں کوئی بھی نسبت ہے۔ محمد رسول اللہ ﷺ کی طرف اللہ تعالیٰ نے اپنا پیغام فرشتہ کے ذریعہ بھیجا اور مسیح پر ایک کبوتر کی شکل میں روح القدس نازل ہوا۔ کبوتر سے انہوں نے کیا ڈرنا تھا۔ کبوتر تو وہ جانور ہے جس کی ہڈیاں بھی انسان چبا جاتا ہے۔ یہی عیسوی اور محمدی تجلّی کا فرق ہے جس کی بناء پر اللہ تعالیٰ نے قرآنی تعلیم کو شرک سے محفوظ رکھا لیکن عیسائیت پر شیطان غالب آگیا کیونکہ عیسائی مذہب کے پیشوا پر روح القدس ایک نہایت ہی کمزور شکل میں نازل ہوا تھا۔
حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”ہمارے نبی ﷺ پر جو روح القدس کی تجلّی ہوئی تھی وہ ہر ایک تجلّی سے بڑھ کر ہے۔ روح القدس کبھی کسی نبی پر کبوتر کی شکل پر ظاہر ہوا اور کبھی کسی نبی یا اوتار پر گائے کی شکل پر ظاہر ہوا اور کسی پر کچھ یا مچھ کی شکل پر ظاہر ہوا اور انسان کی شکل کا وقت نہ آیا جب تک انسان کامل یعنی ہمارا نبی ﷺ مبعوث نہ ہوا۔ جب آنحضرت ﷺ مبعوث ہوگئے تو روح القدس بھی آپ پر بوجہ آپ کے کامل انسان ہونے کے انسان کی شکل پر ہی ظاہر ہوا اور چونکہ روح القدس کی قوی تجلّی تھی جس نے زمین سے لے کر آسمان کا افق بھر دیا تھا اس لئے قرآنی تعلیم شرک سے محفوظ رہی لیکن چونکہ عیسائی مذہب کے پیشوا پر روح القدس نہایت کمزور شکل میں ظاہر ہوا تھا یعنی کبوتر کی شکل پر اس لئے ناپاک روح یعنی شیطان اس مذہب پر فتحیاب ہوگیا۔“

(کشتی نوح روحانی خزائن جلد ۱۹ صفحہ ۸۳۔۸۴)

اس جگہ یہ نکتہ یاد رکھنا چاہئے کہ خدا تعالیٰ جن کو انسانوں کی ہدایت کے لئے بھیجتا ہے وہ اس کے رسول کہلاتے ہیں اور رسول دنیا میں دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جن کا کام صرف خط دے دینا ہوتا ہے اس سے زیادہ ان کا کام کچھ نہیں ہوتا۔ اور ایک وہ جن کا کام ان احکام کو نافذ کرنا بھی ہوتا ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام پر تجلّی الٰہی کا کبوتر کی صورت میں نازل ہونا بتاتا ہے کہ مسیحؑ کی حیثیت صرف اس پیغامبر کی تھی جو پیغام سنا دیتا ہے اور اس کا کام ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن رسول کریم ﷺ پر تجلّی الٰہی کا نزول ایک مرد کامل کی شکل میں ظاہر ہوا جس سے اس طرف اشارہ تھا کہ آپ صرف پیغامبر نہ ہوں گے بلکہ ایک کامل نمونہ بھی اپنے مخاطبین کے لئے ہوں گے۔

انجیل میں یہ بھی بتایا گیا ہے:

> ’’تب یسوع روح کے وسیلے بیابان میں لایا گیا تا کہ شیطان اسے آزمائے اور جب چالیس دن اور چالیس رات روزہ رکھ چکا، آخر کو بھوکا ہوا تب آزمائش کرنے والے نے اس پاس آ کے کہا۔ اگر تُو خدا کا بیٹا ہے تو کہہ یہ پتھر روٹی بن جائیں۔ اس نے جواب میں کہا لکھا ہے کہ انسان صرف روٹی سے نہیں بلکہ ہر اک بات سے جو خدا کے منہ سے نکلتی ہے جیتا ہے۔ تب شیطان اسے مقدس شہر میں اپنے ساتھ لے گیا اور ہیکل کے کنگورے پر کھڑا کر کے اس سے کہا کہ اگر تُو خدا کا بیٹا ہے تو اپنے تئیں نیچے گرا دے کیونکہ لکھا ہے کہ وہ تیرے لئے اپنے فرشتوں کو فرمائے گا اور وہ تجھے ہاتھوں پر اٹھا لیں گے۔ ایسا نہ ہو کہ تیرے پاؤں کو پتھر سے ٹھیس لگے۔ یسوع نے اس سے کہا یہ بھی لکھا ہے کہ تُو خداوند اپنے خدا کو مت آزما۔ پھر شیطان اسے ایک بڑے اونچے پہاڑ پر لے گیا اور دنیا کی ساری بادشاہتیں اور ان کی شان و شوکت اسے دکھائیں اور اس سے کہا اگر تُو گر کے مجھے سجدہ کرے تو یہ سب کچھ تجھے دوں گا۔ تب یسوع نے اسے کہا اے شیطان دور

ہو کیونکہ لکھا ہے کہ تُو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر اور اس اکیلے کی بندگی کر"۔

(متی باب ۴ آیت ۱ تا ۱۰)

دیکھو عیسائیوں کو تو رسول کریم ﷺ پر یہ اعتراض تھا کہ آپ نے وحی الٰہی کے متعلق شبہ کا اظہار کیا مگر یہاں یہ لکھا ہے کہ شیطان حضرت مسیحؑ کو اپنے ساتھ لئے پھرا۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ واقعہ میں ایسا ہوا ہے ہم صرف یہ کہتے ہیں کہ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا تعالیٰ پر کامل یقین تھا تو انجیل کے بیان کے مطابق وہ شیطان کے پیچھے پیچھے کیوں بھاگے پھرتے تھے اور کیا وجہ ہے کہ جس طرف شیطان ان کی انگلی پکڑ کر لے جاتا اسی طرف وہ نہایت اطمینان کے ساتھ چلنا شروع کر دیتے؟

بیت المقدس میں لے جاتا تو وہاں چلے جاتے ہیں۔ ہیکل کے کنگورے پر کھڑا کرتا ہے تو وہاں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ گویا جس طرح کوئی بے بس ہوتا ہے شیطان کی ہر بات مانتے چلے جاتے ہیں۔ بہر حال عیسائیوں کو دو باتوں میں سے ایک بات ضرور تسلیم کرنی پڑے گی۔ یا تو ان کو یہ ماننا پڑے گا کہ یہ ایک ظاہری واقعہ ہے اور یا ان کو یہ ماننا پڑے گا کہ یہ ظاہری واقعہ نہیں بلکہ خواب ہے۔ اگر اسے ظاہری واقعہ تسلیم کیا جائے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ شیطان حضرت مسیح کے پاس آیا کیوں؟ کیا وہ خدا تعالیٰ کے بیٹے کو دھوکا دے سکتا تھا؟ اگر نہیں تو اس کا ظاہری صورت میں حضرت مسیحؑ کے پاس آنا بالکل بے معنی بات تھی جس کی کوئی بھی توجیہ نہیں ہوسکتی۔ ہاں اگر اس واقعہ کو حضرت مسیحؑ کی خواب قرار دے دیا جائے تو ایسا ہوسکتا ہے مگر اس صورت میں بھی یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ حضرت مسیحؑ کے دل میں یہ خیالات آنے شروع ہو گئے تھے کہ کیا مجھے شیطان کی طرف سے تو الہام نہیں ہوا۔ حضرت مسیحؑ کا رؤیا کی حالت میں شیطان کے پیچھے چلنا اور اسے نہ دُھتکارنا ان کے قلب کی اس حالت پر دلالت کرتا ہے کہ وہ اس کے شیطان ہونے پر یقین نہ رکھتے تھے اور اس وقت تک شیطانی اور رحمانی رویا میں فرق نہیں کر سکتے تھے۔

غرض انجیل کی آیات سے یہ امر ظاہر ہے کہ یسوع کو ایک کبوتری کے نظارہ میں پہلا جلوہ ہوا۔ جبکہ رسول کریم ﷺ کو ایک کامل القویٰ انسان کی شکل میں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو

آگ کی صورت میں۔ پھر موسیٰ علیہ السلام کا شک اور خوف بھی ثابت ہے اور مسیح کا بھی کیونکہ شیطان کا ملنا اور مسیح کا اس کے پیچھے جانا تردّد اور شک پر ہی دلالت کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ ان کے دل میں اس وقت تک الٰہی کلام پر وہ یقین اور وثوق پیدا نہیں ہوا تھا جو بعد میں جا کر پیدا ہوا۔

پھر سوال یہ ہے کہ جب کبوتر کی شکل میں روح القدس نازل ہوا تو اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ انجیل میں صرف اتنا لکھا ہے: ''آسمان سے ایک آواز یہ کہتی آئی کہ یہ میرا پیارا بیٹا ہے جس سے میں خوش ہوں۔'' ان الفاظ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو کونسا نیا علم بخشا گیا ہے یا کونسا معرفت کا نیا نکتہ تھا جو آپ پر نازل کیا گیا۔ محض کسی آواز کا آجانا تو کوئی بڑی بات نہیں ہوتی۔ آواز تو ایک پاگل کو بھی آجاتی ہے۔ یا جب موسیٰؑ کو اللہ تعالیٰ نے یہ کہا کہ ''میں تیرے باپ کا خدا اور ابراہام کا خدا اور اسحاق کا خدا اور یعقوب کا خدا ہوں'' تو موسیٰؑ کو اس سے کیا لطف آیا ہوگا یا کونسا عرفان ان کو حاصل ہوا ہوگا۔ کیا اس کلام کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کہہ سکتے تھے کہ مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک ایسی بات بتائی گئی ہے جو پہلے میرے علم میں نہیں تھی۔ یا عرفان کا ایک نیا باب میرے لئے کھول دیا گیا ہے۔ یقیناً وہ ایسی کوئی بات نہیں کہہ سکتے تھے۔ اسی طرح حضرت مسیحؑ پر اگر ایک کبوتری کی شکل میں روح القدس نازل ہوگیا اور آسمان سے یہ آواز آگئی کہ یہ میرا پیارا بیٹا ہے تو کیا ہوگیا؟ یہ محض ایک بیان ہے اس سے زیادہ ان الفاظ کی کوئی حقیقت نہیں۔ نہ ان میں عرفان کی کوئی بات ہے نہ علم و حکمت کا کوئی نکتہ ہے۔ نہ تعلق باللہ کا کوئی راز ان میں منکشف کیا گیا ہے اور نہ کوئی اور ایسی بات بیان کی گئی ہے جو علم اور معرفت کی زیادتی کے ساتھ تعلق رکھتی ہو۔ پھر یہ بھی قابلِ غور بات ہے کہ حضرت مسیحؑ نے کبوتر کی شکل میں روح القدس کے نازل ہونے کا جو نظارہ دیکھا اس کے متعلق یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ کوئی حقیقی نظارہ نہیں تھا بلکہ دماغ کی خرابی کا ایک کرشمہ تھا کیونکہ جن لوگوں کو وہم ہو جاتا ہے وہ بعض دفعہ معمولی معمولی باتوں سے ایسے نتائج اخذ کر لیتے ہیں جو کسی اور انسان کے واہمہ میں بھی نہیں آتے۔ مولوی یار محمد صاحب حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے ایک صحابی تھے ان کے دماغ میں نقص تھا۔ بعض دفعہ باتیں کرتے وقت حضرت مسیح موعود علیہ السلام اپنے ہاتھ کو حرکت دیتے تو مولوی یار محمد صاحب

جھٹ کود کر آگے آجاتے اور سمجھتے کہ یہ اشارہ حضرت مسیح علیہ السلام نے میرے لئے کیا تھا۔ اسی طرح جن میں وہم کا مرض پیدا ہو جاتا ہے وہ بعض دفعہ پرندوں کی پرواز سے فال لینا شروع کر دیتے ہیں۔ دائیں طرف سے کوئی پرندہ گزر جائے تو سمجھتے ہیں کہ ہمیں کام میں کامیابی ہو جائے گی اور اگر بائیں طرف سے کوئی پرندہ گزر جائے تو سمجھتے ہیں کہ اب ہمیں نحوست کا سامنا کرنا ہوگا۔ اسی رنگ میں ہو سکتا ہے کہ جب یوحنا سے بپتسمہ پانے کے بعد حضرت مسیح پانی سے باہر آئے ہوں تو کوئی کبوتر اڑ کر ان کے پاس آبیٹھا ہو اور انہوں نے سمجھ لیا ہو کہ یہ آسمان سے میرے پاس آیا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بدء وحی کا واقعہ بے شک ایک حقیقی نظارہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ آپ سے ہمکلام ہوا۔ مگر اس کلام میں کوئی ایسی بات نہیں جس میں علم و عرفان کا کوئی خاص راز منکشف کیا گیا ہو یا کوئی ایسی بات بتائی گئی ہو جو دنیا کے لئے ایک نرالے پیغام کی حیثیت رکھتی ہو۔ صرف موسیٰ کو یہ کہا گیا تو فرعون کے پاس جا اور بنی اسرائیل کو اس کی غلامی سے نکال۔ یہ محض ایک دنیوی بات ہے۔ زیادہ سے زیادہ اسے سیاسی لحاظ سے اہمیت دی جاسکتی ہے مگر مذہبی اور روحانی نقطۂ نگاہ سے اس میں کوئی ایسی بات نہیں جو دنیا کے لئے جدید پیغام ہو یا اس پر کوئی نئی حقیقت روشن کرنے والا ہو۔ بہر حال رسول کریم ﷺ اور سابق انبیاء کی بدء وحی کے واقعات کا جب آپس میں مقابلہ کیا جائے تو اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ رسول کریم ﷺ کی وحی باقی تمام انبیاء کی وحیوں میں ایک ممتاز مقام رکھتی ہے اور اللہ تعالیٰ نے جس قسم کی محبت اور پیار کا سلوک آپؐ سے کیا ہے اس قسم کی محبت اور پیار کا سلوک اس نے اور کسی نبی سے نہیں کیا"۔

(تفسیر کبیر جلد ۹ صفحہ ۲۲۶ تا ۲۲۸)

آپؐ سے روح القدس کے جدا ہونے کا غلط اعتقاد

مسلمانوں کے اس غلط اعتقاد کی نفی کرتے ہوئے حضرت مسیح موعود علیہ السلام آئینہ

کمالات اسلام میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

''سوچنا چاہئے کہ کیا یہی ادب اور یہی ایمان اور عرفان ہے **اور یہی محبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم** ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت اِس نقص اور تنزل کی حالت کو روا رکھا جائے کہ گویا **روح القدس** آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم سے مدّتوں تک علیحدہ ہو جاتا تھا اور نعوذ باللہ ان مدتوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انوار قدسیہ سے جو **روح القدس** کا پرتوہ ہے محروم ہوتے تھے غضب کی بات ہے کہ **عیسائی لوگ** تو حضرت مسیح علیہ السلام کی نسبت یقینی اور قطعی طور پر یہ اعتقاد رکھیں☆ کہ **روح القدس** جب سے حضرت مسیح پر نازل ہوا کبھی ان سے جدا نہیں ہوا اور وہ ہمیشہ اور ہر دم روح القدس سے تائید یافتہ تھے یہاں تک کہ خواب میں بھی ان سے روح القدس جدا نہیں ہوتا تھا اور ان کا **روح القدس** کبھی آسمان پر ان کو اکیلا اور مہجور چھوڑ کر نہیں گیا اور نہ روح القدس کی روشنی ایک دم کیلئے بھی کبھی ان سے جدا ہوئی **لیکن مسلمانوں کا یہ اعتقاد** ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا روح القدس آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم سے جدا بھی ہو جاتا تھا اور اپنے **دشمنوں** کے سامنے بصراحت تمام یہ اقرار کریں کہ **رُوح القدس** کی دائمی رفاقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت عیسٰی کی طرح نصیب نہیں ہوئی۔

اب سوچو کہ اس سے زیادہ تر اور کیا بے ادبی اور گستاخی ہوگی کہ آنحضرت صلعم کی صریح توہین کی جاتی ہے اور عیسائیوں کو اعتراض کرنے کیلئے موقع دیا جاتا ہے اِس بات کو کون نہیں جانتا کہ روح القدس کا نزول نورانیت کا باعث اور اس کا جدا ہو جانا ظلمت اور تاریکی اور بدخیالی اور تفرقہ ایمان کا موجب ہوتا ہے خدا تعالیٰ **اسلام** کو ایسے مسلمانوں کے شر سے بچاوے جو کلمہ کو کہلا کر **رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم** پر ہی حملہ کر رہے ہیں۔ عیسائی لوگ تو حواریوں کی نسبت بھی یہ اعتقاد نہیں رکھتے کہ کبھی ان سے روح القدس جدا ہوتا تھا بلکہ ان کا تو یہ عقیدہ ہے کہ وہ لوگ روح القدس کا فیض دوسروں کو بھی دیتے تھے۔ لیکن یہ لوگ مسلمان کہلا کر اور **مولوی**

☆**نوٹ**۔ حضرت مسیح کی نسبت مسلمانوں کا بھی یہی اعتقاد ہے دیکھو تفسیر ابن جریر و ابن کثیر و معالم و فتح البیان و کشاف و تفسیر کبیر و حسینی وغیرہ بموقعہ تفسیر آیت وَاَیَّدْنٰہُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ (البقرہ:۸۸) افسوس افسوس افسوس۔ منہ

اور **محدّث** اور **شیخ الکل** نام رکھا کر پھر جناب **ختم المرسلین خیر الاوّلین والآخرین** کی شان میں ایسی ایسی بدگمانی کرتے ہیں اور اس قدر سخت بد زبانی کر کے پھر خاصے مسلمان کے مسلمان اور دوسرے لوگ ان کی نظر میں کافر ہیں۔

اور اگر یہ سوال ہو کہ قرآن کریم میں اس بات کی کہاں تشریح یا اشارہ ہے کہ روح القدس مقرّبوں میں ہمیشہ رہتا ہے اور ان سے جدا نہیں ہوتا تو اس کا یہ جواب ہے کہ سارا قرآن کریم ان تصریحات اور اشارات سے بھرا پڑا ہے بلکہ وہ ہر یک مومن کو روح القدس ملنے کا وعدہ دیتا ہے چنانچہ منجملہ ان آیات کے جو اس بارہ میں کھلے کھلے بیان سے ناطق ہیں۔ **سورۃ الطارق** کی پہلی دو آیتیں ہیں اور وہ یہ ہیں وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الطَّارِقُ النَّجْمُ الثَّاقِبُ اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ (الطارق:۲۔۵) یہ آخری آیت یعنی اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ جس کے یہ معنی ہیں کہ ہر ایک نفس پر ایک فرشتہ نگہبان ہے یہ صاف دلالت کر رہی ہے کہ جیسا کہ انسان کے ظاہر وجود کیلئے فرشتہ مقرر ہے جو اُس سے جدا نہیں ہوتا ویسا ہی اس کے باطن کی حفاظت کیلئے بھی مقرر ہے جو باطن کو شیطان سے روکتا ہے اور گمراہی کی ظلمت سے بچاتا ہے اور وہ **رُوح القدس** ہے جو خدا تعالیٰ کے خاص بندوں پر شیطان کا تسلّط ہونے نہیں دیتا اور اسی کی طرف یہ آیت بھی اشارہ کرتی ہے کہ اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ (الحجر:۴۳) اب دیکھو کہ یہ آیت کیسے صریح طور پر بتلا رہی ہے کہ خدا تعالیٰ کا فرشتہ انسان کی حفاظت کیلئے ہمیشہ اور ہر دم اس کے ساتھ رہتا ہے اور ایک دم بھی اس سے جدا نہیں ہوتا۔ کیا اس جگہ یہ خیال آ سکتا ہے کہ انسان کے ظاہر کی نگہبانی کیلئے تو دائمی طور پر فرشتہ مقرر ہے لیکن اس کی باطن کی نگہبانی کیلئے کوئی فرشتہ دائمی طور پر مقرر نہیں بلکہ متعصّب سے متعصّب انسان سمجھ سکتا ہے کہ باطن کی حفاظت اور روح کی نگہبانی جسم کی حفاظت سے بھی زیادہ ضروری ہے کیونکہ جسم کی آفت تو اسی جہان کا ایک دکھ ہے لیکن روح اور نفس کی آفت جہنم ابدی میں ڈالنے والی چیز ہے سو جس خدائے رحیم وکریم کو انسان کے اس جسم پر بھی رحم ہے جو آج ہے اور کل خاک ہو جائے گا اس کی نسبت کیونکر گمان کر سکتے ہیں کہ اس کو

انسان کی **رُوح** پر رحم نہیں۔ پس اس نص قطعی اور یقینی سے ثابت ہے کہ **رُوح القدس** یا یوں کہو کہ اندرونی نگہبانی کا فرشتہ ہمیشہ نیک انسان کے ساتھ ایسا ہی رہتا ہے جیسا کہ اس کی بیرونی حفاظت کیلئے رہتا ہے۔ (آئینہ کمالات اسلام، روحانی خزائن جلد نمبر ۵ صفحہ ۷۵ تا ۷۸)

حضرت مسیح موعود علیہ السلام اس بارہ میں مزید بیان فرماتے ہیں کہ:

الغرض جیسا کہ ہم ابھی بیان کر چکے ہیں یہ بات نہایت احتیاط سے اپنے حافظہ میں رکھ لینی چاہئے کہ مقربوں کا روح القدس کی تاثیر سے علیحدہ ہونا ایک دم کے لئے بھی ممکن نہیں کیونکہ اُن کی نئی زندگی کی روح یہی روح القدس ہے پھر وہ اپنی روح سے کیونکر علیحدہ ہو سکتے ہیں۔ اور جس علیحدگی کا ذکر احادیث اور بعض اشارات قرآن کریم میں پایا جاتا ہے اُس سے مراد صرف ایک قسم کی تجلّی ہے کہ بعض اوقات بوجہ مصالح الٰہی اُس قسم کی تجلّی میں کبھی دیر ہو گئی ہے اور اصطلاح **قرآنِ کریم** میں اکثر نزول سے مراد وہی تجلّی ہے ورنہ ذرہ سوچنا چاہئے کہ جس آفتابِ صداقت کے حق میں یہ آیت ہے: وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى (النجم ۴،۵) یعنی اُس کا کوئی نطق اور کوئی کلمہ اپنے نفس اور ہوا کی طرف سے نہیں وہ تو سراسر وحی ہے جو اُس کے دل پر نازل ہو رہی ہے **اس کی نسبت** کیا ہم خیال کر سکتے ہیں کہ وہ مدتوں نورِ وحی سے بکلّی خالی ہی رہ جاتا تھا۔ مثلاً یہ جو منقول ہے کہ بعض دفعہ چالیس دن اور بعض دفعہ بیس دن اور بعض دفعہ اس سے زیادہ ساٹھ دن تک بھی وحی نازل نہیں ہوئی۔ اگر اس عدم نزول سے یہ مُراد ہے کہ فرشتہ جبرائیل بکلّی آنحضرت صلعم کو اِس عرصہ تک چھوڑ کر چلا گیا تو یہ سخت اعتراض پیش آئے گا کہ اس مدت تک جس قدر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے باتیں کیں کیا وہ احادیث نبویہ میں داخل نہیں تھیں اور کیا وحی **غیر متلو اُن کا نام** نہیں تھا اور کیا اِس عرصہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی خواب بھی نہیں آتی تھی جو بلاشبہ وحی میں داخل ہے **اور اگر حضرت بٹالوی صاحب اور میاں نذیر حسین دہلوی** سچے ہیں اور یہ بات صحیح ہے کہ ضرور مدتوں جبرائیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر بھی چلا جاتا تھا اور آنحضرت بکلّی وحی سے خالی رہ جاتے تھے تو بلاشبہ اُن دنوں کی احادیث ان دونوں **حضرتوں** کے نزدیک قابلِ اعتبار نہیں ہوں گی کیونکہ وحی کی روشنی سے خالی

ہیں اور اُن کے نزدیک اُن دنوں میں خوابوں کا سلسلہ بھی بکلّی بند تھا۔

اب **منصفو** دیکھو کہ کیا اِن دونوں **شیخوں** کی بے ادبی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت انتہا کو پہنچ گئی یا نہیں وہ **آفتابِ صداقت** جس کا کوئی دل کا خطرہ بھی بغیر وحی کی تحریک کے نہیں اُس کے بارے میں اِن لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ گویا وہ نعوذ باللہ مدتوں ظلمت میں بھی پڑا رہتا تھا اور اُس کے ساتھ کوئی روشنی نہ تھی۔ اِس عاجز کو **اپنے ذاتی تجربہ** سے یہ معلوم ہے کہ **رُوح القدس کی قدسیّت** ہر وقت اور ہر دم اور ہر لحظہ بلافصل ملہم کے تمام قُویٰ میں کام کرتی رہتی ہے اور وہ بغیر روح القدس اور اس کی تاثیر قدسیّت کے ایک دم بھی اپنے تئیں ناپاکی سے بچا نہیں سکتا اور انوار دائمی اور استقامت دائمی اور محبت دائمی اور عصمت دائمی اور برکات دائمی کا بھی سبب ہوتا ہے کہ روح القدس ہمیشہ اور ہر وقت اُن کے ساتھ ہوتا ہے پھر امام المعصومین اور امام المتبرکین اور سیّد المقربین کی نسبت کیونکر خیال کیا جائے کہ نعوذ باللہ کسی وقت ان تمام برکتوں اور پاکیزگیوں اور روشنیوں سے خالی رہ جاتے تھے افسوس کہ یہ لوگ حضرت عیسیٰ کی نسبت یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ تینتیس برس روح القدس ایک دم کے لئے بھی اُن سے جدا نہیں ہوا مگر اس جگہ اس قُرب سے منکر ہیں۔ (آئینہ کمالات اسلام، روحانی خزائن جلد نمبر ۵ صفحہ ۹۰ تا ۹۴ حاشیہ)

نیز فرماتے ہیں کہ:

اِن مولویوں نے بات بات میں حضرت عیسیٰ کو بڑھایا اور ہمارے سیّد و مولیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کی۔ غضب کی بات ہے کہ اِن کا عقیدہ حضرت مسیح کی نسبت تو یہ ہو کہ کبھی روح القدس اُن سے جدا نہیں ہوتا تھا اور مسِ شیطان سے وہ بری تھے اور یہ دونوں باتیں انہیں کی خصوصیت تھی لیکن ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت اِن کا یہ اعتقاد ہو کہ نہ روح القدس ہمیشہ اور ہر وقت اُن کے پاس رہا اور نہ وہ نعوذ باللہ نقلِ کفر کفر نباشد مسِ شیطان سے بری تھے۔ باوجود اِن باتوں کے یہ لوگ مسلمان کہلاویں اِن کی نظر میں ہمارے سیّد و مولیٰ **محمد صلی اللہ علیہ وسلم** مردہ مگر حضرت عیسیٰ اب تک زندہ۔ اور عیسیٰؑ کے لئے رُوح القدس دائمی رفیق مگر ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نعوذ باللہ اس نعمت سے بے بہرہ اور حضرت عیسیٰ مسِ شیطان سے محفوظ مگر ہمارے نبی

صلی اللہ علیہ وسلم محفوظ نہیں جن لوگوں کے یہ عقائد ہوں اُن کے ہاتھ سے جس قدر دین اسلام کو اس زمانہ میں نقصان پہنچ رہا ہے کون اِس کا اندازہ کرسکتا ہے یہ لوگ چھپے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن ہیں چاہئے کہ ہر یک مسلمان اور سچا عاشق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے پرہیز کرے سلف صالح کو سراسر شرارت کی راہ سے اپنے اقوال مردودہ کے ساتھ شامل کرنا چاہتے ہیں حالانکہ اپنی نابینائی کی وجہ سے سلف صالح کے اقوال کو سمجھ نہیں سکتے اور نہ احادیث نبویہ کی اصل حقیقت تک پہنچ سکتے ہیں صرف دھوکہ دینے کی راہ سے کہتے ہیں کہ اگر ہمارا یہ حال ہے تو یہی عقیدہ سلف صالح کا ہے۔

اے نادانو! یہ سلف صالح کا ہرگز طریقہ نہیں۔ اگر صحابہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت یہ اعتقاد رکھتے کہ کبھی یا مُدتوں تک آپ سے روح القدس جدا بھی ہوجاتا تھا تو وہ ہرگز ہر یک وقت اور ہر یک زمانہ کی احادیث کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اخذ نہ کرتے ان کی نظر تو اِس آیت پر تھی۔ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى (النجم:۴،۵)

اگر صحابہ تمہاری طرح مسِ شیطان کا اعتقاد رکھتے تو وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو **سید المعصومین** کیوں قرار دیتے خدا تعالیٰ سے ڈرو کیوں افترا پر کمر باندھی ہے۔

مصطفٰے را چوں فروتر شد مقام | از مسیحِ ناصری اے طفلِ خام
آنکہ دستِ پاک او دستِ خداست | چوں تواں گفتن کہ از روحش جداست
آنکہ ہر کردار و قولش دینِ ماست | یکدم از جبریل بُعدش چوں رواست
بر امامِ انبیاء ایں افترا | چوں نمے ترسید از قہرِ خدا

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت صحابہ کا بلا شبہ یہ اعتقاد تھا کہ آنجناب کا کوئی فعل اور کوئی قول وحی کی آمیزش سے خالی نہیں گو وہ وحی مجمل ہو یا مفصل۔ خفی ہو یا جلی۔ بیّن ہو یا مُشتبہ یہاں تک کہ جو کچھ آنحضرت صلعم کے خاص معاملات و مکالمات خلوت اور سرّ میں بیویوں سے تھے یا جس قدر اکل اور شرب اور لباس کے متعلق اور معاشرت کی ضروریات میں روزمرہ کے خانگی امور تھے سب اسی خیال سے احادیث میں داخل کیے گئے کہ وہ تمام کام اور کلام روح

القدس کی روشنی سے ہیں چنانچہ ابو داؤد وغیرہ میں یہ حدیث موجود ہے اور امام احمد بجید وسائط عبداللہ ابن عمر سے روایت کرتے ہیں کہ عبداللہ نے کہا کہ مَیں جو کچھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنتا تھا لکھ لیتا تھا تامیں اُس کو حفظ کرلوں۔ پس بعض نے مجھ کو منع کیا کہ ایسا مت کر کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بشر ہیں کبھی غضب سے بھی کلام کرتے ہیں تو مَیں یہ بات سن کر لکھنے سے دستکش ہو گیا۔ اور اس بات کا رسول اللہ صلعم کے پاس ذکر کیا۔ تو آپ نے فرمایا کہ اُس ذات کی مجھ کو قسم ہے جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ جو مجھ سے صادر ہوتا ہے خواہ قول ہو یا فعل وہ سب خدا تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ (آئینہ کمالات اسلام، روحانی خزائن نمبر جلد ۵ صفحہ ۱۱۲ تا ۱۱۳)

ایک کبوتر پالا تھا تا لوگ روح القدس سمجھیں

ایک پادری نے آنحضورﷺ پر یہ الزام لگایا کہ آپؐ نے ایک کبوتر پالا ہوا تھا تا لوگ سمجھیں کہ یہ روح القدس ہے جو وحی پہنچاتا ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام اس کے ردّ میں تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

’’اے پیارے دوستو! آپ لوگ اس قوم کو اور اس قوم کی جعلسازیوں کو خوب جانتے ہو کہ کہاں تک ان لوگوں کو جھوٹ کی بندشوں میں کمال ہے۔ پورت صاحب اپنی کتاب مؤید الاسلام میں پادریوں کی مکّاریاں نمونہ کے طور پر لکھتے ہیں۔ کہ ایک بزرگ پادری نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح میں ایک کتاب لکھی اور اس میں ایک موقعہ پر بیان کیا کہ گویا نعوذباللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کبوتر ہلایا ہوا تھا کہ وہ آنجناب کے کانوں پر آ کر اپنا منہ رکھ دیتا تھا اور یہ حرکت اس لئے سکھلائی گئی تا لوگ سمجھیں کہ یہ روح القدس ہے کہ وحی پہنچاتا اور خدا تعالیٰ کا پیغام لاتا ہے۔ مگر جب اس پادری کو لوگوں نے سخت پکڑا کہ یہ قصہ تو نے کہاں سے نقل کیا ہے تو اس نے صاف اقرار کیا کہ میں نے عمداً جھوٹ بنایا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس شریر پادری کو اس کبوتر کی نسبت شک ہوگا جو انجیل میں بیان کیا گیا ہے جو تمام عمر میں صرف ایک دفعہ حضرت مسیح پر نازل ہوا تھا۔ اور پھر کبھی منہ نہ دکھلایا اور کہتے ہیں کہ دراصل وہ کبوتر نہیں تھا بلکہ روح القدس تھا۔ خیر اس جھگڑے سے تو ہمیں کچھ علاقہ نہیں صرف یہ دکھلانا منظور ہے کہ اس

بدطینت پادری نے یہ افترا اُسی انجیلی قصہ کے تصور سے تراش لیا تھا اگر ایسا خیال حضرت عیسیٰ کی نسبت اس کو پیدا ہوتا تو کچھ بے جا نہ تھا۔ کیونکہ حضرت عیسیٰ کی نسبت ایسا بے ہودہ قصہ انجیلوں میں موجود ہے۔ جس کا کوئی ثبوت اب تک کسی عیسائی نے نہیں دیا اور نہ وہ کبوتر محفوظ رکھا۔ اور پادری صاحبوں کی جعلسازیاں صرف اسی پر بس نہیں بلکہ یہ وہی حضرات ہیں جنہوں نے کئی جعلی انجیلیں بنا ڈالیں اور خدا تعالیٰ پر بھی افترا کرنے سے نہ ڈرے۔ ابھی حال میں ایک نئی انجیل کسی بزرگ عیسائی نے تبت کے ملک سے برآمد کی ہے جس کی بہت جوش سے خریداری ہو رہی ہے اور ان میں سے ایک بڑے مقدس کا یہ قول ہے کہ دین کی ترقی اور حمایت کے لئے جھوٹ بولنا نہ صرف جائز بلکہ ذریعہ نجات ہے اس قوم کا جھوٹ سے پیار کرنا اپریل فول کی رسم سے بھی ثابت ہوتا ہے۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ اگر اپریل کی تحریروں اور اخباروں میں خلاف واقعہ باتیں اور خلاف قیاس امور شائع کئے جائیں تو کچھ مضائقہ نہیں۔ اس سے یقین ہوتا ہے کہ غالباً بہت سا حصہ انجیل کا اپریل میں ہی لکھا گیا ہے اور یقیناً تثلیث کے مسئلہ کی جڑ بھی یہی مہینہ ہے جس میں بے دھڑک جھوٹ بولا جاتا ہے اور خلاف قیاس باتیں شائع کی جاتی ہیں۔ غرض ان لوگوں کے نزدیک کسی ضرورت کے وقت جھوٹ کا استعمال کرنا کچھ کراہت کی بات نہیں، جب دیکھتے ہیں کہ کوئی پردہ دری ہونے لگی ہے تو فی الفور جھوٹ سے کام لیتے ہیں“۔

(ضیاءالحق، روحانی خزائن جلد ۹ صفحہ ۲۹۸، ۲۹۹)

شیطانی وحی کا الزام

سورۃ الشعراء آیت ۲۱۱ تا ۲۱۴ کی تفسیر میں حضرت مصلح موعودؓ آنحضرتؐ پر شیطانی وحی کے اعتراض کی تردید کرتے ہوئے بیان فرماتے ہیں:

”ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے کفار کے ایک اعتراض کی تردید فرمائی ہے ان کا اعتراض یہ تھا کہ اس شخص کے ساتھ شیطان کا تعلق ہے اور اس کی طرف سے اس پر کلام نازل ہوتا ہے۔ چنانچہ کو قرآن کریم نے ان کے اس اعتراض کی طرف قرآن کریم کے مختلف

مقامات میں اشارات ضرور پائے جاتے ہیں۔مثلاً اللہ تعالیٰ سورۂ تکویر میں فرماتا ہے۔ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ۔ (التکویر:۲۶) یعنی اس رسول ﷺ پر نازل ہونے والا کلام کسی دھتکارے ہوئے شیطان کا قول نہیں۔اسی طرح زیرِتفسیر آیات میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔وَمَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيٰطِيْنُ شیطانوں نے اس کلام کونہیں اُتارا۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار کا ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ اس پر شیطان نازل ہوتا ہے افسوس ہے کہ بعض مسلمان مفسرین نے اس قول کواور بھی پکا کردیا اور کفار کے ہاتھوں میں انہوں نے ایک خطرناک ہتھیار دے دیا اور وہ اس طرح کہ وہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ کفارِ مکہ کے سردار رسول کریم ﷺ کے پاس آئے اور انہوں نے کہا کہ آپؐ کے ماننے والے تو ادنیٰ لوگ ہیں۔اگر آپؐ دین میں کچھ نرمی کردیں تو ہم لوگ بھی آپؐ کے پاس آ کر بیٹھا کریں۔اسی طرح دوسرے لوگ بھی آپؐ کے پاس آنے لگیں گے۔اتنے میں آپ نماز پڑھنے لگے۔جب آپؐ نے یہ آیت پڑھی کہ اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى کہ تم بھی ذرا لات اور عزّٰی کا حال سناؤ اور تیسرے مناۃ کا بھی جوان کے علاوہ ہے۔تو شیطان نے آپ کی زبان پر یہ کلمات جاری کردیئے کہ تِلْكَ الْغَرَانِيْقُ الْعُلٰى وَاِنَّ شَفَاعَتَهُنَّ لَتُرْتَجٰى ۔یعنی یہ لمبی گردنیں رکھنے والے بت بڑی اعلیٰ شان کے مالک ہیں اوران کی شفاعت کی یقینی طور پر امید کی جاسکتی ہے۔کفار نے یہ بات سنی تو وہ بڑے خوش ہوئے۔چنانچہ جب آپؐ نے سورۃ ختم کی اور سجدہ کیا تو سب کفار نے بھی آپؐ کے ساتھ سجدہ کردیا۔کیونکہ انہوں نے سمجھا کہ آپؐ نے دین میں نرمی کردی ہے۔اس روایت کو اتنے طریقوں سے بیان کیا گیا ہے کہ ابن حجرؒ جیسے آدمی بھی کہتے ہیں کہ اس کی تاویل کی ضرورت ہے۔میں اس وقت اس کی تاویل میں نہیں پڑتا کیونکہ اس پر تفصیلی بحث سورۃ حج میں گزر چکی ہے۔میں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ کیا واقعہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسا ہوا۔ مجھے قاضی عیاض کا یہ قول بے انتہا پسند ہے کہ بعض محدثین کی قلم سے شیطان نے یہ حدیث لکھوا دی ہے گویا اگر شیطان کا تسلط تسلیم ہی کرنا ہے تو کیوں نہ اس کا تسلط محدثین پر تسلیم

کرلیا جائے۔ یہ تو قاضی عیاض کا جواب ہے۔ قرآنی جواب یہ ہے کہ تِلْكَ الْغَرَانِيْقُ الْعُلٰى وَاِنَّ شَفَاعَتَهُنَّ لَتُرْتَجٰى کا فقرہ جہاں جہاں بیان کیا جاتا ہے۔ اس کے معاً بعد یہ آیت آتی ہے کہ اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى ۝ تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى ۝ اِنْ هِيَ اِلَّآ اَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ (النجم:۲۲-۲۴) یعنی کیا تمہیں تو اپنے لئے بیٹے پسند اور خدا تعالیٰ کے لئے تم لڑکیاں تجویز کر رہے ہو۔ یہ تقسیم تو نہایت ہی ناقص اور ظالمانہ تقسیم ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ صرف چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے رکھ لئے ہیں ورنہ اللہ تعالیٰ نے ان بتوں کی تائید کے لئے کوئی دلیل نازل نہیں کی۔ اب بتاؤ کہ کیا اس فرضی کلام کے بعد جو محمد رسول اللہؐ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے کوئی شخص ان آیتوں کا منکر یہ خیال بھی کرسکتا تھا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عقائد میں نرمی اختیار کرلی ہے اور اس پر کوئی بے وقوف سے بے وقوف مشرک بھی سجدہ کرسکتا تھا۔ پس یہ آیات ہی بتا رہی ہیں کہ ان میں وہ فقرے داخل ہی نہیں ہوسکتے تھے جو بتوں کی تعریف میں بیان کئے جاتے ہیں۔ آخر کفار عربی تو جانتے تھے کیا وہ اتنا بھی نہیں سمجھ سکتے تھے کہ اس سورۃ کے تو لفظ لفظ میں شرک کی مذمت کی گئی ہے پھر یہ کس طرح کہا جاسکتا ہے کہ آپؐ نے اپنے دینی عقائد میں نرمی اختیار کرلی ہے۔ یہی مضمون زیر تفسیر آیات میں بیان کیا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ کفار کا یہ الزام کہ اس شخص پر شیطان کلام نازل کرتا ہے درست نہیں کیونکہ (الف) اس شخص کا اپنا چال چلن ایسا اعلیٰ اور پاکیزہ ہے کہ ایسے آدمیوں کا شیطان سے کوئی تعلق ہو ہی نہیں سکتا۔ (ب) پھر جو تعلیم اس پر نازل ہوئی ہے وہ ایسی مطہر اور پاک ہے کہ ناپاک شیطان اس تعلیم کو اتار ہی نہیں سکتا۔ آخر یہ کس طرح ممکن ہے کہ شیطان کے خلاف تعلیم ہے۔ تو یہ کلام اس کی طرف سے کیسے نازل ہوسکتا ہے۔ (ج) اس کتاب میں آسمانی علوم ہیں اور اس میں شیطانی کلام کا اس قدر ردّ ہے کہ اگر شیطان یا اس کے ساتھی اس میں کچھ ملانا بھی چاہیں تو نہیں ملا سکتے کیونکہ کہیں کوئی عبارت چھپ ہی نہیں سکتی اور پھر وہ آسمانی علوم

کے بیان کرنے کی طاقت بھی نہیں رکھتے کیونکہ اِنَّھُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ خدا تعالیٰ نے انہیں آسمان کی باتیں سننے سے محروم کیا ہوا ہے گویا آسمان پر جا کر باتیں سننا تو الگ رہا وہاں تک کسی کے جانے کی طاقت بھی قرآن کریم نے تسلیم نہیں کی مگر عجیب بات یہ ہے کہ بعض مسلمان یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ شیطان آسمان پر جاتا ہے اور وہ ملاء اعلیٰ اور جبریلؑ اور عرش کی باتوں کو سن کر زمین پر آ جاتا ہے اور پھر وہ اپنے چیلے چانٹوں کو وہ خبریں بتاتا پھرتا ہے۔ حالانکہ خدا تعالیٰ یہ فرماتا ہے کہ شیطان آسمانی کلام سننے کی طاقت ہی نہیں رکھتا۔ خدا تو خدا ہے۔ اس دنیا کی معمولی معمولی بادشاہوں کے پاس بھٹکنے کی بھی لوگوں میں طاقت نہیں ہوتی اور وہ ان کے قریب جانے سے لرزتے اور گھبراتے ہیں۔ پھر یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ زمین و آسمان کے خدا کے راز شیطان اچک کر لے آئے۔ اور وہ انہیں بگاڑ کر دنیا میں پھیلانا شروع کر دے۔ غرض قرآن کریم کفار کے اس الزام کی تردید کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ شیاطین نے اس کلام کو نازل نہیں کیا اور یہ کام نہ ان کے مناسب حال تھا اور نہ وہ اس کی طاقت رکھتے تھے۔ یعنی قرآن کریم میں تو وہ وہ نصیحتیں ہیں جو شیطانی تعلیموں کے بالکل خلاف ہیں۔ پھر یہ کس طرح تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ شیطان نے خود اپنے خلاف محمد رسول اللہؐ پر تعلیم نازل کر دی۔ یہ دلیل حضرت مسیحؑ نے بھی انجیل میں استعمال کی ہے۔ چنانچہ لکھا ہے کہ:

''پھر وہ ایک گونگی بد روح کو نکال رہا تھا۔ اور جب وہ بد روح نکل گئی تو ایسا ہوا کہ گونگا بولا اور لوگوں نے تعجب کیا لیکن ان میں سے بعض نے کہا۔ یہ تو بد روحوں کے سردار بعلزبول کی مدد سے بد روحوں کو نکالتا ہے۔ بعض اور لوگ آزمائش کے لئے اس سے آسمانی نشان طلب کرنے لگے۔ مگر اس نے ان کے خیالات کو جان کر ان سے کہا جس سلطنت میں پھوٹ پڑے وہ ویران ہو جاتی ہے اور جس گھر میں پھوٹ پڑے وہ برباد ہو جاتا ہے اور اگر شیطان بھی اپنا مخالف ہو جائے تو اس کی سلطنت کس طرح قائم رہے گی کیونکہ تم میری بابت کہتے ہو کہ یہ بد روحوں کو بعلزبول کی مدد سے نکالتا ہے۔'' (لوقا باب ۱۱ آیت ۱۴ تا ۱۸)

اسی طرح متی میں لکھا ہے کہ حضرت مسیحؑ نے ان سے کہا۔ ''اگر شیطان ہی نے

شیطان کو نکالا تو وہ آپ اپنا مخالف ہوگیا ۔پھر ان کی بادشاہی کس طرح قائم رہے گی ۔“

(متی باب ۱۲ تا ۲۶)

قرآن کریم بھی یہی دلیل مخالفوں کے سامنے پیش کرتا ہے ۔اور انہیں توجہ دلاتا ہے کہ اگر تمہارا یہ اعتراض صحیح ہو کہ شیطان نے یہ کلام نازل کیا ہے تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ شیطان نے اپنا بیڑا آپ غرق کرلیا ۔کیونکہ اس کتاب کے لفظ لفظ میں شیطان کو دھتکارا گیا ہے اور اس کی ایک ایک تعلیم میں اس پر پھٹکار ڈالی گئی ہے ۔اب یہ کس طرح تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ شیطان نے خود اپنے خلاف اتنا بڑا مواد فراہم کردیا ۔یہ تو عقل کے بالکل خلاف ہے ۔

اسی طرح وَمَا یَسْتَطِیْعُوْنَ میں جو دلیل استعمال کی گئی ہے کہ اس قرآن میں تو غیب کی خبریں ہیں اور غیب کی خبریں بیان کرنا شیطان کے اقتدار سے باہر ہے ۔اسے بھی انجیل میں استعمال کیا گیا ہے اور حضرت مسیحؑ نے واضح کیا ہے کہ علم غیب صرف خدا تعالیٰ کو حاصل ہے اور شیاطین تو الگ رہے فرشتے بھی اس کے رازوں سے آگاہ نہیں چنانچہ ایک دفعہ حضرت مسیحؑ نے جب اپنی آمد ثانی کی علامات بتائیں تو اس کے ساتھ ہی آپ نے اس امر کی بھی وضاحت فرمادی کہ کو میری یہ باتیں کبھی نہیں ٹلیں گی ۔”لیکن اس دن اور اس گھڑی کی بابت کوئی نہیں جانتا ۔نہ آسمان کے فرشتے نہ بیٹا مگر صرف باپ ۔جیسا نوح کے دنوں میں ہوا ویسا ہی ابن آدم کے آنے کے وقت ہوگا ۔کیونکہ جس طرح طوفان کے پہلے سے دنوں میں لوگ کھاتے پیتے اور بیاہ شادی کرتے تھے اس دن تک کہ نوح کشتی میں داخل ہوا ۔اور جب تک طوفان آکران سب کو بہانہ لے گیا ان کو خبر نہ ہوئی اسی طرح ابن آدم کا آنا ہوگا ۔“ (لوقا باب ۲۴ آیت ۳۶ تا ۴۰)

غرض محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک اور بے عیب زندگی اور آپ کی تعلیم کا پاک اور مطہر ہونا اور پھر قرآن کریم میں آسمانی علوم اور غیب کی خبروں کا بکثرت اظہار اور شیاطین کا آسمانی علوم کے بیان کرنے کی طاقت ہی نہ رکھنا بتا رہا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جو یہ الزام لگایا جارہا ہے کہ آپؐ کے ساتھ شیطان کا تعلق ہے اور اس نے آپؐ پر یہ کلام نازل کردیا ہے سراسر غلط اعتراض ہے ۔محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا شیطان سے نہیں خدا سے تعلق

ہے اور اسی نے آپؐ پر یہ کلام نازل فرمایا ہے۔" (تفسیر کبیر جلد ۷ص ۲۷۴ تا ۲۷۷)

☆

اس اعتراض کے ردّ میں حضرت مصلح موعودؓ ایک دوسرے مقام پر فرماتے ہیں:

"اعتراض یہ تھا کہ اس کے ساتھ شیطان کا تعلق ہے اور اس کی طرف سے اسے کلام حاصل ہوتا ہے اور گو کفار کا کوئی قول اس اعتراض کے متعلق نقل نہیں کیا گیا مگر اس اعتراض کے اشارے ضرور پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَمَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيٰطِيْنُ (الشعراء:۲۱۱) شیطان اس کلام کو لے کر نہیں اترے۔ اسی طرح فرماتا ہے۔ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ۔ (التکویر:۲۶) یہ شیطان رجیم کا قول نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار کا یہ بھی اعتراض تھا کہ اس پر شیطان اترتا ہے۔ افسوس ہے کہ مسلمانوں نے اس اعتراض کو اور پکا کر دیا ہے اور کفار کے ہاتھ میں ایک ہتھیار دے دیا ہے۔ وہ اس طرح کہ وہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ کفار مکہ کے سردار جمع ہو کر رسول کریم ﷺ کے پاس آئے اور کہا کہ آپ کے پاس ادنیٰ درجہ کے لوگ آتے ہیں اور بڑے لوگ آپ کی باتیں نہیں سنتے۔ اگر آپ دین میں کچھ نرمی کر دیں تو ہم لوگ آپ کے پاس آ کر بیٹھا کریں۔ اس طرح دوسرے لوگ بھی آپ کے پاس آنے لگیں گے۔ اس پر رسول کریم ﷺ کو خیال آیا کہ اگر ایسا کر دیا جائے تو پھر بڑے بڑے لوگ مان لیں گے۔ (مجھے کیا ہی لطف آیا اس شخص کے اس فقرہ سے جس کا نام نولڈ کے ہے۔ وہ لکھتا ہے "معلوم ہوتا ہے یہ روایت بنانے والے محمد (ﷺ) کو اپنے جیسا ہی بیوقوف سمجھتے تھے۔") غرض رسول کریم ﷺ کو نعوذ باللہ دین میں نرمی کرنے کا خیال آیا۔ اتنے میں آپ نماز پڑھنے لگے اور سورۃ نجم پڑھنی شروع کی۔ اس وقت شیطان نے اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى۔ وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى (النجم:۲۰،۲۱) کے بعد یہ کلمات آپ کی زبان پر جاری کر دیئے کہ وَتِلْكَ الْغَرَانِيْقُ الْعُلٰى وَ اِنَّ شَفَاعَتَهُنَّ لَتُرْتَجٰى کیا تم نے لات اور عزّیٰ اور منات کی حقیقت نہیں دیکھی۔ یہ بہت خوبصورت دیویاں ہیں اور ان کی شفاعت کی بڑی امید ہے۔ چونکہ سورۃ نجم کے آخر میں سجدہ آتا ہے۔ رسول کریم ﷺ نے سجدہ کیا تو سب کفار نے بھی آپ کے ساتھ سجدہ کر دیا کیونکہ

انہوں نے سمجھ لیا کہ آپ نے دین میں نرمی کر دی ہے اور بتوں کو مان لیا ہے۔اس روایت کو اتنے طریقوں سے بیان کیا گیا ہے کہ ابن حجر جیسے آدمی کہتے ہیں کہ اس کی تاویل کی ضرورت ہے۔گو تاریخی طور پر یہ روایت بالکل غلط ہے اور میں ثابت کر سکتا ہوں کہ یہ محض جھوٹ ہے۔مگر اس وقت میں کسی تاویل میں نہیں پڑتا میں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ قرآن اس کے متعلق کیا کہتا ہے اور کیا واقعہ میں رسول کریم ﷺ سے ایسا ہوا؟ اس موقع پر میں ایک مسلمان بزرگ کا قول بھی بیان کرتا ہوں جو مجھے بے انتہا پسند ہے۔میں تو جب بھی یہ قول پڑھتا ہوں ان کے لئے دعا کرتا ہوں۔یہ بزرگ قاضی عیاض ہیں۔وہ فرماتے ہیں شیطان نے رسول کریم ﷺ پر تو کوئی تصرف نہیں کیا البتہ بعض محدثین کے قلم سے شیطان نے یہ روایت لکھوا دی ہے۔گویا اگر شیطان کا تسلط کسی پر کرانا ہی ہے تو کیوں نہ محدثین پر کرایا جائے۔رسول کریم ﷺ کو درمیان میں کیوں لایا جائے۔بعض نادان کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے سورۃ نجم پڑھتے ہوئے یہ آیتیں بھی پڑھ دیں۔اس پر جبریل نازل ہوا اور اس نے کہا آپؐ نے یہ کیا کیا۔میں تو یہ آیتیں نہیں لایا تھا۔یہ تو شیطان نے جاری کی ہیں۔یہ معلوم کر کے رسول کریم ﷺ کو سخت فکر ہوا۔خدا تعالیٰ نے اس فکر کو یہ کہہ کر دور کر دیا کہ:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ ۚ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِى الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (الحج:۵۳)

فرمایا تم سے پہلے بھی کوئی نبی اور رسول ایسا نہیں بھیجا گیا کہ جب اس کے دل میں کوئی خواہش پیدا ہوئی ہو تو شیطان نے اس میں دخل نہ دے دیا ہو۔پھر اللہ تعالیٰ شیطان کی بات کو مٹا دیتا ہے اور جو اس کی اپنی طرف سے ہوتی ہے اسے قائم رکھتا ہے۔کہتے ہیں جب یہ آیت اللہ تعالیٰ نے نازل کی تو رسول کریم ﷺ کی تسلی ہو گئی۔تسلی کس طرح ہوئی اسی طرح جس طرح اس بڑھیا عورت کی ہو گئی تھی جس سے کسی نے پوچھا کہ کیا تم یہ چاہتی ہو کہ تمہارا کبڑا پن دور ہو جائے یا یہ کہ دوسری عورتیں بھی تمہاری طرح کبڑی ہو جائیں۔اس نے کہا مجھ پر تو دوسری عورتوں نے

جس قدر ہنسی کرنی تھی کر لی ہے اب باقی عورتیں بھی کُبڑی ہو جائیں تا کہ میں بھی ان پر ہنسوں۔ اس روایت کو درست قرار دینے والوں کے نزدیک رسول کریم ﷺ کی کس طرح تسلی ہوئی۔ اس طرح کہ خدا تعالیٰ نے آپ کو کہہ دیا کہ تم پر ہی شیطان کا قبضہ نہیں ہوا سب نبیوں پر ہوتا چلا آیا ہے۔ یہ سن کر رسول کریم ﷺ کا فکر دور ہو گیا۔ کتنی نامعقول بات ہے ان لوگوں نے کبھی اتنا بھی نہ سوچا کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَاللّٰہُ عَلِیْمٌ حَکِیْمٌ اللہ تعالیٰ جاننے والا اور حکمت والا ہے۔ کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ شیطان کا ہر نبی اور رسول پر قبضہ پالینا بڑی حکمت کی بات ہے اور پھر علیم کا اس کے ساتھ کیا تعلق ہے۔ میں بیان کر رہا تھا کہ ایک بزرگ کے قول سے مجھے بڑا مزا آتا ہے۔ ان کا نام قاضی عیاض ہے۔ وہ اس قسم کی روایتیں نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ان سے یہ تو پتہ لگ گیا کہ شیطان کا تصرّف ہوا مگر رسول کریم ﷺ پر نہیں بلکہ ان روایتوں کو نقل کرنے والوں کی قلموں پر ہوا ہے۔ یہ بہت ہی لطیف بات ہے۔

قرآن کریم نے اس کا جو جواب دیا ہے وہ اسی جگہ موجود ہے جہاں کہتے ہیں کہ شیطان نے آیتیں نازل کیں یعنی تِلْکَ الْغَرَانِیْقُ الْعُلٰی۔ وَاِنَّ شَفَاعَتَھُنَّ لَتُرْتَجٰی کے بعد کہتے ہیں کہ یہ آیات اتریں:۔

اَلَکُمُ الذَّکَرُ وَلَہُ الْاُنْثٰی ۝ تِلْکَ اِذًا قِسْمَۃٌ ضِیْزٰی ۝ اِنْ ھِیَ اِلَّآ اَسْمَآءٌ سَمَّیْتُمُوْھَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُکُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰہُ بِھَا مِنْ سُلْطٰنٍ

(النجم:۲۲تا۲۴)

فرمایا کیا تم اپنے لئے تو بیٹے قرار دیتے ہو اور خدا کے لئے لات، منات اور عزّیٰ بیٹیاں۔ یہ کس قدر بھونڈی تقسیم ہے جو تم نے کی۔ یہ نام تم نے اپنے طور پر رکھ لئے ہیں۔ خدا کی طرف سے نازل نہیں ہوئے۔ خدا نے تو ان بتوں کے لئے اتارا ہی کچھ نہیں۔ کیا ان آیات کے بعد کوئی شخص ان فقروں کو درمیان میں شامل سمجھ سکتا ہے۔ پس یہ آیات ہی بتا رہی ہیں کہ ان میں وہ فقرے داخل نہیں ہو سکتے۔ آخر کار عربی تو جانتے تھے۔ اس کے علاوہ مندرجہ ذیل آیتیں بھی اس حصہ کو رد کر رہی ہیں۔ فرمایا:

وَمَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيٰطِيْنُ ۝ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهُمْ وَمَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ۝

(الشعراء:۲۱۱تا۲۱۲)

یعنی اس میں شیطانی کلام کا اس قدر ردّ ہے کہ اسے شیطان اتار ہی کس طرح سکتا ہے۔ پھر اگر شیطان یا اس کے ساتھی اس میں کچھ ملانا چاہیں تو ملا ہی نہیں سکتے۔ کہیں کوئی عبارت کھپ ہی نہیں سکتی۔ جو کچھ ملائیں گے بے جوڑ ہوگا۔ جیسا کہ یہاں ہوا ہے۔ پھر آگے چل کر فرماتا ہے:

هَلْ اُنَبِّئُكُمْ عَلٰى مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيٰطِيْنُ ۝ تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ ۝ يُّلْقُوْنَ السَّمْعَ وَاَكْثَرُهُمْ كٰذِبُوْنَ ۝

(الشعراء:۲۲۲تا۲۲۴)

کیا میں تمہیں بتاؤں کہ شیطان کس طرح اترتے ہیں۔ شیطان کا تعلق ہر آفاق اور اثیم کے ساتھ ہوتا ہے۔ یعنی جو بڑا جھوٹ بولنے والا اور گناہگار ہو اس سے شیطان کا تعلق ہوتا ہے۔ مگر محمد رسول اللہ ﷺ کے متعلق تو تم خود کہتے ہو کہ اس سے بڑھ کر سچا اور کوئی نہیں۔ اس کے امین ہونے کے بھی تم قائل ہو پھر اس پر شیطان کا تصرّف کس طرح ہوسکتا ہے۔ پھر فرماتا ہے:

اِلٰٓى اَوْلِيٰٓـِٕهِمْ لِيُجَادِلُوْكُمْ ۚ وَاِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ

(الانعام:۱۲۲)

کہ شیطان تو اپنی وحی شیطانوں کی طرف کرتا ہے تاکہ وہ تم سے جھگڑیں۔ مومنوں کی طرف نہیں کرتا۔ اب دیکھو وہ روایتیں جو بیان کی جاتی ہیں رسول کریم ﷺ پر کیسا خطرناک الزام لگاتی ہیں۔ شیطان تو اپنے دوست کو ہی کہے گا کہ یہ ہتھیار لے جا اور لڑ۔ کسی مسلمان کو وہ اپنے خلاف کس طرح بتائے گا۔ اسی طرح سورۃ نحل رکوع ۱۳ میں آتا ہے:۔

اِنَّهٗ لَيْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝
اِنَّمَا سُلْطٰنُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يَتَوَلَّوْنَهٗ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِهٖ مُشْرِكُوْنَ ۝

(النحل:۱۰۰،۱۰۱)

یعنی شیطان کا مومنوں پر کوئی تسلط نہیں ہوسکتا جو خدا پر توکل رکھتے ہیں۔ شیطان کی حکومت تو انہی پر ہوتی ہے جو اس کے دوست ہوتے ہیں اور اس کے ساتھ شرک کرتے ہیں۔ محمد ﷺ تو

ساری عمر شرک کارڈ کرتے رہے۔ان سے شیطان کا کیا تعلق ہو سکتا ہے۔"

(انوار العلوم جلد۱۲ صفحہ ۴۴۹ تا ۴۵۴)

کفار کا اعتراض کہ اللہ ہم سے ہم کلام کیوں نہیں ہوتا صرف آپؐ سے کیوں؟

سورۃ البقرہ کی آیت ۱۱۹ کی تفسیر میں حضرت مصلح موعود بیان فرماتے ہیں:

"بعض لوگ اپنی نادانی سے یہ خیال کرتے ہیں کہ خدا تعالیٰ بغیر کسی حکمت کے یونہی ایک شخص کو نبی بنا کر بھیج دیتا ہے اور وہ انتخاب میں کسی اہلیت کو مدنظر نہیں رکھتا۔اور پھر اس غلط خیال کے نتیجے میں یہ کہنا شروع کر دیتے ہیں کہ خدا تعالیٰ ہمیں براہ راست کیوں حکم نہیں دے دیتا کہ ایسا کرو۔اور ایسا نہ کرو تا کہ کوئی جھگڑا ہی پیدا نہ ہو۔آخر اس کی کوئی وجہ ہونی چاہئے کہ وہ ہم سے کیوں کلام نہیں کرتا۔اور اگر ہم اس بات کے مستحق نہیں کہ خدا تعالیٰ ہمارے ساتھ باتیں کرے تو کم از کم یہ تو ہونا چاہئے تھا کہ کوئی دلیل ہی مہیا کر دی جاتی جس کی وجہ سے ہم اسے مجبوراً مان لیتے۔

میری تحقیق یہ ہے کہ قرآن کریم میں جہاں بھی کفار کے آیت طلب کرنے کا ذکر آتا ہے وہاں اس سے مراد ہمیشہ عذاب ہی ہوتا ہے۔بشرطیکہ اس کے خلاف وہاں کوئی قرینہ موجود نہ ہو۔چنانچہ وہ تمام مقامات جہاں کفار کی طرف سے آیت کا مطالبہ کیا گیا ہے ان پر غور کر کے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ہر جگہ آیت سے مراد عذاب ہی ہوتا ہے۔اس جگہ بھی یہی مراد ہے کہ یا تو اللہ تعالیٰ کا کلام ہم پر نازل ہوتا اور ہم اسے مان لیتے کیونکہ اگر یہ اس کا بندہ ہے تو ہم بھی اسی کے بندے ہیں۔پھر اس میں اور ہم میں کیا فرق ہے۔اور اگر یہ کہو کہ تم اس کے بندے تو ہو مگر تم عذاب کے مستحق ہو تو ایسی صورت میں ہم پر عذاب نازل ہونا چاہئے۔گویا دو صورتوں میں سے ایک صورت ضرور ہونی چاہئے۔اگر ہم اس کے بندے ہیں تو ہم پر بھی کلام نازل ہونا چاہئے اور اگر کہو کہ تم گندے ہو گئے ہو تو پھر ہمیں ہلاک کر دینا چاہئے۔لیکن اگر وہ ہمیں ہلاک بھی نہیں کرتا

تو اس کے معنے یہ ہیں کہ ہم گندے نہیں اس لئے ہم پر بھی کلام نازل ہونا چاہئے۔ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کو ہم پر کیا فضیلت حاصل ہے کہ صرف اسی پر کلام نازل ہوتا ہے۔

كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِن قَبْلِهِمْ۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اسی طرح ان لوگوں نے بھی جو ان سے پہلے گزرے ہیں کہا تھا اور بالکل ان کی بات کے مشابہ کہا تھا۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ تمام انبیاء کے مقابلہ میں ایک ہی قسم کے اعتراض ہوتے چلے آئے ہیں...... اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر ان کا اعتراض صحیح ہے تو پھر تمام انبیاء کی نبوتیں باطل ٹھہرتی ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب دعویٰ کیا تھا کہ ان کو الہام ہوتا ہے تو اس وقت اوروں کو الہام نہیں ہوا بلکہ صرف موسیٰ علیہ السلام کو ہوا۔ پھر باقی لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے یکدم تباہ بھی نہیں کیا۔ ہاں حجت کے بعد وہ ہلاک ہوئے اور وہ بھی آہستہ آہستہ۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جب الہام ہوا تو ان کے زمانہ میں بھی باقی لوگوں کو الہام نہیں ہوا اور پھر باقی لوگوں کو یکدم تباہ بھی نہیں کیا گیا۔ پس اگر یہ دلیل صحیح ہے کہ یا تو اللہ تعالیٰ ہم پر الہام نازل کرے اور اگر ہم الہام کے مستحق نہیں تو ہمیں تباہ کردے۔ تو اس دلیل کو پہلوں پر چسپاں کر کے دیکھ لو کہ کیا یہ صحیح قرار پاتی ہے یا غلط؟ اور اگر تمہاری یہ دلیل پہلوں پر چسپاں نہیں ہوتی تو معلوم ہوا کہ تمہارا یہ مطالبہ منہاج نبوت کے خلاف ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ جب کسی شخص سے کوئی جواب بن نہ آئے تو وہ آگے سے ایسا عذر تلاش کرتا ہے جس پر بحث ختم ہو کر اس کا پیچھا چھوٹے۔ سچے نبیوں کے مقابلہ میں ہمیشہ سے یہ طریق اختیار کیا جاتا رہا ہے۔ جب ان کے مخالفوں کو ان سے بحث کرنے میں ندامت ہوئی ہے تو فوراً انہوں نے ایسے مطالبات پیش کر دیئے ہیں کہ جن کی نسبت ان کو یقین تھا کہ ایک یا دوسری وجہ سے ان کا پورا ہونا ناممکن ہے۔ کبھی تو سنت اللہ کے خلاف کسی بات کا مطالبہ کر دیتے، کبھی کسی دیر میں ہونے والی بات کو فوراً پورا کرنے کا مطالبہ کرتے۔ کبھی ایسے امر کا مطالبہ کرتے جو خلاف شان الٰہی ہوتا اور پھر علاوہ اس قسم کے مطالبات کے یہ جواب بھی دیا کرتے کہ اچھا ہم لوگ جھوٹے ہیں تو عذاب الٰہی کیوں نہیں آتا۔ ہم پر عذاب الٰہی نازل ہو تب ہم مانیں گے ورنہ نہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی اس سلوک میں دوسرے نبیوں سے مستثنیٰ نہ تھے بلکہ جس قدر آپؐ کا درجہ بلند تھا اسی قدر آپؐ سے آپؐ کے دشمنوں نے زیادہ غیر معقولیت کے ساتھ معاملہ کیا۔ جب ان کو کوئی جواب نہ آتا تو قسم قسم کے سوال کرتے جن میں سے دو اس جگہ بیان کئے گئے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اگر سچے ہو تو خدا تعالیٰ ہم سے خود کلام کرے اور ہم سے کہے کہ یہ شخص سچا ہے اس کو مان لو۔ حالانکہ خدا تعالیٰ نے کبھی کسی نبی کے زمانہ میں یہ نہیں کیا کہ ملک کے ہر آدمی کو الہام ہوا ہو کہ فلاں شخص سچا ہے اسے مان لو۔ یہ تو ہو جاتا ہے کہ بعض اشخاص کو خدا تعالیٰ رؤیا اور کشوف کے ذریعہ بتا دیتا ہے کہ یہ مامور سچا ہے۔ مگر سب لوگوں کو بتانا اس کی سنت کے خلاف ہے اور جن کو بتاتا ہے ان کی شہادت سے لوگ فائدہ نہیں اٹھاتے بلکہ ان پر بھی الزام لگا دیتے ہیں کہ یہ بھی منصوبوں میں شامل ہیں۔ پھر سب کو الہام ہونا اس لئے بھی بے فائدہ ہے کہ ایمان تبھی مفید ہوتا ہے جبکہ وہ انسان کو کوشش سے حاصل ہو۔ اگر خدا تعالیٰ کا کلام سب پر نازل ہو تو پھر ایمان کا کوئی فائدہ نہیں رہتا۔ اور انسان کی پیدائش کی اصل غرض فوت ہو جاتی ہے اور دوسری مخلوق اور انسان میں کچھ فرق نہیں رہتا۔ پس فرمایا کہ یہ لوگ سنت اللہ سے واقف نہیں اور نہیں جانتے کہ ایمان کس صورت میں نافع ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ ہم سے کلام کرے حالانکہ ایسا مطالبہ ہے جو پہلے نبیوں سے بھی ہوتا رہا ہے۔ جن کو یہ مانتے ہیں لیکن انہوں نے اسے پورا نہیں کیا۔ پھر اس نظیر کے موجود ہوتے ہوئے اس رسول سے کیوں ایسا مطالبہ کرتے ہیں۔ درحقیقت اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے دل پہلے انبیاء کے منکرین کے دلوں کے مشابہ ہو گئے ہیں۔

دوسرا مطالبہ یہ بیان کیا کہ ہمیں کوئی آیت دکھاؤ اس کا جواب یہ دیا کہ ایسی آیات تو ہم دکھا چکے ہیں جن سے اگر کوئی فائدہ اٹھانے والا انسان ہو تو فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ لیکن جن لوگوں نے ضد سے کام لینا ہو اور ہٹ پر قائم رہنا ہو ان کا کوئی علاج نہیں۔ اس جگہ یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ قرآن کریم میں جہاں تو آیت کا لفظ اللہ تعالیٰ اور اس کے انبیاء اور مومنوں کی طرف سے استعمال کیا گیا ہے وہاں تو اس کے معنے عام ہوتے ہیں یعنی کوئی نشان جو کسی صداقت پر

دلیل ہو۔خواہ وہ عذاب ہو یا انعام۔خواہ کوئی ایسا نشان ہو جو ان دونوں قسموں میں سے نہ ہو اور صرف ایک علامت کے طور پر ہو۔لیکن جب کفار کے منہ سے یہ لفظ بیان کیا جائے تو اس کے معنے جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے ہمیشہ عذاب کے ہوتے ہیں۔پس تَاْتِیْنَآ اٰیَۃٌ سے مراد یہ ہے کہ ہم پر ایسا عذاب نازل ہو جو ہمیں تباہ کر دے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہاں تمہارا یہی کام تھا کہ تم اس قسم کے اعتراض کرتے اس لئے کہ جن لوگوں کے تم جانشین ہو وہ بھی یہی کہتے آئے ہیں کیونکہ جس طرح نبی کا نبی مثیل ہوتا ہے اسی طرح اس نبی کے وقت کے کافر پہلے نبیوں کے کافروں کے مثیل ہوتے ہیں۔پس اگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن یہ کہتے ہیں کہ آپؐ نے کوئی نشان نہیں دکھایا تو ٹھیک کہتے ہیں کیونکہ وہ حضرت عیسیٰ کے دشمنوں کے مثیل تھے۔اور اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ان کے دشمن کہتے تھے کہ یہ کوئی نشان نہیں لایا تو سچ کہتے تھے کیونکہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دشمنوں کے مثیل تھے۔اور اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی ان کے مخالفوں نے یہی کہا تو ان کا کہنا حق تھا کیونکہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دشمنوں کے مثیل تھے۔اور اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ان کے نہ ماننے والوں نے یہ کہا تو ان کا حق تھا کیونکہ وہ حضرت نوحؑ کے دشمنوں کے مثیل تھے۔خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ ان کے دل مل گئے ہیں اس لئے کہتے ہیں کہ کوئی نشان نہیں لایا حالانکہ ماننے والوں کے لئے بہتیرے نشان ہیں۔ہاں نہ ماننے والوں کے لئے کوئی نہیں۔

تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ سے ظاہر ہے کہ انبیاء کی جماعتوں اور ان کے مخالفین کا ایک ہی طریق عمل ہوتا ہے نبیوں کی مشابہت نبیوں سے۔ان کی جماعتوں کی مشابہت پہلی جماعتوں سے اور ان کے مکفرین کی مشابہت پہلے مکفرین سے ہوتی ہے۔جس طرح انبیاء اور ان کی جماعتیں ایک ہی راستہ پر قدم مارتی چلی جاتی ہیں۔اسی طرح ان کے مخالفین بھی اپنے پیشرؤوں کی سنتوں پر عامل ہوتے ہیں۔خصوصاً جن انبیاء کی آپس میں مشابہت اور مماثلت ہو اور ایک ہی قسم کے کام ان کے سپرد ہوں ان کے حالات تو آپس میں بہت ہی ملتے جلتے ہیں۔

قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ میں بتایا کہ عذاب تو تم صداقت معلوم کرنے کے

لئے مانگتے ہو حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ ہم نے بہت سی آیات ظاہر کردی ہیں جو اس رسول کی صداقت ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں بشرطیکہ تمہاری نیت ماننے کی ہو اور تم ضد اور تعصب سے کام نہ لو۔ پس اگر تمہارا مطالبہ دیانت داری پر مبنی ہے تو تم ان دلائل و براہین پر کیوں غور نہیں کرتے اور صرف عذاب کا مطالبہ ہی کیوں کرتے ہو۔ اگر انبیاء کی بعثت کی غرض یہ ہوتی کہ لوگوں کو تباہ کیا جائے تو ادھر نبی آتا اور ادھر خدا تعالیٰ تمام منکروں کو تباہ کردیتا۔ لیکن اگر ایسا ہوتا تو پھر مانتا کون؟ اس لئے اللہ تعالیٰ کا یہ قانون ہے کہ انبیاء کی بعثت کے بعد پہلے رحمت کی آیات ظاہر ہوتی ہیں تاکہ جس نے ماننا ہو مان لے اور پھر جو ضدی طبع نہیں مانتے ان پر عذاب آجاتا ہے۔ اس آیت میں لِقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ فرما کر اللہ تعالیٰ نے ایک لطیف اشارہ اس امر کی طرف فرمایا ہے کہ نشان تو بہت ظاہر ہو چکے ہیں مگر جو شخص ہر بات میں شبہ پیدا کرے اسے ہدایت کس طرح مل سکتی ہے۔ اگر تم ہدایت حاصل کرنا چاہتے ہو تو اپنی شکی طبیعت کو چھوڑ و اور یقین کا مادہ پیدا کرو ورنہ جو لوگ صرف یہی کہنا جانتے ہیں کہ ”اور نشان دکھاؤ“ ان کے لئے کہاں سے نشان آسکتے ہیں۔ ہماری زبان میں بھی مشہور ہے کہ سوتے کو سب جگا سکتے ہیں لیکن جاگتے کو کوئی نہیں جگا سکتا۔ اسی طرح جو لوگ ہر نشان کا انکار کردیں ان کے لئے کوئی نشان بھی ہدایت کا موجب نہیں بن سکتا۔ یہاں آیات سے قرآن کریم کی آیات مراد نہیں بلکہ ہر قسم کے دلائل اور براہین مراد ہیں جو کسی نبی کی صداقت ثابت کرنے کے لئے ضروری ہوتے ہیں۔ اس آیت نے عیسائیوں کے اس اعتراض کو بھی باطل کردیا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی نشان نہیں دکھایا کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم یقین رکھنے والی قوم کے لئے ہر قسم کے نشانات کھول کر بیان کر چکے ہیں۔“

(تفسیر کبیر جلد ۲ص ۱۴۱تا ۱۴۴)

باب دوم

مجنون، ساحر، مسحور، مفتری اور شاعر ہونے کے الزامات

مجنون ہونے کا اعتراض

آنحضرت ﷺ پر مخالفین نے مجنون ہونے کا اعتراض کیا ہے اس کے جواب میں حضرت خلیفۃ المسیح الاوّلؓ سورۃ الحجر آیت ۷ کی تفسیر میں فرماتے ہیں:۔

''اِنَّکَ لَمَجْنُوْنٌ: راست بازوں کو آج تک ایسا کہا جاتا ہے۔اللہ تعالیٰ نے سورۃ القلم میں ایک بات فرمائی ہے کہ جو کچھ لکھا گیا ہے ان کے خلاصے در خلاصے اور علوم کو جمع کرو تو رسول اللہ مجنون ثابت نہ ہوں گے بلکہ اعقل الناس ۔سورۃ القلم میں فرمایا ۔ وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ (القلم:۴) سات موقع پر انسان کے خُلق کا جلوہ ہوتا ہے۔

۱۔ ایک مثلاً انسان گھوڑے یا ہاتھی پر جاتا ہے اسے دیکھ کر کئی لوگ حسد کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کا دادا ایسا تھا یا پڑ دادا ایسا۔اخلاقِ فاضلہ ہوں تو یہ فضول کارروائی نہ کریں۔

۲۔ پس ایک بہشت تو وہ ہوا جب ایسی ایسی جلن نہ لگیں۔دوسرا بہشت بیوی کے ساتھ اچھے تعلقات ہیں۔

۳۔ اسی طرح بچوں اور نوکروں کے ساتھ اچھا تعلّق بھی ہے تو یہ تیسرا بہشت اس دنیا کا ہے۔

۴۔ اپنی قوم کے ساتھ معاملات میں عمدہ اخلاق رکھتا ہے تو یہ چوتھا بہشت ہے۔

۵۔ پھر قوم کی دو قسمیں ہیں۔اپنے ہم مذہب یا غیر مذہب۔ان سے تعلقات محبت والے ہوں تو یہ پانچواں بہشت ہے۔

۶۔ ایک بادشاہ سے تعلقات ہیں۔

۷۔ ایک خدا سے۔

حضرت نبی کریمؐ کو فرمایا تو بڑے اعلیٰ خُلق پر ہے۔رسول کریم ﷺ کے خلق اپنی ذات میں بے نظیر تھے۔بیویوں کے ساتھ تعلق اس سے بڑھ کر۔قوم کے ساتھ ایسا صاف معاملہ کہ جب تک خدائی پیغام نہیں پہنچایا۔سب آپؐ کو صادق و امین سمجھتے تھے۔ لَا یُکَذِّبُوْنَکَ وَلٰکِنَّ الظّٰلِمِیْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ یَجْحَدُوْنَ (الانعام:۳۴) بادشاہوں

کے ساتھ ایسے اچھے تعلق کہ آپؐ کے مریدوں نے حبشہ میں کس امن سے زندگی گزاری۔ اور خود مکہ کے شر انگیز رئیسوں میں کیسے مامون رہے اور پھر خدا سے ایسا تعلق کہ قرآن شریف جیسی خاتم الکتب کی وحی کے مَہبط ہوئے کیا ایسا شخص مجنون ہو سکتا ہے۔ جو تمام مدبّرانِ ملک کی تجویزوں اور تدبیروں کے مقابلہ میں اکیلا کامیاب ہوا۔ (ضمیمہ اخبار بدر قادیان ۱۲ جنوری ۱۹۱۰ء)

☆

مجنون کے اعتراض کی وجہ

حضرت مصلح موعود سورۃ الشعراء کی آیت ۲۸ کی تفسیر میں انبیاء پر مجنون ہونے کے اعتراض کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

''جب لوگ اللہ تعالیٰ کے نبیوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ زمانہ کی رو کے بالکل خلاف آواز اٹھا رہے ہیں اور اپنے مقصد کو پورا کرنے کے لئے انہیں کسی قسم کی ہلاکت اور تباہی کی پرواہ نہیں تو وہ سمجھتے ہیں یہ لوگ پاگل ہیں اگر عقلمند ہوتے تو رائے عامہ کے خلاف اپنی آواز کیوں بلند کرتے۔ چنانچہ رسول کریم ﷺ جب مبعوث ہوئے اور آپؐ نے مکہ والوں کے سامنے یہ بات پیش کی کہ ایک خدا کی ہی پرستش کرو تو عرب کے لوگوں جو لات اور مناۃ اور عزّیٰ کے پرستار تھے ان کے لئے یہ بات حیرت کا موجب ہوئی اور انہوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ یہ شخص تو پاگل ہے جو اتنے خداؤں کو ایک خدا قرار دے رہا ہے۔ خدا تو کئی ہیں مگر یہ شخص کہتا ہے کہ صرف ایک ہی خدا ہے۔ پس ان کی نگاہ میں آپ کی یہ بات نعوذ باللہ ایک پاگلانہ بڑ سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھی۔

پھر رسول کریم ﷺ کو دنیا اس لئے بھی پاگل کہتی کہ آپؐ فرماتے تھے۔ شراب نہ پیئو، جوا نہ کھیلو اور دوسروں کے مال نہ لوٹو۔ عرب کے لوگ کہتے تھے یہ کیسا آدمی ہے جو شراب سے منع کرتا ہے جو زندگی کا سرور ہے اور جوا کھیلنے اور مال لوٹنے سے منع کرتا ہے جو ایک فائدہ مند کام ہے۔ اس کی یہ باتیں تو پاگلوں والی باتیں ہیں۔ اسی طرح وہ کہا کرتے کہ محمد رسول اللہ کو کیا ہو گیا ہے کہ ہمیں یہ تعلیم دیتا ہے کہ تم اپنی زندگیوں کو بنی نوع انسان کی خدمت میں لگا دو۔ اپنے

مالوں کو خدا کی راہ میں خرچ کرو تو تمہیں ثواب ملے گا۔ یہ تو پاگلوں والی بات ہے۔

حضرت شعیبؑ جب لوگوں سے کہتے کہ تم دوسروں کا مال نہ لوٹو۔ اپنے مال کو ناجائز کاموں میں صرف نہ کرو تو آپ کی باتوں سے آپ کی قوم حیران ہوتی تھی اور کہتی تھی کہ شعیب پاگل ہو گیا ہے۔ اور دیوانوں کی سی باتیں کرتا ہے۔

اس زمانہ میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو لوگوں نے پاگل کہا جب آپ نے وفات مسیح کا مسئلہ دنیا کے سامنے پیش کیا تو مسلمان سمجھ ہی نہ سکے کہ جب ۱۳۰۰ سال سے یہ مسئلہ امت محمدیہ کے اکابر پیش کرتے چلے آرہے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر زندہ ہیں تو وہ فوت کس طرح ہو گئے۔ (تفسیر کبیر جلد ۷ صفحہ ۱۰۷)

☆

سورۃ التکویر کی تفسیر میں حضرت مصلح موعودؓ اس الزام کے ردّ میں بیان فرماتے ہیں:

''چونکہ ایسی پیشگوئیوں کو سن کر بعض لوگ کہہ دیا کرتے ہیں کہ یہ شخص جو ایسی باتیں کرتا ہے پاگل ہے۔ اس لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مذکورہ بالا اخلاق کو بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ (التکویر:۲۳) تم اس شعبہ میں مبتلا نہ ہونا کہ یہ پاگل ہے کیونکہ وہ صَاحِبُكُمْ ہے۔ تمہارے ساتھ رہا ہے کہیں باہر سے نہیں آیا اور تم خود اس کی نیکی اور تقویٰ اور عقل اور اصابت رائے کے گواہ رہے ہو۔ پھر اب کس وجہ سے اسے پاگل قرار دیتے ہو۔ آخر عقل سے جنون کی طرف رجوع یا کسی صدمہ سے ہوتا ہے یا بیماری سے یا تدریجی طور پر ہوتا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے ساتھ رہے ہیں۔ اور ان میں سے کوئی بات بھی آپ میں نہیں پائی جاتی۔ پھر ان کو پاگل تم کس طرح کہتے ہو۔ یہ قرآن کریم کا معجزانہ کمال ہے کہ ایک لفظ میں دلیل بیان کر دیتا ہے۔ اس جگہ صرف صَاحِبُكُمْ کے مختصر سے لفظ سے مجنون ہونے کے الزام کی نفی کر دی۔ یعنی اس طرف توجہ دلا کر کہ یہ تو تمہارا صاحب یعنی دوست اور مشیر کار اور امانتدار کہلاتا تھا۔ یکدم اسے جنون آخر کہاں سے آیا۔ اور اس دعویٰ کے بعد اس کے مجنون ہونے کا فتویٰ کیوں لگانے لگ گئے۔ اس سے پہلے تو اسے اپنا آقا اور

سردار کہا کرتے تھے۔اور اپنا لیڈر تسلیم کرتے تھے۔اور بڑا عقلمند اور سمجھدار قرار دیتے تھے۔

فرمایا: مجنون کے الزام کو رد کر کے اب بتاتا ہے کہ جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دَورِ نبوت ایک لمبے عرصہ تک کے لئے ہے تو وہ اس لمبے عرصہ کے متعلق پیشگوئیاں کیوں نہ کرے۔وہ اپنے دعویٰ کی وجہ سے مجبور ہے کہ جو باتیں تم کو دُور اور خلاف عقل نظر آتی ہیں اُن پر روشنی ڈالے کیونکہ وہ باتیں اس کے زمانہ بعثت کے اندر شامل ہیں تمہارے لئے وہ زمانہ غیب ہے لیکن اس کے جہان پر وہ ظاہر ہے اور اس کی دنیا کے لئے بطور افقِ مبین کے ہے جسے وہ دیکھ رہا ہے اور جن خبروں کو وہ بتا رہا ہے وہ مشرق سے تعلق رکھتی ہیں۔

مشرق کا استدلال اس سے ہوتا ہے کہ گو افق تو ہر جہت بعیدہ کو کہتے ہیں لیکن حدِ نظر جہاں آسمان اور زمین کو ملتے ہوئے دیکھتی ہے وہ ہر سمت افق تو ہوتی ہے مگر افق مبین نہیں ہوتی یعنی کھولنے اور ظاہر کرنے والی افق۔کھولنے اور ظاہر کرنے والی افق مشرق کی ہی ہوتی ہے جدھر سے سورج نکلتا ہے اور اندھیروں کو پھاڑ دیتا ہے۔پس افق مبین کے الفاظ ادا کر کے نہ صرف زمانہ بعیدہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے بلکہ مشرق کی طرف کے ظہور کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔پھر فرماتا ہے کہ اس کی بتائی ہوئی خبریں گو تم کو عجیب معلوم ہوتی ہیں مگر تمہیں اسے مجنون کہنے کا حق نہیں ہے کیونکہ وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِينٍ (التکویر:۲۵) اس نے غیب کی ایک ہی خبر نہیں دی کہ تم کہہ دو کہ یہ تو پاگل ہے بلکہ یہ غیب پر بخیل نہیں ہے یعنی اس نے آئندہ حالات سے تعلق رکھنے والی بہت سی اہم خبریں دی ہیں جن میں سے کئی پوری بھی ہو چکی ہیں۔ اگر ایک ہی خبر ہوتی جو اس نے دی ہوتی اور اگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف یہ کہا ہوتا کہ چونکہ تیرہ سو سال کے بعد ایسا ہو جائے گا اس لئے تم مجھے مان لو تو تم کہہ سکتے تھے کہ یہ پاگل ہے مگر اب تم یہ بات نہیں کر سکتے کیونکہ وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِينٍ یہ پہلی خبر نہیں ہے جو اس نے دی ہو بلکہ اور بھی یہ بہت سی خبریں دے چکا ہے اور وہ خبریں پوری بھی ہو چکی ہیں پس تم ان خبروں پر قیاس کر کے کہہ سکتے ہو کہ یہ بات بھی ایک دن پوری ہو جائے گی۔تمہارا یہ حق نہیں ہے کہ تم اسے پاگل کہو۔آج کل جو چھوٹے مدعی کھڑے ہو گئے ہیں اُن سے جب ہماری

بحث ہوتی ہے کہ بتاؤ تمہاری کون کون سی پیشگوئی پوری ہوئی تو وہ کہہ دیتے ہیں کہ تم مرزا صاحب کی فلاں بات مانتے ہو یا نہیں جس نے ابھی تین سو سال کے بعد پورا ہونا ہے جب تم اس بات کو مانتے ہو تو ہماری بات کیوں نہیں مان لیتے۔ ہم انہیں یہی کہا کرتے ہیں کہ اگر مرزا صاحب کی صرف یہی ایک پیشگوئی ہوتی کہ تین سو سال کے بعد ایسا ہو جائے گا تو یقیناً یہ آپ کی صداقت کا کوئی قطعی ثبوت نہ تھا۔ آپ کی صداقت کا ثبوت تو یہ ہے کہ آپ نے اس کے علاوہ اور بھی پیشگوئیاں کیں جو پوری ہو گئیں اُن پر قیاس کر کے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ پیشگوئی بھی ایک دن پوری ہو جائے گی مگر تمہاری حالت تو یہ ہے کہ تمہاری اب تک کوئی پیشگوئی پوری نہیں ہوئی۔ جتنی پیشگوئیاں ہیں سب آئندہ زمانوں سے تعلق رکھتی ہیں چنانچہ جس قدر مدعی ہیں ان کا سارا زور اسی پر ہوتا ہے کہ اگر مَیں اُن کو مان لوں تو اسلام کو ترقی حاصل ہو جائے گی مگر وہ یہ نہیں سوچتے کہ میں ان کو کس طرح مان لوں جبکہ اُن کی صداقت کا کوئی ثبوت ہی نہیں۔ تو فرماتا ہے وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِينٍ سچے مدعی کو پہچاننے کا یہ ایک زبردست اصول ہے کہ اس کی بعض پیشگوئیاں قریب زمانہ سے تعلق رکھتی ہیں اور بعض بعید زمانہ سے تعلق رکھتی ہیں مثلاً حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے پیشگوئی فرمائی ہے کہ روس کا عصا مجھے دیا جائے گا یا تین سو سال میں جماعت احمدیہ کا ساری دنیا پر غلبہ ہو جائے گا۔ ان پیشگوئیوں کو دشمن دیکھتا ہے تو کہتا ہے یہ محض ڈھکوسلے ہیں کون ان باتوں کو مان سکتا ہے۔ ایسے لوگوں کا جواب اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں دیا ہے کہ یہ غیب پر بخیل نہیں ہے اس نے صرف ایک یا دو خبریں نہیں دیں جو ابھی صدیوں بعد پوری ہونے والی ہیں بلکہ یہ اور بھی کئی قسم کی خبریں دے چکا ہے جو پوری ہو چکی ہیں اُن کو دیکھتے ہوئے تم کیوں یہ تسلیم نہیں کرتے کہ جب وہ باتیں پوری ہو گئی ہیں تو یہ بات بھی پوری ہو جائے گی مجھے اچھی طرح یاد ہے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے پاس آ کر جب کوئی شخص کہتا کہ مجھے کوئی نشان دکھایا جائے تو آپ فرماتے پہلے نشانات سے تم نے کیا فائدہ اٹھایا ہے کہ تمہیں اور نشان دکھایا جائے۔ یہی بات اللہ تعالیٰ نے اس جگہ بیان فرمائی ہے کہ وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِينٍ بظاہر تم اسے ایک پاگل کی بڑ قرار دیتے ہو کہ دور مشرق میں ایک مامور آئے گا جس کے ساتھ

اسلام کی ترقی وابستہ ہوگی لیکن اگر یہ پاگلوں والی بات ہوتی تو اس کی صداقت کا کوئی اور ثبوت نہ ہوتا۔ لیکن جب اس کی پیشگوئیاں بکثرت ایسی موجود ہیں جو پوری ہوچکی ہیں تو تمہیں ماننا پڑے گا کہ یہ پاگل نہیں ہے اور پھر جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے اس کے اخلاق اور اس کی پہلی زندگی کے حالات مزید ثبوت ہیں اس بات کا کہ یہ مجنون نہیں ہے۔

پھر فرمایا: یہاں ایک نہایت لطیف اور زبردست ثبوت پیش کیا گیا ہے جو صادق اور کاذب مدعی میں ما بہ الامتیاز کا کام دیتا ہے مگر چونکہ یہ ثبوت باریک ہوتا ہے اس لئے جب تک ایک ماہر فن اس دلیل کو صحیح طور پر پیش نہ کرے دوسرا شخص سمجھ نہیں سکتا۔ رَجِیْم کے معنے ہوتے ہیں دھتکارا ہوا پس وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ۔ التکویر:۲۶) کے یہ معنے ہوئے کہ یہ دھتکارے ہوئے شیطان کا قول نہیں ہے۔ یعنی دو ہی الزام کفار لگا سکتے ہیں ایک یہ کہ نعوذ باللہ آپ پاگل ہیں اس کا جواب اوپر گزر چکا ہے۔ دوسرے یہ کہ نعوذ باللہ آپ بد اور شیطان سے تعلق رکھتے ہیں اس کا بھی وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ سے رد ہوگیا کیونکہ جس کی کئی پیشگوئیاں پوری ہوچکی ہوں وہ شیطان سے تعلق رکھنے والا کس طرح کہلا سکتا ہے۔ شیطان کو علم غیب کہاں سے آیا، وہ دھتکارا ہوا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم نے دوسری جگہ اس مضمون کو یوں بیان فرمایا ہے۔ اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ الْكَوَاكِبِ ۙ وَحِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ مَّارِدٍ ۚ لَا يَسَّمَّعُوْنَ اِلَى الْمَلَاِ الْاَعْلٰى وَيُقْذَفُوْنَ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ ۖ دُحُوْرًا وَّلَهُمْ عَذَابٌ وَّاصِبٌ ۙ اِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ ثَاقِبٌ ۞ (الصّٰفّٰت:۷۔۱۱) یعنی ہم نے ورلے آسمان کو ستاروں کے ساتھ مزین کیا ہے اور ہم نے اسے ہر سرکش شیطان سے محفوظ کیا ہے وہ خدا کے مقربوں کی بات نہیں سُن سکتے (کجا یہ کہ خدا تعالیٰ کی بات سُنیں) اور ہر طرف سے اُن پر پتھراؤ ہوتا ہے تا کہ اُنہیں دُور کردیا جائے اور انہیں مستقل عذاب ملتا ہے۔ ہاں اگر کوئی بات (مقربین سے) اُچک لے تو اللہ تعالیٰ اُس پر ایک چھید دینے والا ستارہ پھینکتا ہے جو اُسے تباہ کردیتا ہے پس اس آیت میں

بتایا گیا ہے کہ علمِ غیب شیطانوں کو نہیں ہوتا۔ اگر جھوٹے ملہمین کسی کی بات کو اپنی طرف منسوب کر کے وہ غیب دان بننا بھی چاہیں تو اللہ تعالیٰ اُن کو سزا دے کر تباہ کر دیتا ہے پس جبکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غیب کے بیان کرنے میں بخیل نہیں یعنی کثرت سے غیب بیان کرتے ہیں تو ان کا تعلق شیطان سے کس طرح ہو سکتا ہے وہ تو لازماً خدا تعالیٰ کے ماموروں ہی سمجھے جا سکتے ہیں۔ ایک دلیل اور بھی اس جگہ دی گئی ہے اور وہ یہ کہ رَجِیْم دھتکارے ہوئے کو کہتے ہیں۔ پس اس جگہ کفار کو اس طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے کہ یہ مدعی تو روز بروز ترقی کر رہا ہے جو شخص شیطان سے تعلق رکھتا ہے وہ تو ذلیل ہوا کرتا ہے نہ کہ ترقی کرتا جاتا ہے۔

(تفسیر کبیر جلد ۸ صفحہ ۲۳۶ تا ۲۳۹)

☆

سورۃ الحجر کی آیت ۷ کی تفسیر میں حضرت مصلح موعودؓ عیسائیوں کے اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"اِنَّکَ لَمَجْنُوْنٌ۔ اس کے متعلق عیسائیوں نے اعتراض کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں ضرور کوئی جنون کا مادہ تھا ورنہ عرب لوگ آپؐ کو کیوں مجنون کہتے؟ اچھے بھلے آدمی کو کون پاگل کہتا ہے؟ اس اعتراض کے بیان میں انہوں نے پہلے تو مجنون کے معنوں کی تعیین میں غلطی کی ہے۔ سیل اس آیت کا ترجمہ یوں کرتا ہے:

ضرور تجھ پر کوئی شیطان قابض ہے۔ THOU ART CERTAINLY POSSESSED BY A DEVIL

روڈویل اس کا ترجمہ یوں کرتا ہے:

تجھ پر یقیناً کسی جن کا سایہ ہے۔ THOU ART SURELY POSSESSED BY A JINN.

پامر لکھتا ہے:

تُو تو بُری روحوں کے قبضہ میں ہے۔ VERILY THOU ART POSSESSED

گویا مجنون ان کے نزدیک وہ شخص ہوتا ہے جس پر کوئی شیطان یا جن قابض ہو حالانکہ اس

جگہ یہ معنی مراد نہیں ہو سکتے اور نہ ہیں (۔) مجنون کے معنی پاگل یا دیوانہ ہوتے ہیں۔

مجنون کے معنی ''اقرب الموارد'' میں لکھے ہیں مَنْ زَالَ عَقْلُهُ اَوْ فَسَدَ جس کی عقل جاتی رہے یا عقل میں خرابی آجائے۔(تفصیل کے لئے دیکھو حل لغات)

اصل میں یورپین مصنفین نے اپنے عیب کو چھپانے کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذمے یہ الزام لگانے کی کوشش کی ہے کیونکہ انجیل میں لکھا ہے کہ یہودی حضرت مسیح علیہ السلام کو کہتے تھے کہ اس پر جن سوار ہے۔مگر انہوں نے اتنا غور نہ کیا کہ وہاں کہنے والے یہودی ہیں اور اس جگہ مشرکین۔یہودیوں کے نزدیک تو جن ایک ناپاک روح ہے جس پر وہ سوار ہو اس کے معنے ہیں کہ وہ گندا ہے۔مگر مشرکین کے ہاں تو جنوں کی پوجا کی جاتی تھی۔اگر کفار کا یہی مطلب ہوتا تو وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مخالفت نہ کرتے بلکہ آپؐ سے ڈرتے۔

پھر عیسائی معترضین نے دوسرا ظلم یہ کیا کہ وہ لکھتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اہل مکہ جو مجنون کہتے تھے اس کا ضرور کوئی سبب چاہئے اور وہ سبب وہ یہ بتاتے ہیں کہ آپؐ کو نعوذباللہ من ذالک مرگی کے دورے پڑتے تھے۔اس کی تائید میں انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وہ واقعہ نقل کیا ہے جو آپؐ کو حلیمہ دائی کے ہاں بقول بعض مؤرخین پیش آیا تھا۔وہ واقعہ اس طرح بیان ہوا ہے کہ آپ نے جنگل میں دیکھا (جہاں بعض بڑے بچے جانور چرا رہے تھے) کہ دو آدمی براق لباس پہنے ہوئے آئے ہیں۔انہوں نے آپؐ کو گرالیا اور آپؐ کے سینہ کو چاک کیا اور کوئی سیاہ سی چیز اندر سے نکال کر پھینک دی۔عیسائی اس واقعہ سے استدلال کرتے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس وقت بچے تھے اس لئے جھوٹ تو نہیں بولتے تھے۔لہٰذا مرگی کا دورہ ماننا پڑے گا۔

میں اس وقت اس بحث میں نہیں پڑتا کہ مرگی کے دورہ میں انسان اس قسم کے واقعات اور نظارے دیکھتا، سوچتا اور انہیں یاد رکھ سکتا ہے یا کہ نہیں۔میں نے ڈاکٹری کتابیں دیکھی ہیں جن میں اس مرض کی اقسام اور ان کی کیفیات بیان ہیں۔ان میں یہ ہرگز نہیں لکھا کہ انسان اس

دورے کی حالت میں کسی نظارہ کو دیکھ کر بار ترتیب یاد رکھ سکتا ہے۔اور پھر مرگی کے دورے والے کی آنکھیں،شکل اور عقل اور دوسرے حالات سے ہی ظاہر ہو جاتا ہے کہ وہ مرگی کا مریض ہے۔ بلاوجہ معمولی سی تکالیف کو بار بار دہرانا،خالی الذہن نظر آنا اور معمولی معمولی باتوں پر غصہ کرنا ایسے شخص کی عادت میں داخل ہو جاتا ہے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ایسی کوئی بات پائی نہ جاتی تھی۔

عیسائی پوچھتے ہیں کہ اگر کوئی وجہ نہ تھی تو ساری قوم انہیں کیوں مجنون کہہ رہی تھی ۔میں کہتا ہوں کہ خدا تعالیٰ نے دنیا میں یسوع نامی ایک اور آدمی بھی پیدا کیا ہے جس کو لوگ آسیب زدہ قرار دیتے تھے اور مجنون کہتے تھے۔چنانچہ یوحنا 10/19-20 میں لکھا ہے کہ:

''ان باتوں کے سبب یہودیوں میں پھر اختلاف ہوا۔ان میں بہتیرے تو کہنے لگے کہ اس میں بدروح ہے اور وہ دیوانہ ہے۔تم اس کی کیوں سنتے ہو''

اس بزرگ کے ایک شاگرد پولوس نامی کی نسبت بھی لکھا ہے:

''جب وہ اس طرح جوابدہی کر رہا تھا تو فیتس نے بڑی آواز سے کہا اے پولوس تو دیوانہ ہے۔بہت علم نے تجھے دیوانہ کر دیا ہے''۔(اعمال 22/24)

اب عیسائیوں کو چاہئے کہ وہ پہلے مسیحؑ اور پولوس کو دیوانہ کہنے کا سبب مرگی کا دورہ ثابت کریں اس کے بعد محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات کی طرف توجہ کریں کیونکہ اپنے گھر کا کام مقدم ہوتا ہے۔

کاش یہ مسیحی معترضین انصاف سے کام لیتے اور غور کرتے تو اگر حضرت مسیحؑ کو بغیر مرگی کے دوروں کے صرف وعظ سن کر پاگل کہا جا سکتا ہے۔تو کیوں رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ کے عظیم الشان دعویٰ کرنے والے کو روحانی عالم سے ناواقف پاگل نہیں کہہ سکتے تھے۔ مسیحیوں کا یہ اعتراض اور بھی قابل تعجب ہو جاتا ہے جب کہ ہم دیکھتے ہیں کہ اگلی آیات میں کفار کی پیش کردہ وجہ بھی بیان ہے جس کی بنا پر وہ آپؐ پر جنون کا الزام لگاتے تھے۔وہ اس الزام کی وجہ مرگی کو بیان نہیں کرتے بلکہ آپؐ کے دعاوی کو بعید از عقل ہونے کو اس کی وجہ قرار دیتے ہیں

اور یہ بات ہر نبی میں پائی جاتی ہے۔کوئی نبی نہیں جس نے وہ باتیں نہ کی ہوں جن کو اُس زمانہ کے لوگ ماننے کو تیار نہ تھے۔ (تفسیر کبیر جلد ۴ صفحہ ۱۱ تا ۱۴)

☆

سورۃ المومنون کی آیت ۲۶ کی تشریح میں حضرت مصلح موعود اس اعتراض کا جواب یوں بیان فرماتے ہیں: ''رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی مخالفین نے مجنون کہا۔اِسی طرح بعض لوگ کہتے ہیں کہ آپ پر جن آتے تھے۔عیسائی پادری جب دیکھتے ہیں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخالفین نے مجنون کہا تو وہ خوشی سے پھولے نہیں سماتے اور کہتے ہیں کہ اگر آپ میں کوئی دماغی نقص نہیں تھا تو دشمن نے آپ کو مجنون کیوں کہا؟ وہ اس امر کو بُھول جاتے ہیں کہ خود مسیحؑ جن کو وہ ابن اللہ قرار دیتے ہیں اُن کو بھی لوگوں نے دیوانہ اور مجنون قرار دیا تھا۔چنانچہ انجیل میں لکھا ہے کہ:

''ان باتوں کے سبب یہودیوں میں پھر اختلاف ہوا۔ان میں بہتیرے تو کہنے لگے کہ اِس میں بدرُوح ہے (یعنی اِس پر جن آتے ہیں) اور وہ دیوانہ ہے۔تم اُس کی کیوں سُنتے ہو۔'' (یوحنا باب ۱۰ آیت ۱۹،۲۰)

پھر پولوس کو وہ رسول قرار دیتے ہیں اور عہد نامہ جدید بتاتا ہے کہ اُس کو بھی دیوانہ قرار دیا گیا۔چنانچہ لکھا ہے:۔

''جب وہ اس طرح جواب دہی کر رہا تھا تو فیتس نے بڑی آواز سے کہا۔اے پولوس: تُو دیوانہ ہے۔بہت علم نے تجھے دیوانہ کر دیا ہے۔'' (اعمال باب ۲۶۔آیت ۲۴)

اب اگر لوگوں کے دیوانہ اور مجنون کہنے کی وجہ سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں کوئی دماغی نقص تسلیم کرنا جائز ہے تو عیسائی کیوں اپنے مسیح کو بھی مجنون نہیں کہتے اور کیوں پولوس کو بھی دیوانہ قرار نہیں دیتے۔اور اگر مسیح لوگوں کے مجنون کہنے کی وجہ سے واقعہ میں کوئی دماغی نقص اپنے اندر رکھتا تھا تو وہ دنیا کا نجات دہندہ کس طرح ہو گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ دنیا اگر انبیاء کو مجنون کہتی ہے تو صرف اس لئے کہ وہ ایسی تعلیم پیش

کرتے ہیں جو زمانہ کی رو کے بالکل خلاف ہوتی ہے اور جس کو انسانی عقل نہیں بنا سکتی۔علماء اس کو سُنتے ہیں تو مخالفت میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔امراء سُنتے ہیں تو عیش میں آ جاتے ہیں۔عوام سُنتے ہیں تو وہ بھڑک اُٹھتے ہیں۔مگر چونکہ وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے مؤید ہوتے ہیں اور اُن کی پُشت پر اللہ تعالیٰ کھڑا ہوتا ہے۔وہ نہ مخالفت کی پرواہ کرتے ہیں اور نہ دُشمنوں کی ایذا رسانیوں سے گھبراتے ہیں اور برابر اپنے کام میں مشغول رہتے ہیں۔لوگ حیرت اور استعجاب سے اُن کو دیکھتے ہیں۔مگر بجائے یہ سمجھنے کے کہ زمین و آسمان کا خدا اُن کی پُشت پر ہے وہ خیال کرنے لگ جاتے ہیں کہ یہ دیوانہ ہے۔یعنی جس طرح دیوانہ اپنا کام کئے جاتا ہے اور لوگوں کی ہنسی یا مخالفت کی کوئی پرواہ نہیں کرتا اِسی طرح وہ بھی کسی مصیبت کی پرواہ نہیں کرتے اور خدا تعالیٰ کی توحید کو پھیلاتے چلے جاتے ہیں۔جب مکہ کے لوگوں نے دیکھا کہ ہم نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو توحید کے وعظ سے باز رکھنے کے لئے ہر قسم کی تدابیر اختیار کیں مگر یہ پھر بھی اپنے کام سے نہیں رُکا اور اُس نے بتوں کو بُرا بھلا کہنا نہیں چھوڑا تو انہوں نے کہنا شروع کر دیا کہ یہ شخص تو مجنون ہے اللہ تعالیٰ اُن کے اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے فرماتا ہے کہ نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَۙ مَاۤ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍۚ (القلم:۲،۳)یعنی ہم دوات اور قلم کو اور اُن تمام تحریروں کو جو دوات اور قلم سے لکھی گئی ہیں اِس بات کی شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں کہ تُو اپنے رب کے فضل سے مجنون نہیں ہے یعنی قلم اور دوات سے جس قدر علوم احاطہ تحریر میں آئے ہیں یا آئندہ زمانوں میں آئیں گے اگر ان سب کو جمع کر لیا جائے اور پھر اِن کو تیرے علوم کے ساتھ مقابلہ کیا جائے تو دُنیا کو معلوم ہوگا کہ تُو ان سے بہت زیادہ علوم پھیلا رہا ہے۔پس اگر اور لوگ ادنیٰ اور معمولی علوم پھیلانے کی وجہ سے اعلیٰ درجہ کے موجد اور سائنس دان اور فلاسفر اور فقیہہ عالم کہلا سکتے ہیں تو تُو ان سے ہزاروں گُنا زیادہ علوم پھیلانے کی وجہ سے مجنون کس طرح ہو گیا۔

غرض انبیاء کے مخالفین کا یہ ایک پُرانا حربہ ہے جس سے وہ ہمیشہ کام لیتے رہے ہیں یا یُوں کہو کہ جس طرح ڈوبتا ہوا آدمی سہارے کے لئے تنکوں پر بھی ہاتھ ڈال دیتا ہے اِسی طرح وہ

بھی مجنون کہہ کر الٰہی سلسلوں کی ترقی کو روکنا چاہتے ہیں مگر آخر خدا کے رسول ہی کامیاب ہوتے ہیں اور مخالفین مجنون کہنے والے نا کامی اور نامرادی کا منہ دیکھتے ہیں۔(تفسیر کبیر جلد ۶ صفحہ ۱۵۸، ۱۵۹)

آپؐ پر جادو کے اثر کی حقیقت

حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام نے فرمایا کہ:

''جادو بھی شیطان کی طرف سے ہوتا ہے۔رسولوں اور نبیوں کی یہ شان نہیں ہوتی کہ ان پر جادو کا کچھ اثر ہو سکے۔بلکہ ان کو دیکھ کر جادو بھاگ جاتا ہے۔جیسے کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے
وَلَا يُفْلِحُ السَّاحِرُ حَيْثُ أَتَىٰ (طٰہٰ:۷۰)
دیکھو حضرت موسیٰ کے مقابل پر جادو تھا۔آخر موسیٰ غالب ہوا کہ نہیں؟ یہ بات بالکل غلط ہے کہ آنحضرت ﷺ کے مقابلہ پر جادو غالب آ گیا۔ہم اس کو کبھی نہیں مان سکتے۔آنکھ بند کر کے بخاری اور مسلم کو مانتے جانا یہ ہمارے مسلک کے برخلاف ہے۔یہ تو عقل بھی تسلیم نہیں کر سکتی کہ ایسے عالیشان نبی پر جادو اثر کر گیا ہو۔ایسی باتیں کہ اس جادو کی تاثیر سے (معاذ اللہ) آنحضرت ﷺ کا حافظہ جاتا رہا۔یہ ہو گیا اور وہ ہو گیا۔کسی صورت میں صحیح نہیں ہو سکتیں۔معلوم ہوتا ہے کہ کسی خبیث آدمی نے اپنی طرف سے ایسی باتیں ملا دی ہیں۔گو ہم نظرِ تہذیب سے احادیث کو دیکھتے ہیں لیکن جو حدیث قرآن کریم کے برخلاف آنحضرت ﷺ کی عصمت کے برخلاف ہو اس کو ہم کب مان سکتے ہیں۔اس وقت احادیث جمع کرنے کا وقت تھا۔گو انہوں نے سوچ سمجھ کر احادیث کو درج کیا تھا مگر پوری احتیاط سے کام نہیں لے سکے۔وہ جمع کرنے کا وقت تھا لیکن اب نظر اور غور کرنے کا وقت ہے۔آثار نبی جمع کرنا بڑے ثواب کا کام ہے لیکن یہ قاعدہ کی بات ہے کہ جمع کرنے والے خوب غور سے کام نہیں لے سکتے۔اب ہر ایک کا اختیار ہے کہ خوب غور اور فکر سے کام لے جو ماننے والی ہو وہ مانے اور جو چھوڑنے والی ہو وہ چھوڑ دے۔ایسی بات کہ آنحضرت ﷺ پر (معاذ اللہ) جادو کا اثر ہو گیا تھا۔اس سے تو ایمان اٹھ جاتا ہے۔خدا تعالیٰ فرماتا ہے إِذْ يَقُولُ الظَّالِمُونَ إِن تَتَّبِعُونَ إِلَّا رَجُلًا مَّسْحُورًا

(بنی اسرائیل:۴۸) ایسی ایسی باتیں کہنے والے تو ظالم ہیں نہ مسلمان۔ یہ تو بے ایمانوں اور ظالموں کا قول ہے کہ آنحضرت ﷺ پر (معاذاللہ) سحر اور جادو کا اثر ہو گیا تھا۔ اتنا نہیں سوچتے کہ جب (معاذاللہ) آنحضرت ﷺ کا یہ حال ہے تو پھر امت کا کیا ٹھکانا؟ وہ تو پھر غرق ہو گئی۔ معلوم نہیں ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ جس معصوم نبی ﷺ کو تمام انبیاء مَسِّ شیطان سے پاک سمجھتے آئے ہیں ان کی شان میں ایسے ایسے الفاظ بولتے ہیں"۔ (ملفوظات جلد ۵ صفحہ ۳۴۸ تا ۳۴۹ ایڈیشن ۲۰۰۳ء)

☆

یہ اعتراض کہ یہود نے آپؐ پر جادو کیا اور اس کے اثر سے آپؐ بیمار ہو گئے۔ اس قصہ کی حقیقت حضرت مصلح موعود سورۃ الفلق کی تفسیر میں یوں بیان فرماتے ہیں:

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بیمار ہونا اور لوگوں کا یہ سمجھنا کہ آپ پر یہودیوں کی طرف سے جادو کیا گیا ہے، یہ واقعہ جن الفاظ میں روایت کیا گیا ہے وہ الفاظ یہ ہیں:۔

عَنْ عَائِشَةَ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْهَا قَالَتْ سُحِرَ رَسُوْ لُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ حَتّٰی اَنَّه لَیُخَیَّلُ اِلَیْهِ اَنَّه فَعَلَ الشَّیْءَ وَلَمْ یَکُنْ فَعَلَه ...... (روح المعانی)

چونکہ مفسرین نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت کو ترجیح دی ہے اس لئے ہم صرف اسی روایت کا ترجمہ کرتے ہیں:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر یہودیوں کی طرف سے جادو کیا گیا اور اس کا اثر یہاں تک ہوا کہ آپ بعض اوقات یہ سمجھتے تھے کہ آپ نے فلاں کام کیا ہے حالانکہ وہ کام نہیں کیا ہوتا تھا۔ ایک دن یا ایک رات رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے دُعا کی۔ پھر دُعا کی اور پھر دُعا کی۔ پھر فرمایا اے عائشہ! اللہ تعالیٰ سے جو کچھ میں نے مانگا تھا وہ اس نے مجھے دے دیا۔ حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ وہ کیا ہے تو آپ نے فرمایا کہ میرے پاس دو آدمی آئے۔ ایک میرے سَر کے پاس بیٹھ گیا اور دوسرا میرے پاؤں کے پاس۔ پھر وہ شخص جو میرے سَر کے پاس بیٹھا ہوا تھا اُس نے پاؤں

کے پاس بیٹھنے والے کو مخاطب کر کے کہا۔ یا غالباً یہ فرمایا کہ پاؤں کے پاس بیٹھنے والے نے سَر کے پاس بیٹھنے والے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ اِس شخص (یعنی محمد رسول اللہ) کو کیا تکلیف ہے۔ تو دُوسرے نے جواب دیا کہ جادو کیا گیا ہے۔ اس نے کہا کہ کس نے جادو کیا ہے۔ تو اس نے جواب دیا لبید بن الاعصم یہودی نے۔ تب پہلے نے کہا کہ کس چیز میں جادو کیا گیا ہے۔ تو دوسرے نے جواب دیا کہ کنگھی اور سَر کے بالوں پر جو کھجور کے خوشہ کے اندر ہے۔ پہلے نے پوچھا یہ چیزیں کہاں ہیں۔ تو دوسرے نے کہا یہ ذی اروان کے کنوئیں میں ہیں۔ حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہؓ سمیت کنویں کے پاس تشریف لے گئے۔ پھر فرمایا اے عائشہ! اللہ کی قسم کنویں کا پانی یوں معلوم ہوتا تھا جیسے مہندی کے نچوڑ کی طرح سُرخ ہوتا ہے (معلوم ہوتا ہے یہودیوں میں یہ رواج تھا کہ جب وہ کسی پر جادو ٹونا کرتے تھے تو مہندی یا اسی قسم کی کوئی اور چیز پانی میں ڈال دیتے تھے۔ یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ جادو کے زور سے پانی کو سُرخ کیا گیا ہے) اور وہاں کی کھجوریں ایسی تھیں جیسے شیاطین یعنی سانپوں کے سر (اس میں کھجور کے گابھوں کو سانپوں کے سروں کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے یعنی کھجوریں گابھوں والی تھیں)۔

حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ میں نے کہا یا رسول اللہ آپ نے اس چیز کو جس پر جادو کیا گیا تھا جلا کیوں نہ دیا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے جب اللہ تعالیٰ نے شفا دے دی تو میں نے ناپسند کیا کہ کوئی ایسی بات کروں جس سے شَر کھڑا ہو۔ (یعنی یہودیوں کو یہ شور مچانے کا موقع ملے کہ انہوں نے ہماری چیزوں کو جلا دیا ہے) اس لئے میں نے حکم دیا کہ ان اشیاء کو دفن کر دیا جائے چنانچہ ان کو دبا دیا گیا ہے۔ حضرت عائشہؓ کی روایت میں جن دو مردوں کا ذکر آتا ہے کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دو فرشتے تھے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دکھائے گئے۔ اگر وہ انسان ہوتے تو حضرت عائشہؓ کو بھی نظر آجاتے۔

یہ روایت جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بیان کی گئی ہے اس کا صرف اتنا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرشتوں کے ذریعہ سے خبر دی کہ یہودیوں نے

آپؐ پر جادو کیا ہوا ہے۔اس کا یہ مطلب نہیں کہ جس طرح جادو کا اثر تسلیم کیا جاتا ہے اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کا اثر بھی ہو گیا تھا بلکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ جب کوئی شخص اس قسم کا ہو جو دوسرے سے شدید عناد رکھتا ہو تو اس کی توجہ دوسرے شخص پر مرکوز ہو جاتی ہے۔اور جس طرح مسمریزم کا دوسرے پر اثر پڑتا ہے اسی طرح جادو کا بھی ایک اثر پڑتا ہے۔گویا یہ بھی مسمریزم کی ایک قسم ہوتی ہے جس میں دوسرے پر توجہ ڈالنے کی کوشش کی جاتی ہے۔اسی طرح یہودیوں نے بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کوشش کی۔اور بعض دفعہ دشمن جب خاص طورر پر کسی امر کے متعلق اجتماع خیال کرتا ہے تو اس کا اثر مسمریزم کے طور پر دوسرے پر بھی ہو جاتا ہے۔جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے جادو ٹونے کی چیزیں نکال کر زمین میں دفن کر دیں تو یہودیوں کو خیال ہو گیا کہ انہوں نے جو جادو کیا تھا وہ باطل ہو گیا ہے۔ادھر اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو صحت عطا فرما دی۔خلاصہ کلام یہ کہ یہودی یہ یقین رکھتے تھے کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کر دیا ہے اس وجہ سے طبعی طور پر ان کی توجہ اس طرف مرکوز ہوئی کہ آپ بیمار ہو جائیں۔چنانچہ اس کا اثر آپ کے جسم پر بھی پڑا۔لیکن جب خدا تعالیٰ نے حقیقت ظاہر کر دی اور آپؐ نے ان کی چیزیں دفن کرا دیں تو یہودیوں کی وہ توجہ ہٹ گئی اور اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو صحت عطا فرما دی۔اس روایت سے جہاں یہودیوں کے اس عناد کا پتہ چلتا ہے جو اُن کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے تھا وہاں یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خدا تعالیٰ کے سچے رسول تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپؐ کو ان تمام باتوں کا علم دے دیا گیا جو یہودی آپؐ کے خلاف کر رہے تھے پس آپؐ کو غیب کی باتوں کا معلوم ہو جانا اور یہودیوں کا اپنے مقصد میں ناکام رہنا آپؐ کے سچا رسول ہونے کی واضح اور بیّن دلیل ہے۔ (تفسیر کبیر جلد ۱۰ صفحہ ۵۳۹ تا ۵۴۲)

آپؐ پر شاعر ہونے کا الزام

کفار مکہ نے آنحضورؐ پر شاعر ہونے کا بھی الزام لگایا اس الزام کے ردّ میں سورۃ الشعراء

کی تفسیر میں حضرت مصلح موعودؓ بیان فرماتے ہیں:۔

''کفار مکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کو سن کر اپنے جن خیالات کا اظہار کیا کرتے تھے قرآن کریم نے ان کا مختلف مقامات میں ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ وہ کبھی آپ کو مجنون کہنے لگ جاتے تھے۔ کبھی کہتے کہ اسے پریشان خوابیں آتی ہیں۔ جن کی وجہ سے یہ ایسا دعویٰ کر بیٹھا ہے۔ کبھی کہتے یہ ساحر ہے کبھی کہتے کہ یہ خود تو نیک بخت ہے۔ لیکن کسی اور نے اس پر جادو کر دیا ہے گویا یہ ساحر نہیں بلکہ مسحور ہے۔ کبھی کہتے یہ کاہن ہے۔ کبھی کہتے کہ اسے کوئی اور شخص باتیں سکھا دیتا ہے یہ کلام اس کا اپنا نہیں۔ کبھی کہتے کہ اس کے ساتھ شیطان کا تعلق ہے کبھی کہتے یہ مفتری اور کذاب ہے اور کبھی کہتے کہ یہ شاعر ہے۔ چنانچہ سورۃ انبیاء میں اللہ تعالیٰ ان میں سے بعض اعتراضات کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے۔ بَلْ قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍۭ بَلِ افْتَرٰىهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ (الانبیاء:۶) یعنی مخالف کہتے ہیں کہ یہ کلام تو پریشان خوابیں ہیں بلکہ پریشان خوابیں بھی نہیں اس نے دیدہ ودانستہ یہ باتیں اپنے پاس سے بنالی ہیں بلکہ اصل بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ شاعرانہ مزاج رکھنے والا آدمی ہے جس کے دماغ میں طرح طرح کے خیالات اُٹھتے رہتے ہیں اور جس طرح مشہور اور قادر الکلام شعراء کے اشعار میں بڑی بھاری فصاحت وبلاغت اور بلند پروازی پائی جاتی ہے۔ اسی طرح اس کلام میں بھی شاعرانہ فصاحت وبلاغت کا حامل ہے۔ پس درحقیقت یہ بھی ایک شاعر ہے کوئی روحانی آدمی نہیں۔

اللہ تعالیٰ زیر تفسیر آیات میں کفار کے اس ادعا کو بھی باطل ثابت کرتا ہے اور فرماتا ہے کہ تمہارا یہ خیال بھی کلی طور پر غلط ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ شعراء پر ایسے لوگ ہی گرویدہ ہوتے ہیں جس کا تقویٰ اور روحانیت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ چونکہ شعروں میں عموماً عشق اور محبت نفسانیہ اور شہوانیہ کا ذکر کرتے ہیں۔ اس لئے ایسے ہی لوگ ان کے پیچھے چلتے ہیں جو خود بھی تقویٰ سے دور ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ بعض آوارہ نوجوانوں کو ان کے سینکڑوں اشعار یاد ہوتے ہیں اور بعض شاعروں کی غزلیں رنڈیاں گاتی ہیں کیونکہ ان میں خدا اور اس کے رسول کا کہیں ذکر نہیں ہوتا بلکہ عموماً ان کے ذریعہ نوجوانوں کے شہوانی جذبات کو تحریک دی جاتی ہیں اور

واعظ اور ناصح پر پھبتیاں اڑائی جاتی ہیں جس کی وجہ سے ان کی ایسے ہی لوگوں میں مقبولیت ہوتی ہے جس کا روحانیت سے کوئی دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔ مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متبعین تو ایسے ہیں جنہوں نے اپنی صداقت اور دیانت اور عفت اور پاکیزگی کا ایک بے مثال نمونہ لوگوں کے سامنے پیش کر رکھا ہے۔ ان کی راتیں قیام و سجود ہیں اور ان کے دن ذکر الٰہی اور اعلاءِ کلمہ اسلام میں بسر ہوتے ہیں۔ پھر تم یہ کس طرح کہہ سکتے ہو کہ جس مقدس انسان کا دامن چھو کر ان کے اندر ایسی پاکیزگی پیدا ہوئی ہے وہ تمہارے بدعمل شاعروں کی طرح ایک ایسا انسان ہے جو جذبات کو بھڑکا کر لوگوں کو اپنے اردگرد جمع کر رہا ہے۔ اس کی جماعت کی پاکیزگی اور ان کا تقویٰ وطہارت میں بے مثال نمونہ قائم کرنا خود اس بات کا ثبوت ہے کہ تمہارا یہ ادعا بالکل باطل ہے۔ اور تم نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام سمجھنے میں سخت غلطی کھائی ہے۔

پھر فرماتا ہے اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِیْ كُلِّ وَادٍ یَّهِیْمُوْنَ۔ (الشعراء:۲۲۶) کیا تم نہیں دیکھتے کہ شاعر مختلف طبائع کو خوش کرنے کے لئے کبھی ادھر کی بات کر دیتے ہیں کبھی ادھر کی۔ ان کے سامنے کوئی خاص مقصد اور مدعا نہیں ہوتا بلکہ جو چیز بھی ان کے ذہن میں آجائے اسی کے متعلق وہ کچھ نہ کچھ کہنا شروع کر دیتے ہیں۔ چنانچہ شاعروں کی کوئی غزل لے لو فِیْ كُلِّ وَادٍ یَّهِیْمُوْنَ کا تمہیں ان کی ہر غزل میں نظارہ نظر آجائے گا۔ ایک شعر میں تو لکھا ہوگا۔ میں مر گیا۔ میرا معشوق مجھ سے بے وفائی کرتا ہے اور میں اس کے ہجر میں اس کی بے التفاتی کی وجہ سے جاں بلب ہوں۔ مگر ساتھ ہی اگلے شعر میں یہ لکھا ہوتا ہے کہ مجھے اپنے معشوق کا وصال نصیب ہوا۔ میں جی اٹھا اور میں زندہ ہو گیا۔ ساری غزل کا ایک شعر بھی دوسرے شعر سے جوڑ نہیں رکھتا۔ ایک شعر میں وہ کچھ اور بیان کر رہے ہوتے ہیں اور دوسرے شعر میں وہ کہیں اور نکل جاتے ہیں۔ ایک شعر میں تو وہ کہتے ہیں میں محبوب سے ملنے کی تیاری کر رہا ہوں۔ اور دوسرے میں کہتے ہیں ہائے مرا جا رہا ہوں۔ غرض ان کی غزلوں کا ہر شعر دوسرے سے متناقض ہوتا ہے اور ان کی باتوں کا کوئی سر پیر ہی نہیں ہوتا۔ کبھی ادھر کی کہتے ہیں کبھی ادھر کی۔ کبھی کہتے ہیں میں اپنے محبوب کے عشق میں مر گیا حالانکہ وہ زندہ اپنے شعر سنا رہے ہوتے ہیں کبھی کہتے ہیں میں اپنے معشوق کے عشق

میں سرگردان ہوں۔حالانکہ وہ اچھے بھلے دنیا کے کام کررہے ہوتے ہیں۔کبھی کہتے ہیں معشوق ہر وقت ہمارے دل میں ہے اور یہ بالکل جھوٹ ہوتا ہے۔کبھی کہتے ہیں کہ میں اپنے محبوب کے لئے خون کے آنسو پی رہا ہوں۔حالانکہ وہ آرام سے زندگی بسر کررہے ہوتے ہیں۔نہ مر رہے ہوتے ہیں نہ خون پی رہے ہوتے ہیں۔ان کا مطلب صرف اتنا ہوتا ہے کہ لوگوں کے جذبات کو ابھارا جائے چاہے وہ ابھارنا اچھے رنگ میں ہو یا برے رنگ میں۔کبھی وہ خوشی کی باتیں کرتے ہیں اور کبھی غمی کی۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔فِیْ کُلِّ وَادٍ یَّھِیْمُوْنَ۔یعنی وہ ہر جنگل میں اور ہر وادی میں سرگردان پھرتے ہیں۔ان کو کسی جگہ بھی جذبات کے ابھارنے کا سامان مل جائے چاہے کہیں سے ملے لے لیتے ہیں۔وہ عاشقوں کو بھی خوش کرتے ہیں اور معشوقوں کو بھی۔وہ غریبوں کو بھی خوش کرتے ہیں اور امیروں کو بھی۔وہ مظلوموں کو بھی خوش کرتے ہیں اور ظالموں کو بھی۔وہ غالب کو بھی خوش کرتے ہیں اور مغلوب کو بھی۔ان کو تو ہر کسی کی خوشی مطلوب ہوتی ہے چاہے ان کو اپنے شعروں میں کتنا بھی جھوٹ کیوں نہ بولنا پڑے۔وہ چاہتے ہیں کہ کوئی غریب ہمارے شعر پڑھے یا امیر۔ظالم پڑھے یا مظلوم۔عاشق پڑھے یا معشوق، غالب پڑھے یا مغلوب سب کے سب خوش ہوجائیں چاہے ان کے اشعار حقیقت سے کتنے ہی دور ہوں۔پس شعراء کا مقصد اور مدعا یہی ہوتا ہے کہ ہر خاص و عام ان سے خوش ہوجائے اور ان کے شعروں کی داد دے۔چنانچہ کبھی وہ کسی امیر کی تعریف کرنے لگ جاتے ہیں اور مقصد یہ ہوتا ہے کہ کچھ روپے مل جائیں یا کوئی وظیفہ مقرر ہوجائے ورنہ اس کی ذات سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔لطیفہ مشہور ہے کہ ایک شخص نے جو سخت بھوکا تھا ایک دفعہ چند لوگوں کو جو اچھے کپڑے پہنے ہوئے تھے کہیں جاتے دیکھا تو اس نے خیال کیا کہ یہ غالباً دعوت پر جارہے ہیں میں بھی ان کے ساتھ شامل ہوجاؤں۔جب یہ کھانا کھانے لگیں گے تو میں بھی وہیں سے کھانا کھالوں گا۔چنانچہ وہ ان کے ساتھ شامل ہوگیا۔جاتے جاتے وہ بادشاہ کے دربار میں جاپہنچے اور انہوں نے اس کی تعریف میں قصائد پڑھنے شروع کردیئے۔تب اسے پتہ لگا کہ یہ تو شاعر ہیں اور اپنے اپنے قصائد سنانے آئے ہیں۔چنانچہ ہر شاعر نے اپنی اپنی باری پر اٹھ کر قصیدہ سنانا شروع کردیا۔یہ اب سخت

حیران ہوا کہ میں کیا کروں شعر کہنے کی اس میں قابلیت نہیں تھی۔ مگر طبیعت لطیفہ سنج تھی۔ جب سب شاعر اپنے اپنے قصائد سنا چکے اور بادشاہ سے انعام لے کر گھروں کو روانہ ہو گئے تو بادشاہ اس سے مخاطب ہوا اور کہنے لگا۔ اب آپ قصیدہ شروع کریں وہ کہنے لگا کہ حضور میں شاعر نہیں ہوں۔ بادشاہ نے پوچھا آپ یہاں کیوں آئے ہیں وہ کہنے لگا حضور میں وہی ہوں جس کا قرآن کریم میں اسی طرح ذکر آتا ہے کہ وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ۔ (الشعراء:۲۲۵) شاعروں کے پیچھے غاوی آیا کرتے ہیں۔ وہ شاعر تھے اور میں غاوی ہوں۔ بادشاہ کو اس کا یہ لطیفہ پسند آ گیا اور اس نے حکم دے دیا کہ اسے بھی کچھ انعام دے دیا جائے۔ اب یہ ہے تو ایک لطیفہ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ شاعر کے پیچھے چلنے والے عموماً گمراہ لوگ ہی ہوتے ہیں کیونکہ شاعر کبھی کچھ کہہ دیتے ہیں کبھی کچھ۔ ان کا کوئی اصول نہیں ہوتا کبھی ہزلیہ کلام سے لوگوں کو ہنساتے ہیں۔ کبھی شہادت امام حسینؓ کا واقعہ لکھ کر لوگوں کو رلاتے ہیں کبھی مدحیہ قصائد پڑھتے ہیں اور کبھی اس کی ہجو کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ غرض ہر جنگل میں سرگردان پھرتے ہیں۔ کوئی ایک مقصد اور مدعا لے کر کھڑے نہیں ہوتے مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو دنیا میں توحید پھیلانے کیلئے آیا ہے اور یہی ایک مقصد ہے جو رات اور دن اس کے دماغ پر حاوی رہتا ہے اور اسی کیلئے وہ تکلیفیں اٹھا رہا ہے۔ پھر تم یہ کس طرح کہہ سکتے ہو کہ یہ ایک شاعر ہے اگر شاعر ہوتا تو اس کا بھی کوئی مقصد نہ ہوتا۔ جدھر لوگوں کی اکثریت ہوتی ادھر ہی چل پڑتا اور ان کو خوش کرنے کی کوشش کرتا۔ مگر اس نے تو سب دنیا کو اپنا مخالف بنا لیا ہے اور ہر ایک کو توحید کی طرف لانے کی کوشش کر رہا ہے پھر یہ شاعر کس طرح ہوا؟

پھر فرمایا ہے وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ (الشعراء:۲۲۷) شاعروں میں ایک یہ بات بھی پائی جاتی ہے کہ ان کا قول اور ہوتا ہے اور فعل اور۔ اور وہ جو کچھ منہ سے کہتے ہیں عملاً وہ ایسا نہیں کرتے۔ یعنی اگر وہ اپنے اشعار میں لوگوں کو اخلاق حسنہ اختیار کرنے کی تلقین کرتے ہیں تو خود شرابیں پیتے ہیں اور اگر اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کی نصیحت کرتے ہیں تو آپ نماز اور روزہ کے قریب بھی نہیں جاتے۔ لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جو قول ہے وہی اس کا عمل ہے اور جو

بات اس کے عمل میں ہے وہی اس کی زبان پر ہے پس تمہارا یہ کہنا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک شاعر ہے محض حقائق پر غور نہ کرنے کا نتیجہ ہے۔اگر تم غور کرو تو تمہیں نظر آئے گا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور شعراء کے کلام اور ان کے کردار میں بعد المشرقین پایا جاتا ہے اور دونوں کی آپس میں کوئی نسبت ہی نہیں ہے۔

(تفسیر کبیر جلد ۷ص ۳۰۱۔۳۰۴)

☆

ایک دوسرے مقام پر اس اعتراض کا جواب حضرت مصلح موعودؓ ان الفاظ میں دیتے ہیں:

''ایک اعتراض یہ کیا گیا کہ آپ شاعر ہیں۔چنانچہ سورۃ انبیاء رکوع اول میں آتا ہے بَلْ هُوَ شَاعِرٌ کہ یہ فصیح باتیں بیان کر کے لوگوں پر اثر ڈال لیتا ہے۔اس کا جواب سورۃ یاسین رکوع ۵ میں یہ دیا کہ:

وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّقُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ ۙ لِّيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا وَّيَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ (یٰس:۷۰،۷۱)

یعنی ہم نے اسے شعر نہیں سکھایا اور یہ تو اس کی شان کے مطابق بھی نہیں ہے۔یہ تو ذِكْرٌ اور قُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ ہے۔کھول کھول کر باتیں سنانے والا ہے۔یہ اس لئے نازل کیا گیا تا کہ اسے جس میں روحانی زندگی ہے ڈرائے اور کافروں پر حجت تمام ہو جائے۔اس میں اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ اول قرآن شعر نہیں۔ان لوگوں کی عقلیں ماری گئی ہیں کہ نثر کو شعر کہتے ہیں۔دوم اگر کہیں کہ مجازی معنوں میں شعر کہتے ہیں کیونکہ شعر کے معنی ایسی چیز کے ہوتے ہیں جو اندر سے باہر آئے اور شعر کو اس لئے شعر کہا جاتا ہے کہ وہ جذبات کو ابھارتا ہے۔تو اس کا جواب یہ دیا کہ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ یہ تو اس کی شان کے ہی مطابق نہیں کہ اس قسم کی باتیں کرے اس کی ساری زندگی دیکھ لو۔شاعر کی غرض اپنے آپ کو مشہور کرنا ہوتی ہے مگر یہ تو کہتا ہے مِثْلُكُمْ میں تمہارے جیسا ہی انسان ہوں۔پھر شاعران لوگوں کی مدح کرتا ہے جن سے اس نے کچھ حاصل کرنا ہوتا

ہے۔مگر یہ تو کہتا ہے کہ میں تم سے کچھ نہیں لیتا۔نہ کچھ مانگتا ہوں۔پس شاعری اور اس کالا یا ہوا کلام آپس میں کوئی مناسبت نہیں رکھتے۔سوم۔پھر اس میں ذکر ہے حالانکہ شعر ذکر نہیں ہوتا۔ یعنی شاعر اندرونی جذبات کو ابھارتا ہے۔شہوت اور حسن پرستی کا ذکر آتا ہے مگر یہ ایسی باتوں کی مذمت کرتا ہے۔چہارم۔پھر یہ ایسا کلام ہے جو فطرت کے اعلیٰ محاسن کو بیدار کر کے جن کی فطرت صحیح ہوتی ہے انہیں بدیوں سے بچاتا ہے اور جو مردہ ہوتے ہیں ان پر حجت تمام کرتا ہے حالانکہ شاعر جذباتِ بہیمیہ کو ابھارتا ہے۔پس اسے مجازی طور پر بھی شعر نہیں کہہ سکتے۔"

(انوار العلوم جلد ۱۲ صفحہ ۴۲۸ تا ۴۲۹)

☆

مجنون، پریشان خوابیں آنے، ساحر، مسحور ہونے کا اعتراض

ان اعتراضات کے جواب میں حضرت مصلح موعودؓ فرماتے ہیں:

"**میں سب سے پہلے جنون کے اعتراض** کو لیتا ہوں۔کیونکہ رسول کریم ﷺ کی زندگی اتنی پاکیزہ تھی کہ منکر اس کے متعلق کوئی حرف گیری نہیں کر سکتے تھے۔اس لئے جب آپؐ کا کلام سنتے تو یہ نہ کہہ سکتے کہ آپؐ جھوٹے ہیں بلکہ یہ کہتے کہ پاگل ہے۔چونکہ مشرکانہ خیالات ان لوگوں کے دلوں میں گڑے ہوئے تھے۔ادھر وہ سمجھتے تھے کہ محمد (ﷺ) جھوٹ نہیں بول سکتے اس لئے ان دونوں باتوں کے تصادم سے یہ خیال پیدا ہو جاتا کہ اس کی عقل ماری گئی ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

وَقَالُوْا یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْ نُزِّلَ عَلَیْهِ الذِّكْرُ اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ (الحجر:۷)

جب محمد ﷺ نے قرآن پیش کیا تو لوگوں نے حیران ہو کر کہ اب کس طرح انکار کریں یہ کہہ دیا کہ اے وہ شخص جو کہتا ہے کہ مجھ پر خدا کا کلام اترا تیرا دماغ پھر گیا ہے اور تو پاگل ہو گیا ہے۔اس کا جواب قرآن کریم میں اس طرح دیا گیا ہے کہ:

نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ ۝ مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ ۝ وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ ۝ وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۝ فَسَتُبْصِرُ وَيُبْصِرُوْنَ ۝ بِاَيِّكُمُ الْمَفْتُوْنُ ۝ (القلم:۲ تا ۷)

لوگ تجھے پاگل کہتے ہیں مگر ہم دوات اور قلم کو تیری سچائی کے لئے شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ پاگل آخر کسے کہتے ہیں؟ اسے جس کی عقل عام انسانوں کی عقل کی سطح سے نیچے ہوتی ہے۔ ورنہ پاگلوں میں بھی کچھ نہ کچھ عقل تو ہوتی ہے۔ وہ کھانا کھاتے اور کپڑا پہنتے اور پانی پیتے ہیں۔ پاگل انہیں اس لئے کہتے ہیں کہ ادنیٰ معیار عقل جو قرار دیا جاتا ہے اس سے ان کی عقل کم ہو جاتی ہے۔ خدا تعالیٰ رسول کریم ﷺ کو پاگل کہنے والوں کے متعلق فرماتا ہے تم اسے پاگل کہتے ہو مگر سب سے زیادہ عقل مند لکھنے پڑھنے والے عالم سمجھے جاتے ہیں اور مصنفین کو بڑا دانا تسلیم کیا جاتا ہے۔ ہم کہتے ہیں ان عقلمندوں کی باتیں مقابلہ کے لئے لاؤ۔ دنیا کی تمام کتابیں جو اب لکھی جا چکی ہیں انہیں اکٹھا کر کے لاؤ۔ یہ نہیں فرمایا کہ جو اپنی طرف سے لوگوں نے لکھی ہیں بلکہ فرمایا جو لکھی گئی ہیں۔ گویا مذہبی اور آسمانی کتابیں بھی لے آؤ یا اعلیٰ درجہ کے علوم کی کتابیں جو لائبریریوں میں محفوظ رکھی جاتی ہیں وہ نکال کر لاؤ۔ اگر یہ سب کی سب کتابیں اس کے مقابلہ میں ہیچ ثابت ہوں تو انہیں ماننا چاہئے کہ مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ اللہ تعالیٰ کے فضل سے تو مجنون نہیں ہے۔

دیکھو یہ کتنا بڑا دعویٰ ہے اور کتنی زبردست دلیل ہے۔ یہ اس زمانہ کے لوگوں کو دلیل دی۔ اور بعد میں آنے والوں کو یہ دلیل دی وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ آئندہ بھی جو لوگ تجھے پاگل کہیں گے ہم انہیں کہیں گے محمد (ﷺ) اب تو تمہارے سامنے نہیں مگر اس کے کارناموں کے نتائج تمہارے سامنے ہیں۔ پاگل جو کام کرتا ہے اس کی کوئی جزا نہیں ہوتی۔ کیا جب کوئی پاگل بادشاہ بن جاتا ہے تو اسے کوئی ٹیکس ادا کیا کرتا ہے؟ یا ڈاکٹر بن جاتا ہے تو اس سے کوئی علاج کراتا ہے؟ یا کوئی نبی بنتا ہے تو کوئی اس کا مرید بنتا ہے؟ مگر رسول کریم ﷺ کے متعلق فرمایا کہ ہم اس کے کاموں کا وہ اجر دیں گے جو کبھی کاٹا نہیں جائے گا۔ کوئی زمانہ ایسا نہیں

آئے گا جب اس کے اعمال کا اجر نہ مل رہا ہوگا۔ جب بھی کوئی پاگل ہونے کا اعتراض کرے اس کے سامنے یہ بات رکھ دی جائے گی کہ پاگل کے کام کا نتیجہ تو اس وقت بھی نہیں نکلتا جب وہ کام کر رہا ہوتا ہے۔ مگر رسول کریم ﷺ کے متعلق دیکھو کہ کئی سو سال گزر جانے کے بعد بھی نتائج نکل رہے ہیں۔

پھر فرمایا ہم ایک اور بات بتاتے ہیں۔ وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ پاگل کو پاگل کہو تو وہ تھپڑ مارے گا لیکن عقل مند برداشت کر لے گا۔ اگر یہ لوگ تجھے پاگل سمجھتے تو تیری مجلس میں آکر تجھے پاگل نہ کہتے بلکہ تجھ سے دور بھاگتے۔ یہ جو تیرے سامنے تجھے پاگل کہتے ہیں یہی ثبوت ہے اس بات کا کہ تو پاگل نہیں ہے اور آئندہ آنے والوں کے لئے یہ ثبوت ہے کہ یہ پاگل کہنے والوں کے متعلق تو یہ تعلیم دیتا ہے کہ ان کے برا بھلا کہنے پر چپ رہو۔ کیا ایسا بھی کوئی پاگل ہوتا ہے جو صرف آپ ہی پاگل کہنے والوں کے مقابلہ میں اپنے جوش کو نہ دبائے بلکہ آئندہ نسلوں کو بھی ہدایت کر جائے کہ مخالفوں کو برا بھلا نہ کہنا۔

فَسَتُبْصِرُ وَيُبْصِرُوْنَ پس عنقریب تو بھی دیکھ لے گا اور وہ بھی دیکھ لیں گے کہ بِاَيِّكُمُ الْمَفْتُوْنُ تم دونوں میں سے کون گمراہ ہے۔ اس دلیل میں اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ پاگل کو کبھی خدائی مدد نہیں ملتی۔ محمد رسول اللہ ﷺ خدا تعالیٰ کی مدد سے کامیاب ہو رہے ہیں پھر ان کو پاگل کس طرح قرار دیا جا سکتا ہے۔

دوسرا اعتراض:

دوسرا اعتراض رسول کریم ﷺ پر اس حالت میں کیا گیا جب مخالفین نے دیکھا کہ پاگل کہنے پر عقل مند لوگ خود ہمیں پاگل کہیں گے۔ جب وہ یہ دیکھیں گے کہ جسے پاگل کہتے ہیں اس نے تو نہ کسی کو مارا ہے نہ پیٹا۔ بلکہ نہایت اعلیٰ درجہ کے اخلاق دکھائے ہیں۔ پس انہوں نے سوچا کہ کوئی اور بات بناؤ۔ اس پر انہوں نے کہا اسے پریشان خوابیں آتی ہیں اور ان کی وجہ سے دعویٰ کر بیٹھا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ اس اعتراض کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے:

بَلْ قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ (الانبیاء:٦) کہتے ہیں کہ اس کا کلام اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ

ہے۔ کچھ مشتبہ سی خوابیں ہیں جو اسے آتی ہیں۔ یعنی آدمی تو اچھا ہے۔ اس کی بعض باتیں پوری بھی ہو جاتی ہیں لیکن بعض بری باتیں بھی اسے دکھائی دیتی ہیں۔ جنون اور اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ میں یہ فرق ہے کہ جنون میں بیداری میں دماغی نقص پیدا ہو جاتا ہے لیکن اَضْغَاثُ میں نیند میں دماغی نقص پیدا ہو جاتا ہے۔ چونکہ مخالفین دیکھتے تھے کہ رسول کریم ﷺ کے معاملات میں کوئی نقص نہیں اس لئے کہتے کہ جنون سے مراد ظاہری جنون نہیں بلکہ خواب میں اسے ایسی باتیں نظر آتی ہیں۔ اس کا جواب قرآن کریم یہ دیتا ہے کہ:

لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (الانبیاء:۱۱)

جن لوگوں کو اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ ہوتی ہیں کیا ان کی خوابوں میں قومی ترقی کا بھی سامان ہوتا ہے؟ پراگندہ خواب تو پراگندہ نتائج ہی پیدا کر سکتی ہے۔ مگر اس پر تو وہ کتاب نازل کی گئی ہے جو تمہارے لئے عزت اور شرف کا موجب ہے۔ کیا دماغ کی خرابی سے ایسی ہی تعلیم حاصل ہوتی ہے؟ تم اپنے آپ کو عقل مند کہتے ہو کیا تم اتنی بات بھی نہیں سمجھ سکتے؟

تیسرا اعتراض:

پھر بعض لوگوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ هٰذَا سٰحِرٌ (ص:۵) کہ یہ جادوگر ہے۔ سٰحِرٌ کے معنی عربی زبان میں جھوٹ کے بھی ہوتے ہیں۔ مگر مخالفین نے رسول کریم ﷺ کو الگ بھی جھوٹا کہا ہے۔ اس لئے اگر اس کے معنی جھوٹ کے ہوں تو اس کا جواب علیحدہ ہوگا۔ دوسرے معنی سٰحِرٌ کے یہ ہوتے ہیں کہ باطن میں کچھ اور ہو اور ظاہری شکل میں کچھ اور دکھائی دے۔ اللہ تعالیٰ اس کے جواب میں فرماتا ہے:

وَاِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا وَيَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ (القمر:۳) اگر یہ لوگ محمد (ﷺ) کا کوئی نشان دیکھتے ہیں تو اعراض کر لیتے ہیں اور کہتے ہیں ہم ان باتوں کو خوب سمجھتے ہیں۔ یہ بڑا پرانا جادو ہے۔ آگے فرماتا ہے: حِكْمَةٌۢ بَالِغَةٌ فَمَا تُغْنِ النُّذُرُ

قرآن میں تو حکمت بالغہ ہے۔ قرآن میں ایسے مضامین ہیں جو دلوں میں تبدیلی پیدا کرنے والے ہیں۔ سٰحِرٌ کے معنی تو یہ ہیں کہ ظاہر کو مسخ کر دیا جائے اور باطن آزاد رہے۔ مگر

قرآن کا اثر تو یہ ہے کہ ظاہر کی بجائے دلوں کو بدلتا ہے اس لئے اسے ملجئ نہیں کہہ سکتے۔

یہ حکمت بالغہ ہے۔ یعنی حکمت کی ایسی باتیں ہیں جو دور تک اثر کرنے والی ہیں۔ یہ اندرونی جذبات اور افکار پر اثر ڈالتی ہیں۔ مگر ان لوگوں کو یہ انذار فائدہ نہیں دیتا۔

چوتھا اعتراض:

پھر بعض نے کہا کہ یہ ساحر تو معلوم نہیں ہوتا ہاں مسحور ضرور ہے۔ یعنی خود تو بڑا اچھا ہے لیکن کسی نے اس پر سحر کر دیا ہے اس لئے یہ ایسی باتیں کہتا پھرتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

وَقَالَ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا (الفرقان:۹)

یعنی ظالم لوگ یہ کہتے ہیں کہ مسلمان ایک مسحور کی اتباع کر رہے ہیں۔ کسی نے اس پر جادو کر دیا ہے جس کی وجہ سے اس کی عقل ماری گئی ہے۔

اس آیت سے پہلے ملائکہ کے نزول کے متعلق معترضین کا مطالبہ ہے۔ جب رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ ملائکہ نازل ہوتے ہیں اور خزانے عطا کرتے ہیں (ملائکہ سے الہام اور خزانے سے معارف قرآن مراد تھے) تو مخالفین نے کہا کہ دیکھو اسے جو ملائکہ نظر آتے ہیں اس کی وجہ یہی ہے کہ یہ مسحور ہے۔ فرشتے ہمیں نظر نہیں آتے خزانے ہمیں دکھائی نہیں دیتے مگر یہ کہتا ہے کہ مجھ پر فرشتے نازل ہوتے ہیں اور خزانے مل رہے ہیں، کہاں ملے ہیں؟ یہ سحر کا ہی اثر ہے جو ایسی باتیں کرتا ہے۔ اسی طرح اور بہت سے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ نَرٰى رَبَّنَا ؕ لَقَدِ اسْتَكْبَرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ وَعَتَوْ عُتُوًّا كَبِيْرًا ۝ يَوْمَ يَرَوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ لَا بُشْرٰى يَوْمَئِذٍ لِّلْمُجْرِمِيْنَ وَيَقُوْلُوْنَ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا ۝ وَقَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا ۝ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ يَوْمَئِذٍ خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَّاَحْسَنُ مَقِيْلًا ۝ وَيَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ وَنُزِّلَ الْمَلٰٓئِكَةُ

تَنْزِيْلًا ۞ اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذِ ِالْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ ؕ وَكَانَ يَوْمًا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ عَسِيْرًا

(الفرقان ۲۲ تا ۲۷)

یعنی یہ نادان کہتے ہیں کہ یہ مسحور ہے اور ثبوت پیش کرتے ہیں کہ ہمیں کیوں فرشتے نظر نہیں آتے، ہمیں کیوں خزانے دکھائی نہیں دیتے۔ لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ ہم پر وہ فرشتے کیوں نہیں اترتے جن کے متعلق یہ کہتا ہے کہ مجھ پر اترتے ہیں۔ اَوْ نَرٰى رَبَّنَا ؕ یا یہ کہتا ہے کہ میں اپنے رب کو دیکھتا ہوں ہمیں وہ کیوں نظر نہیں آتا۔ یہ جاہل خیال کرتے ہیں کہ ہمیں چونکہ وہ چیزیں نظر نہیں آتیں اس لئے یہ جو ان کے دیکھنے کا دعویٰ کرتا ہے تو مسحور ہے۔ مگر یہ اپنے نفسوں کو نہیں دیکھتے۔ کیا ایسے گندوں کو خدا نظر آ سکتا ہے۔ انہوں نے بڑی سرکشی سے کام لیا ہے۔ يَوْمَ يَرَوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ لَا بُشْرٰى يَوْمَئِذٍ لِّلْمُجْرِمِيْنَ ان کو بھی فرشتے نظر آئیں گے مگر اور طرح۔ جب انہیں فرشتے نظر آئیں گے تو یہ کانوں کو ہاتھ لگائیں گے اور کہیں گے کہ کاش یہ ہمیں دکھائی نہ دیتے۔ اس دن مجرموں کے لئے خوشخبری نہیں ہوگی۔ بلکہ یہ گھبرا کر کہیں گے کہ ہم سے پرے ہی رہو۔ اسی طرح ہم بھی ان کو نظر تو آئیں گے مگر انعام دینے کیلئے نہیں بلکہ وَقَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا ہم ان کو تباہ کرنے کے لئے ان کے اعمال کی طرف متوجہ ہوں گے اور ان کی حکومت کو باریک ذرّوں کی طرح اڑا کر رکھ دیں گے۔ اور وہ جن کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ ایک مسحور کے پیچھے چل رہے ہیں ان کیلئے وہ بڑی خوشی کا دن ہوگا۔ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ يَوْمَئِذٍ خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَّاَحْسَنُ مَقِيْلًا ان کو نہایت اعلیٰ جگہ اور آرام دہ ٹھکانہ ملے گا۔ اس کے آگے تفصیل بیان کی ہے کہ وَيَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ وَنُزِّلَ الْمَلٰٓئِكَةُ تَنْزِيْلًا اس دن آسمان سے بارش برسے گی اور بہت سے فرشتے اتارے جائیں گے جیسے بدر کے موقع پر ہوا۔ اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذِ ِالْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ ؕ اس دن مکہ کی حکومت تباہ کر دی جائے گی اور حکومت

محمد رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ میں دے دی جائے گی۔ وَكَانَ يَوْمًا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ عَسِيْرًا اور مکہ کی فتح کا دن کافروں پر بڑا سخت ہوگا۔ باقی رہے خزانے سو ان کے متعلق فرمایا:

وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا (الفرقان:۳۱)

ہمارا یہ رسول قیامت کے دن اپنے خدا سے کہے گا کہ اے میرے رب انہوں نے اگر حکومت نہ دیکھی تھی تو اس کے متعلق اعتراض کر لیتے، خزانے نہ دیکھے تھے تو اعتراض کر لیتے، فرشتے نہ دیکھے تھے تو اعتراض کر لیتے مگر یہ قرآن کو دیکھ کر کس طرح انکار کر سکتے تھے۔ مگر افسوس کہ اتنے بڑے قیمتی خزانہ کا بھی انہوں نے انکار کر دیا۔ حالانکہ یہ تو ان کو دکھائی دینے والی چیز تھی۔ سورۃ بنی اسرائیل میں بھی یہ ذکر ہے کہ رسول کریم ﷺ کو مسحور کہا جاتا تھا۔ چنانچہ فرماتا ہے:

اِذْ يَقُوْلُ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا (بنی اسرائیل:۴۸)

یعنی ظالم لوگ کہتے ہیں کہ تم ایک مسحور کی پیروی کر رہے ہو۔ پھر اس جگہ اور سورہ فرقان میں بھی اس کے معاً بعد یہ آیت آتی ہے:

اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلًا

(الفرقان:۱۰)

یعنی دیکھ یہ کیسی باتیں تیرے لئے بیان کرتے ہیں حالانکہ یہ سارا زور تیرے پیش کردہ کلام کے رد میں لگا رہے ہیں اور ناکامی اور نامرادی کی وجہ سے ان کی جانیں نکلی جا رہی ہیں مگر پھر بھی یہ کہتے ہیں کہ اس پر کسی جادو کا اثر ہے۔ اگر یہ بات ہے تو اس کمزور کے مقابلہ سے یہ لوگ کیوں عاجز آ رہے ہیں۔ مسحور تو دوسروں کا تابع ہوتا ہے اور یہ لوگوں کو اپنے تابع کر رہا ہے اور دوسرے تمام لوگ اس کے مقابل پر عاجز ہیں۔

مجھے نہایت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس اعتراض میں مسلمان بھی کافروں کے ساتھ شامل ہو گئے ہیں اور انہوں نے لکھا ہے کہ یہودیوں نے نعوذ باللہ رسول کریمؐ پر ایک جادو کر دیا تھا اور اس کے اثرات بڑے لمبے عرصہ تک آپ پر رہے۔ اور اس میں وہ امام بخاری کو بھی گھسیٹ لائے ہیں حالانکہ قرآن کریم میں وہ صاف طور پر پڑھتے ہیں وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ

(المائدۃ:۶۸)خدا تعالیٰ تجھے لوگوں کے حملہ سے محفوظ رکھے گا۔اگر لوگ رسول کریم ﷺ پر سحر کر سکتے تھے تو پھر یَعۡصِمُکَ مِنَ النَّاس کس طرح درست ہوا؟

ہم تو دیکھتے ہیں رسول کریم ﷺ تو الگ رہے آپ کے غلاموں پر بھی کوئی سحر نہیں کر سکتا۔ ایک شخص نے ایک احمدی دوست سے بیان کیا کہ میں مسمریزم میں بڑا ماہر ہوں۔ایک دفعہ میں نے ارادہ کیا کہ مرزا صاحب کے پاس جا کر ان پر مسمریزم کروں اور لوگوں کے سامنے ان سے عجیب وغریب حرکات کراؤں۔یہ خیال کر کے میں ان کی مجلس میں گیا اور ان پر توجہ ڈالنے لگا مگر وہ دوسرے لوگوں کے ساتھ بڑے اطمینان کے ساتھ باتیں کرتے رہے اور ان پر کچھ اثر نہ ہوا۔ پھر میں نے اور زور لگایا مگر پھر بھی کوئی اثر نہ ہوا۔آخر میں نے سارا زور لگایا اور کوشش کی کہ آپ پر اثر ڈالوں مگر اس وقت مجھے ایسا معلوم ہوا کہ ایک شیر مجھ پر حملہ کرنے لگا ہے۔یہ دیکھ کر میں وہاں سے بھاگا اور واپس چلا آیا۔لاہور جا کر اس نے حضرت مسیح موعودؑ کو خط لکھا کہ میں نے سمجھ لیا ہے کہ آپ بہت بڑے ولی اللہ ہیں۔کسی نے اسے کہا کہ تم نے ولی اللہ کس طرح سمجھ لیا ہو سکتا ہے وہ مسمریزم میں تم سے زیادہ ماہر ہوں۔اس نے کہا مسمرائیزر کے لئے ضروری ہے کہ وہ خاموش ہو کر دوسرے پر توجہ ڈالے۔مگر وہ اس وقت دوسروں سے باتیں کرتے رہے تھے اس لئے وہ مسمرائیزر نہیں ہو سکتے۔‘‘

(انوار العلوم جلد۱۲ صفحہ ۴۳۰ تا ۴۳۶)

کاہن ہونے کا اعتراض

آپ ﷺ کو کاہن بھی کہا گیا۔اس اعتراض کے رد میں حضرت مصلح موعودؓ فرماتے ہیں:

’’ایک اعتراض یہ کیا گیا کہ آپ کاہن ہیں۔کاہن وہ لوگ ہوتے ہیں جو مختلف علامات سے آئندہ کی خبریں بتاتے ہیں۔چنانچہ قرآن کریم میں آتا ہے۔وَلَا بِقَوۡلِ کَاہِنٍ ؕ قَلِیۡلًا مَّا تَذَکَّرُوۡنَ (الحاقۃ:۴۳)لوگ تجھے کاہن کہتے ہیں حالانکہ تیرا کلام ایسا نہیں مگر یہ لوگ بالکل

نصیحت حاصل نہیں کرتے۔

یہ عجیب بات ہے کہ قرآن کریم میں جہاں دو جگہ مسحور کا ذکر آیا ہے وہاں دونوں جگہ یہ آیت بھی ساتھ آئی ہے کہ اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوا لَكَ الْأَمْثَالَ فَضَلُّوا فَلَا يَسْتَطِيعُونَ سَبِيلًا اسی طرح کاہن کا لفظ بھی دو جگہ آیا ہے۔ اور دونوں جگہ ذکر کا لفظ ساتھ ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کاہن اور مذکر دونوں اضداد میں سے ہیں۔ چنانچہ سورہ طور رکوع ۲ میں آتا ہے۔ فَذَكِّرْ فَمَا أَنْتَ بِنِعْمَتِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ وَلَا مَجْنُونٍ (الطور:۳۰) ان لوگوں کو نصیحت کر کیونکہ تو اپنے رب کے فضل سے نہ کاہن ہے نہ مجنون۔ یعنی کاہن مذکر نہیں ہو سکتا اور مذکر کاہن نہیں ہو سکتا۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ کاہن درحقیقت ارڑ پوپو کی قسم کے لوگوں کو کہتے ہیں جو بعض علامتوں وغیرہ سے اخبارِ غیبیہ بتاتے ہیں۔ چونکہ رسول کریم ﷺ غیب کی اخبار بتاتے تھے بعض نادان آپ کو کاہن کہہ دیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ان کی اخبار تو محض اخبار ہوتی ہے اور اس کی اخبار تذکیر کا پہلو رکھتی ہیں اور اصلاح نفس اور اصلاحِ قوم سے تعلق رکھتی ہیں تو پھر یہ کاہن کیونکر ہوا۔ کاہنوں کی خبریں تو ایسی ہی ہوتی ہیں جیسے مولوی برہان الدین صاحب جہلمی کو ایک نے بتائی تھی۔ مولوی صاحب نے ایک دفعہ پردہ میں بیٹھ کر ایک ارڑ پوپو کو اپنا ہاتھ دکھایا۔ اس نے آپ کو عورت سمجھ کر خاوند کے متعلق باتیں بتانی شروع کر دیں۔ جب وہ بہت کچھ بیان کر چکا تو مولوی صاحب نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے اپنی داڑھی اس کے سامنے کر دی۔ یہ دیکھ کر وہ وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا اور پھر کبھی اس محلّہ میں نہیں آیا۔

غرض کاہنوں کی خبریں محض خبریں ہوتی ہیں کہ فلاں کے ہاں بیٹا ہوگا۔ فلاں مر جائے گا۔ ان میں خدا تعالیٰ کی قدرت کا اظہار نہیں ہوتا۔ مگر محمد رسول اللہ ﷺ جو خبریں بتاتے ہیں ان کو کاہنوں والی خبریں نہیں کہا جا سکتا۔ یہ تو ایمان کو تازہ کرنے والی اور خدا تعالیٰ کی قدرت اور اس کے جلال کو ظاہر کرنے والی ہیں۔ رسول کہتا ہے میں خدا کی طرف سے آیا ہوں جو میرا مقابلہ کرے گا وہ ناکام رہے گا اور جو مجھے مان لے گا جیت جائے گا۔ مگر کوئی کاہن یہ نہیں کہہ سکتا۔ پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ ۚ قَلِيلًا مَا تَذَكَّرُونَ یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ کاہن

کا قول ہے۔ ان کی عقل ایسی ماری گئی ہے کہ اتنی پیش گوئیاں سنتے ہیں جن میں خدا تعالیٰ کی قدرت اور جبروت کا اظہار ہے مگر پھر بھی نصیحت حاصل نہیں کرتے۔

دوسرا ردّ اس کا یہ فرمایا:

فَلَآ اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ ۝ وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ ۝ اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ۝ وَّمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ؕ قَلِيْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ ۝ وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ۝ تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ ۝ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ۝ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ ۝ فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حٰجِزِيْنَ ۝

(الحاقۃ: ۳۹تا۴۸)

یعنی ہم شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں اس کو بھی جسے تم دیکھتے ہو اور اس کو بھی جسے تم نہیں دیکھتے۔ یعنی اس کے ظاہری اور باطنی دونوں حالات اس بات پر شاہد ہیں کہ یہ قرآن ایک عزت والے رسول کا کلام ہے۔ ظاہری حالات کے لحاظ سے ایک بات میں کاہن اور شاعر دونوں مشترک ہوتے ہیں۔ شاعر بھی بڑے بڑے جذبات کا اظہار کرتا ہے اور سب کچھ بیان کرنے کے بعد ہاتھ پھیلا دیتا ہے۔ اسی طرح کاہن بھی خبریں بتا کر مانگتا پھرتا ہے۔ مگر فرمایا یہ رسول تو ایسا ہے جو اپنے پاس سے خرچ کرتا ہے۔ کاہن تو دوسروں سے مانگتا ہے۔ یہاں یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ قرآن کو رسول کریم ﷺ کا کلام قرار دیا گیا ہے یہاں رسول کہہ کر اس شبہ کو رد کر دیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ یہ آپ کا کلام نہیں کیونکہ رسول وہی ہوتا ہے جو دوسرے کا پیغام لائے۔ اگر محمد (رسول اللہ ﷺ) اپنی طرف سے بیان کرتا تو آپ کا کلام سمجھا جاتا ہے مگر یہ تو رسول ہے۔

تیسری دلیل یہ دی کہ کاہن تو اپنے اخبار کو اپنے علم کی طرف منسوب کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں نے جفر، رمل، تیروں اور ہندسوں وغیرہ سے یہ یہ باتیں معلوم کی ہیں۔ وہ خدا تعالیٰ کی طرف اپنی خبروں کو منسوب نہیں کرتا۔ مگر یہ رسول کہتا ہے کہ میں خدا کی طرف سے کلام پا کر سناتا ہوں اور یہ اپنے کلام کو تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ کہتا ہے۔

یہاں یہ بھی بتا دیا کہ کاہن ایسی باتیں بیان کرنے کی وجہ سے اس لئے سزا نہیں پاتا کہ وہ

خدا پر تقوّل نہیں کرتا بلکہ اپنی طرف سے بیان کرتا ہے۔ مگر رسول کہتا ہے کہ خدا کی طرف سے میں بیان کرتا ہوں۔ اگر رسول جھوٹا ہو تو فوراً تباہ کر دیا جاتا ہے۔ پس یہ کاہن نہیں ہے بلکہ خدا کا سچا رسول ہے۔ اور اس پر جو کلام نازل ہوا ہے یہ رب العالمین خدا کی طرف سے اتارا گیا ہے۔ اگر کہو کہ یہ اس طرح اپنی کہانت کو چھپاتا ہے تو یاد رکھو کہ جان بوجھ کر ایسا کرنے والا کبھی سزا سے نہیں بچ سکتا۔ اگر یہ شخص ہماری طرف جھوٹا الہام منسوب کر دیتا خواہ ایک ہی ہوتا تو ہم یقیناً اس کو دائیں ہاتھ سے پکڑ لیتے اور اس کی رگ جان کاٹ دیتے اور اس صورت میں تم میں سے کوئی بھی نہ ہوتا جو اسے خدا کے عذاب سے بچا سکتا۔" (انوار العلوم جلد ۱۲ صفحہ ۴۲۶ تا صفحہ ۴۲۸)

☆

مفتری ہونے کا الزام

آپؐ پر مخالفین کی طرف سے نعوذ باللہ مفتری اور کذاب ہونے کا الزام بھی کیا گیا۔ اس الزام کا تفصیلی جواب دیتے ہوئے حضرت مصلح موعود فرماتے ہیں:

"اعتراض یہ کیا گیا ہے کہ یہ شخص مفتری اور کذاب ہے۔ سورۃ صٓ میں آتا ہے دشمنوں نے کہا هٰذَا سٰحِرٌ كَذَّابٌ اسی طرح سورۃ نحل ۱۴ میں آتا ہے: قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مُفْتَرٍ مخالف کہتے ہیں کہ تو مفتری ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کا جواب یہ دیتا ہے کہ:

وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ۝ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۝

(یونس: ۳۸ تا ۳۹)

فرمایا یہ قرآن خدا کے سوا کسی اور سے بنایا ہی نہیں جا سکتا۔ اس کے اندر تو پہلی کتابوں کی پیش گوئیوں کی تصدیق ہے پھر اس کے اندر الہامی کتابوں کی تفصیل ہے۔ اور اس میں شک کی کوئی بات نہیں۔ یہ کتاب رب العالمین کی طرف سے ہے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ اپنے پاس سے

بنالی ہے۔ ان سے کہو کہ تم اس جیسی کوئی ایک ہی سورت لے آؤ۔ اکیلے نہیں سب کو اپنی مدد کے لئے بلالو اگر تم واقع میں سچے ہو۔

قرآن کریم کے متعلق پانچ دعوے

اس آیت میں پانچ دعوے قرآن کریم کے متعلق پیش کئے گئے ہیں۔ اول یہ کہ قرآن اپنی دلیل آپ ہے اور اسے خدا کے سوا کوئی بنا ہی نہیں سکتا۔ اس میں ایسے امور ہیں جو انسان کے اختیار سے باہر ہیں یعنی امورِ غیبیہ۔ فرماتا ہے۔

قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ (النمل:٦٦)

کہ آسمان اور زمین میں خدا کے سوا کوئی غیب نہیں جانتا۔ مطلب یہ کہ قرآن میں غیب کی باتیں ہیں اور یہ خدا کے سوا کوئی نہیں بتا سکتا۔

دوسرا دعویٰ یہ کیا گیا ہے کہ اس کے ذریعہ پہلی کتابوں کی پیشگوئیاں پوری ہوتی ہیں۔

تیسرا یہ کہ اس میں پہلی کتابوں کی تشریح ہے۔

چوتھا یہ کہ ہر امر کو دلیل کے ساتھ ایسے رنگ میں بیان کرتا ہے کہ اس کے درست ہونے میں کوئی شک نہیں رہ جاتا۔

پانچواں یہ کہ قرآن خدا کی صفت رب **العالمین** کے ماتحت نازل ہوا ہے تا کہ اس کا فیضان سب قوموں کے لئے وسیع ہو۔

فرماتا ہے اگر قرآن افتراء ہے تو ان پانچ صفات والی کوئی سورۃ پیش کرو۔ اگر ان صفات والی سورۃ لے آؤ گے تو ہم مان لیں گے کہ انسان ایسی کتاب بنا سکتا ہے۔ لیکن اگر تم سارے مل کر بھی نہ بنا سکو تو معلوم ہوا کہ ایسی کتاب کوئی انسان نہیں بنا سکتا۔

اس سے معلوم ہوا کہ جس سورۃ (یونس) میں یہ دعوے کئے گئے ہیں اس سے پہلے جس قدر قرآن اتر چکا تھا اس میں یہ پانچ باتیں پائی جاتی تھیں۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ کیا قرآن کے اس حصہ میں یہ پانچوں باتیں ہیں۔ اگر ہیں تو ثابت ہو جائے گا کہ یہ خدا تعالیٰ کا کلام ہے۔

علمِ غیب

پہلی بات یہ بیان فرمائی کہ قرآن میں وہ باتیں ہیں جو خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔یعنی قرآن میں علم غیب ہے۔اس کے لئے جب ہم قرآن کریم کو دیکھتے ہیں تو اس کی نہایت ابتدائی سورتوں میں سے ایک سورۃ کوثر ہے جو ایک عظیم الشان پیشگوئی پر مشتمل ہے۔

خدا تعالیٰ فرماتا ہے:

اِنَّاۤ اَعۡطَيۡنٰكَ الۡكَوۡثَرَؕ‏ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانۡحَرۡؕ‏ اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الۡاَبۡتَرُ

رسول کریم ﷺ کے متعلق دشمن کہا کرتا کہ یہ ابتر ہے اس کی کوئی نرینہ اولاد نہیں۔اس کے بعد اس کا جانشین کون بنے گا۔اللہ تعالیٰ اس سورۃ میں فرماتا ہے کہ تو ابتر نہیں بلکہ تیرا دشمن ابتر ہے۔رسول کریم ﷺ کس طرح ابتر نہیں اور آپ کا دشمن کس طرح ابتر ہے اس کے متعلق خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔اِنَّاۤ اَعۡطَيۡنٰكَ الۡكَوۡثَرَ اے محمد (ﷺ) ہم نے تیرے متعلق فیصلہ کر دیا ہے کہ ہم تجھے ایک عظیم الشان جماعت دیں گے جو روحانی طور پر تیری فرزند ہوگی۔اور اس میں بڑے بڑے اعلیٰ پایہ کے انسان ہوں گے۔پھر فرماتا ہے:فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانۡحَرۡ اے محمد (ﷺ) تو اس خوشی میں خوب نمازیں پڑھ، دعائیں کر اور قربانیاں کر۔کیونکہ ہم تیری روحانی نسل کو بڑھانے والے ہیں۔اور یہ روحانی نسل اس طرح بڑھے گی کہ ابوجہل کا بیٹا چھینیں گے اور تجھے دے دیں گے۔وہ ابتر ہو جائے گا اور تو اولاد والا ہوگا۔یہی حال دوسروں کا ہوگا۔ان کے بیٹے چھین چھین کر ہم تمہیں دے دیں گے۔چنانچہ ایسا ہی ہوا ان کے بیٹے رسول کریم ﷺ کو دے گئے اور وہ روحانی لحاظ سے ابتر ہو گئے۔یہی وجہ تھی کہ جوں جوں رسول کریم ﷺ کو کامیابی ہوتی گئی کفار زیادہ تکلیفیں دیتے گئے۔اس پیشگوئی کے پورا ہونے کا جو سورۃ کوثر میں بیان کی گئی ہے اللہ تعالیٰ نے سورۃ انبیاء رکوع ۴ میں ذکر کیا ہے۔فرماتا ہے:۔

اَفَلَا يَرَوۡنَ اَنَّا نَاۡتِى الۡاَرۡضَ نَـنۡقُصُهَا مِنۡ اَطۡرَافِهَا ؕ اَفَهُمُ الۡغٰلِبُوۡنَ

(الانبیاء:۴۵)

فرمایا کیا یہ لوگ اتنا بھی نہیں دیکھتے کہ ہم ان کے ملک کو اس کے کناروں کی طرف سے

چھوٹا کرتے جا رہے ہیں اور ہر روز ان کی اولادیں محمد رسول اللہ ﷺ کو دے رہے ہیں۔ کیا اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ غالب آئیں گے۔ وہ غالب کس طرح آسکتے ہیں جب کہ ہم ان کے جگر گوشے کاٹ کاٹ کر تیرے حوالے کرتے جا رہے ہیں اور انہی ابتر کہنے والوں کے بچے اور عزیز اسلام میں داخل ہو کر اس کی صداقت ظاہر کر رہے ہیں اور کفار کو بے اولاد اور آنحضرت ﷺ کو با اولاد ثابت کر رہے ہیں۔ چنانچہ مکہ کے بڑے بڑے خاندانوں کے جو بیٹے اور بھتیجے رسول کریم ﷺ کو دیئے گئے ان میں حضرت عثمانؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، حضرت طلحہ بن عبیداللہؓ، حضرت ابوعبیدہؓ، حضرت ارقم بن ابی ارقمؓ، حضرت عثمان بن مظعونؓ اور حضرت سعید بن زیدؓ تھے۔ یہ لوگ ابتدا میں ہی ایمان لے آئے تھے اور وہ رؤساء جو رسول کریم ﷺ کو دکھ دینے میں سب سے بڑھے ہوئے تھے یہ ان کے بیٹے اور بھانجے اور بھتیجے تھے۔ ان کے مسلمان ہونے کی وجہ سے کفار کو اور زیادہ غصہ آتا کہ یہ اپنے باپ دادا کے خلاف کھڑے ہو گئے ہیں اور محمد (ﷺ) کی تائید کرتے ہیں۔ حضرت عثمان بن مظعونؓ ولید بن مغیرہ کے عزیز تھے اور اس نے ان کو پناہ دی ہوئی تھی۔ حضرت عثمانؓ ایک دن باہر جا رہے تھے کہ انہوں نے دیکھا کہ ایک مسلمان پر سخت ظلم کیا جا رہا ہے مگر آپ کو کسی نے کچھ نہ کہا۔ انہوں نے ولید کے پاس جا کر کہا کہ میں اب آپ کی پناہ میں نہیں رہنا چاہتا۔ کیونکہ میں یہ نہیں دیکھ سکتا کہ دوسرے مسلمانوں کو تو اس طرح دکھ دیا جائے اور میں آپ کی پناہ میں محفوظ رہوں۔ اللہ تعالیٰ مومن کے ایمان کی آزمائش کرتا ہے۔ ادھر انہوں نے پناہ ترک کی اور ادھر یہ حادثہ پیش آ گیا کہ لبید جو ایک بہت بڑے شاعر تھے ایک مجلس میں شعر سنا رہے تھے کہ ایک شعر انہوں نے پڑھا جس کا مطلب یہ تھا کہ ہر چیز خدا کے سوا تباہ ہونے والی ہے اور ہر نعمت آخر میں ضائع ہونے والی ہے۔ جب لبید نے پہلا مصرع پڑھا تو حضرت عثمانؓ نے کہا ٹھیک ہے۔ اس پر لبید نے غصہ سے اس کی طرف دیکھا کہ ایک بچہ میرے کلام کی داد دے رہا ہے۔ اسے اس نے اپنی ہتک سمجھا اور کہا۔ اے مکہ والو! پہلے تو تم میں ایسے بدتہذیب لوگ نہ تھے اب تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ انہوں نے یہ بے وقوف بچہ ہے اسے جانے دیں۔ حالانکہ بات یہ تھی کہ انہوں نے قرآن سنا ہوا تھا اور اب

ان کے نزدیک شعروں کی کچھ حقیقت ہی نہیں رہ گئی تھی۔ بلکہ خود لبید نے مسلمان ہونے پر یہی طریق اختیار کیا۔ حضرت عمرؓ نے ایک دفعہ اپنے ایک گورنر کو کہلا بھیجا کہ مجھے بعض مشہور شعراء کا تازہ کلام بھجواؤ۔ جب ان سے اس خواہش کا اظہار کیا گیا تو انہوں نے قرآن کریم کی چند آیات لکھ کر بھیج دیں۔

جب لبید نے دوسرا مصرع پڑھا اور کہا کہ ہر نعمت ضائع ہونے والی ہے تو عثمانؓ نے کہا یہ غلط ہے۔ جنت کی نعمتیں کبھی زائل نہیں ہوں گی۔ یہ سن کر اسے طیش آ گیا اور اس نے اہلِ مجلس سے کہا تم نے بڑی ہتک کرائی ہے۔ اس پر ایک شخص نے عثمانؓ کو برا بھلا کہا اور اس زور سے مُکّا مارا کہ ان کی آنکھ نکل گئی۔ ولید کھڑا دیکھ رہا تھا اس نے کہا دیکھا میری پناہ سے نکل جانے کا یہ نتیجہ ہوا۔ اب بھی پناہ میں آ جاؤ۔ حضرت عثمانؓ نے کہا پناہ کیسی؟ میری تو دوسری آنکھ بھی انتظار کر رہی ہے کہ خدا تعالیٰ کی راہ میں نکلے۔ ان کے فوت ہونے پر رسول کریم ﷺ نے انہیں بوسہ دیا اور آپؐ کی آنکھوں سے اس وقت آنسو جاری تھے۔ جب رسول کریم ﷺ کا صاحبزادہ ابراہیمؓ فوت ہوا تو آپ نے فرمایا اَلْحِقْ بِسَلَفِنَا الصَّالِحِ عُثْمَانَ بْنِ مَظْعُوْنٍ یعنی ہمارے صالح عزیز عثمان بن مظعون کی صحبت میں جا۔

پہلی کتب کی پیشگوئیوں کو پورا کرنے والی کتاب

دوسرا دعویٰ قرآن کریم کے متعلق یہ کیا گیا ہے کہ یہ پہلی کتب کی پیشگوئیوں کو پورا کرنے والی کتاب ہے۔ چنانچہ استثناء باب ۱۸ آیت ۱۵ میں آتا ہے:

> ”خداوند تیرا خدا تیرے لئے، تیرے ہی درمیان سے، تیرے ہی بھائیوں میں سے، تیری مانند ایک نبی برپا کرے گا۔“

اس میں یہ پیشگوئی کی گئی تھی کہ وہ نبی جو آنے والا ہے وہ بنی اسرائیل میں سے نہیں ہوگا بلکہ ان کے بھائیوں یعنی بنی اسمٰعیل میں سے ہوگا۔ گویا وہ اولادِ ابراہیم علیہ السلام میں سے ہی ہوگا نہ کہ کسی غیر قوم سے۔ پھر اس کی علامت یہ بتائی کہ:

> ”جب وہ نبی خداوند کے نام سے کچھ کہے اور وہ جو اس نے کہا ہے واقع نہ

ہو یا پورا نہ ہو تو وہ بات خداوند نے نہیں کہی۔"

اب دیکھو قرآن کی باتیں کیسی پوری ہوئیں اور اس کی بیان کردہ پیشگوئیاں کس طرح سچی نکلیں۔ کفار نے جب رسول کریم ﷺ کے متعلق کہا کہ اس کی اولاد نہیں تو خدا تعالیٰ نے فرمایا ہم اسے اولاد دیں گے اور ابتر کہنے والوں کی اولاد ہی چھین کر دے دیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور یہ پیشگوئی بڑی شان سے پوری ہوئی۔

حضرت مسیح نے اس پیشگوئی کا مصداق ہونے سے انکار کیا ہے۔ چنانچہ یوحنا باب ۱ آیت ۲۱ میں لکھا ہے:۔

"انہوں نے اس سے پوچھا۔ پھر کون ہے؟ کیا تو ایلیا ہے؟ اس نے کہا میں نہیں ہوں۔ کیا تو وہ نبی ہے؟ اس نے جواب دیا کہ نہیں۔"

اسی طرح اعمال باب ۳ میں لکھا ہے کہ وہ نبی مسیح کی بعثت ثانی سے پہلے اور بعثتِ اول کے بعد ظاہر ہوگا۔ بلکہ یہاں تک لکھا ہے کہ:

"سموئیل سے لے کر پچھلوں تک جتنے نبیوں نے باتیں کیں ان سب نے ان دنوں کی خبر دی ہے۔"

یہ پیشگوئی رسول کریم ﷺ کے ذریعہ پوری ہوئی کیونکہ آپؐ ان کے بھائیوں یعنی حضرت ابراہیم کے بیٹے حضرت اسماعیلؑ کی اولاد میں سے تھے۔ اسی طرح یسعیاہ آنے والے نبی کی خبر دیتے ہوئے کہتے ہیں:

"تب قومیں تیری راستبازی اور سارے بادشاہ تیری شوکت دیکھیں گے۔ اور تو ایک نئے نام سے کہلائے گا جسے خداوند کا منہ خود رکھ دے گا۔"

سوائے اسلام کے دنیا میں کوئی مذہب نہیں جس کا نام خدا تعالیٰ نے رکھا ہو۔ چنانچہ اسلام کے متعلق ہی فرمایا ہے وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا ۔

دوسری پیشگوئی اسی کے ساتھ لکھی ہے اور وہ یہ ہے کہ:

"تو آگے کو متروکہ نہ کہلائے گی اور تیری سرزمین کا کبھی پھر خرابہ نام نہ ہوگا۔ بلکہ تو

حفیضیاہ کہلائے گی۔“

یہ پیشگوئی بھی اسلام کے متعلق ہی ہے۔ چنانچہ مکہ کے متعلق خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ مَن دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا جو اس میں داخل ہو وہ امن میں آجاتا ہے۔

پھر حضرت مسیح کہتے ہیں:

”مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنی ہیں۔ مگر اب تم ان کی برداشت نہیں کر سکتے۔ لیکن جب وہ یعنی سچائی کا روح آئے گا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا۔ اس لئے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا لیکن جو کچھ سنے گا وہی کہے گا۔ اور تمہیں آئندہ کی خبریں دے گا۔“

اب دیکھو اس میں کتنی علامتیں رسول کریم ﷺ کی بیان کی گئی ہیں۔ اول یہ کہ آنے والا نبی ایسی تعلیم دے گا جو مسیح تک کسی نے نہیں دی۔ گویا وہ سب سے بڑھ کر تعلیم دے گا۔

(۲) وہ ساری باتیں کہے گا یعنی کامل تعلیم دے گا۔ اور اس کے بعد اور کوئی اس سے بڑھ کر تعلیم نہیں لائے گا۔

(۳) وہ اپنی طرف سے کچھ نہیں کہے گا بلکہ کلام اللہ لائے گا۔

(۴) اس کلام اللہ میں آئندہ کی خبریں ہوں گی۔

(۵) وہ کلام مجھ (یعنی مسیح) پر دشمنوں کے عائد کردہ الزامات کو دور کرے گا۔

یہ سب باتیں رسول کریم ﷺ پر صادق آتی ہیں۔ پہلی بات حضرت مسیح نے یہ فرمائی تھی کہ وہ نبی ایسی تعلیم لائے گا جو پہلے کوئی نہیں لایا۔ قرآن کریم اس کے متعلق فرماتا ہے:

عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ (العلق:۶) یعنی قرآن کریم کے ذریعہ وہ وہ باتیں سکھائی گئی ہیں جو کسی اور کو معلوم نہیں۔ دوسری بات حضرت مسیحؑ نے یہ بیان کی تھی کہ وہ ساری باتیں بتائے گا۔ قرآن کریم میں اس کے متعلق آتا ہے۔ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ (المائدہ:۴) آج سارا دین تم پر مکمل کر دیا گیا ہے۔ پھر سورۃ کہف رکوع ۸ میں آتا ہے۔

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِلنَّاسِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ (الکہف:۵۵) ہم نے اس قرآن میں ہر ضروری بات کو مختلف پیرایوں میں بیان کر دیا ہے۔ تیسری بات حضرت مسیحؑ نے یہ بتائی تھی کہ وہ اپنی طرف سے کچھ نہ کہے گا بلکہ خدا تعالیٰ جو کچھ بتائے گا اسے پیش کرے گا۔ قرآن کریم میں بھی آتا ہے وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى (النجم:۴،۵) یہ رسول اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتا بلکہ خدا ہی کا کلام پیش کرتا ہے۔ باقی سب کتابوں میں انبیاء کی اپنی باتیں بھی ہیں صرف قرآن ہی ایک ایسا کلام ہے جو سارے کا سارا خدا کا کلام ہے۔ پانچویں بات حضرت مسیحؑ نے یہ بیان فرمائی ہے کہ وہ نبی ان الزامات کو دور کرے گا جو میرے پر لگائے جاتے ہیں۔ اس کے متعلق سب لوگ جانتے ہیں کہ حضرت مسیحؑ کو نعوذ باللہ وَلَدُ الزِّنَا کہا گیا تھا اور لعنتی قرار دیا گیا تھا۔ قرآن نے ان الزامات کی پوری تردید کی۔

کتبِ سماویہ کی تفصیل

اب میں تیسری بات بیان کرتا ہوں کہ قرآن کریم کتبِ سماویہ کی تشریح اور تفصیل بیان کرنے والا ہے۔ اس میں علوم روحانیہ کو کھول کر بیان کیا گیا ہے اور انہیں کمال تک پہنچایا گیا ہے۔ میں اس کی ایک دو مثالیں پیش کرتا ہوں تورات میں لکھا تھا:

> ”تیری آنکھ مروت نہ کرے کہ جان کا بدلہ جان، آنکھ کا بدلہ آنکھ، دانت کا بدلہ دانت، ہاتھ کا بدلہ ہاتھ اور پاؤں کا بدلہ پاؤں ہوگا۔“

اور انجیل میں یہ تعلیم دی گئی تھی کہ:

> ”تم سن چکے ہو کہ کہا گیا تھا کہ آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت۔ لیکن تم سے یہ کہتا ہوں کہ شریر کا مقابلہ نہ کرنا بلکہ جو کوئی تیرے داہنے گال پر طمانچہ مارے دوسرا بھی اس کی طرف پھیر دے۔ اور اگر کوئی تجھ پر نالش کر کے تیرا کُرتہ لینا چاہے تو چوغہ بھی اسے لے لینے دے۔ اور جو کوئی تجھے ایک کوس بیگار لے جائے اس کے ساتھ دو

کوس چلا جا۔"

مگر قرآن کریم نے کہا ہے:

وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ۗ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ۝ (الشوریٰ:۴۱)

یعنی شرارت کے مطابق بدی کا بدلہ تو لے لینا جائز ہے لیکن جو شخص معاف کر دے اور اس میں دوسروں کی اصلاح مدنظر رکھے اللہ تعالیٰ اسے خود اجر دے گا۔ اللہ تعالیٰ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔ تورات نے ایک حصہ تو بیان کیا تھا اور دوسرا چھوڑ دیا تھا اور انجیل نے دوسرا حصہ بیان کیا تھا اور پہلا حصہ چھوڑ دیا۔ قرآن کریم نے اس تعلیم کو مکمل کر دیا۔ فرمایا بدی کا بدلہ لے لینا جائز ہے لیکن جو شخص معاف کر دے ایسی صورت میں کہ بدی نہ بڑھے اس کا اجر اللہ پر ہے۔ ہاں جو ایسے طور پر معاف کرے کہ معافی دینے پر ظلم بڑھ جائے تو اس سے خدا ناراض ہوگا کیونکہ وہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔

صدقہ وخیرات اور مرد وعورت کے تعلقات کے متعلق تفصیلی احکام گزشتہ سال کے مضمون میں بیان کر چکا ہوں اور بتا چکا ہوں کہ پہلی کتب میں ان امور کے متعلق صرف مختصر احکام دیئے گئے ہیں۔ مگر قرآن کریم نے ہر ایک حکم کی غرض اور اس کے استعمال کی حدود وغیرہ تفصیل سے بیان کی ہیں۔

دلائل وبراہین سے مزین کلام

قرآن کریم کی چوتھی خصوصیت یہ بیان کی کہ لَا رَيْبَ فِيْهِ۔ ہر ایک امر کو دلیل سے بیان کرتا ہے اور شک کی گنجائش نہیں چھوڑتا۔ شک ہمیشہ ابہام سے پیدا ہوتا ہے مگر قرآن کریم کے دعووں کی بنیاد مشاہدہ پر ہے۔ قرآن میں ہستی باری تعالیٰ، ملائکہ، دعا، نبوت، انبیاء کی ضرورت، قضاء وقدر، حشر ونشر، جنت ودوزخ، نماز وروزہ، حج وزکوٰۃ اور معاملات وغیرہ کے متعلق دلائل بیان کئے گئے ہیں یونہی دعوے نہیں کئے گئے۔ مثلاً جنت کے متعلق آتا ہے۔ وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ مرنے کے بعد تمہیں جنت ملے گی اور تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ

مرنے کے بعد کیا معلوم جنت ملے گی یا نہیں۔قرآن اسی دنیا میں جنت کا ثبوت پیش کرتا ہے اور مومنوں کو اسی دنیا میں جنت حاصل ہو جاتی ہے۔اس کا ثبوت یہ دیا کہ:

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ (حٰمٓ السجدۃ:۳۱)

یعنی وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ اللہ ہمارا رب ہے اور پھر استقامت سے اسلام کی تعلیم پر قائم رہتے ہیں۔ان پر فرشتے اترتے ہیں جو انہیں کہتے ہیں کہ تم غم نہ کرو۔تم کو جنت کی بشارت ہو۔ گویا اسی دنیا میں انہیں خدا سے کلام کرنے کا شرف حاصل ہو جاتا ہے اور جب خدا کا کلام مل گیا تو ریب کہاں رہ گیا۔

قرآن کریم کے ذریعہ صفت رب العالمین کا ظہور

پانچویں بات یہ بیان فرمائی کہ قرآن کریم کا اس حالت میں نزول ہوا کہ اس سے رب العالمین کی صفت کا ظہور ہوتا ہے۔اس لئے کہ اس میں ہر فطرت کا لحاظ رکھا گیا ہے۔بعض انسانوں میں غصہ زیادہ ہوتا ہے اس لئے ضروری ہے کہ انہیں عفو کی طرف توجہ دلائی جائے۔بعض میں دیوثی اور بے غیرتی ہوتی انہیں غیرت کی تعلیم دی گئی۔انجیل نے اس کا خیال نہیں رکھا اس نے ہر حال میں عفو کی تعلیم دی ہے اور تورات نے عفو کا خیال نہیں رکھا اور ہر حالت میں سزا دینے پر زور دیا ہے۔مگر قرآن نے دونوں قسم کے لوگوں کا خیال رکھا ہے۔پھر زمانہ کا خیال رکھا ہے اور تمام دنیا کو دعوت دی ہے۔چنانچہ فرمایا:۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا (الاعراف:۱۵۹)

کہہ دے اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ تعالیٰ کا رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں۔

پس قرآن کریم سے پہلے کوئی کتاب ایسی نہیں جس نے ساری دنیا کو دعوت دی ہو۔انہوں نے دوسری قوموں کے لئے رستے بند کر دیئے۔حضرت مسیحؑ کا انجیل میں یہ قول موجود ہے کہ:

”میں اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا اور کسی کے پاس نہیں بھیجا گیا۔“

اور یہ کہ:

”لڑکوں کی روٹی لے کر کتوں کو ڈال دینی اچھی نہیں۔“

گویا مسیح نے بنی اسرائیل کے سوا کسی اور کو ہدایت دینے سے انکار کر دیا۔ مگر قرآن میں سب قوموں کے ماننے کے لئے خدا تعالیٰ نے سامان جمع کر دیئے۔ مثلاً

(ا) سارے نبیوں کی تصدیق کی۔ اس سے سب کے دلوں میں بشاشت پیدا کر دی۔ لیکن اگر کوئی ہندو، عیسائی ہو تو اسے یہ کہنا پڑتا ہے کہ بدھ اور کرشن جھوٹے ہیں۔ اور اگر کوئی عیسائی ہندو ہو تو اسے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جھوٹا قرار دینا پڑتا ہے۔ مگر کتنی خوبی کی بات ہے کہ قرآن نے کہہ دیا:

إِنَّآ أَرْسَلْنَٰكَ بِٱلْحَقِّ بَشِيرًا وَنَذِيرًا ۚ وَإِن مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ

(فاطر: ۲۵)

ہم نے اے محمد (ﷺ) تجھے حق کے ساتھ بشیر اور نذیر بنا کر بھیجا ہے۔ اور کوئی قوم ایسی نہیں جس میں ہماری طرف سے نذیر نہ بھیجا گیا ہو۔ اس بنا پر رسول کریم ﷺ نے تمام اقوام سے کہہ دیا کہ مجھے قبول کر کے تمہیں اپنے بزرگوں کو جھوٹا کہنے کی ضرورت نہیں۔ وہ بھی سچے تھے۔ ہاں ان میں اور مجھ میں یہ فرق ہے کہ ان کی تعلیم اس زمانہ کے لئے مکمل تھی جس میں وہ آئے۔ لیکن میں جو تعلیم لایا ہوں یہ ہر زمانہ کے لئے مکمل ہے۔

مفتری ہمیشہ ناکام ہوتا ہے

دوسری دلیل رسول کریم ﷺ کے مفتری نہ ہونے کی قرآن کریم یہ بیان کرتا ہے کہ مفتریوں کا ذکر کرنے کے بعد فرماتا ہے:

أُولَٰٓئِكَ لَمْ يَكُونُوا مُعْجِزِينَ فِى ٱلْأَرْضِ وَمَا كَانَ لَهُم مِّن دُونِ ٱللَّهِ مِنْ أَوْلِيَآءَ ۘ يُضَٰعَفُ لَهُمُ ٱلْعَذَابُ ۚ مَا كَانُوا يَسْتَطِيعُونَ ٱلسَّمْعَ وَمَا كَانُوا يُبْصِرُونَ ۝ أُولَٰٓئِكَ ٱلَّذِينَ خَسِرُوٓا أَنفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُم مَّا كَانُوا

يَفۡتَرُوۡنَ ﴿۲۱﴾ (ہود:۲۱۔۲۲)

یعنی لوگ کہتے ہیں کہ یہ نبی جھوٹ پیش کرتا ہے حالانکہ اس قسم کا جھوٹ بنانے والے تو خدا کے عذاب میں گرفتار ہوتے ہیں اور وہ عذاب سے ہرگز بچ نہیں سکتے۔ ان کا عذاب لحظہ بہ لحظہ بڑھتا جاتا ہے اور وہ سچی بات سننے کی بھی طاقت نہیں رکھتے کجا یہ کہ وہ سچی باتیں خود بنا سکیں۔ وہ عذاب سے گھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور جب دنیا میں ان کا یہ حال ہوتا ہے تو تم سمجھ سکتے ہو کہ قیامت میں ان کا کیا حال ہوگا۔

اس میں بتایا کہ مفتریوں کی تو یہ علامت ہوتی ہے کہ ان پر عذاب نازل ہوتا ہے مگر محمد رسول اللہ ﷺ پر تو کوئی عذاب نہیں آیا بلکہ خدا نے اس کی مدد کی ہے۔

دوسری علامت مفتری کی یہ ہوتی ہے کہ اس کا عذاب بڑھتا جاتا ہے مگر اس رسول کی تو ہر گھڑی پہلی سے اچھی ہے۔

(۳) پھر مفتری کو اپنی تعلیم بدلنی پڑتی ہے۔ مگر کیا اس نے بھی قرآن کی کوئی بات بدلی؟ پھر یہ مفتری کس طرح ہوسکتا ہے۔"

(انوار العلوم جلد ۱۲ صفحہ ۴۵۳ تا صفحہ ۴۶۲)

باب سوم

گناہ گار ہونے کے الزامات

اور

استغفار کی حقیقت

پاک اور پوتر نہ ہونے کا الزام

پنڈت لیکھرام پشاوری نے آنحضورؐ کی ذات پر الزام لگایا کہ آپؐ پاک اور پوتر نہ تھے

اس بارے میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام چشمہ معرفت میں تحریر فرماتے ہیں:

''اور اگر کسی نادان دشمن کی اب بھی تسلّی نہ ہو تو ہم ایک تازہ ثبوت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پوتر اور پاک ہونے کا لکھتے ہیں جس پر لیکھرام آریہ نے اپنے مارے جانے سے مہر لگا دی ہے واضح ہو کہ مضمون پڑھنے والے نے جس قدر ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر حملے کئے ہیں وہ صرف آنکھیں بند کر کے لیکھرام کی کتابوں میں سے لکھے ہیں اور یہ لیکھرام کا ہی دعویٰ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی پوتّر اور پاک نہیں تھی۔ اور اُس کے نزدیک ویدوں کے رشیوں کی زندگی پاک تھی۔ اسی نفسانی خیال کی وجہ سے وہ قادیان میں آیا میں نے اُس کو سمجھایا کہ خدا کے پاک نبی پر حملہ کرنا اچھا نہیں مگر وہ خدا کی عظمت اور قدرت کا منکر تھا اس کو اس بات کی کچھ بھی پروا نہیں تھی کہ خدا سے ڈرے اور راہِ راست کو انصاف کے ساتھ دیکھے اور اُس کی شوخی حد سے بڑھ گئی تھی اور بجز ٹھٹھے اور ہنسی اور گالی کے کوئی اس کا شیوہ نہ تھا آخر میں نے اُس کو مباہلہ کے لئے بلایا یعنی اس بات کے لئے کہ وہ بجائے خود اور میں بجائے خود دعا کروں کہ خدا جھوٹے کو ہلاک کرے اور اس طرح پر مجھ میں اور اس میں فیصلہ کر دے۔ پس بد دعا کے وقت مجھ کو خدا نے اس کی نسبت بشارت دے دی کہ وہ چھ۶ برس کے اندر قتل کے ذریعہ سے جوانا ں مرگ مرے گا اور عید کے بعد جو دن آتا ہے اس میں یہ پیشگوئی پوری ہوگی۔ ایسا ہی لیکھرام نے میرے مقابل پر اپنا مباہلہ چھپوا دیا یعنی یہ دُعا کہ سچے کے حق میں خدا فیصلہ کرے اور جھوٹے پر اپنا قہر نازل کرے یہ دُعا اُس نے اپنی کتاب میں ابوجہل کی طرح بڑے درد دل سے لکھی ہے اور خدا سے فیصلہ چاہا ہے پس خدا نے اُس کے قتل کئے جانے سے یہ فیصلہ کر دیا کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب میں جھوٹا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم درحقیقت پوتّر اور پاک اور صادق ہیں اور نیز یہ کہ موجودہ ویدوں کی تعلیم صحیح نہیں ہے پھر نہ معلوم کہ اس خدائی فیصلہ کے بعد مضمون

پڑھنے والے نے دوبارہ اعتراض کیوں پیش کر دیا کیا اس کو خدائی فیصلہ سے تسلی نہ ہوئی اور اگرچہ ہم لیکھرام کا یہ مباہلہ اپنی کتاب حقیقۃ الوحی میں درج کر چکے ہیں مگر پھر بھی آریہ صاحبوں کی خاطر سے اس جگہ بھی درج کر دیتے ہیں اور ہم اُن کو متنبہ کرتے ہیں کہ پوتر اور پاک کی یہ نشانی ہے جو خدا کی گواہی سے اُس کا پاک ہونا ثابت ہو نہ صرف دعویٰ۔ جیسا کہ وید کے رشیوں کے بارے میں کیا جاتا ہے بھلا بتلاؤ کہ اس بات کا ثبوت کیا ہے؟ کہ وید کے رشی پوتر تھے کونسی خدا نے گواہی اُن کے پوتر ہونے کے بارے میں دی ہے اُن کی گندی تعلیمیں نیوگ وغیرہ صاف بتلا رہی ہیں کہ انہوں نے پاک راہ کی طرف ہدایت نہیں کی پھر وہ آپ کیونکر پاک اور پوتر ٹھہر سکتے ہیں۔ (چشمہ معرفت، روحانی خزائن جلد نمبر ۲۳ صفحہ ۱۷۶ تا ۱۷۷)

آپؐ کے استغفار پر اعتراض کی حقیقت

۳؍اگست ۱۹۰۳ء شام کی مجلس میں سلسلہ کلام اس امر سے شروع ہوا کہ تمام نبیوں اور راستبازوں کے کلام میں عجز وانکسار کے الفاظ اور اپنی کمزوری کا اظہار پایا جاتا ہے۔ اس پر اعتراض نہیں کرنا چاہئے۔ حضرت حجۃ اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جو اشتہار متعلقہ زلزلہ میں اس قسم کے الفاظ استعمال کئے ہیں ان پر مولوی محمد حسین بٹالوی نے اعتراض کیا ہے۔ اعلیٰ حضرت نے میرے معزز بھائی مفتی محمد صادق صاحب کو غالباً بائبل میں ایسے مقامات دیکھنے کے لئے ارشاد فرمایا تھا۔ اس کا ذکر مفتی صاحب نے کیا۔ اس پر اعلیٰ حضرت نے فرمایا:

اس قسم کے الفاظ تمام نبیوں کی کتابوں میں پائے جاتے ہیں چونکہ ان کی معرفت بہت بڑھی ہوئی ہوتی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی عظمت اور جبروت کے مقام کو شناخت کرتے ہیں۔ اس لئے نہایت انکسار اور عاجزی کا اظہار کرتے ہیں۔ نادان جن کو اس مقام کی خبر نہیں ہے وہ اس پر اعتراض کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ ان کی کمال معرفت کا نشان ہوتا ہے۔ آنحضرتؐ کے لئے إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ ۝ وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا ۝ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ إِنَّهُ كَانَ تَوَّابًا ۝ (النصر: ۲ تا ۴) آیا ہے۔

اس میں صاف فرمایا ہے ہتو استغفار کر۔اس سے کیا مراد ہے؟اس سے یہی مراد ہے کہ تبلیغ کا جو عظیم الشان کام تیرے سپرد تھا دقائق تبلیغ کا پورا پورا علم تو اللہ تعالیٰ ہی کو ہے اس لئے اگر اس میں کوئی کمی رہی ہو تو اللہ تعالیٰ اسے معاف کر دے۔ یہ استغفار تو نبیوں اور راستبازوں کی جان بخش اور عزیز چیز ہے۔اب اس پر نادان اور کوتاہ اندیش عیسائی اعتراض کرتے ہیں۔ جہاں استغفار کا لفظ انہوں نے سن لیا جھٹ اعتراض کر دیا حالانکہ اپنے گھر میں دیکھیں تو مسیح کہتا ہے کہ مجھے نیک مت کہہ۔اس کی تاویل عیسائی یہ کرتے ہیں کہ مسیح کا منشا یہ تھا کہ مجھے خدا کہے۔ یہ کیسے تعجب کی بات ہے۔کیا مسیح کو ان کی والدہ مریم یا ان کے بھائی خدا کہتے تھے جو وہ یہی آرزو اس شخص سے رکھتے تھے کہ وہ بھی خدا کہے۔انہوں نے یہ لفظ تو اپنے عزیزوں اور شاگردوں سے بھی نہیں سنا تھا۔وہ بھی استاد استاد ہی کہا کرتے تھے۔پھر یہ آرزو اس غریب سے کیونکر ان کو ہوئی۔کیا وہ خوش ہوتے تھے کہ کوئی انہیں خدا کہے یہ بالکل غلط ہے ان کو نہ کسی نے استاد (''خدا''۔مرتب) کہا اور نہ انہوں نے کہلوایا۔پھر ایک اور توجیہ کرتے ہیں کہ دراصل وہ شخص منافق تھا۔اس لئے حضرت مسیح گویا خفا ہوئے کہ تُو نیک کیوں کہتا ہے کیونکہ تو مجھے نہیں جانتا۔یہ بھی بالکل غلط بات ہے۔ کہاں سے معلوم ہوا کہ وہ منافق تھا۔

غرض اصل بات یہی ہے کہ خدا تعالیٰ کے برگزیدہ بندے اپنی عبودیت کا اعتراف کرتے رہتے ہیں اور دعاؤں میں لگے رہتے ہیں۔احمق ان باتوں کو عیب سمجھتے ہیں۔اگر آنحضرتؐ کی دعاؤں کو دیکھا جاوے تو پھر ایسے احمق اعتراض کرنے والے تو خدا جانے کیا کیا کہیں۔جیسے:

اَللّٰھُمَّ بَاعِدْ بَیْنِیْ وَ بَیْنَ خَطَایَایَ کَمَا بَاعَدْتَ بَیْنَ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ

(ترجمہ: اے اللہ میرے اور میری خطاؤں کے درمیان اسی طرح بُعد اور دوری پیدا فرما دے جس طرح مشرق اور مغرب کے درمیان تو نے بُعد پیدا فرمایا ہے۔مرتب)

(ملفوظات جلد۴ صفحہ ۳۱۵ تا ۳۱۶ ایڈیشن ۲۰۰۳ء)

☆

ایک عیسائی کے اعتراض "وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِکَ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ.......اور اس کے امثال سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا گنہگار ہونا ثابت ہوتا ہے" کے جواب میں حضرت حکیم مولانا نورالدینؓ نے فرمایا:

پھر کیا ہوا۔سوچو تو سہی ۔مسیح ملعون بنیں اور ان کی الوہیت اور خدائی میں بٹہ نہ لگے بایں ہمہ گنہگار کے تمام عیسائیوں کے معاصی سے گنہگار ہوئے اور بقول عیوب عورت کے شکم سے نکل کر صادق نہیں ٹھہر سکتے تھے۔دیکھو ایوب وہ جو عورت سے پیدا ہوا کیا ہے کہ صادق ٹھہرے۔(۱۵باب۱۴ ایوب)

پھر مریم جب بگناہ موروثی آدم گنہگار تھی تو مسیح کو کوئی پاک نہیں ٹھہرا سکتا۔کون ہے جو ناپاک سے پاک نکالے۔کوئی نہیں ۔(ایوب۱۴باب۴)اور پھر عیسائیوں میں تمام آدمی کے گناہ سے گنہگار ہیں اور آدم کا گناہ عورت سے شروع ہوا تو مریم اور اس کا بیٹا کیسے محفوظ رہ سکتے ہیں؟ پس گنہگار اگر الوہیت سے معزول نہیں تو گنہگار نبوت اور رسالت سے کیسے معزول ہوسکتا ہے۔

اور سنو! کتب مقدسہ کا محاورہ ہے ۔مورثِ اعلیٰ کا نام لے کر قوم کو مخاطب کیا جاتا ہے ۔دیکھو یترون (یعقوب)موٹا ہوا۔اور اُس نے لات ماری۔تو تُو موٹا ہوگیا۔چربی میں چھپ گیا۔خالق کو چھوڑ دیا(استثناء۳۲باب ۹۔۱۰)یعقوب کو جیسی اس کی روشیں ہیں ۔سزا دے گا۔۱۱باب۲ہوشیع ۔یعقوب کو اس کا گناہ اور اسرائیل کو اس کی خطا جتاؤں (میکہ۳باب ۸)یہ تو عہد عتیق کا محاورہ سنایا۔اب عہدِ جدید کو سُنئے ۔اس نے تو حد کر دی سنو!سنو!سنو!

مسیح نے ہمیں مول لے کر شریعت سے چھڑایا کہ وہ ہمارے بدلہ سے لعنت ہوا۔

(نامہ گلتیاں۳باب۱۳،۱۴۔قرنتی۵باب ۲۱)

پس مَیں کہتا ہوں جب صاحبِ قوم قوم کے گناہ سے گنہگار کہا جاتا ہے۔اور جب قوم کو صاحبِ قوم کے نام سے مخاطب کیا جاتا ہے تو آپ نے ان آیات میں جن سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا گنہگار ہونا ثابت کرتے ہیں اس امر کو کیوں فروگزاشت کئے دیتے ہیں بایں ہمہ جن آیات

سے آپ لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت الزام قائم کرتے ہیں۔ان میں یقینی طور پر بلحاظ عربی بول چال کے اعتراض ہو ہی نہیں سکتا۔مثلاً سوچو آیت **وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِکَ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ** میں ہم کہتے ہیں۔ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ والا واؤ عطف تفسیری کا واؤ ہے۔اور واؤ تفسیری خود قرآن میں موجود ہے۔دیکھو سورۃ رعد۔

تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ ۭ وَالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ (الرعد:۲)

تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ وَقُرْاٰنٍ مُّبِيْنٍ (الحجر:۲)

(فصل الخطاب حصہ اوّل طبع دوم صفحہ ۱۶۷،۱۶۸)

استغفار کی حقیقت

اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو استغفار کا حکم دیا ہے۔اس پر معاندین آپؐ کے گناہ گار ہونے کا اعتراض کرتے ہیں۔اس اعتراض کا جواب اور آپ کے استغفار کی حقیقت بیان کرتے ہوئے حضرت مصلح موعودؓ سورۃ النصر کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

''استغفار کا لفظ **غَفْرٌ** سے نکلا ہے اور جیسا کہ حلِ لغات میں بتایا جاچکا ہے **غَفْرٌ** کے معنے ڈھانکنے یا حفاظت کرنے کے ہیں۔اور استغفار کے معنے ہیں حفاظت کے لئے دُعا یا طلبِ حفاظت۔گویا استغفار کرنے والا شخص اللہ تعالیٰ سے دُعا کرتا ہے کہ وہ اس کو اپنی حفاظت میں لے لے اور اس کی بشریّت کی کمزوریاں ظاہر نہ ہوں۔یا یہ کہ وہ خدا تعالیٰ کی حفاظت میں اِس طور پر آجائے کہ اس سے کوئی گناہ سرزد نہ ہو۔

قرآن کریم نے استغفار کے معنے میں وسعت پیدا کرتے ہوئے اس کو ان معنوں میں بھی استعمال کیا ہے کہ جو گناہ انسان سے صادر ہو چکے ہوں ان کے بدنتائج اور ان کی سزا سے بچنے کے لئے اللہ تعالیٰ کی حفاظت طلب کی جائے۔چنانچہ قرآن کریم میں یہ لفظ اس مفہوم میں کثرت سے استعمال ہوا ہے۔اور یہ ادنیٰ لوگوں کی لئے ہے۔کامل لوگوں کے لئے اس کا یہی

مفہوم ہوتا ہے کہ قوم کی اصلاح کرتے ہوئے اگر کوئی امر نظر انداز ہو جائے تو اللہ تعالیٰ اس کا ازالہ کر دے۔

سورۃ نصر کی زیرِ تفسیر آیت میں اللہ تعالیٰ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا ہے۔ کہ اے ہمارے رسول! اِسْتَغْفِرْهُ ۔اللہ تعالیٰ سے استغفار کرو۔اِسی طرح قرآن کریم میں بعض مقامات پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اِسْتَغْفِرْ لِذَنْبِکَ کے الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں کہ اپنے ذنب کے لئے استغفار کرو۔

ایسے مقامات کو پڑھتے وقت یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ استغفار کا لفظ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کن معنوں میں استعمال ہوا ہے۔کیا اِن معنوں میں کہ آپؐ سے کوئی گناہ سرزد ہوا تھا اور پھر آپؐ کو حکم ہوا کہ آپؐ اس کی سزا سے بچائے جانے کی دُعا کریں یا کسی اور معنے میں؟

عیسائی صاحبان بھی ہمیشہ اِس قسم کی آیات کو لے کر جہاں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو استغفار کا حکم دیا گیا ہے مسلمانوں پر اعتراض کرتے چلے آئے ہیں کہ دیکھو تمہارا رسول گناہ گار تھا تبھی تو ان کو استغفار کا حکم دیا گیا۔اور اس کے بعد وہ یہ کہہ دیتے ہیں کہ چونکہ مسیح علیہ السلام کے لئے کوئی ایسا لفظ استعمال نہیں ہوا اس لئے وہ گناہوں سے پاک تھے۔

اِس اعتراض کے جواب میں مسلمانوں کو بڑی دقّت پیش آئی۔اور گو انہوں نے جواب دینے کی بڑی کوشش کی ہے لیکن حضرت مسیح موعود علیہ السلام سے پہلے اِس کا جواب دینے میں وہ کامیاب نہیں ہو سکے۔اور یہی وجہ تھی کہ ہزارہا مسلمان عیسائی بن گئے۔اَور تو اَور سادات میں سے بھی بعض نے بپتسمہ لے لیا۔غرض رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق لفظ استغفار کے استعمال سے عیسائیوں نے مسلمانوں کو دھوکہ دیا اور بجائے اس کے کہ مسلمان عیسائیوں کو جواب دیتے وہ خود ان کے دھوکہ میں آ گئے۔

ان آیات کو جن میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے استغفار کا لفظ استعمال ہوا ہے حل کرنے کے لئے یہ امر اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم

دُنیا کی ہدایت اور راہنمائی کے لئے آئے تھے۔اور اس دُنیا میں اِس لئے مبعوث کئے گئے تھے کہ تا گمراہ اور بے دین لوگوں کو باخدا انسان بنائیں اور نا گناہوں اور بدیوں میں گرفتار شدہ انسانوں کو پاک وصاف کریں۔

اور آپؐ کا درجہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے اِن الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (آل عمران:۳۲) اے ہمارے رسول! تم یہ بات لوگوں کو اچھی طرح سُنا دو کہ اگر وہ خدا تعالیٰ سے محبت رکھتے ہیں تو اُن کو چاہئے کہ وہ تیری اتباع کریں۔اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے پیارے اور محبوب بن جائیں گے۔پھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت قرآن کریم میں آتا ہے لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (الاحزاب:۲۲) کہ اے مسلمانو! اِس رسول میں تمہارے لئے ایک نیک نمونہ ہے۔اگر تم خدا کے حضور مقبول بننا چاہتے ہو اور اگر تم خدا سے تعلق پیدا کرنا پسند کرتے ہو تو اس کا آسان طریق یہ ہے کہ اس رسول کے اقوال، افعال اور حرکات وسکنات کی پیروی کرو۔کیونکہ آپؐ کے اقوال وافعال ہیں جیسا کہ قرآن کریم نے آپؐ کے متعلق وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى (الانفال:۱۸) کہہ کر آپؐ کے کنکر پھینکنے کو اللہ تعالیٰ کا کنکر پھینکنا قرار دیا ہے۔پھر آپؐ کے متعلق یہ بھی فرمایا کہ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى (النجم:۴،۵) یعنی یہ نبی اپنی خواہش سے کلام نہیں کرتا بلکہ وہی بات کہتا ہے جو خدا تعالیٰ اس کو بذریعہ وحی حکم دیتا ہے۔پس وہ شخص جس کی اتباع سے انسان خدا سے ملتا ہی نہیں بلکہ اس کا محبوب بن جاتا ہے۔اور وہ شخص جو دُنیا کے لئے ایک نمونہ تھا اور جس کے اقوال وافعال خدا کے اقوال وافعال تھے اس کا استغفار ان معنوں میں نہیں ہوسکتا کہ اس سے کوئی گناہ سرزد ہوا تھا اور اُس نے یہ دُعا کی کہ اللہ تعالیٰ اس کو اِس گناہ کی سزا سے بچالے۔کیونکہ یہ ظاہر بات ہے کہ اگر وہ بھی گناہ کا مرتکب ہوسکتا تھا تو خدا تعالیٰ نے اس کی اتباع کا کیوں حکم دیا اور اُسے دنیا کے لئے نمونہ کیوں قرار دیا؟ پس آپ کو نمونہ قرار دینے کے معنے ہی یہ ہیں کہ آپؐ ہر ایک بدی اور گناہ سے پاک تھے۔گویا آپ کا استغفار گناہوں کی سزا سے بچنے کے لئے نہ تھا بلکہ کسی اور

معنے میں تھا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر وہ کونسے معنے ہیں جن کو ادا کرنے کے لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے استغفار کا لفظ استعمال ہوا ہے۔سو جاننا چاہئے کہ زیر تفسیر سورۃ کی ابتدائی دو آیات میں یہ مضمون بیان کیا گیا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد بھی مسلمانوں کی نصرت کا سلسلہ جاری رہے گا اور فتوحات کے دروازے ان کے لئے کھول دیئے جائیں گے۔اور قومیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس طرح برکت پائیں گی جس طرح آپ کی زندگی میں لوگوں نے برکت پائی تھی۔ گویا اِن آیات میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا گیا تھا کہ آئندہ زمانہ میں ہزاروں ہزار لوگ اسلام میں ایک وقت میں داخل ہوا کریں گے۔اور یہ ظاہر ہے کہ جب کسی قوم کو فتح حاصل ہوتی ہے اور مفتوح قوم کے ساتھ فاتح قوم کے تعلقات قائم ہوتے ہیں تو ان میں جو بدیاں اور بُرائیاں ہوتی ہیں وہ فاتح قوم میں بھی آنی شروع ہو جاتی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ فاتح قوم جن ملکوں سے گزرتی ہے ان کے عیش وعشرت کے جذبات اپنے اندر لے لیتی ہے اور چونکہ عظیم الشان فتوحات کے بعد اس قدر آبادی کے ساتھ فاتح قوم کا تعلق ہوتا ہے جو فاتح سے بھی تعداد میں زیادہ ہوتی ہے۔اس لئے اس کو فوراً تعلیم دینا اور اپنی سطح پر لانا مشکل ہوتا ہے۔اور جب فاتح قوم کے افراد مفتوح قوم میں ملتے ہیں تو بجائے اس کو اخلاقی طور پر نفع پہنچانے کے خود اس کے بد اثرات سے متاثر ہو جاتے ہیں۔ جس کا نتیجہ رفتہ رفتہ نہایت خطرناک ہوتا ہے۔اور درحقیقت جس وقت کوئی قوم ترقی کرتی اور کثرت سے پھیلتی ہے وہی زمانہ اس کے تنزل اور انحطاط کا بھی ہوتا ہے۔پس رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان فتوحات کی خبر کو معلوم کر کے طبعی طور پر متفکر ہو سکتے تھے کہ ان فتوحات کے ساتھ ساتھ کہیں مسلمانوں میں انحطاط تو شروع نہ ہو جائے گا اور وہ لوگ جو اسلام میں نئے داخل ہوں گے ان کی پوری طرح تربیت کا کیا سامان ہو گا کیونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جیسا کامل استاد اور نفوس کا تزکیہ کرنے والا اور کامل راہنما ان کو میسّر نہ ہو گا۔پس ان خیالات کے جواب کے طور پر اللہ تعالیٰ نے اِسۡتَغۡفِرۡهُ کے الفاظ نازل فرمائے اور بتایا کہ اے محمد رسول اللہ! جب تک

آپ دنیا میں رہے آپ نے اپنی ذمہ داری کو ادا کیا اور تربیت اور تزکیہ نفوس کا کام کرتے رہے۔ لیکن جب آپ ہمارے پاس آجائیں گے تو آپ کی ذمہ داری ختم ہو جائے گی اور اللہ تعالیٰ خود اُمتِ محمدیہؐ کا کفیل ہو جائے گا۔ ایسی صورت میں آپ کو فکر کی کیا ضرورت ہے۔ ہاں آپ وہ کام کریں جو آپ کی استطاعت میں ہے اور وہ یہ کہ آپ دُعاؤں میں لگ جائیں اور اللہ تعالیٰ سے التجا کریں کہ وہ نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کی حفاظت کرے اور ان کی نصرت کرتا رہے بلکہ اسلام میں نئے داخل ہونے والوں کی بھی خود ہی تربیت کا سامان کرے اور ایسی صورت پیدا کردے کہ تمام مسلمان ٹھوکر اور غلطیوں سے بچتے رہیں۔ اور اگر کبھی کوئی رخنہ پیدا بھی ہو تو اس کی اصلاح کا سامان خدا تعالیٰ پیدا کرتا رہے۔ گویا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی ذات کے لئے استغفار کرنے کا حکم نہیں دیا گیا۔ بلکہ اپنی اُمت کے لوگوں کے لئے استغفار کا حکم دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے آپ دُعا کریں کہ وہ آپ کی اُمت کی حفاظت فرمائے اور ان میں کوئی روحانی طور پر رخنہ نہ پڑے۔ اور اگر کوئی خرابی پیدا ہو تو اس کی اصلاح کا سامان پیدا ہو جائے۔ چنانچہ روایات سے پتہ چلتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حکم کے مطابق دعا کرنی شروع کردی اور واقعات بتاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس دُعا کو شرفِ قبولیت بخشا اور آپ کی وفات کے بعد جس قدر فتنے پیدا ہوئے ان کی اصلاح کردی گئی اور آئندہ ایسا انتظام کردیا گیا کہ ہر فتنے کے پیدا ہونے پر اس کی اصلاح ہو جائے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ آپ کی وفات پر جب بعض قبائل عرب مرتد ہوگئے اور بعض نے زکوۃ دینے سے انکار کردیا تو اللہ تعالیٰ نے اس فتنہ کا ایسا سدّ باب کیا جس کی نظیر ملنی مشکل ہے اور پھر سے اسلام صحیح شکل میں قائم ہوگیا۔ اگر اس وقت اس فتنہ کو دبایا نہ جاتا تو اسلام کی صحیح شکل کا قائم رہنا مشکل امر تھا۔

اسی طرح اسلام کی فتوحات کے زمانہ میں جب کثرت سے عیسائی لوگ مسلمان ہوئے تو وہ اپنے ساتھ حیات مسیح اور مسیحؑ کے بے گناہ ہونے اور باقی تمام انسانوں کے (جن میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی آجاتے ہیں) خطا کار ہونے کا عقیدہ بھی لے آئے اور وہ اتنا پھیلا کہ اس غلط فہمی کی وجہ سے عیسائیت کو اسلام پر حملہ کرنے کا موقع مل گیا اور مسلمان اسلام کو

چھوڑ کر عیسائیت میں داخل ہونا شروع ہو گئے۔ آخر اللہ تعالیٰ نے اس فتنے کے استیصال کے لئے اور اُمّت کی حفاظت کے لئے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے وجود کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چودہ سو سال بعد کھڑا کر دیا۔ اور آپ کے ذریعہ اسلام کو ایسے مقام پر کھڑا کر دیا کہ کجا وہ حالت کہ وہ اپنا دفاع بھی نہیں کر سکتا تھا اور مسلمان اسلام کو چھوڑ رہے تھے۔ اور کجا یہ حالت پیدا ہوگئی کہ تمام مذاہب میدان سے بھاگ گئے اور اسلام عیسائیت پر حملہ آور ہو گیا اور غیر مذاہب کے لوگ کثرت سے اسلام میں داخل ہونے شروع ہو گئے اور وہ دن دُور نہیں جبکہ ہر شخص اسلام کے مادی غلبہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا اور اسلام کا ضعف اس کی طاقت میں تبدیل ہو جائے گا۔ پس یہ سب کچھ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے استغفار اور دُعا کا نتیجہ ہے۔

اب ایک سوال باقی رہ جاتا ہے اور وہ یہ کہ جن آیات میں استغفار کے ساتھ ذنب کا لفظ استعمال ہوا ہے اس کا کیا مطلب ہے کیونکہ ذنب کے معنے لغت میں جُرم کے لکھے ہیں۔ اور اِس لحاظ سے **اِسْتَغْفِرْ لِذَنْبِکَ** کے معنے یہ بنیں گے کہ اے محمد رسول اللہ! اپنے جُرم کے لئے آپ استغفار کریں۔ اِس بارے میں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ جیسا کہ اِس آیت کی تفسیر کے شروع میں اصولی طور پر لکھا جا چکا ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہ عظیم الشان انسان ہیں جن کی اتباع سے انسان خدا سے ملتا ہی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا محبوب بن جاتا ہے اور پھر یہ کہ آپ دنیا کے لئے نمونہ ہیں اور آپ کے اقوال و افعال خدا کے اقوال و افعال ہیں۔ پس آپؐ کے متعلق یہ تصور ہی نہیں ہو سکتا کہ قرآن کریم نے کہیں یہ کہا ہو کہ آپ گناہ گار ہیں۔ کیونکہ آپؐ تو دُنیا کو گناہ سے چھڑانے کے لئے آئے تھے۔ اگر آپؐ خود ہی گناہ گار تھے تو دُنیا کو گناہ سے کیسے آزاد کروا سکتے تھے پس وہ آیات جن میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ذنب کا لفظ استعمال ہوا ہے اس کے معنے قرآن کریم کے بیان کی روشنی میں یہ نہیں کئے جا سکتے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے گناہ کے لئے استغفار کا حکم دیا گیا تھا بلکہ اس کے اَور ہی معنے ہیں۔

اب ان معنوں کو معلوم کرنے کے لئے ہم ان آیات پر یکجائی نظر کرتے ہیں جن میں ذنب کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ وہ آیات حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ اللہ تعالیٰ سورۃ مومن میں فرماتا ہے۔ فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّ اسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ (المومن:۵۶)

۲۔ سورۃ محمدؐ میں یوں آیا ہے۔ فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مُتَقَلَّبَكُمْ وَمَثْوٰىكُمْ (محمد:۲۰)

۳۔ تیسری آیت جہاں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ذنب کا لفظ استعمال ہوا ہے وہ سورۃ فتح کی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ۙ لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا (الفتح:۲،۳)

اِن آیات میں اور سورۃ محمدؐ اور مومن کی آیات میں لفظ ذنب کے استعمال میں ایک فرق ہے اور وہ یہ کہ سورۃ محمدؐ اور مومن میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہے کہ اِسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِکَ یعنی اپنے ذنب کے لئے استغفار کرو۔ اور سورۃ فتح کی آیات میں غفر کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی گئی ہے اور فرمایا ہے لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ کہ اللہ تعالیٰ نے تیرے پہلے اور پچھلے ذنب پر مغفرت کر دی ہے۔

اِن آیات کے حل کے لئے سب سے پہلے ہم لغت کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ لغت میں غفر کے معنے ڈھانکنے کے ہیں۔ اور ذَنَبہٗ ذَنْبًا کے معنے ہوتے ہیں۔ تَلَاهُ فَلَمْ يُفَارِقْ اَثَرَهٗ کہ اس کے پیچھے پیچھے گیا اور اس کی اتباع اور قدم بقدم چلنے کو ترک نہ کیا۔ اور ذَنَّبَ الْعَمَامَةَ کے معنے ہوتے ہیں۔ اَفْضَلَ مِنْهَا شَيْئًا وَاَرْخَاهُ۔ کہ پگڑی باندھتے وقت اس کا ایک زائد حصہ جو سر پر لپیٹا نہ جا سکتا تھا اس کو لٹکا دیا (اقرب) پس ذنب کے معنے ہوئے پیچھے آنا یا زائد چیز۔ اور غفر ذنب کے معنے ہوئے زائد چیز کا ڈھانپ دینا یا پیچھے آنے والے واقعات کی خرابیوں کا ڈھانپ دینا۔ پس رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے ذنب کے لئے استغفار کرنے سے مراد یہ ہوگی کہ آپ یہ دُعا کریں کہ نبوّت کے کام کے وہ بوجھ جو بشری طاقت سے

زائد ہیں اللہ تعالیٰ اُن کے اُٹھانے کی طاقت عطا کردے۔ یا آپ کے بعد آنے والے واقعات کی خرابیوں پر پردہ ڈال دے۔

اب ہم سورۃ مومن، سورۃ محمدؐ اور سورۃ فتح کی ان آیات پر جن میں ذنب کا لفظ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے استعمال کیا گیا ہے جب غور کرتے ہیں تو ایک ایسی عجیب بات معلوم ہوتی ہے۔ جو اِن آیات کے مضمون کو اس طرح حل کردیتی ہے کہ سب اعتراض دُور ہو جاتے ہیں۔ اور وہ یہ کہ ان سب جگہوں میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں کے ہلاک ہونے اور آپ کی فتح کا ذکر ہے۔ چنانچہ پہلا مقام سورۃ مومن کا ہے اور یہ سورۃ مکّی ہے اور اس میں آتا ہے کہ فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّ اسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِکَ یعنی اے رسول اللہ! آپ دشمنوں کی ایذاؤں پر صبر کریں اور اُس دن کا انتظار کریں جب آپ کا غلبہ ہوگا اور یہ ایذا دینے والے شرمندہ ہوں گے اور یہ یاد رکھیں کہ یہ غلبہ کا وعدہ پورا ہو کر رہے گا اور مکّہ بھی آپ کو ملے گا اور آپ اپنے ذنب کے لئے استغفار کریں۔

اِس آیت سے پہلے مندرجہ ذیل آیات ہیں۔ اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ ۝ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ الظّٰلِمِيْنَ مَعْذِرَتُهُمْ وَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَ لَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ ۝ وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْهُدٰى وَ اَوْرَثْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْكِتٰبَ ۝ هُدًى وَّ ذِكْرٰى لِاُولِي الْاَلْبَابِ ۝ (المومن: ۵۰۔۵۵)

یہ آیات مکّہ میں نازل ہوئی تھیں۔ جب مسلمان بہت تکلیف اور دُکھ میں تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کو مخاطب کرکے فرماتا ہے کہ اے مسلمانو! گھبراؤ نہیں اور یاد رکھو کہ ہم اپنے رسولوں اور ان لوگوں کی جو اُن پر ایمان لاتے ہیں اِسی دُنیا میں مدد کرتے ہیں اور اس دن بھی ہم ان کی مدد کریں گے جب فیصلہ کے لئے گواہ اپنی گواہیاں دینے کے لئے آکھڑے ہوں گے۔ وہ ایسا دن ہوگا جبکہ نافرمانوں کو ان کی معذرت کچھ بھی فائدہ نہ دے گی اور ان کے لئے خدا سے دُوری ہوگی اور اُنہیں رہنے کو بہت بُرا گھر ملے گا۔ یاد رکھو ہم نے موسیٰ کو ہدایت دی اور بنی اسرائیل کو تورات کا وارث کیا جس میں لوگوں کے لئے ہدایت اور نصیحت تھی۔ یعنی جس طرح بنی اسرائیل تورات

کی برکت سے ارضِ مقدسہ کے وارث ہو گئے اور خدا کی نعمتیں اُن کو مل گئیں اسی طرح مسلمانوں کو بھی مکمل کتاب ملے گی اور دُنیا پر ظاہری غلبہ بھی حاصل ہو جائے گا۔اور مکہ جو اُن کا مقدس مقام ہے اور جو وہ اس وقت مخالفوں کے قبضہ میں ہے وہ بھی ان کو مل جائے گا۔اس غلبہ کی پیشگوئی کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَاللّٰهِ حَقٌّ وَّاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ کہ اے رسول! جلدی نہ کرو کہ یہ غلبہ کا وعدہ کب آئے گا بلکہ صبر سے کام لو۔یقیناً یہ وعدہ پورا ہو کر رہے گا اور اپنے ذنب کے لئے استغفار کرو۔غرض پہلے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں کی ہلاکت کی خبر دی اور پھر غلبہ اور فتح مکہ کی خبر دی اور استغفار کا حکم دیا۔

دوسری جگہ جہاں استغفار کا حکم ہے وہ سورۃ محمدؐ کی یہ آیت ہے۔فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ اس سے پہلے یہ آیت ہے۔فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا السَّاعَةَ اَنْ تَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً ۚ فَقَدْ جَآءَ اَشْرَاطُهَا ۚ فَاَنّٰى لَهُمْ اِذَا جَآءَتْهُمْ ذِكْرٰىهُمْ

سورۃ محمدؐ کا سارا مضمون مخالفین اسلام کی تباہی کے ذکر میں ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ وہ مسلمانوں کے ہاتھوں شکست کھائیں گے اور اسلام کو فتح ہوگی۔اِس مضمون کو بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا السَّاعَةَ اَنْ تَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً ۚ کہ مخالفینِ اسلام تو بس اس گھڑی کے منتظر ہیں جس میں مسلمانوں اور کافروں کے درمیان فیصلہ ہو جائے گا کہ سچا کون ہے اور جھوٹا کون اور اس سے پہلے پہلے اسلام کے دلائل پر غور کرنے کی کوشش ہی نہیں کرتے اور سمجھ بیٹھے ہیں کہ ہم اُس وقت جب معاملہ کُھل جائے گا ایمان لے آئیں گے۔ لیکن اُنہیں یاد رکھنا چاہئے کہ فتح مکہ کی گھڑی اچانک آجائے گی ۔ہاں یاد رکھو اس کے قریب آنے کی علامات ظاہر ہو چکی ہیں ۔پھر جب وہ گھڑی آپہنچے گی ان کا ایمان لانا ان کو کیا فائدہ دے سکتا ہے ۔پھر اس کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے نبی! یہ امر یاد رکھو کہ صرف قادر خدا ایک ہی ہے اسی کے اشارے پر ہر ایک چیز حرکت کرتی ہے ۔پس جب وقت آجائے گا اللہ تعالیٰ کے فرشتے اُتریں گے اور لوگوں کے دلوں کو تمہاری طرف مائل کر دیں گے اور لوگوں کے لئے اسلام

میں داخل ہونے کا راستہ کُھل جائے گا۔پس ایسے وقت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو استغفار کرنا چاہئے۔نہ صرف اپنے لئے بلکہ مومن مَردوں اور مومن عورتوں کے لئے اللہ تعالیٰ تمہارے حالات سے بخوبی واقف ہے۔

غرض اِن آیات میں بھی پہلے دشمنوں کی تباہی کا ذکر ہے اور پھر مسلمانوں کی کامیابی اور پھر اس کے بعد استغفار کا حکم ہے۔تیسری جگہ جہاں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ذنب کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔لیکن ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ہم نے تیرے ذنب پر پردہ ڈال دیا ہے وہ سورۃ فتح کی ابتدائی آیات ہیں۔ان آیات میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔اِنَّا فَتَحۡنَا لَکَ فَتۡحًا مُّبِیۡنًا ۙ﴿۲﴾ تَاَخَّرَ وَ یُتِمَّ نِعۡمَتَہٗ عَلَیۡکَ وَ یَہۡدِیَکَ صِرَاطًا مُّسۡتَقِیۡمًا ۙ﴿۳﴾ وَّ یَنۡصُرَکَ اللّٰہُ نَصۡرًا عَزِیۡزًا ﴿۴﴾ یعنی اے نبی! ہم تجھے ایک ایسی کُھلی فتح عطا کریں گے۔کہ جس کے بعد ہر ایک پر واضح ہو جائے گا کہ دین اسلام سچا دین ہے اور تم صراط مستقیم پر تھے اور اس فتح کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک طرف تم پر فتح سے پہلے ایمان لانے والوں کو تربیت ہو کہ ان کے نقائص دُور ہو جائیں گے اور تمہاری بشری کمزوریوں کی وجہ سے ان کی تربیت میں اگر کوئی کمی رہ گئی ہے تو وہ دور کر دی جائے گی اور فتح کے بعد جو لوگ اسلام میں داخل ہوں گے ان کی تربیت میں اگر تمہاری بشری کمزوریوں کی وجہ سے کوئی نقص رہ جائے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو بھی دُور کر دے گا اور تمہاری دعاؤں کے نتیجہ میں تم پر نعمت کو مکمل کر دے گا۔یعنی مسلمانوں میں ایسے لوگ بار بار پیدا ہوتے رہیں گے جو اصلاحِ اُمّت کا کام سرانجام دیں گے اور اس کی خرابیوں کو دُور کر کے صحیح مقام پر ان کو قائم رکھیں گے اور دُنیاوی لحاظ سے بھی مسلمانوں کی حکومت قائم ہو جائے گی۔اور اللہ تعالیٰ ان کو ترقی کی راہ پر گامزن کر دے گا جس سے وہ خدا تعالیٰ کے انعامات کے مورد ہوتے رہیں گے اور اللہ تعالیٰ تمہاری ایسی نصرت کرے گا کہ کوئی مانع اور مزاحم نہ ہو سکے گا۔

اِن آیات میں بھی پہلے فتح و نصرت کا ذکر ہے۔اور دشمنوں کی ہلاکت کی پیشگوئی کی گئی ہے اور اس کے بعد ذنب پر مغفرت کر دینے کا ذکر کیا گیا ہے۔غرض اِن تمام آیات کو دیکھ کر بالطبع یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی فتح اور آپ کے دشمنوں کی مغلوبیت کے

ساتھ وہ کونسی بات متعلق ہے جس کے لئے استغفار کا حکم ہے۔یا وہ کونسی بات ہے جس کے متعلق فرمایا ہے کہ ہم نے اس پر مغفرت کر دی ہے۔سو جاننا چاہئے کہ نبی باوجود نبی ہونے کے پھر انسان ہی ہوتا ہے اور انسان کے تمام کام خواہ کسی حد تک وسیع ہوں محدود ہی ہوتے ہیں۔ایک استاد خواہ کتنا ہی لائق ہو اور ایک وقت میں تیس چالیس نہیں بلکہ سَو سوا سَو لڑکوں کو بھی پڑھا سکتا ہو۔اگر اس کے پاس ہزار دو ہزار لڑکے لے آئیں نہیں پڑھا سکے گا۔رسول بھی استاد ہی ہوتے ہیں۔جیسا کہ قرآن شریف میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت آتا ہے۔يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ (آل عمران: ۱۶۵) کہ اس رسول کا کام یہ ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کی آیتیں لوگوں کو سُنائے۔کتاب کی تعلیم دے اور اُن کو پاک کرے اور احکام کا فلسفہ سکھائے۔غرض نبی ایک اُستاد ہوتا ہے اس کا کام تعلیم دینا ہوتا ہے اس لئے وہ تھوڑے لوگوں کو ہی دے سکتا ہے کیونکہ لاکھوں کروڑوں انسانوں کو سبق دینا اور پھر یاد بھی کروا دینا کسی انسان کا کام نہیں ہوسکتا۔پس جب کسی کے سامنے لاکھوں اور کروڑوں انسانوں کی جماعت سبق لینے کے لئے کھڑی ہو تو ضرور ہوگا کہ اس کی تعلیم میں نقص رہ جائے اور لوگ پوری طرح علم نہ حاصل کرسکیں۔یا یہ ہوگا کہ بعض تو پڑھ جائیں گے اور بعض کی تعلیم ناقص رہ جائے گی اور بعض بالکل جاہل کے جاہل ہی رہ جائیں گے اور کوئی تعلیم حاصل نہ کرسکیں گے۔

پس جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے فتوحات کی خبر دی اور بتایا گیا کہ مکّہ فتح ہوگا اور اس کے نتیجہ میں بے شمار لوگ اسلام میں داخل ہوں گے تو آپؐ کے دل میں جو بڑا ہی پاک دل تھا یہ گھبراہٹ پیدا ہوئی کہ ان تھوڑے سے لوگوں کو تو میں اچھی طرح تعلیم دے لیتا تھا،قرآن کریم سکھا سکتا تھا۔لیکن یہ جو لاکھوں انسان اسلام میں داخل ہوں گے ان کو میں کس طرح تعلیم دوں گا۔اور مجھ میں جو بوجہ بشریت کے یہ کمزوری ہے کہ اتنے کثیر لوگوں کو تعلیم نہیں دے سکتا اس کا کیا علاج ہوگا۔اس کا جواب خدا تعالیٰ نے یہ دیا کہ اس میں شک نہیں کہ جب فتح ہوگی اور نئے نئے لوگ کثرت سے اسلام میں داخل ہوں گے تو ان میں بہت سی کمزوریاں ہوں گی۔اور یہ بھی سچ ہے کہ وہ سب کے سب آپ سے تعلیم نہیں پا سکتے۔مگر ان کو تعلیم دلانے کا یہ

علاج ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ سے دُعا مانگیں کہ اے خدا مجھ میں بشریّت کے لحاظ سے یہ کمزوری ہے کہ اتنے لوگوں کو تعلیم نہیں دے سکتا۔ تُو میری اس کمزوری کو ڈھانپ دے اور وہ اس طرح کہ وہ ان سب لوگوں کو خود ہی تعلیم دیدے اور خود ہی ان کو پاک کر دے۔ پس رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو **اِسْتَغْفِرْ لِذَنْبِکَ** کے الفاظ کہہ کر اس طرف متوجہ کیا گیا ہے کہ اسلام میں کثرت سے داخل ہونے والے لوگوں کی تعلیم و تربیت کے لئے آپ خدا تعالیٰ سے دُعا کریں اور التجا کریں کہ اب لوگوں کے کثرت سے آنے کی وجہ سے جو بد نتائج نکل سکتے ہیں ان سے آپ ہی بچائیے۔ اور اُن کو خود ہی دُور کر دیجئے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ آپ کا لاکھوں انسانوں کو ایک ہی وقت میں پوری تعلیم نہ دے سکنا کوئی گناہ نہیں بلکہ بشری کمزوری کا نتیجہ ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ آپ کے متعلق ذنب کا لفظ استعمال ہوا ہے لیکن جَنَاحٌ۔ اِثْمٌ یا جرم کا لفظ استعمال نہیں ہوا۔ گناہ اسے کہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کی دی ہوئی طاقت اور قوّت کے باوجود اس کے حکم کی فرمانبرداری نہ کی جائے۔ اور وہ بات جس کی خدا تعالیٰ کی طرف سے طاقت ہی نہ دی جائے اس کا نہ کر سکنا گناہ نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ بشری کمزوری کہلاتی ہے۔ مثلاً ایک شخص بیمار ہو جاتا ہے تو یہ اس کا گناہ نہیں بلکہ ایک کمزوری ہے جو بشریت کی وجہ سے اُسے لاحق ہوئی۔ تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ گناہ نہ تھا کہ آپؐ اس قدر زیادہ لوگوں کو پڑھا نہ سکتے تھے بلکہ خدا تعالیٰ نے آپؐ کو بنایا ہی ایسا تھا۔ اور آپؐ کے ساتھ یہ ایسی بات لگی ہوئی تھی جو آپؐ کی طاقت سے بالا تھی۔ اس لئے آپؐ کو بتایا گیا کہ ایمان لانے والوں کی کثرت کی وجہ سے جو نقص ان کی تعلیم میں رہ جائے گا اس کے دُور کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ سے دُعا کریں۔ پس وہ تمام آیات جن میں آپؐ کے لئے **وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِکَ** کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں ان میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی گناہ کا اظہار مقصود نہیں ہے بلکہ بشری کمزوری کے بد نتائج سے بچنے کی آپؐ کو راہ بتائی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ وہ بوجھ جو آپؐ پر پڑنے والا ہے اور آپ کی طاقت سے زائد ہے اس کے لئے اللہ تعالیٰ سے دُعا کریں کہ اس کو اُٹھانے اور ذمہ داری کو پوری طرح سے ادا کرنے کی توفیق ملے۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ لوگ جو فتح مکہ کے بعد ایمان لائے تھے اور وہ رسول

کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زیرِ تربیت زیادہ عرصہ نہ رہ سکے تھے۔ ابتلاؤں اور فتنوں کے وقت ان کا ایمان بھی نہ خراب ہوا اور وہ اسلام جیسی نعمت سے محروم نہ ہوئے۔ گو آپ کی وفات پر کچھ لوگ مرتد ہوئے مگر جلدی ہی واپس آگئے۔ اور ان فسادوں میں شامل نہ ہوئے جو اسلام کو تباہ کرنے کے لئے شریروں اور مفسدوں نے برپا کئے تھے۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں جو عظیم الشان فساد ہوا۔ اس میں عراق، مصر، کوفہ اور بصرہ کے لوگ تو شامل ہو گئے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ایمان لائے تھے۔ لیکن یمن، حجاز اور نجد کے لوگ شامل نہ ہوئے۔ یہ وہ ملک تھے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں فتح ہوئے تھے۔ پس اللہ تعالیٰ نے اُن ملکوں کے لوگوں کی جو آپؐ کے زمانہ میں اسلام لائے تھے بُرائیاں اور کمزوریاں دُور کر دی تھیں۔ لوگ تو کہتے ہیں کہ امیر معاویہ کا زور اور طاقت تھی کہ شام کے لوگ اِس فتنہ میں شامل نہ ہوئے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کرامت تھی۔ اور دُعا کا اثر تھا کہ شام کے لوگ حضرت عثمانؓ کے خلاف نہیں اُٹھے۔ کیونکہ گو یہ مُلک رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں فتح نہ ہوا لیکن آپؐ نے اس پر بھی چڑھائی کی تھی جس کا ذکر قرآن شریف کی سورۃ توبہ میں ان تین صحابہ کا ذکر کرتے ہوئے آیا ہے جو اس سفر میں شامل نہ ہوئے تھے۔ پس شام کا اس فتنہ میں شامل نہ ہونا امیر معاویہ کی دانائی کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ اس لئے تھا کہ وہاں اسلام کا بیج رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بو یا گیا۔ اور اس سرزمین میں آپؐ نے قدم مبارک ڈالا تھا۔ پس خدا تعالیٰ نے آپؐ کی دُعاؤں میں اس ملک کو بھی شامل کر لیا۔

اس عظیم الشان فتنہ میں اس قدر صحابہ میں سے صرف تین صحابہ کے شامل ہونے کا پتہ لگتا ہے۔ اور ان کی نسبت بھی ثابت ہے کہ صرف غلط فہمیوں کی وجہ سے شامل ہو گئے تھے اور بعد میں توبہ کر لی تھی۔ پس رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ایک ایسی خصوصیت ہے کہ جو کسی اور نبی کو حاصل نہیں ہوئی۔ اس لئے جہاں آپ کی فتح کا ذکر آیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ اسلام میں کثرت سے لوگ داخل ہونے والے ہیں وہاں ساتھ ہی استغفار کا حکم بھی آیا ہے جو آپؐ کو اس طرف متوجہ کرنے کے لئے تھا کہ ہم آپ کو غلبہ اور عزت دینے والے ہیں اور بے شمار لوگ آپ کے

ساتھ شامل ہونے والے ہیں۔ پس یاد رکھیں کہ جب آپ کے پاس بہت سے شاگرد ہو جائیں تو آپ خدا تعالیٰ کے حضور گر جائیں اور عرض کریں کہ الٰہی اب کام انسانی طاقت سے بڑھتا جاتا ہے۔ آپ خود ہی ان نو واردوں کی اصلاح کر دیجئے۔ ہم آپ کی دُعا قبول کریں گے اور ان کی اصلاح کر دیں گے اور ان کی کمزوریاں اور بدیاں دُور کر کے ان کو پاک کر دیں گے۔

پس قرآن کریم کی وہ آیات جن میں یہ ذکر آتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے ذنب کے لئے استغفار کرنا چاہئے۔ اس سے یہ ہرگز مراد نہیں کہ آپ سے کوئی گناہ سرزد ہوا ہے۔ اور اس کے لئے آپ کو استغفار کرنا چاہئے بلکہ اس سے صرف یہ مراد ہے کہ فتوحات کی وجہ سے اور اسلام میں لوگوں کے کثرت سے داخل ہونے کی وجہ سے جو تربیت کا کام بڑھنے والا ہے اور وہ آپ کی طاقتوں سے زیادہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو باحسن وجوہ سرانجام دینے کی طاقت عطا کرے اور اگر اس میں کوئی کمزوری رہ جائے تو اس پر پردہ ڈال دے اور اس کی اصلاح اس طور پر کر دے کہ کوئی بُرا نتیجہ پیدا نہ ہو۔ اور چونکہ یہ نومسلموں کی تربیت کا کام صحابہ اور صحابیات نے بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات کے ماتحت کرنا تھا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سورۃ محمد کی آیات میں یہ بھی فرما دیا کہ نہ صرف اپنے لئے بلکہ آپ کے تحت جو مربی کام کرنے والے ہیں ان کے لئے بھی دُعا کر دیں کہ وہ صحیح رنگ میں تربیت کر سکیں۔ اور اگر ان کی تربیت میں کوئی نقص رہ جائے تو اس کا بدنتیجہ نہ نکلے بلکہ اس کی بھی پردہ پوشی ہو جائے۔

خلاصہ کلام یہ کہ سورۃ نصر میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو **اِسْتَغْفِرْہُ** کا حکم دینے سے مراد یہ ہے کہ آپ دُعا کریں کہ فتوحات کے نتیجے میں جو خرابیاں اُمتِ محمدؐیہ میں پیدا ہو سکتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ خود اُن کی اصلاح کا انتظام فرماوے۔

اور وہ آیات جہاں **اِسْتَغْفِرْ لِذَنْبِکَ** کے الفاظ کہے گئے ہیں ان میں یہ حکم ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ دُعا کرنی چاہئے کہ آپ کے زمانہ میں جو فتوحات ہوں گی اور جن کے نتیجہ میں کثرت سے لوگ اسلام میں داخل ہوں گے اللہ تعالیٰ آپ کو اُن کی تربیت پوری طرح کرنے کی توفیق دے اور اگر تربیت میں کوئی کمی رہ جائے تو اس کمی کے نتیجہ میں جو خرابی پیدا

ہو سکتی ہے اس کے بد نتائج سے بچا لے۔

اِنَّہٗ کَانَ تَوَّابًا: ۔تَابَ کے معنے ہوتے ہیں فضل کے ساتھ رجوع کیا۔اور توّاب مبالغہ کا صیغہ ہے اس لئے اس کے معنے ہوں گے بار بار فضل کے ساتھ رجوع کرنے والا۔گویا اس حصہ آیت میں اس مضمون کو ادا کیا گیا ہے کہ اے محمد رسول اللہ! اگر آپ دُعاؤں میں لگ جائیں گے تو اللہ تعالیٰ آپ کی دُعاؤں کو ضرور سُنے گا۔اور اپنے فضل کے ساتھ آپ کی قوم پر بار بار رجوع کرے گا۔نبوّت،صدّیقیت،شہیدیت اور صالحیت چار روحانی انعام ہیں جن کو قرآن کریم نے بیان فرمایا ہے۔اور بتایا ہے کہ ان انعاموں کا ملنا خدا تعالیٰ کے فضل پر منحصر ہے۔چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ۝ ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ ۗ وَكَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيْمًا (النساء:۷۰،۷۱)
یعنی جو اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل اطاعت کرے گا تو وہ ان لوگوں کے زمرہ میں شامل ہو جائے گا جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام کیا یعنی نبی،صدّیق،شہید اور صالح۔اور ان مقامات کا ملنا اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ بوجہ علیم ہونے کے پوری طرح جانتا ہے کہ کون ان فضلوں کا مورد ہونے کا اہل ہے۔

پس اِنَّہٗ کَانَ تَوَّابًا کے الفاظ میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تسلّی دی گئی ہے کہ جب بھی آپ کی قوم کو حفاظت کی ضرورت ہوگی جب بھی کسی اصلاح کی ضرورت ہوگی اللہ تعالیٰ اس کی حفاظت اور اصلاح کے ذرائع پیدا کر دے گا۔اور اس خرابی کے مناسب حال شخص پیدا کر دے گا چنانچہ واقعات بتاتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دُعا سُنی گئی۔اور اُمت میں جب بھی کوئی خرابی پیدا ہوئی تو اس کی اصلاح کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس کے مناسب حال شخص کھڑا کر دیا۔چنانچہ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی اُس وقت بڑے بڑے صحابہ گھبرا گئے۔حتّٰی کہ حضرت عمرؓ جیسا زبردست شخص بھی گھبرا گیا۔اس وقت اللہ تعالیٰ نے حضرت ابو بکرؓ کو صدّیقیت کے مقام پر کھڑا کر دیا اور تمام مسلمان ایک ہاتھ پر

جمع ہو گئے۔ اور جتنے فتنے اس وقت کھڑے ہوئے ان کا مقابلہ کرنے کی قوت حضرت ابو بکرؓ کو دی گئی۔ باوجود اس کے کہ آپ کی طبیعت نرم تھی لیکن آپ نے فتنوں کو دبانے کے لئے جو کام کیا اس کو دیکھ کر انسان دنگ رہ جاتا ہے۔ پس حضرت ابو بکرؓ کی خلافت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اُن دعاؤں کے نتیجہ میں تھی جو آپ نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے ماتحت کیں۔

پھر حضرت ابو بکرؓ کی وفات کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت عمرؓ کو کھڑا کر دیا۔ چونکہ حضرت ابو بکرؓ کے زمانہ میں لڑائیوں کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ اور ایرانیوں اور شامیوں کے ساتھ مٹھ بھیڑ ہو رہی تھی اس لئے آپ کی وفات کو بے وقت سمجھا گیا۔ لیکن حضرت عمرؓ نے خلافت پر متمکن ہوتے ہی ایسی راہنمائی کی کہ مصر، شام، اور فلسطین کے سارے علاقے مسلمانوں کے ماتحت آ گئے اور قیصر و کسریٰ کی ساری طاقتیں ختم ہو گئیں۔ اور ایک طرف مسلمانوں کی ایک مستحکم سلطنت قائم ہو گئی اور دوسری طرف مسلمان ایک ہاتھ پر اکٹھے رہے۔ اور ان میں کوئی خرابی پیدا نہ ہوئی بلکہ آپ کی خلافت میں اسلام کا وہ رعب و دبدبہ قائم ہوا کہ مسلمان بڑے بڑے بادشاہوں کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ پس محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں کا دوسرا اثر حضرت عمرؓ کے وجود میں ظاہر ہوا۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کے وجود بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں کا نتیجہ تھے۔ پھر حضرت عمر بن عبدالعزیز اور مجدّدِ دین اُمت جو مختلف ممالک اور مختلف زمانوں میں اسلام کی حفاظت اور اسلام کی صحیح صورت کو قائم رکھنے کے لئے کھڑے ہوئے سب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں کی بدولت ہی تھے۔ اور پھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تیرہ سَو سال بعد جب ایک طرف آپؐ کے ماننے والے اسلام کو چھوڑ بیٹھے اور اس پر عمل کرنا ترک کر دیا اور دوسری طرف مغربی اقوام نے اسلام پر ہلّہ بول دیا اور چاہا کہ اسلام کا نام تک مٹا دیا جائے۔ ایسی نازک حالت میں اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو مبعوث کر دیا اور آپؑ کے ذریعہ مسلمانوں کی ایک ایسی جماعت قائم کر دی جو ایک طرف صحیح اسلام کا نمونہ تھی اور دوسری طرف اسلام کے لئے اپنے اموال اور اپنی جانوں کو قربان کرنے والے تھے اور اس طرح اسلام از سرِ نو زندہ ہو گیا۔ چنانچہ کجا

تو یہ حالت تھی کہ سمندر پار سے عیسائیوں کے پادری مسلمانوں کے مختلف ممالک میں اسلام پر حملے کر رہے تھے اور کجا یہ حالت ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سپاہیوں نے اُن کے ممالک میں پہنچ کر اُن پر حملہ شروع کر دیا۔ اور یکے بعد دیگرے مخالفین میں سے ہی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عشاق پیدا ہونے شروع ہو گئے۔ اور اب یہ بات نظر آ رہی ہے کہ وہ دن جلد ہی آنے والا ہے جبکہ تمام مغربی اقوام محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جھنڈے تلے جمع ہوں گی اور ایک ہی رسول ہوگا اور ایک ہی شریعت اور خدا تعالیٰ کی بادشاہت جس طرح آسمان پر ہے زمین پر بھی قائم ہو جائے گی۔ بہرحال اللہ تعالیٰ نے جو وعدہ فرمایا تھا کہ وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دُعاؤں کو سُنے گا اور بار بار اپنے فضل کے ساتھ آپ کی قوم پر رجوع کرے گا وہ پوری شان کے ساتھ پورا ہوا ہے اور پورا ہوتا رہے گا کیونکہ اسلام قیامت تک کے لئے ہے اور خدا کے وعدے بھی قیامت تک پورے ہوتے رہیں گے۔ انشاءاللہ

روایات میں آتا ہے کہ جب سورۃ نصر نازل ہوئی اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو اس سے اطلاع دی تو آپ نے فرمایا **لَیَخْرُجَنَّ مِنْهُ اَفْوَاجًا کَمَا دَخَلُوْا فِیْهِ اَفْوَاجًا** (فتح القدیر) کہ اب تو اسلام میں لوگ گروہ در گروہ داخل ہو رہے ہیں لیکن ایک وقت ایسا آئے گا۔ جبکہ مسلمان گروہ در گروہ اسلام کو خیر باد کہنے لگ جائیں گے اور اسلام کے حلقہ سے نکل جائیں گے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمودہ سَو فی صدی پوری ہوا ہے۔ چنانچہ اس زمانہ میں جب عیسائیت نے اسلام پر حملہ کیا۔ لوگ کثرت سے اسلام کو چھوڑ کر عیسائیت میں داخل ہو گئے تھے۔ اور اسی طرح سے دوسری تحریکیں جو اسلام کے خلاف چلیں اُن کا شکار ہو گئے تھے۔ پس اسلام کا موجودہ تنزل بھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کا بیّن ثبوت ہے۔ کیونکہ ایسے وقت میں جب کہ اسلام دن دُگنی اور رات چوگنی ترقی کر رہا تھا۔ اور اس کے تنزل کا خیال بھی نہیں آ سکتا تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا کہ ایک وقت وہ بھی آئے گا جب کہ اسلام کے ماننے والے اس کو خیر باد کہہ دیں گے۔ اور گروہ در گروہ اسلام سے نکل کھڑے ہوں گے صرف اور صرف خدائے علّام الغیوب کے علم کی بناء پر ہی ہو سکتا تھا۔ پس جہاں

خدا تعالیٰ کی یہ بات پوری ہوئی ہے وہاں دوسری بات بھی پوری ہوگی جو اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے کہلوائی کہ دوبارہ اسلام زندہ کیا جائے گا۔ اور مسیح موعود کی بعثت کے ذریعہ سے اسلام کا سورج پھر وسطِ آسمان میں چمکے گا۔ اور تمام قومیں اسلام میں داخل ہو کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حمد کے گیت گائیں گی۔ پس جس طرح سے عالم الغیب خدا کی باتیں پہلے پوری ہوئی ہیں، اب بھی پوری ہوں گی۔ **وَمَا ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ بِعَزِیْزٍ۔**

روایات میں آتا ہے کہ سورۃ نصر کے نزول پر اللہ تعالیٰ کے حکم **سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ وَاسْتَغْفِرْہُ** کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کثرت سے یہ دُعائیہ کلمات اُٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے پڑھا کرتے تھے کہ **سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِکَ اَسْتَغْفِرُکَ وَاَتُوْبُ اِلَیْکَ** (درمنثور) یعنی اے اللہ میں تیری تسبیح کرتا ہوں اور تیری ذات میں سب خوبیوں کے ہونے کا اقرار کرتا ہوں اور تجھ سے بشری کمزوری پر پردہ پوشی چاہتا ہوں اور تیری طرف ہی رجوع کرتا ہوں۔ حضرت ام سلمہؓ روایت کرتی ہیں کہ میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ یا رسول اللہ آپ یہ دُعا بار بار کیوں پڑھتے ہیں۔ تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اسی قسم کی دُعا کرنے کا ارشاد فرمایا ہے اور پھر سورۃ نصر کی آیات پڑھیں۔ بہرحال اس روایت سے ثابت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق اپنی اُمت کے لئے کثرت سے دُعائیں کیں تا آپ کی اُمت راہِ راست پر قائم رہے۔ اور جب کبھی اس میں کوئی خرابی پیدا ہو تو اللہ تعالیٰ ایسے اشخاص کو کھڑا کردے جو اس خرابی کو دُور کردیں۔ اور یہ کہ خود اللہ تعالیٰ اُمت محمدیہ کی تربیت کا انتظام کرتا رہے۔ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ دُعا سُنی گئی اور اس کا نتیجہ جو کچھ نکلا وہ تاریخ کے اوراق بتا رہے ہیں اور قیامت تک ایسا ہی ہوتا رہے گا اور جب بھی اسلام کی حفاظت کا سوال پیدا ہوگا اللہ تعالیٰ خود اس کی حفاظت کے سامان پیدا کردے گا۔

(تفسیر کبیر جلد ۱۰ صفحہ ۴۸۲ تا ۴۹۵)

گناہ گار اور استغفار کی حقیقت

حضرت مصلح موعودؓ ذنب اور استغفار کی حقیقت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

پھر یہ جو کہا جاتا ہے کہ رسول کریم ﷺ نعوذ باللہ گناہگار تھے۔ اس کے لئے ذَنْب اور اِسْتِغْفَار کے الفاظ پیش کئے جاتے ہیں۔ لیکن عام طور پر لوگوں نے اس کے معنی نہیں سمجھے اِسْتِغْفَار کے یہ معنی بھی ہوتے ہیں کہ جو مشکلات کسی کے رستہ میں حائل ہوں ان کو ڈھانپ دیا جائے۔ اسی طرح ذَنْب کے معنی گناہ کے بھی ہوتے ہیں اور غیر ضروری باتوں کے بھی۔ پس غَفَر کے معنی ڈھانکنے اور ذَنْب کے معنی زوائد کے ہیں۔ جب رسول کریم ﷺ کے متعلق اِسْتِغْفَار کا لفظ آتا ہے تو اس سے مراد آپؐ کے رستہ کی مشکلات کا دور ہونا ہوتا ہے۔ اور جہاں ذَنْب کا لفظ آتا ہے وہاں زوائد کا دور کیا جانا مراد ہوتا ہے۔ چنانچہ دیکھو سورۃ نساء رکوع ۱۶ میں پہلے جنگ کا ذکر ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَلَا تَكُنْ لِّلْخَآئِنِيْنَ خَصِيْمًا ۙ وَّاسْتَغْفِرِ اللّٰهَ (النساء:۱۰۶، ۱۰۷)

اے محمد رسول اللہ جب ہم حکومت دیں گے تو کچھ لوگ ایسے ہوں گے جو دین کی باتوں میں خیانت سے کام لیں گے اور کجی کا راستہ اختیار کریں گے۔ ان سے لڑنے کی طرف توجہ نہ کرنا۔ بلکہ بجائے اس کے خدا تعالیٰ سے دعائیں کرنا کہ ان کی یہ کمزوری دور ہو جائے۔ (۲) سورہ مومن رکوع ۶ میں بھی پہلے اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا (المومن:۵۲) فرما کر نصرت کا ذکر کیا ہے اور پھر وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ (المومن:۵۶) میں استغفار اور تسبیح کا حکم دیا ہے۔ سورۃ محمد رکوع ۲ میں بھی پہلے ساعت کے آنے کا ذکر ہے یعنی فتح کا اور پھر وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ (محمد:۲۰) فرماتا ہے (۴) سورہ نصر میں بھی پہلے فتح کا ذکر ہے اور پھر آتا ہے فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ (النصر:۴) (۵) سورۃ فتح میں بھی پہلے فتح کا ذکر ہے اور پھر غَفَر کا۔ فرمایا اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ۙ لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ (الفتح:۲،۳) ان سب حوالوں

میں فتح کے ساتھ ذَنب یا **استغفار** کا ذکر کیا ہے۔ یعنی یا تو فتح کے وعدہ کے بعد یا فتح کے ذکر کے بعد۔ چار جگہوں میں تو فتح کے وعدہ کے ساتھ اس کا ذکر کیا ہے۔ اور ایک جگہ فتح مبین کا ذکر ہے۔ اور وہاں لِیَغْفِرَ کہا ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ تیری دعا سنی گئی اور ہم نے عام فتوحات کی بجائے تجھے فتح مبین عطا کی ہے۔ تا کہ تیرے ذنب بخشے جائیں۔

اب دیکھنا یہ چاہئے کہ کسی کو فتح و نصرت کا ملنا کیا گناہ ہے اور ہر جگہ فتح کے ساتھ یہ الفاظ کیوں آئے ہیں۔ اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ استغفار اور ذنب کسی اور قسم کا ہے۔ اگر گناہ مراد تھا تو چاہئے تھا کہ کسی گناہ کا ذکر کیا جاتا۔ مگر ایسا تو ایک جگہ بھی نہیں کیا گیا۔ بلکہ بجائے اس کے یہ بتایا کہ ہم تجھے فتح و نصرت دیتے ہیں۔ تو استغفار کر۔ اس سے صاف معلوم ہوا کہ اس کے معنی کچھ اور ہیں۔ اور وہ یہ کہ فتح کے ساتھ جو لوگ سلسلہ بیعت میں شامل ہو جاتے ہیں اور لاکھوں کی تعداد میں ہوتے ہیں ان کی تربیت پوری طرح نہیں ہوسکتی۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قوم کے زوال کا وقت اسی دن سے شروع ہو جاتا ہے جب کہ فتوحات شروع ہوتی ہیں اور لوگوں کی تربیت اچھی طرح نہیں ہوسکتی۔ جب لاکھوں مسلمان ہو گئے اور وہ سارے ملک میں پھیلے ہوئے تھے تو ان کی تربیت ناممکن تھی۔ اس لئے فرمایا یہ بات بشریت سے بالا ہے کہ اتنے لوگوں کی پوری طرح تربیت کی جا سکے۔ ان کی تربیت خدا ہی کر سکتا ہے۔ اس لئے دعائیں کر کہ خدایا تو ہی ان کی نیک تربیت کے سامان پیدا فرما۔ اور پھر خوشخبری دی کہ ہم نے تمہاری دعائیں سن لی ہیں۔ اِنَّا فَتَحْنَا لَکَ فَتْحًا مُّبِیْنًا ۙ لِّیَغْفِرَ لَکَ اللّٰہُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِکَ وَ مَا تَاَخَّرَ ہم تجھ کو جو فتح عظیم دیں گے وہ ایسی صورت میں دیں گے کہ وہ فتح مبین ہوگی۔ حق و باطل میں تمیز کر دینے والی ہوگی اور صرف جسموں پر ہی نہیں ہوگی بلکہ دلوں پر بھی ہوگی۔ لوگ منافقت سے اسلام میں داخل نہیں ہوں گے بلکہ دین کے شوق کی وجہ سے ہوں گے۔ اور یہ فتح ہم نے اس لئے دی ہے کہ تربیت کا پہلو مضبوط ہو جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور اللہ تعالیٰ نے حق کو واضح کر کے تربیت کے پہلو کو مضبوط کر دیا۔ اور ایسے نائب آپ کو بخشے جو ہمیشہ کے لئے دین کے محافظ ہو گئے۔ دیکھ لو ایک تو وہ وقت تھا کہ ابوجہل کا بیٹا عکرمہ مکہ چھوڑ کر اس لئے بھاگ گیا کہ جہاں محمد (ﷺ) ہو وہاں میں نہیں رہ سکتا۔ مگر پھر وہ طاقت آیا کہ وہ مسلمان ہوا اور ایسا مخلص مسلمان ہوا کہ ایک جنگ

میں دشمن چُن چُن کر صحابیوں کو مار رہے تھے۔عکرمہ نے کہا یہ بات مجھ سے دیکھی نہیں جاتی۔کوئی ہے جو دشمن کے مقابلہ کے لئے میرے ساتھ چلے۔اس طرح کچھ آدمی ساتھ لئے اور جرنیل سے اجازت لے کر دشمن پر جس کی تعداد ساٹھ ہزار تھی حملہ کر دیا اور عین قلب پر حملہ کیا۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کفار کو شکست ہوگئی اور وہ بھاگ گئے۔اس وقت عکرمہ کو دیکھا گیا تو وہ دم توڑ رہے تھے۔ ان کی پیاس محسوس کر کے جب پانی لایا گیا تو انہوں نے کہا پہلے میرے ساتھی کو پانی پلاؤ۔اس ساتھی نے دوسرے کی طرف اشارہ کر دیا اور دوسرے نے تیسرے کی طرف۔وہ سات نوجوان تھے جو زخموں کی وجہ سے دم توڑ رہے تھے مگر کسی نے پانی کو منہ بھی نہ لگایا۔اور ہر ایک نے یہی کہا کہ پہلے فلاں کو پلاؤ مجھے بعد میں پلا دینا۔جب سب نے انکار کیا تو وہ پھر عکرمہ کے پاس آیا۔ دیکھا تو وہ فوت ہو چکے تھے۔اس کے بعد اس نے دوسروں کو دیکھا تو وہ بھی شہید ہو چکے تھے۔

غرض خدا تعالیٰ نے رسول کریم ﷺ کو صرف ظاہری فتح ہی عطا نہیں فرمائی بلکہ ظاہری فتح کے ساتھ قلوب کی فتح بھی عطا کی۔

رسول کریمؐ کا بلند ترین مقام

پھر قرآن نہ صرف یہ کہ رسول کریم ﷺ کو بے گناہ قرار دیتا ہے بلکہ نہایت اعلیٰ درجہ کا انسان قرار دیتا ہے۔فرماتا ہے۔اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ کوئی یہ نہ کہے کہ ہمارا نبی گنہگار ہے۔اگر دشمن ایسا کہتے ہیں تو وہ بکتے ہیں۔ہم جانتے ہیں کہ تو بڑے اعلیٰ اخلاق والا ہے۔

پھر فرمایا اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ (الم نشرح:۲) اے محمد رسول اللہ! کیا ہم نے تیرا سینہ کھول نہیں دیا۔

پھر فرماتا ہے لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (الاحزاب:۲۲) تمہارے لئے محمد رسول اللہؐ ایک اعلیٰ درجہ کا نمونہ ہے۔اس کے پیچھے چل کر تم نجات پا سکتے ہو۔

پھر اس سے بھی بڑا درجہ آپ کا یہ بیان فرمایا کہ آپ دوسروں کو پاک کرانے والے ہیں۔ فرماتا ہے۔كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ (البقرۃ: ۱۵۲)۔ہم نے تم میں سے ہی ایک رسول بھیجا ہے جو ہماری آیتیں پڑھ کر تمہیں سناتا ہے

اور گناہگاروں کو پاک بناتا ہے۔

پھر اس سے بڑھ کر فرمایا:۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ

وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ (آل عمران:۳۲)

تو کہہ دے کہ اے ماننے والو یا مجھ پر اعتراض کرنے والو! اگر تم اللہ کا محبوب بننا چاہتے ہو تو آؤ اس کا طریق میں تمہیں بتاؤں۔ جس طرح میں عمل کرتا ہوں اس طرح تم بھی عمل کرو۔ پھر اللہ تعالیٰ تم کو بھی اپنا محبوب بنا لے گا۔

پھر اس سے بھی آگے ترقی کی اور فرمایا کہ محمد رسول اللہ (ﷺ) تو وہ ہے کہ اس پر جو کلام نازل ہوا ہے اسے بھی ہم کسی ناپاک کو چھونے نہیں دیتے۔ پھر کیا اس کلام کو لانے والا ناپاک ہو سکتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ۝ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ۝ لَا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ۝

(الواقعہ:۷۸-۸۰)

یہ قرآن بڑی عظمت والا ہے۔ یہ اس جگہ خدا نے رکھا ہے جہاں کوئی گندہ شخص اسے ہاتھ نہیں لگا سکتا اور اسے مطہر کے بغیر کوئی چھو ہی نہیں سکتا۔ پھر جس پر یہ کلام نازل ہوا اسے ناپاک کس طرح کہہ سکتے ہو۔

پھر فرمایا ہم نے اسے وہ کتاب دی ہے جس کو آج ہی نہیں بلکہ آئندہ بھی کوئی ناپاک نہیں چھو سکے گا۔ بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ ۝ كِرَامٍۭ بَرَرَةٍ ۝ (عبس:۱۶،۱۷) یہ ہمیشہ ایسے لوگوں کے ہاتھ میں رہے گی جو دور دور سفر کرنے والے اور نہایت معزز اور اعلیٰ درجہ کے نیکوکار ہوں گے۔"

(انوار العلوم جلد ۱۲ صفحہ ۴۶۷ تا ۴۷۰)

ضآل ہونے کا الزام اور اس کی حقیقت

آنحضورؐ پر یہ الزام بھی لگایا گیا ہے کہ آپ ضآل تھے اور آپؐ سے گناہ سرزد ہوتے تھے۔ اس الزام کی حقیقت حضرت مصلح موعودؓ ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں:

''دوسرا الزام رسول کریم ﷺ پر یہ لگایا گیا ہے کہ آپ نعوذ باللہ نبوت سے پہلے ضآل تھے اور بعد میں بھی گناہ آپ سے سرزد ہوتے رہے۔ ان الزامات کی بنا خود قرآن کریم ہی کی بعض آیات کو قرار دیا گیا ہے۔ ضآل کے متعلق تو یہ آیت پیش کی جاتی ہے وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى (الضحیٰ:۸) ہم نے تجھے ضـــال پایا پھر ہدایت دی۔ اس کا جواب قرآن کریم کی ایک دوسری آیت ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے آپ سے ضلالت کی کلی طور پر نفی کردی ہے۔ فرماتا ہے۔ وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى ۝ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى ۝ (النجم:۲،۳) ہم نجم کو شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ نجم اس بوٹی کو کہتے ہیں جس کی جڑ نہ ہو۔ فرمایا ہم اس بوٹی کو شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں جس کی جڑ نہیں ہوتی جب کہ وہ گر جاتی ہے۔ یعنی وہ جتنا اونچا ہونا چاہتی ہے اسی قدر گرتی ہے۔ اس شہادت سے تم سمجھ سکتے ہو کہ تمہارا یہ صاحب کبھی گمراہ نہیں ہوا اور نہ راستہ سے دور ہوا۔ ضَلَّ ظاہری گمراہی کے لئے آتا ہے اور غَوٰى باطنی فساد کے لئے جو فساد اعتقاد سے پیدا ہو۔

فرمایا جو بے جڑ کی بوٹی ہو اس پر تو جتنے زیادہ دن گزریں اس میں کمزوری آتی جاتی ہے۔ اگر محمد رسول اللہ ﷺ کا خدا سے تعلق نہ ہوتا تو اس کی جڑ مضبوط نہ ہوتی اور یہ کمزور ہوتا جاتا اور خرابی پیدا ہو جاتی۔ مگر تم دیکھتے ہو کہ جوں جوں دن گزر رہے ہیں اسے زیادہ سے زیادہ طاقت حاصل ہو رہی ہے اور یہ دن رات ظاہری اور باطنی طور پر ترقی حاصل کر رہا ہے۔ اگر ضلالت اس کے اندر ہوتی تو اس پر ضلالت والا کلام نازل ہوتا۔ مگر اس پر جو کلام نازل ہوا ہے اس میں دیکھو کہ کیا اس میں کوئی بھی ہوائے نفس کا نشان ملتا ہے۔ اگر یہ غاوی ہوتا تو شیطانی اثر اس کے کلام

پر ہوتا۔لیکن اس کا کلام تو پُرشوکت اور قادرانہ کلام پر مشتمل ہے۔شیطانی تعلقات والا انسان دنیا پر تصرف کیسے حاصل کرسکتا ہے۔

یہی مضمون اللہ تعالیٰ نے سورۃ ضحیٰ میں بیان کیا ہے۔فرماتا ہے۔ وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى (الضحیٰ:۵) تیری ہر پیچھے آنے والی گھڑی پہلی سے بہتر ہے۔اب کیا یہ عجیب بات نہیں کہ یہاں تو کہا کہ تیری ہر پچھلی گھڑی پہلی گھڑی سے اچھی ہوتی ہے۔لیکن اس سورۃ میں کہہ دیا کہ تو گمراہ تھا۔آیا پچھلی گھڑی کا پہلی سے اچھی ہونا ضلالت کی دلیل ہوتا ہے؟

سورۃ ابراہیم رکوع ۴ میں آتا ہے:

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ (ابراہیم:۲۵) یا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ کیسی باتیں بیان کرتا ہے۔پاک کلمہ کی مثال ایک پاک درخت کی سی ہوتی ہے جس کی جڑ میں بڑی مضبوطی ہوتی ہے اور اس کی شاخیں آسمان تک پہنچی ہوئی ہوتی ہیں۔اسی طرح صادق کی علامت یہ ہے کہ اس کی تعلیم ترقی کرتی ہے اور اس کی جماعت بڑھتی جاتی ہے۔اب یہ رسول جو دن رات ترقی کررہا ہے اگر ضلالت پر ہوتا تو جتنی زیادہ تعلیم بناتا اسی قدر زیادہ نقص ہوتے۔مگر اس کے کلام کی زیادتی تو اس کی تعلیم کو مکمل بنا رہی ہے۔

پھر بتایا اگر یہ غاوی ہوتا تو شیطانی اثر اس کے کلام پر ہوتا۔مگر اس کا کلام تو ایسا ہے کہ وہ:

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝ عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى ۝

(النجم:۴تا۶)

یہ اپنی خواہشِ نفسانی سے کلام نہیں کرتا بلکہ اس کا پیش کردہ کلام صرف خدا تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے والی وحی ہے اور اس کو یہ کلام بڑی قوت والے خدا نے سکھایا ہے۔

ایک اور آیت بھی اس امر کو حل کرتی ہے۔سورہ بنی اسرائیل رکوع ۸ میں آتا ہے:

وَاِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهٗ ۖ وَاِذًا لَّاتَّخَذُوْكَ خَلِيْلًا (بنی اسرائیل:۷۴)

فرمایا قریب تھا کہ لوگ تجھے عذاب میں مبتلا کردیں۔عام طور پر لوگوں نے غلطی سے اس کے یہ معنی کیے ہیں کہ رسول کو پھسلا لیں۔مگر وہ رسول کریم ﷺ کو کہاں پھسلا سکتے تھے۔اس کے تو یہ معنی ہیں کہ قریب ہے کہ یہ لوگ تجھے سخت عذاب دیں۔اس کلام کی وجہ سے جو تجھ پر وحی کیا گیا ہے۔تا کہ تو اس سے گھبرا کر کچھ تبدیلی کرلے اور اگر ایسا ہو تو یہ ضرور تجھے دوست بنالیں۔ لیکن ان کا خیال ایک جنون ہے۔

وَلَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْـًٔا قَلِيْلًا (بنی اسرائیل:۷۵)

اگر ہم نے قرآن نہ بھی نازل کیا ہوتا تو بھی تیری فطرت ایسی پاک ہے کہ یہ بات تو بڑی ہے، تیری ان سے مشابہت پھر بھی معمولی سی ہوتی۔مگر اب تو تجھے وحی الٰہی نے ایک صحیح راستہ دکھایا دیا ہے۔اب ان کی یہ خواہش کس طرح پوری ہوسکتی ہے۔

اب سوال ہوتا ہے کہ پھر وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى کا کیا مطلب ہوا۔سو اس کا جواب خود اسی سورۃ میں موجود ہے۔اس میں رسول کریم ﷺ کی صداقت کی ایک زبردست دلیل دی گئی ہے۔فرماتا ہے: وَالضُّحٰى ۙ وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰى ۙ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى (الضحیٰ ۴،۲)

اے دنیا کے لوگو سنو! عین دوپہر کے وقت کو اور رات کو جب وہ خوب ساکن ہو جاتی ہے اور اس کی تاریکی چاروں طرف پھیل جاتی ہے۔ہم اس بات کی شہادت میں پیش کرتے ہیں کہ محمد (ﷺ) کو ہم نے کبھی نہیں چھوڑا اور نہ محمد رسول اللہ (ﷺ) سے ہم کبھی ناراض ہوئے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ دوپہر اور آدھی رات اس بات کی کس طرح دلیل ہیں کہ محمد ﷺ سے خدا کبھی ناراض نہیں ہوا اور نہ اس نے آپ کو چھوڑا۔یہ ظاہر ہے کہ یہاں ظاہری دن رات مراد نہیں بلکہ مجازی دن رات مراد ہیں۔اور یہ محاورہ ہر زبان میں پایا جاتا ہے کہ رات اور دن سے خوشی اور رنج اور ہوش اور غفلت کا زمانہ مراد لیا جاتا ہے۔رات تاریکی، مصیبت اور جہالت کو کہتے ہیں۔اور دن ترقی، روشنی اور علم کے زمانہ کو کہتے ہیں۔پس خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم تیری عمر کی ان گھڑیوں کو بھی پیش کرتے ہیں جو خوشی کی تھیں اور ان کو بھی جو رنج کی تھیں۔اور تیرے

ہوش کے زمانہ کو بھی اور بچپن کے زمانہ کو بھی جو جہالت کا زمانہ ہوتا ہے۔ پھر اس زمانہ کو بھی جو نبوت سے پہلے کا تھا۔ اور اسے بھی جب نبوت کا سورج طلوع ہو کر نِصْفُ النَّھار پر آ گیا۔ تجھ پر وہ زمانہ بھی آیا جب کہ تو دایہ کی گود میں تھا۔ پھر وہ زمانہ بھی آیا جو شباب کی تاریکی کا زمانہ ہوتا ہے۔ وہ زمانہ بھی آیا جب جذبات سرد ہو جاتے ہیں۔ پھر وہ زمانہ بھی آیا جب کہ ہر طرف تیرے دشمن ہی دشمن تھے اور تیرے لئے دن بھی رات تھا۔ پھر وہ زمانہ آیا جب ساری قوم تجھے امین اور صادق کہتی تھی۔ ان سب زمانوں کو دیکھ لو کیا کوئی وقت بھی ایسا آیا ہے جب خدا نے تیری نصرت سے ہاتھ روکا ہو۔ اس کی ناراضگی کسی رنگ میں تجھ پر ظاہر ہوئی ہو۔ بعض لوگ آرام اور عزت حاصل ہونے پر بگڑ جاتے ہیں مگر تجھے جب امن ہوا امیر بیوی ملی۔ تیری قوم نے تیری عزت کی۔ اس وقت بھی تو نے اچھے کام کئے۔ پھر وہ زمانہ آیا کہ خدا نے اپنا کلام تجھ پر اتارا تب بھی تو فرمانبردار رہا۔ گویا تیری ہر آنے والی گھڑی پہلی سے اعلیٰ اور بہتر رہی ہے۔ اور خدا کی تائید اور اس کی پسندیدگی بڑھتی چلی گئی۔ اب دیکھو رسول کریم ﷺ کی صداقت کی یہ کتنی بڑی دلیل ہے۔ عجیب بات ہے خدا تعالیٰ تو کہتا ہے کہ اس کی ساری زندگی بچپن سے آخر تک دیکھ لو۔ ایک لمحہ بھی اس کے لئے گمراہی کا نہیں آیا اور خدا تعالیٰ نے اسے نہیں چھوڑا۔ مگر نادان مخالف کہتے ہیں کہ آپ گمراہ تھے۔ اگر یہی گمراہی ہے تو ساری ہدایت اس پر قربان کی جاسکتی ہے۔

پھر فرماتا ہے وَلَلْاٰخِرَةُ خَیْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى (الضحیٰ:۵)۔ تیرا ہر قدم ترقی کی طرف چلتا گیا۔ بچپن میں انسان بے گناہ ہوتا ہے۔ اگر نعوذ باللہ رسول کریم ﷺ بڑے ہو کر گمراہ ہو گئے تو آخرت اولیٰ سے بہتر نہ ہوئی۔ مگر خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ تیری ہر اگلی گھڑی پہلے سے اچھی تھی۔ اور جب ہر اگلی گھڑی اچھی تھی تو ضلالت کہاں سے آ گئی۔

پھر فرماتا ہے وَلَسَوْفَ یُعْطِیْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى عنقریب اللہ تعالیٰ تجھے ایسے انعام دے گا کہ تو خوش ہو جائے گا۔ اس کے متعلق ہم قرآن کریم سے دیکھتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ کی وہ کون سی خواہش تھی جس کے پورا ہونے سے آپ خوش ہو سکتے تھے۔

سورہ کہف رکوع ۱ میں آتا ہے۔

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا

(الکہف:۷)

اے محمد (ﷺ) تو اپنے آپ کو اس لئے ہلاک کر رہا ہے کہ لوگ ہمارے کلام پر ایمان کیوں نہیں لاتے ۔یہ خواہش تھی رسول کریم ﷺ کی کہ آپ کی قوم خدا تعالیٰ کے کلام کو مان لے۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى تو نے دیکھا کہ تیری ہر گھڑی کو ہم نے پہلے سے اچھا رکھا۔پھر کیا تمہاری یہ بات ہم رڈ کر دیں گے کہ تیری قوم ہدایت پا جائے ۔ہمیں اس خواہش کا بھی علم ہے اور اسے بھی ہم پورا کر دیں گے۔

پھر فرمایا اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى اے محمد (ﷺ) تو یتیم تھا جب پیدا ہوا۔اس یتیمی کے وقت سے خدا نے تم کو اپنی گود میں لے لیا۔گویا کوئی وقت خدا کی گود سے باہر اب تک آیا ہی نہیں۔آوی کے معنی ہیں قرب میں جگہ دی فرمایا اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى کیا خدا نے تم کو یتیم پا کر اپنے پاس جگہ نہیں دی۔وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى اب اس کے معنے اگر یہ کئے جائیں کہ تجھے گمراہ پایا پھر ہدایت دی تو یہ معنی یہاں چسپاں ہی نہیں ہو سکتے ۔پس اس کے یہی معنی ہیں کہ ہم نے تجھ میں محبت کی تڑپ دیکھی اور دنیا کی ہدایت کا سامان دے دیا۔ان معنوں کی تائید ایک اور آیت سے بھی ہوتی ہے۔جب حضرت یعقوب علیہ السلام نے کہا کہ مجھے یوسف کی خوشبو آ رہی ہے تو انہیں گھر والوں نے کہا تَاللّٰهِ اِنَّكَ لَفِيْ ضَلٰلِكَ الْقَدِيْمِ (یوسف:۹۶) یوسف کی پرانی محبت تیرے دل سے نکلتی ہی نہیں ۔تو ابھی تک اس پرانی محبت میں گرفتار ہے۔وہ لوگ حضرت یعقوب علیہ السلام کو گمراہ نہیں سمجھتے تھے بلکہ یوسف علیہ السلام کی محبت میں کھویا ہوا سمجھتے تھے۔اس لئے ضَلال کا لفظ انہوں نے شدتِ محبت کے متعلق استعمال کیا۔پس وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى کے یہ معنی ہیں کہ جب تو جوان ہوا اور تیرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ خدا سے ملے بغیر میں آرام نہیں پا سکتا تو ہم نے تجھے فوراً آواز دی کہ آ جا میں موجود ہوں ۔اے محمد (ﷺ) تجھے معلوم ہے کہ جب ہم نے ہدایت دی تو وہ تیرے نفس کے لئے ہی نہ تھی بلکہ ساری دنیا کے لئے تھی ۔پس لوگ تیرے پاس آئے اور مختلف طبائع کے لوگ

آئے پھر ہم نے ان کی کفالت کے لئے قرآن کے ذریعہ تجھے وہ رزق دیا جو ہر فطرت کے انسان کے لئے کافی تھا۔ پس وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى (الضحیٰ:۹)۔اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم نے تجھے کثیر العیال پایا اور اپنے فضل سے غنی کر دیا۔ فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ (الضحیٰ:۱۰،۱۱)۔ پس اب تو بھی ان پر اتنا بوجھ نہ ڈالنا کہ ان کی طاقتیں کچلی جائیں۔ نہ اتنی رعایت کرنا کہ بگڑ جائیں۔ اس آیت میں ضالّ کے مقابل پر سائِل رکھا گیا ہے۔ جس میں اس طرف اشارہ کے وہاں بھی ضالّ سے مراد خدا کی محبت کے طلبگار کے ہیں۔ بہر حال فرمایا کہ جب کوئی تمہارے پاس ہدایت حاصل کرنے کے لئے آئے تو انکار نہ کرنا بلکہ وہ ہدایت جو ہم نے تجھے دی ہے اسے ساری دنیا میں پہنچانا۔

ضال کے جو معنی میں نے اس وقت کئے ہیں اس کے خلاف کوئی اور معنی ہو ہی نہیں سکتے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ہم نے تجھے ضال پایا اور اس کے نتیجہ میں ہدایت دی اور دوسری طرف فرماتا ہے وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ کہ فسق کے نتیجہ میں کبھی ہدایت نہیں ملا کرتی۔ پھر ضال کے معنی گمراہ کس طرح کئے جا سکتے ہیں۔ پھر فرماتا ہے:

وَاِذَا جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰى نُؤْتٰى مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ رُسُلُ اللّٰهِ ۘؔ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ ؕ سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا صَغَارٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعَذَابٌ شَدِيْدٌۢ بِمَا كَانُوْا يَمْكُرُوْنَ (الانعام:۱۲۵)

جب ان کے پاس کوئی نشان آتا ہے تو وہ کہتے ہیں ہم اسے نہیں مان سکتے جب تک ہمیں ویسا ہی کلام نہ ملے جو رسولوں کو ملا۔ اللہ سب سے زیادہ جانتا ہے کہ وہ اپنی رسالت کہاں رکھے۔ یہ گنا ہگار لوگ ہیں ان کو تو ذلت ہی ملے گی۔ اس آیت میں صاف طور پر بتا دیا کہ گناہ کے نتیجہ میں ذلت حاصل ہوتی ہے نہ کہ ہدایت۔"

(انوار العلوم جلد ۱۲ صفحہ ۴۶۲ تا صفحہ ۴۶۷)

باب چہارم

علمائے یہود و نصاریٰ

سے تعلیم پانے اور امّی نہ ہونے

کے الزامات

علماء یہود و نصاریٰ سے علمی معاونت لینے اور اُمّی نہ ہونے کا الزام

اللہ تعالیٰ نے آنحضورؐ کو النبی الاُمّی کا خطاب دیا ہے۔ بعض مخالفین نے یہ الزام لگایا ہے کہ آپؐ علماءِ یہود و نصاریٰ سے علمی معاونت لیتے تھے اور یہ کہ آپؐ اُمّی نہ تھے۔ اس الزام کی حقیقت بیان کرتے ہوئے حضرت مسیح موعود علیہ السلام براہین احمدیہ میں تحریر فرماتے ہیں:۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اُمّی ہونا عربوں اور عیسائیوں اور یہودیوں کی نظر میں ایسا بدیہی اور یقینی امر تھا کہ اس کے انکار میں کچھ دم نہیں مار سکتے تھے بلکہ اسی جہت سے وہ توریت کے اکثر قصے جو کسی خواندہ آدمی پر مخفی نہیں رہ سکتے بطور امتحان نبوت آنحضرت پوچھتے تھے اور پھر جواب صحیح اور درست پاکر ان فاش غلطیوں سے مبرا دیکھ کر جو توریت کے قصوں میں پڑ گئے ہیں وہ لوگ جو ان میں راسخ فی العلم تھے بصدق دلی ایمان لے آتے تھے جن کا ذکر قرآن شریف میں اس طرح پر درج ہے:۔

وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى ۚ ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا وَّاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ ۚ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ وَمَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَا جَآءَنَا مِنَ الْحَقِّ ۙ وَنَطْمَعُ اَنْ يُّدْخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصّٰلِحِيْنَ ۔

سورۃ المائدۃ الجزو نمبر ۷ (المائدۃ: ۸۳ تا ۸۵)

(ترجمہ) سب فرقوں میں سے مسلمانوں کی طرف زیادہ تر رغبت کرنے والے عیسائی ہیں کیونکہ ان میں بعض بعض اہلِ علم اور راہب بھی ہیں جو تکبر نہیں کرتے اور جب خدا کے کلام کو جو اُس کے رسول پر نازل ہوا سنتے ہیں تب تُو دیکھتا ہے کہ اُن کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں اس وجہ سے کہ وہ حقانیت کلام الٰہی کو پہچان جانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ خدایا ہم ایمان لائے ہم کو اُن لوگوں میں لکھ لے جو تیرے دین کی سچائی کے گواہ ہیں اور کیوں ہم خدا اور خدا کے سچے کلام پر ایمان نہ

لاویں۔حالانکہ ہماری آرزو ہے کہ خدا ہم کو ان بندوں میں داخل کرے جو نیکوکار ہیں۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖۤ اِذَا یُتْلٰى عَلَیْهِمْ یَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا وَّ یَقُوْلُوْنَ سُبْحٰنَ رَبِّنَاۤ اِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا وَ یَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ یَبْكُوْنَ وَ یَزِیْدُهُمْ خُشُوْعًا سورۃ بنی اسرائیل الجزو نمبر ۱۵

(بنی اسرائیل:۱۰۸۔۱۱۰) جو لوگ عیسائیوں اور یہودیوں میں سے صاحب علم ہیں جب ان پر قرآن پڑھا جاتا ہے تو سجدہ کرتے ہوئے ٹھوڑیوں پر گر پڑتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارا خدا تخلّفِ وعدہ سے پاک ہے ایک دن ہمارے خداوند کا وعدہ پورا ہونا ہی تھا اور روتے ہوئے مونہہ پر گر پڑتے ہیں اور خدا کا کلام اُن میں فروتنی اور عاجزی کو بڑھاتا ہو۔

پس یہ تو ان لوگوں کا حال تھا جو عیسائیوں اور یہودیوں میں اہل علم اور صاحب انصاف تھے کہ جب وہ ایک طرف آنحضرت کی حالت پر نظر ڈال کر دیکھتے تھے کہ محض اُمّی ہیں کہ تربیت اور تعلیم کا ایک نقطہ بھی نہیں سیکھا اور نہ کسی مہذب قوم میں بود و باش رہی اور نہ مجالسِ علمیہ دیکھنے کا اتفاق ہوا۔اور دوسری طرف وہ قرآن شریف میں صرف پہلی کتابوں کے قصے نہیں بلکہ صدہا باریک صداقتیں دیکھتے تھے جو پہلی کتابوں کی مکمل اور متمم تھیں تو آنحضرت کی حالت اُمیّت کو سوچنے سے اور پھر اس تاریکی کے زمانہ میں ان کمالات علمیہ کو دیکھنے سے نیز انوار ظاہری و باطنی کے مشاہدہ سے نبوت آنحضرت کی ان کو اظہر من الشّمس معلوم ہوتی تھی اور ظاہر ہے کہ اگر ان مسیحی فاضلوں کو آنحضرت کے اُمّی اور مؤیّد من اللہ ہونے پر یقین کامل نہ ہوتا تو ممکن نہ تھا کہ وہ ایک ایسے دین سے جس کی حمایت میں ایک بڑی سلطنت قیصر روم کی قائم تھی اور جو نہ صرف ایشیا میں بلکہ بعض حصوں یورپ میں بھی پھیل چکا تھا اور بوجہ اپنی مشرکانہ تعلیم کے دنیا پرستوں کو عزیز اور پیارا معلوم ہوتا تھا صرف شک اور شبہ کی حالت میں الگ ہو کر ایسے مذہب کو قبول کر لیتے جو بباعث تعلیم توحید کے تمام مشرکین کو بُرا معلوم ہوتا تھا اور اُس کے قبول کرنے والے ہر وقت چاروں طرف سے معرض ہلاکت اور بلا میں تھے پس جس چیز نے ان کے دلوں کو اسلام کی طرف پھیرا وہ یہی بات تھی جو انہوں نے آنحضرتؐ کو محض اُمّی اور سراپا مؤیّد من اللہ پایا اور قرآن

شریف کو بشری طاقتوں سے بالاتر دیکھا اور پہلی کتابوں میں اس آخری نبی کے آنے کے لئے خود بشارتیں پڑھتے تھے سو خدا نے ان کے سینوں کو ایمان لانے کے لئے کھول دیا۔ اور ایسے ایماندار نکلے جو خدا کی راہ میں اپنے خونوں کو بہایا اور جو لوگ عیسائیوں اور یہودیوں اور عربوں میں سے نہایت درجہ کے جاہل اور شریر اور بدباطن تھے ان کے حالات پر بھی نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی بہ یقینِ کامل آنحضرت کو اُمّی جانتے تھے اور اسی لئے جب وہ بائبل کے بعض قصے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بطور امتحان نبوت پوچھ کر ان کا ٹھیک ٹھیک جواب پاتے تھے تو یہ بات ان کو زبان پر لانے کی مجال نہ تھی کہ آنحضرت کچھ پڑھے لکھے ہیں۔ آپ ہی کتابوں کو دیکھ کر جواب بتلا دیتے ہیں بلکہ جیسے کوئی لاجواب رہ کر اور گھسیانا بن کر کچے عذر پیش کرتا ہے ایسا ہی نہایت ندامت سے یہ کہتے تھے کہ شاید درپردہ کسی عیسائی یا یہودی عالم بائبل نے یہ قصے بتلا دیئے ہوں گے۔ پس ظاہر ہے اگر آنحضرت کا اُمّی ہونا ان کے دلوں میں بہ یقین کامل متمکن نہ ہوتا تو اسی بات کے ثابت کرنے کے لئے نہایت کوشش کرتے کہ آنحضرت اُمّی نہیں ہیں فلاں مکتب یا مدرسہ میں انہوں نے تعلیم پائی ہے۔ واہیات باتیں کرنا جن سے اُن کی حماقت ثابت ہوتی تھی کیا ضرور تھا۔ کیونکہ یہ الزام لگانا کہ بعض عالم یہودی اور عیسائی درپردہ آنحضرت کے رفیق اور معاون ہیں بدیہی البطلان تھا۔ اس وجہ سے کہ قرآن تو جابجا اہلِ کتاب کی وحی کو ناقص اور اُن کی کتابوں کو محرف اور مبدل اور ان کے عقائد کو فاسد اور باطل اور خود ان کو بشرطیکہ بے ایمان مریں ملعون اور جہنمی بتلاتا ہے۔ اور اُن کے اصولِ مصنوعہ کو دلائل قویہ سے توڑتا ہے تو پھر کس طرح ممکن تھا کہ وہ لوگ قرآن شریف سے اپنے مذہب کی آپ ہی مذمّت کرواتے۔ اور اپنی کتابوں کا آپ ہی رد لکھاتے اور اپنے مذہب کی بیخ کنی کے آپ ہی موجب بن جاتے پس یہ سست اور نادرست باتیں اس لئے دنیا پرستوں کو بکنی پڑیں کہ اُن کو عاقلانہ طور پر قدم مارنے کا کسی طرف راستہ نظر نہیں آتا تھا اور آفتاب صداقت کا ایسی پرزور روشنی سے اپنی کرنیں چاروں طرف چھوڑ رہا تھا کہ وہ اس سے چمگادڑ کی طرح چھُپتے پھرتے تھے اور کسی ایک بات پر ان کو ہرگز ثبات و قیام نہ تھا بلکہ تعصب اور شدّت عناد نے ان کو سودائیوں اور پاگلوں کی طرح بنا رکھا تھا۔

پہلے تو قرآن کے قصوں کو سن کر جن میں بنی اسرائیل کے پیغمبروں کا ذکر تھا اس وہم میں پڑے کہ شاید ایک شخص اہل کتاب میں سے پوشیدہ طور پر یہ قصے سکھاتا ہوگا جیسا اُن کا یہ مقولہ قرآن شریف میں درج ہے۔ اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ ۔سورۃ النحل الجزو نمبر ۱۴ (النحل:۱۰۴) اور پھر جب دیکھا کہ قرآن شریف میں صرف قصے ہی نہیں بلکہ بڑے بڑے حقائق ہیں تو پھر یہ دوسری رائے ظاہر کی وَاَعَانَهٗ عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ ۔سورۃ الفرقان الجزو نمبر ۱۸۔(الفرقان:۵) یعنی ایک بڑی جماعت نے متفق ہو کر قرآن شریف کو تالیف کیا ہے ایک آدمی کا کام نہیں۔ پھر جب قرآن شریف میں ان کو یہ جواب دیا گیا کہ اگر قرآن کو کسی جماعت علماء فضلاء اور شعرا نے اکٹھے ہو کر بنایا ہے تو تم بھی کسی ایسی جماعت سے مدد لے کر قرآن کی نظیر بنا کر دکھلاؤ تا تمہارا سچا ہونا ثابت ہو تو پھر لاجواب ہو کر اس رائے کو بھی جانے دیا اور ایک تیسری رائے ظاہر کی اور وہ یہ کہ قرآن کو جنّات کی مدد سے بنایا ہے یہ آدمی کا کام نہیں پھر خدا نے اس کا جواب بھی ایسا دیا کہ جس کے سامنے وہ چون و چرا کرنے سے عاجز ہو گئے جیسا فرمایا ہے۔

وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ فَاَيْنَ تَذْهَبُوْنَ (التکویر:۲۵۔۲۷)

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰۤى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ۔سورۃ بنی اسرائیل الجزو نمبر ۱۵ (بنی اسرائیل:۸۹)

یعنی قرآن ہر یک قسم کے امور غیبیہ پر مشتمل ہے اور اس قدر بتلانا جنات کا کام نہیں۔ ان کو کہہ دے کہ اگر تمام جن متفق ہو جائیں اور ساتھ ہی بنی آدم بھی اتفاق کر لیں اور سب مل کر یہ چاہیں کہ مثل اس قرآن کے کوئی اور قرآن بنا دیں تو ان کے لئے ہرگز ممکن نہیں ہوگا اگرچہ ایک دوسرے کے مددگار بن جائیں۔

پھر جب ان بدبختوں پر اپنے تمام خیالات کا جھوٹ ہونا کھل گیا اور کوئی بات بنتی نظر نہ آئی تو آخر کار کمال بے حیائی سے کمینہ لوگوں کی طرح اس بات پر آ گئے کہ ہر طرح پر اس تعلیم کو شائع ہونے سے روکنا چاہئے جیسا اس کا ذکر قرآن شریف میں فرمایا ہے:۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ

وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ (حٰمٓ السجدہ:۲۷)

وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ (آل عمران:۷۳)

یعنی کافروں نے یہ کہا کہ اس قرآن کو مت سنو۔ اور جب تمہارے سامنے پڑھا جاوے تو تم شور ڈال دیا کرو۔ تا شاید اسی طرح غالب آ جاؤ۔ اور بعضوں نے عیسائیوں اور یہودیوں میں سے یہ کہا کہ یوں کرو کہ اول صبح کے وقت جا کر قرآن پر ایمان لے آؤ۔ پھر شام کو اپنا ہی دین اختیار کر لو۔ تا شاید اس طور سے لوگ شک میں پڑ جائیں اور دینِ اسلام کو چھوڑ دیں۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ وَيَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰٓؤُلَآءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ وَمَنْ يَّلْعَنِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ نَصِيْرًا

سورۃ النساء الجزو نمبر ۵ (النساء:۵۲، ۵۳)

کیا تو نے دیکھا نہیں کہ یہ عیسائی اور یہودی جنہوں نے انجیل اور توریت کو کچھ ادھورا سا پڑھ لیا ہے ایمان ان کا دیوتوں اور بتوں پر ہے اور مشرکوں کو کہتے ہیں کہ ان کا مذہب جو بُت پرستی ہے وہ بہت اچھا ہے اور توحید کا مذہب جو مسلمان رکھتے ہیں یہ کچھ نہیں یہ وہی لوگ ہیں جن پر خدا نے لعنت کی ہے اور جس پر خدا لعنت کرے اس کے لئے کوئی مددگار نہیں۔

اب خلاصہ اس تقریر کا یہ ہے کہ اگر آنحضرت اُمّی نہ ہوتے تو مخالفین اسلام بالخصوص یہودی اور عیسائی جن کو علاوہ اعتقادی مخالفت کے یہ بھی حسد اور بغض دامنگیر تھا کہ بنی اسرائیل میں سے رسول نہیں آیا بلکہ ان کے بھائیوں میں سے جو بنی اسماعیل ہیں آیا وہ کیونکر ایک صریح امر خلاف واقعہ پا کر خاموش رہتے بلاشبہ ان پر یہ بات بکمال درجہ ثابت ہو چکی تھی کہ جو کچھ آنحضرت کے مونہہ سے نکلتا ہے وہ کسی اُمّی اور ناخواندہ کا کام نہیں اور نہ دس بیس آدمیوں کا کام ہے تب ہی تو وہ اپنی جہالت سے اَعَانَهٗ عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ۔ (الفرقان:۵) کہتے تھے اور جو اُن میں سے دانا اور واقعی اہل علم تھے وہ بخوبی معلوم کر چکے تھے کہ قرآن انسانی طاقتوں

سے باہر ہے اور اُن پر یقین کا دروازہ ایسا کھل گیا تھا کہ ان کے حق میں خدا نے فرمایا:
يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ (البقرہ:۱۴۷) یعنی اس نبی کو ایسا شناخت کرتے ہیں کہ جیسا اپنے بیٹوں کو شناخت کرتے ہیں اور حقیقت میں یہ دروازہ یقین اور معرفت کا پچھلوں کے لئے ہی نہیں کھلا بلکہ اس زمانہ میں بھی سب کے لئے کھلا ہے کیونکہ قرآن شریف کی حقائیت معلوم کرنے کے لئے اب بھی وہی معجزات قرآنیہ اور وہی تاثیرات فرقانیہ اور وہی تائیدات غیبی اور وہی آیات لاریبی موجود ہیں جو اُس زمانہ میں موجود تھی خدا نے اس دین قویم کو قائم رکھنا تھا اِس لئے اِس کی سب برکات اور سب آیات قائم رکھیں اور عیسائیوں اور یہودیوں اور ہندوؤں کے ادیان مُحرفہ اور برکت حقائیت اور تائیداتِ سماویہ کا نام ونشان نہ رہا۔ ان کی کتابیں ایسے نشان بتلا رہی ہیں جن کے ثبوت کا ایک ذرا نشان اُن کے ہاتھ میں نہیں صرف گزشتہ قصوں کا حوالہ دیا جاتا ہے مگر قرآنِ شریف ایسے نشان پیش کرتا ہے جن کو ہر یک شخص دیکھ سکتا ہے۔

(براہین احمدیہ حصہ چہارم روحانی خزائن جلد نمبر ا صفحہ ۵۷۶ تا ۵۹۲)

☆

عیسائیوں کا آپؐ پر اعتراض کہ آپؐ نے یہود و نصاریٰ علماء سے تعلیم پائی اور بعض نظریات بھی بدلے چنانچہ سر ولیم میور کے اس اعتراض کو نقل کر کے حضرت مصلح موعود بیان فرماتے ہیں:

''معلوم ہوتا ہے کہ جب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں آئے تو یہود و نصاریٰ کے اثر سے انہوں نے جنت کے بارہ میں اپنے کلام کو بدل دیا کسی نے سچ کہا ہے کہ دروغ گورا حافظہ نباشد۔ مسیحی مصنف کفار مکہ کے اسی اعتراض کو بڑی وقعت دیتے ہیں کہ محمد رسول اللہ کو کوئی اور شخص سکھاتا ہے اور اس پر زور دیتے ہیں کہ بعض مسیحی لوگ جو غلام تھے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مسیحی کتب کی باتیں بتاتے تھے اور کبھی وہ یہ الزام لگاتے ہیں کہ آپؐ نے ایک مسیحی راہب سے اپنی جوانی میں مسیحی مذہب کی تعلیم حاصل کی تھی اور اسے قرآن میں نقل کر دیا۔ سر ولیم میور نے اپنی کتاب میں اس امر کی تصدیق کی ہے کہ آپؐ نے صہیب رضی اللہ عنہ سے جو ایک رومی غلام تھے

اور مکہ میں رہتے تھے عیسائیت کے بارہ میں علم حاصل کیا تھا (لائف آف محمد ص ۶۷) اگر یہ بات درست ہے تو مدینہ میں آنے سے پہلے ہی آپ کو مسیحی تعلیم کا علم تھا اور مدینہ میں آکر جنت کے بارہ میں مسیحی تعلیم سے متاثر ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر واقعہ میں مسیحی اور یہودی غلام آپ ﷺ کو پرانے اور نئے عہدنامہ کی باتیں بتایا کرتے تھے تو یہ علم آپ کو مکہ میں ہی حاصل ہو جانا چاہئے تھے۔

بات یہ ہے کہ یہودی اور نصرانی لٹریچر میں جنت کا کوئی ذکر نہیں۔ اسرائیلی لوگوں کو اس دنیا کی زندگی سے ایسی الفت رہی ہے اور ان کی شاخ مسیحیت بھی اسی مرض میں مبتلا رہی ہے کہ اخروی زندگی کے بارہ میں ان کی کتب میں کوئی معین تعلیم موجود نہیں وہ سب ان وعدوں کو جو انبیاء نے اخروی زندگی کے بارہ میں کئے ہیں اسی دنیا پر چسپاں کرتے چلے آئے ہیں۔ پس ان سے کسی کا متاثر ہونا امر محال ہے۔ ان کی کتب میں نہ ان مسائل پر بحث ہے اور نہ کوئی ان سے کچھ اخذ کرسکا ہے وہ تو اسی دنیا کی طرف راغب رہے ہیں جیسا کہ قرآن کریم ان کے حق میں فرماتا ہے کہ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (الکہف: ۱۰۵) یعنی ان کی تمام کوششیں اسی دنیا میں غائب ہو کر رہ جاتی ہیں پس اگر کوئی ان سے اس بارہ میں حاصل کرنا بھی چاہے تو کچھ حاصل نہیں کرسکتا۔ ہاں قرآن کریم ہی ایک ایسی کتاب ہے جس نے ان مسائل پر سیر کن بحث کی ہے جو اپنے اپنے موقع پر بیان ہوگی۔" (تفسیر کبیر جلد ۱ ص ۲۵۵)

سورۃ البقرہ کی آیت ۷۷ کی تشریح میں حضرت مصلح موعودؓ اس اعتراض کے جواب میں بیان فرماتے ہیں:۔

"اس آیت میں ان لوگوں کا بھی جواب ہے جو یہ خیال کرتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہودیوں سے سن سنا کر بائبل کے واقعات قرآن کریم میں لکھ دیئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا کام کرنے والا شخص اس ذریعے کو جس سے وہ فائدہ اٹھاتا ہے بڑھانے کی کوشش کیا کرتا ہے نہ کہ کم کرنے کی۔ اگر نعوذ باللہ من ذالک رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہودیوں سے سن کر قرآن کریم میں واقعات لکھ لیا کرتے تھے تو آپؐ یہود کے اس فعل کا بھانڈا

کیوں چھوڑتے تب تو چاہئے تھا کہ آپ ان کا بھانڈا پھوڑنے کی بجائے ان کے لئے ملاقاتوں کے مواقع پیدا کرنے کی کوشش کرتے۔"

سورۃ البقرہ آیت ۷۸ کی تشریح میں بیان فرمایا:۔"اس آیت میں بھی اس اعتراض کا جواب موجود ہے جو عیسائی مصنفین کی طرف سے کیا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہودیوں سے سن کر بائبل کے واقعات قرآن کریم میں نقل کر دیا کرتے تھے کیونکہ اس آیت میں اس قسم کے خیالات کی تردید کی گئی ہے اور یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ خدا تعالیٰ ہر ضروری خبر اپنے رسول کو خود بتا دیتا ہے۔اور کہا گیا ہے کہ کیا یہودی یہ نہیں سمجھتے کہ اللہ اسے بھی جانتا ہے جو وہ چھپاتے ہیں اور اسے بھی جانتا ہے جو وہ ظاہر کرتے ہیں یعنی قرآن کریم میں ایسی اخبار بھی موجود ہے جو ان یہودیوں نے بیان نہیں کیں اور وہ بھی ہیں جو انہوں نے بیان کیں۔اس سے یہ سمجھ سکتے ہیں کہ جو انہوں نے بیان کی ہیں اگر وہ بیان نہ کرتے تب بھی اس سے قرآن کریم کے مضامین میں کمی نہیں آسکتی تھی۔

مخالفین صداقت ہمیشہ سے ماموروں پر یہ اعتراض کرتے چلے آئے ہیں کہ وہ زمانہ کی رو کی پیداوار ہیں۔اس زمانہ میں جو خیالات زور پر ہوتے ہیں ان سے متاثر ہو کر وہ اپنے لئے ایک مقام تجویز کر لیتے ہیں اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جب کبھی خدا تعالیٰ کسی مامور کو مبعوث کرنے لگتا ہے اس کے آنے سے پہلے لوگوں کی توجہ ایک آنے والے مامور کی طرف پھیر دی جاتی ہے۔بعض سابق پیشگوئیوں کے متعلق لوگ خیال کرنے لگ جاتے ہیں کہ وہ اس زمانہ میں پوری ہوں گی۔اور بعض علامات سے وہ یہ استدلال کرنے لگ جاتے ہیں کہ اسی زمانہ میں وہ موعود مامور آئے گا اور ایسا ہونا ہی چاہیے کیونکہ بعثتِ مامور کے وقت اس کے ماننے کے لئے دنیا میں سامان پیدا کرنا ایک ضروری امر ہے جسے خدا تعالیٰ نظر انداز نہیں کر سکتا۔پس جب وہ مامور آتا ہے تو وہ ان پیشگوئیوں سے بھی فائدہ اٹھاتا ہے جن کی طرف اس کی آمد سے پہلے علماء زمانہ کی نگاہیں اٹھ چکی ہوتی ہیں۔اس سے یہ استدلال کر لینا کہ مامورین زمانہ کی پیداوار ہیں ایک نہایت ہی بودا اعتراض ہے۔کیا ان معترضین کا یہ خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ کو نبی پہلے بھیجنا چاہئے اور

اس کی شناخت کے سامان بعد میں پیدا کرنے چاہئیں؟ اگر خدا تعالیٰ ایسا کرے تو اس کے معنے تو یہ ہوں گے کہ وہ خود دنیا کو ہدایت سے محروم کرنا چاہتا ہے۔ یا پھر کیا ان لوگوں کی یہ خواہش ہے کہ نبیوں کی شناخت کے سامان تو پہلے سے مہیا کر دیئے جائیں اور پہلے نبیوں کی بعض پیشگوئیوں کے پورا ہونے کے آثار بھی ظاہر کر دیئے جائیں لیکن وہ نبی ان پیشگوئیوں سے فائدہ نہ اٹھائے ورنہ یہ سمجھا جائے گا کہ وہ دوسروں کے خیالات سے متاثر ہے۔ ادنیٰ غور سے یہ بات معلوم ہوسکتی ہے کہ یہ خیال بھی بالکل باطل ہے۔ جس چیز کو خدا تعالیٰ نے سچائی کے ظاہر کرنے کے لئے بطور دلیل مہیا کیا ہے اس سے فائدہ نہ اٹھانا تو خدا اور اس کے دین سے غداری ہے اور نبی غدّار نہیں ہوتا۔ پس اس قسم کے اعتراضات خواہ وہ پہلے نبیوں پر ہوئے ہوں یا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر ہوئے ہوں یا آپ کے بعد کسی کے متعلق ہوں بالکل لغو ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آیت زیر تفسیر میں نہایت عمدگی سے اس کو ردّ کر دیا ہے۔ اور فرماتا ہے کہ وہ باتیں بھی ہماری کتاب میں موجود ہیں جن کو تم بیان کرتے ہو اور وہ باتیں بھی موجود ہیں جن کو تم بیان نہیں کرتے یا بیان نہیں کر سکتے۔ خدا تو ساری ہی باتوں سے واقف ہے اس کی طرف سے آنے والی کتاب کسی کے بتائے ہوئے علم کی محتاج نہیں۔ مگر وہ یہ بھی تو نہیں کرسکتی کہ چونکہ کسی اور نے ایک علم کا اظہار کر دیا ہے اس لئے خدا کی کتاب میں سے اس علم کو خارج کر دینا چاہئے۔ اس سے تو سچائی کا خون ہوگا اور خدا کی کتاب ایسی حرکات سے بالا ہوتی ہے۔" (تفسیر کبیر جلد اول ص ۵۲۵ تا ۵۲۶)

☆

کفار اور دیگر مخالفین نے آپؐ پر اعتراض کیا اور یہ آج تک مسلسل اعتراض ہوتا آرہا ہے کہ آپؐ نے قرآن کسی سے سیکھا اور علماء یہود و نصاریٰ سے علمی معاونت حاصل کی۔ اس اعتراض کا بیان قرآن کریم کی سورۃ النحل آیت ۱۰۴ میں بھی ہے۔ اس آیت کی تفسیر اور اعتراضات کے جواب دیتے ہوئے حضرت مصلح موعود بیان فرماتے ہیں:

اس آیت میں کفار کا ایک اور اعتراض بیان کیا گیا ہے جو آج تک مسلمانوں اور مسیحیوں کا محلِ نزاع بنا ہوا ہے۔ میں آیت کا مفہوم بیان کرنے سے پہلے اس اعتراض کی حقیقت

بیان کرتا ہوں۔جیسا کہ آیت کے الفاظ سے ظاہر ہے اس میں کفار کا یہ اعتراض بیان کیا گیا ہے کہ محمد رسول اللہؐ پر الہام نہیں ہوتا بلکہ ان کو ایک آدمی یہ باتیں سکھاتا ہے۔گو قرآن کریم نے اس شخص کا نام نہیں بتایا لیکن عبارت سے ظاہر ہے کہ کفار کا اعتراض اس موقع پر یہ نہ تھا کہ اسے کوئی نامعلوم شخص سکھاتا ہے بلکہ اس موقع پر ان کا اعتراض کسی خاص شخص کے متعلق تھا جس کا وہ اپنے پروپیگنڈا میں نام بھی بتاتے تھے۔قرآن کریم نے گو اس کی شخصیت کا اظہار نہیں کیا مگر یہ بتایا ہے کہ جس شخص پر وہ اعتراض کرتے تھے وہ اعجمی تھا۔اور اسی بنا پر ان کے اعتراض کو رد کیا ہے اور توجہ دلائی ہے کہ ایک اعجمی کی مدد سے یہ کتاب جو عَرَبِيٌّ مُّبِيْنٌ زبان میں ہے کیونکر تیار ہو سکتی تھی۔

مفسرین نے اس اعتراض کے متعلق مختلف واقعات بیان کئے ہیں۔ایک روایت یہ ہے کہ حویطب بن عبدالعزیٰ کا ایک غلام جس کا نام عائش یا یعیش تھا۔وہ پہلی کتب پڑھا کرتا تھا اور اسلام لے آیا تھا اور اسلام پر مضبوطی سے قائم رہا تھا۔مکہ کے لوگ اس کی نسبت الزام لگاتے تھے کہ وہ رسول کریم ﷺ کو سکھاتا ہے۔(روح المعانی جلد ۱۴) فراء اور زجاج کا یہی قول ہے اور مقاتل اور ابن جبیر کا قول ہے کہ مکہ کے لوگ ابوفکیہہ پر الزام لگایا کرتے تھے کہ وہ محمد (ﷺ) کو سکھاتا ہے۔(روح المعانی) بعض نے کہا ہے کہ ابوفکیہہ کا نام یسار تھا اور وہ مکہ کی ایک عورت کا غلام تھا اور یہودی تھا۔

بیہقی اور آدم بن ابی یاس نے عبداللہ بن مسلم الحضرمی سے روایت کی ہے کہ وہ کہا کرتے تھے کہ ہمارے دو نصرانی غلام تھے۔وہ عین التمر کے رہنے والے تھے۔ان میں سے ایک کا نام یسار اور دوسرے کا نام جبر تھا۔دونوں مکہ میں تلواریں بنایا کرتے تھے اور کام کرتے وقت انجیل بھی پڑھتے تھے۔رسول کریمؐ بازار سے گزرتے ہوئے ان کو انجیل پڑھتے ہوئے دیکھ کر کچھ دیر کے لئے وہاں ٹھہر جاتے۔(فتح البیان جلد ۵ نیز روح المعانی جلد ۱۴)

ایک روایت میں ہے کہ ان میں سے ایک سے لوگوں نے پوچھا کہ "اِنَّکَ تُعَلِّمُ مُحَمَّداً" کیا تم محمدؐ کو سکھاتے ہو؟ فَقَالَ لَا بَلْ هُوَ يُعَلِّمُنِي۔اس نے کہا نہیں بلکہ محمدؐ مجھے سکھاتے ہیں۔ (روح المعانی جلد ۱۴)

ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ ایک عجمی رومی غلام مکہ میں تھا، اس کا نام بلعام تھا، رسول اللہؐ اسے اسلام سکھایا کرتے تھے۔ اس پر قریش کہنے لگے کہ یہ محمدؐ کو سکھاتا ہے۔ (روح المعانی جلد ۱۴)

علاوہ ازیں علامہ سیوطیؒ لکھتے ہیں کہ قیس ایک عیسائی غلام تھا۔ اس کی ملاقات رسول اللہؐ سے تھی۔ اس پر الزام لگائے گئے تھے کہ وہ محمدؐ کو سکھاتا ہے۔

درّ منثور میں لکھا ہے کہ عدس ایک غلام تھا جو وسہ بن ربیع کا غلام تھا اس کی نسبت الزام لگایا جاتا تھا۔ اور روح المعانی (جلد ۱۴) اور کشاف میں لکھا ہے کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ کفار سلمانؓ فارسی کے متعلق الزام لگایا کرتے تھے۔ ڈاکٹر سیل لکھتا ہے کہ ڈاکٹر پریڈیا نے سوانح محمدؐ میں لکھا ہے کہ عبداللہ (ابن) سلام کے متعلق لوگ اعتراض کیا کرتے تھے جس کا نام یہودیوں میں عبدیا بن سلوم تھا۔ لیکن خود سیل نے ہی اس کا رڈ کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ پریڈیا نے عبداللہ بن سلام کے متعلق غلطی کھائی ہے۔ سلمان کا نام اس نے غلطی سے عبداللہ بن سلام سمجھ لیا ہے۔ (یعنی دراصل جس کا نام لیا جاتا تھا وہ سلمان تھے)

سیل کہتا ہے کہ عام خیال یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک نُسطوری پادری سے جس کا نام سرگیس تھا مدد لی تھی۔ اور خیال کیا جاتا تھا کہ سرگیس بحیرہ راہب کا نام تھا۔ جس سے محمد صاحبؐ جبکہ آپ حضرت خدیجہؓ کی طرف سے تجارت کے لئے شام کو گئے تھے، ملے تھے۔ اس کی سند میں مشہور مصنف اَلْمَسْعُوْدِی کو پیش کیا جاتا ہے۔ جس نے لکھا ہے کہ بحیرہ راہب کا نام عیسائیوں کی کتاب میں سرگیس آتا ہے۔

پادری ویری مختلف روایات بیان کر کے اپنی رائے کو یوں ظاہر کرتے ہیں کہ ناموں میں خواہ کتنا ہی اختلاف ہو لیکن یہ بات ہم کو یقینی طور پر معلوم ہو جاتی ہے کہ محمد (ﷺ) صاحب کے پاس ایسے ذرائع موجود تھے کہ ہجرت سے پہلے یہودیوں اور عیسائیوں کی مدد حاصل کر سکتے تھے۔ اور یہ بات کہ وہ اس مدد سے فائدہ حاصل کیا کرتے تھے اس کا نا قابل تردید ثبوت مکّی زندگی کے آخری دور کی سورتوں میں جن میں یہودیوں اور مسیحیوں کی کتب کی کہانیاں بیان ہیں مہیا ہے۔

پھر یہی صاحب آیت زیر بحث کا حوالہ دے کر لکھتے ہیں کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ

محمد صاحبؐ کے ہمسائے غیر مذاہب کے لوگوں سے مدد حاصل کرنے کا الزام ان پر لگایا کرتے تھے اور اس اعتراض کا جواب قرآن نے دیا۔ وہ محمد صاحبؐ کی پوزیشن کی کمزوری کو ثابت کر رہا ہے۔ چنانچہ آرنلڈ صاحب بھی اس بارہ میں لکھتے ہیں کہ اس بات کو تسلیم کرتے ہوئے کہ وہ غیر ملکی تھے ہم کہتے ہیں کہ وہ انہیں مسالا تو مہیا کر کے دے سکتے تھے۔

آگے ویری کہتا ہے کہ یہی تو ہے جو وہ کیا کرتے تھے اور اسی وجہ سے کہ محمد صاحب اس مسالے کو لے کر اور اپنی نبوت کے مقصد کی تائید میں ڈھال کر خدا (تعالیٰ) کی طرف منسوب کر کے ان واقعات کو دہرا دیا کرتے تھے۔ اور جبرائیل فرشتہ کی وحی اس کو بتاتے تھے۔ ہم اس پرانے الزام کو دہرانے میں ہچکچاتے نہیں کہ وہ جان بوجھ کر جھوٹ بولا کرتے تھے۔ **(نعوذ باللہ من ھٰذہ الخرافات)**

مسلمان مفسّروں اور عیسائی مؤرخوں اور پادریوں کے خیالات تحریر کرنے کے بعد اب میں اس آیت کا مفہوم بیان کرتا ہوں۔ آیت زیر بحث سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگ اعتراض کیا کرتے تھے کہ رسول کریمؐ کو قرآن کا مضمون کوئی انسان سکھاتا ہے۔ اس اعتراض کا جواب اللہ تعالیٰ یہ دیتا ہے کہ ان کی زبان تو اعجمی ہے اور یہ کلام تو عربی میں ہے۔ مسیحی کہتے ہیں کہ یہ جواب غلط ہے کیونکہ معترض یہ نہیں کہتا کہ وہ غلام قرآن کا مضمون عربی زبان میں بنا کر آپ کو دے دیا کرتے تھے بلکہ یہ کہتا ہے کہ وہ یہودی کتب کے مضامین آپ کو بتاتے تھے اور آپ ان مضامین کو اپنی عبارت میں ڈھال لیا کرتے تھے۔

میرے نزدیک کسی کے کلام کو سمجھنے سے پہلے اس کی عام حالت کا جائزہ لینا بھی ضروری ہوتا ہے۔ اگر قرآن کے دوسرے جوابات جو وہ مخالفوں کے اعتراضوں کے دیتا ہے ایسے ہی بیہودہ ہوتے ہیں جیسا کہ یہ جواب ہے جو پادری ویری اور آرنلڈ صاحب نے قرآن کریم کی طرف منسوب کیا ہے تو بیشک ان کی یہ تنقید قابل اعتناء ہو سکتی ہے لیکن اگر اس کے برخلاف قرآن اپنے مخالفوں کے اعتراضات کے مناسب اور مدلل جواب دیتا ہے۔ تو پھر اس امر کے تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ یا تو پادری صاحبان نے سوال نہیں سمجھا یا جواب نہیں سمجھا۔

دوسرا قابل غور امر اس بارہ میں یہ ہے کہ اگر یہ جواب ایسا ہی بے جوڑ تھا جیسا کہ میسرز

ویری اور آرملڈ ظاہر کرنا چاہتے ہیں تو کیوں مکہ والوں نے اس کو رد نہ کیا؟ اگر ان کا وہی اعتراض تھا جو میسرز ویری اور آرملڈ نے سمجھا ہے تو انہوں نے کیوں اس کے جواب میں یہ بات نہ کہی کہ ہمارا تو یہ اعتراض نہیں کہ آپ عربی اس یہودی یا عیسائی غلام سے بنواتے ہیں۔ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ آپ مسالہ اس سے لیتے ہیں اور پھر اپنی زبان میں اس کے مضامین کو بیان کر دیتے ہیں۔ کفار کی طرف سے یہ اعتراض کسی کمزور روایت میں بھی نہیں پایا جاتا۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ شاید مسلمانوں نے وہ اعتراض تاریخ میں نقل نہ کیا ہو۔ کیونکہ جب بیسیوں روایتیں جن سے رسول کریم ﷺ یا اسلام پر زد پڑتی ہے کتب احادیث میں درج ہیں تو اس ایک اعتراض کے نقل کرنے میں ان کے لئے کیا روک تھی؟ پس صاف ظاہر ہے کہ کفار نے اس امر کو تسلیم کر لیا تھا کہ ان کے سوال کو ٹھیک طور پر سمجھ لیا گیا ہے اور جواب اس کے مطابق ہی دیا گیا ہے۔

اب یہ سوال رہ جاتا ہے کہ مذکورہ سوال کا جواب جو قرآن کریم نے دیا ہے اس کا کیا مطلب ہے؟ تو اس کا مطلب سمجھنے سے پہلے اَعْجَمِیٌّ کے معنے سمجھ لینے ضروری ہیں۔ عربی زبان میں عرب اور عجم دو لفظ عربوں اور غیر عربوں کے لئے مستعمل ہوتے ہیں۔ اور اسی مادہ سے اَعْجَمُ کا لفظ ہی جو غیر عرب کے لئے بولا جاتا ہے۔ چنانچہ تاج العروس جلد ۸ میں ہے عرب کہتے ہیں: رَجُلٌ اَعْجَمُ وَ قَوْمٌ اَعْجَمُ وہ شخص اعجم ہے یا وہ قوم اعجم ہے۔ مطلب یہ کہ وہ آدمی یا قوم غیر عرب ہے عربوں میں سے نہیں ہے۔

اس حد تک کے حوالہ سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ اعجم غیر عرب کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے لیکن اس کے سوا اعجم کے معنے مَنْ لَا یُفْصِحُ کے بھی ہیں یعنی وہ شخص جو بات کھول کر نہ بیان کر سکے اسی طرح یہی معنے اعجمی کے بھی ہیں (تاج)۔ اور ان معنوں میں عرب کی نسبت بھی یہ لفظ بولا جا سکتا ہے۔ اسی طرح اعجم اس شخص کی نسبت بھی بولتے ہیں جس کی زبان میں لکنت ہو خواہ وہ فصیح الکلام ہی کیوں نہ ہو۔ (تاج)

ان معانی کو بیان کرنے کے بعد اب میں اس طرف توجہ پھیرنا چاہتا ہوں کہ اس جگہ اعجمی کا لفظ انسان کی نسبت نہیں بولا گیا بلکہ زبان کی نسبت بولا گیا ہے۔ یعنی یہ نہیں فرمایا کہ جس کی نسبت

قرآن بنانے میں مدد دینے کا الزام لگایا گیا ہے وہ اعجمی ہے بلکہ یوں فرمایا ہے کہ جس شخص کی نسبت یہ لوگ ایسا گمان کر رہے ہیں اس کی زبان اعجمی ہے۔یعنی (۱) غیر عرب لوگوں کی زبان ہے۔یا (۲) یہ کہ اس کی زبان ایسی ناقص ہے کہ وہ اپنا مطلب بیان ہی نہیں کر سکتا۔

اعجمی کے ایک معنے لکنت کے بھی ہیں وہ معنے بولی کی نسبت استعمال نہیں ہو سکتے کیونکہ لکنت چھڑے کی زبان میں ہوتی ہے۔الفاظ سے مرکب بولی میں لکنت نہیں ہوا کرتی۔پس جب اعجمی کا لفظ زبان کی نسبت بولا جائے تو اس کے دو معنے ہوتے ہیں۔غیر عرب زبان یعنی جسے اعجم لوگ بولتے ہیں یا پھر اس حد تک غیر فصیح زبان جو مطلب واضح نہ کر سکتی ہو خواہ اس کا بولنے والا عرب ہی کیوں نہ ہو اور خواہ وہ عربی میں ہی کیوں بات نہ کر رہا ہو۔اعجمی زبان کے معنوں کی تعیین کرنے کے بعد اب میں یہ بتاتا ہوں کہ ان دونوں معنوں کو مدنظر رکھ کر اس آیت کے یہ دو معنے ہوتے ہیں۔

(۱) یہ لوگ کہتے ہیں کہ محمدؐ رسول اللہ کو قرآن کوئی دوسرا شخص سکھاتا ہے۔وہ شخص جس کی طرف یہ لوگ اس کام کو منسوب کرتے ہیں اس کی زبان تو غیر عربی ہے۔

(۲) جس کی نسبت یہ لوگ اس کام کو منسوب کرتے ہیں وہ تو اپنے خیالات ادا کرنے پر قادر ہی نہیں اور قرآن کی زبان عربی ہے اور عربی بھی وہ کہ مضمون اس میں سے پھوٹ پڑتے ہیں۔

ان دونوں جوابوں کو دیکھ لو کہ نہایت معقول اور مدلل اور مسکت ہیں۔جو عربی نہ جانتا ہو وہ بھی عرب کو کچھ سکھا نہیں سکتا اور جس کی دماغی حالت ایسی کمزور ہو کہ صحیح طور پر بات نہ کر سکتا ہو وہ بھی کوئی علمی بات کسی کو نہیں بتا سکتا۔

اب میں یہ بتاتا ہوں کہ کفار کس شخص کی طرف اشارہ کرتے تھے۔اس غلام کے مختلف نام آتے ہیں۔مگر ان مختلف ناموں میں سے اس جگہ کے مطابق وہی روایت ہے جس میں جبر کی نسبت سکھانے کا شبہ ظاہر کیا گیا ہے۔کیونکہ باقی غلام جن کے نام لئے گئے ہیں کھلے طور پر مسلمان تھے اور رسول کریم ﷺ سے صبح و شام ملتے رہتے تھے۔ان میں کسی ایک کو اعتراضات کا نشانہ بنانے کی کوئی وجہ نہ تھی۔اگر اعتراض ہوتا تو سب پر ہوتا۔وہ شخص جو اکیلا تھا اور جن کی

نسبت کفار کو شبہ ہوتا تھا کہ شاید یہ باتیں سکھاتا ہے وہ جبرؔ ہی ہے جو بہت دیر بعد مسلمان ہوا ہے اور رسول کریم ﷺ کی مجالس میں نہیں آتا تھا بلکہ جیسا کہ روایات سے ثابت ہے آپ بعض دفعہ اس کے پاس جبکہ وہ تلواریں بناتے ہوئے انجیل کی آیات پڑھا کرتا تھا کھڑے ہو جاتے تھے۔ پس اس آیت میں جس شخص کی طرف اشارہ ہے وہ یہی شخص ہے اور جیسا کہ حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص اپنے مذہبی جوش کی وجہ سے لوہا کوٹتے ہوئے انجیل پڑھتا جاتا تھا اور بوجہ غیر زبان ہونے کے عجوبہ خیال کرتے ہوئے لوگ اس کے گرد جمع ہو جاتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ بھی اس کے جوش سے متاثر ہوتے اور آپ بھی بعض دفعہ اس کے پاس کھڑے ہو جاتے اور یہ خیال کر کے کہ جس شخص میں مذہب کا اس قدر جوش ہے وہ ضرور سنجیدگی سے دینی مسائل پر غور کرے گا۔ اسے اسلام کی تلقین کرتے۔ بعض لوگ جنہوں نے اس کے پاس رسول کریم ﷺ کو کھڑے دیکھا انہوں نے یہ مشہور کر دیا کہ وہ آپ کو سکھاتا ہے۔ چنانچہ اوپر جو احادیث نقل ہوئی ہیں ان میں یہ بھی آتا ہے کہ اس سے یا اس کا جو ایک اور ساتھی تھا اس سے بعض لوگوں نے سوال کیا کہ کیا تم محمد (ﷺ) کو اپنے دین کی باتیں سکھاتے ہو؟ تو اس نے کہا کہ نہیں وہ مجھے سکھاتے ہیں۔ (روح المعانی جلد ۱۴)

اس سوال و جواب سے ظاہر ہے کہ لوگ اسی کی نسبت گمان کرتے تھے کہ وہ رسول کریمؐ کو سکھاتا ہے۔ اس الزام کا جواب قرآن کریم نے یہ دیا ہے کہ اس کی زبان تو اعجمی ہے یعنی وہ عربی زبان نہیں جانتا یا ایسی تھوڑی جانتا ہے جسے زبان جاننا نہیں کہہ سکتے۔ اور قرآن کی زبان تو عَرَبِیٌّ مُّبِیْنٌ ہے پھر بتاؤ کہ ان دونوں کے درمیان تبادلۂ خیال کس طرح ہو سکتا ہے۔ آخر مذہب کی تعلیمات سکھانے کے لئے زبان ہی ذریعہ ہے۔ اگر دونوں شخصوں کی زبان ایک نہیں۔ ایک کی زبان غیر عربی ہے اور دوسرے کی عربی تو عربی دان غیر عربی دان سے کس ذریعہ سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ یہ جواب نہایت معقول ہے اور اس جواب کو کوئی غیر معقول نہیں کہہ سکتا۔

دوسرے معنے اس آیت کے یہ ہو سکتے تھے کہ اس کی زبان جس کی نسبت اتہام لگایا جاتا ہے کہ وہ سکھاتا ہے گو عربی ہو مگر وہ اپنا مفہوم ادا کرنے کی قابلیت نہیں رکھتا۔ اگر یہ معنے کئے جائیں

تب بھی جواب درست ہے کیونکہ جواب میں قرآن کریم کو پیش کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ قرآن کی زبان اس قدر وسیع مطالب پر مشتمل ہے کہ وہ مبین کہلانے کی مستحق ہے۔ یعنی وہ ہر اعتراض کا خود ہی جواب دیتی جاتی ہے۔ پھر یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ ایک شخص جو اپنا مطلب بھی پوری طرح واضح نہیں کر سکتا یعنی موٹی عقل والا اور کند ذہن ہے وہ ایسے مطالب محمدؐ رسول اللہ کو بتائے کہ ہر دعویٰ کے ساتھ اس کی دلیل بھی موجود ہو اور ہر مشکل جو قرآن پڑھتے ہوئے انسانی ذہن پیدا کرے اس کا حل بھی ساتھ ہی موجود ہو۔ جو شخص کسی علمی بات کے بیان کرنے کے قابل نہیں اور موٹی عقل کا آدمی ہے اور اپنے مطلب کو واضح نہیں کر سکتا وہ اس قسم کی باتیں سمجھا ہی کس طرح سکتا ہے۔ یہ دلیل بھی ایسی کامل اور مُسکت ہے کہ اس کے معقول اور لاجواب ہونے میں کوئی شبہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔

ممکن ہے کوئی اعتراض کرے کہ ہو سکتا تھا کہ وہ غلام اپنے بھدّے پیرایہ میں اناجیل کے واقعات سنا دیتا ہو اور رسول کریم ﷺ اسے اپنے الفاظ میں بیان کر دیتے ہوں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ کہ مبین کا لفظ اس سوال کا جواب بھی دے رہا ہے۔ کیونکہ بتانے والا اگر نا مکمل سچائیاں بتاتا تھا وہ کونسی صورت تھی کہ محمد رسول اللہؐ ان کو مبین صداقتوں یعنی ان صداقتوں میں جو اپنی سچائی کی آپ ہی دلیل ہوں تبدیل کر سکتے تھے۔ کیا کوئی شخص یہ طاقت رکھتا ہے کہ جھوٹ یا غلط بات کو صرف مدلل ہی نہیں بلکہ ایسا مدلل بنا دے کہ مضمون روزِ روشن کی طرح کھل جائے۔

بعض مسیحی اعتراض کو یہ رنگ دیتے ہیں کہ قرآن کا یہ دعویٰ ہے کہ اس میں چونکہ یہود و نصاریٰ کی کتب کی باتیں ہیں اور محمدؐ رسول اللہ بوجہ اُمّی ہونے کے خود ان باتوں سے واقف نہیں ہو سکتے تھے اس لئے ثابت ہوا کہ یہ باتیں انہوں نے خدا تعالیٰ سے معلوم کر کے دنیا کو بتائی ہیں۔ اس دعویٰ کے خلاف یہ اعتراض ہے کہ وہ بعض مسیحی غلاموں سے غلط اور بے جوڑ روایات سن کر قرآن میں داخل کر لیتے تھے اور اس صورت میں یہ ضروری نہیں کہ جس شخص سے وہ ان قصوں کو سنیں وہ ضرور بڑے دماغ کا اور بڑی سمجھ کا آدمی ہو بلکہ واقعات چونکہ غلط بیان ہوئے ہیں اس لئے جاہل اور اکھڑ غلام کی نسبت ایسا الزام واقعات کے زیادہ مطابق بیٹھتا ہے نہ کہ

اعتراض کو دور کرتا ہے۔

اس کا جواب ایک تو یہ ہے کہ قرآن کریم میں کہیں وہ دعویٰ بیان نہیں جو مسیحی قرآن کی طرف منسوب کرتے ہیں۔قرآن کریم اپنی سچائی کی یہ دلیل نہیں دیتا کہ چونکہ اس میں اہل کتاب کی کتب کی باتیں بیان ہوئی ہیں وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ بلکہ قرآن تو یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس میں وہ صداقتیں موجود ہیں جو اہل کتاب کی کتب میں نہیں ہیں۔اس لئے وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ہے۔چنانچہ اسی سورۃ النحل میں یہ آیات گزر چکی ہیں کہ:

تَاللّٰهِ لَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَهُوَ وَلِيُّهُمُ الْيَوْمَ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِى اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (النحل:۶۴،۶۵)

یعنی ہمیں اپنی ہی ذات کی قسم ہے کہ تجھ سے پہلے ہر قوم میں نبی گزر چکے ہیں اور ہر قوم کے پاس ہدایت نامہ آچکا ہے۔مگر باجود اس کے شیطان نے ان قوموں کو گمراہ کر دیا اور اب وہ مختلف باتیں اپنے مذہب کی طرف منسوب کر رہے ہیں جو خدا تعالیٰ کی طرف سے نازل نہ ہوئی تھیں اور وہ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر شیطان کے تصرف میں آئے ہوئے ہیں اور دردناک عذاب کا مورد بننے کے خطرہ میں ہیں۔پس ان کے ان اختلافات کے مٹانے کے لئے ہم نے تجھ پر یہ کتاب اتاری ہے تا کہ اس کے ذریعہ سے وہ سچائیاں جو ان سے مخفی ہو چکی ہیں اور وہ ان کے متعلق اختلاف کر رہے ہیں بیان کرے۔اور اس قرآن کے ذریعہ سے ہم نے مومنوں کے لئے ہدایت اور رحمت کے سامان پیدا کئے ہیں۔اس آیت میں پہلے سب قوموں میں نبی آنے کا ذکر ہے اور بعد میں قرآن کریم کے نزول کا اور یہ نہیں فرمایا کہ چونکہ یہ پہلے نبیوں کی کتب کی باتیں بیان کرتا ہے اس لئے سچا ہے بلکہ یہ فرمایا ہے کہ پہلی کتب کو لوگوں نے چھوڑ دیا اور شیطان کے پیچھے چل پڑے اور ان میں قسم قسم کے اختلاف پیدا ہو گئے۔یہ قرآن ان اختلافوں کو مٹانے اور جو صداقت مخفی ہو گئی تھی اسے ظاہر کرنے کے لئے آیا ہے۔قرآن کریم کے اس دعوے کی موجودگی میں یہ کہنا کہ محمد رسول اللہؐ محض پچھلی کتب کی باتیں بیان کر کے جن کو وہ چند غلاموں سے سن لیتے تھے اپنی

سچائی کا دعویٰ کرتے تھے، کس قدر غلط ہے۔

خود یہ آیت بھی تو جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں یہی بات پیش کر رہی ہے کہ قرآن کریم کی برتری کسی نقل کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کے مبین ہونے کی وجہ سے ہے اور مبین ہونے کے لئے وسیع اور مخفی علوم کی ضرورت ہے جن کی اس آدمی سے جس کی طرف یہ کام منسوب کیا جاتا ہے تو کیا امید کی جا سکتی ہے بڑے سے بڑا عقلمند انسان بھی اس کتاب کے بنانے میں مدد نہیں دے سکتا۔ جس میں سب سچائیاں با دلیل بیان کی گئی ہوں اور سب اعتراضوں کا رڈ موجود ہو۔ ایسی کتاب تو صرف خدا تعالیٰ ہی اتار سکتا ہے۔

ممکن ہے کوئی یہ کہے کہ یہ کہنا غلط ہے کہ وہ غلام جاہل تھے۔ ہم تو سمجھتے ہیں کہ کوئی بڑا عالم رسول کریم (ﷺ) کے قبضہ میں آ گیا تھا۔ جن مسیحیوں نے اس آیت کا مشارٌ الیہ سرگیس کو قرار دیا ہے، اسی حکمت سے قرار دیا ہے کیونکہ وہ زیادہ عقلمند تھے۔ اور انہوں نے اس امر کو محسوس کر لیا تھا کہ قرآن کریم میں یہود و نصاریٰ اور اسلام کے درمیان اختلافی امور کی جو بحث ہے وہ غلام تو الگ رہا۔ اچھے لکھے پڑھے عیسائی کی دسترس سے بھی باہر ہے۔ اس لئے انہوں نے ایک فرضی سرگیس کو تجویز کیا کہ وہ ایک نُسطوری راہب تھا اور آپ کو سکھایا کرتا تھا۔

تاریخی طور پر تو خود مسیحی مصنفوں نے ہی ان کی بات کو رد کر دیا ہے مگر میں عقلی طور پر بھی اس کا ایک جواب بیان کر دیتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ اگر نصاریٰ اس الزام کو یہ شکل دیں تو پھر بھی انہی کے مذہب پر زد پڑتی ہے کیونکہ اس کے یہ معنے ہوں گے کہ یہود و نصاریٰ کی جو تصویر اسلام نے پیش کی ہے خواہ انسانوں سے سیکھ کر کی ہے مگر ہے وہی سچی۔ اور اگر وہ تصویر سچی ہے تو ان کے مذاہب کے غلط ہونے میں کیا شبہ رہ جاتا ہے۔ اس پہلو کے بدلنے سے صرف ان کو یہ تسلی ہو گئی کہ ہمارے مذاہب تو جھوٹے ثابت ہو ہی گئے ہیں، ہم نے قرآن پر بھی اعتراض کر دیا کہ اسے بھی انسانوں نے بنایا ہے۔ لیکن یاد رہے کہ شبہ یقین کا قائم مقام نہیں ہو سکتا۔ قرآن کریم کی طرف جو بات وہ منسوب کر رہے ہیں اسے تو خود ان کے اپنے آدمی نا قابل قبول قرار دیتے ہیں۔ لیکن یہ تسلیم کر کے کہ قرآن کریم نے یہودیوں اور مسیحیوں سے جہاں جہاں اختلاف کیا ہے

وہ کسی بڑے عالم کی تحقیق ہے جس نے اہل کتاب کی لائبریریاں چھان کران باتوں کو نکالا ہے اور موجودہ مذاہب کی غلطیوں کو ظاہر کر دیا ہے۔اس سے تو ان مذاہب کا کچھ بھی نہیں رہتا اور یہودی اور مسیحی زیادہ سے زیادہ یہ کہہ کراپنے کل کو تسلی دے سکتے ہیں کہ یہودیت وہ نہیں جو موجودہ تورات اور کتب یہود میں موجود ہے بلکہ وہ ہے جو قرآن میں بیان ہوئی ہے۔اور نصرانیت وہ نہیں جو موجودہ اناجیل میں ہے بلکہ وہ ہے جو قرآن میں ہے اور اگر وہ ایسا کہیں گے تو دوسرے لفظوں میں قرآن کریم کی تصدیق کریں گے۔

اب ایک پہلو آیت کے ترجمہ کا رہ گیا ہے جو قابل توجہ ہے اور وہ یہ کہ کوئی کہہ سکتا ہے کہ آیت کا ترجمہ کہ جس کی نسبت لوگ گمان کرتے ہیں اس کی زبان غیر عربی ہے اس کے کوایک معنے یہ بھی ہوسکیں کہ اس کو عربی یا آتی ہی نہیں یا اتنی نہیں آتی کہ وہ اپنا مطلب بیان کر سکے۔لیکن اس کے یہ معنے بھی تو ہوسکتے ہیں کہ اس کی مادری زبان غیر عربی ہے اور ایسا شخص جس کی مادری زبان غیر عربی ہو بعد میں عربی سیکھ بھی تو سکتا ہے۔پس جواب مکمل نہ ہوا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ معنے اس آیت کے نہیں ہو سکتے کیونکہ یہ سوال قرآن کریم نے دوسری جگہ خود بیان کیا ہے اور اس کا الگ جواب دیا ہے۔جس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ معنے آیت زیر بحث میں نہیں ہیں۔نیز اس سے یہ امر بھی ثابت ہوتا ہے کہ پادری وھیری کا یہ استنباط کہ سورۂ نحل کا جواب بالکل بودا ہے اور اس سے اعتراض کی سچائی ثابت ہوتی ہے۔ان کی ناواقفیت کی وجہ سے ہے کیونکہ جب قرآن کریم نے وہی سوال جو وھیری صاحب اور دوسرے مسیحی مصنفوں نے اس آیت سے نکالا ہے سورۃ فرقان میں خود بیان کیا ہے اور اس کا جواب نہایت زبردست دیا ہے۔تو یہ کس طرح ممکن تھا کہ سورۂ نحل میں اس سوال کا نہایت بودا جواب دیا جاتا۔

سورۃ فرقان خود وھیری صاحب کے نزدیک ابتدائی مکی سورتوں میں سے ہے وہ لکھتے ہیں کہ:

"اس سورۃ کی آیتیں محمد (صلعم) کی ابتدائی مکی وحی میں سے ہیں" (تفسیر قرآن جلد ۳ صفحہ ۲۰۷)

اور سورۂ نحل کی نسبت وہ لکھتے ہیں کہ:

"تمام شہادت اندرونی ہو یا بیرونی ہمیں اس امر کے ماننے پر مجبور کرتی ہے کہ یہ (نحل) آخری مکّی سورتوں میں سے ہے" (تفسیر القرآن جلد ۳ صفحہ ۲۴ و صفحہ ۲۵)

اب کیا کوئی عقلمند تسلیم کرسکتا ہے کہ جس اعتراض کو سورۃ فرقان میں نہایت زبردست دلائل کے ساتھ رڈ کیا ہے اس کے چھ سال کے بعد اس سوال کا جواب سورۃ نحل میں نہایت بودا اور کمزور دے دیا ہے۔ اگر فرقان بعد کی ہوتی تو کوئی شبہ بھی کرسکتا تھا کہ اس وقت جواب نہیں سُوجھا بعد میں جواب بنالیا۔ مگر فرقان خود مسیحی مصنفوں کے نزدیک پہلے کی ہے اور نحل بعد کی۔

اب میں مضمون کو یکجا بیان کرنے کے لئے پہلے وہ دلائل بیان کرتا ہوں جو سورۃ میں بیان کئے گئے ہیں۔ سورۂ فرقان میں آتا ہے:

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ هٰذَاۤ اِلَّاۤ اِفْكُ ۣافْتَرٰىهُ وَاَعَانَهٗ عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ ۛ فَقَدْ جَآءُوْ ظُلْمًا وَّزُوْرًا ۚ وَقَالُوْۤا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ۝ قُلْ اَنْزَلَهُ الَّذِيْ يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝ (الفرقان:۵تا۷)

یعنی کفار کہتے ہیں کہ قرآن ایک جھوٹی کتاب ہے اور محمدؐ رسول اللہ کو اس کے بنانے میں دوسرے لوگ مدد دیتے ہیں۔ ان کفار نے یہ اعتراض کر کے سخت ظلم کیا ہے اور جھوٹ بولا ہے اور وہ اس اعتراض کو پکا کرنے کے لئے یوں دلیل دیتے ہیں کہ قرآن میں ہے کیا۔ بس پرانے لوگوں کی باتیں نقل کردی گئی ہیں۔ محمد (صلعم) وہ باتیں لکھوا لیتے ہیں اور صبح و شام ان کے سامنے وہ پڑھی جاتی ہیں (تا کہ یاد رہیں) ۔ تو ان سے کہہ کہ قرآن کو تو اس نے اتارا ہے جو آسمان اور زمین کے رازوں کو جانتا ہے۔ وہ بہت بخشنے والا اور مہربان ہے۔

اس آیت میں صاف لفظوں میں اس اعتراض کو نقل کیا گیا ہے جو ویری صاحب سورۃ نحل کی آیت سے نکالنا چاہتے ہیں اور اس اعتراض کو پڑھ کر یہ بھی صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ سورۃ نحل والی آیت کا اعتراض اس اعتراض سے مختلف ہے کیونکہ سورۃ نحل میں ایک شخص کی طرف سکھانا منسوب کیا گیا ہے اور یہاں کئی شخصوں کی طرف۔ پھر سورۃ نحل والی آیت میں کو نام نہیں لیا گیا

مگر یہ ضرور بتایا گیا ہے کہ جس پر الزام لگایا جاتا ہے وہ معیّن شخص ہے۔لیکن سورۃ فرقان میں وہ جماعت غیر معیّن رکھی گئی ہے۔اسی طرح سورۃ نحل میں سکھانے کے کام کا وقت نہیں بتایا گیا لیکن سورۃ فرقان میں یہ بھی بتایا گیا کہ صبح وشام یہ تعلیم کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

سورۃ فرقان کی آیات کے الفاظ صاف بتاتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ کے صحابہ چونکہ صبح و شام نماز کے لئے اور قرآن سیکھنے کے لئے دارارقم میں جمع ہوتے تھے۔وہ نادان یہ خیال کرتے تھے کہ شاید اس جگہ جمع ہو کر بعض مسیحی غلام اپنی کتب کی باتیں ان کو بتاتے ہیں یا ان سے لکھ کر صحابہ لے آتے ہیں اور پھر وہ صبح وشام حفظ کی جاتی ہیں۔ان جاہلوں کی عقل میں صبح وشام کی نمازیں تو آہی نہیں سکتی تھیں۔وہ اس اجتماع کو منصوبہ بازی کا وقت سمجھتے تھے۔خود مجھے اس بارہ میں ایک تجربہ ہو چکا ہے جس سے اس قسم کی بدگمانی کی حقیقت خوب معلوم ہو جاتی ہے۔

کوئی بیس سال کا عرصہ ہوا میں لاہور گیا۔مجھ سے آریوں کے مشہور لیڈر لالہ رام بھجدت جواب فوت ہو چکے ہیں ملنے کے لئے آئے۔ان کے ساتھ کچھ اور صاحبان بھی تھے جن میں ”شیر پنجاب“ جو سکھوں کا مشہور اخبار ہے اس کے ایڈیٹر صاحب بھی شامل تھے۔اتفاق سے اس دن میرا لیکچر تھا۔وہ لیکچر سننے کے لئے ٹھہر گئے۔مجھے سارا دن کام کی وجہ سے حوالے نکالنے کا موقع نہیں ملا تھا۔اس لئے میں نے حافظ روشن علی صاحب مرحوم کو (اللہ تعالیٰ انہیں غریق رحمت فرمائے) جو آیات کو نکالنے کا خاص ملکہ رکھتے تھے،سٹیج پر بٹھالیا اور کہا کہ میں آپ کو مضمون بتاتا جایا کروں گا آپ مجھے آیت کے الفاظ بتاتے جایا کریں۔خیر میں نے لیکچر شروع کیا جہاں کسی آیت سے استدلال کی ضرورت ہوتی میں آہستہ سے ایک دولفظ آیت کے پڑھ دیتا یا مضمون بتا دیتا اور وہ ساری آیت پڑھ دیتے۔میں اسے پڑھ کر جو استدلال پیش کرنا ہوتا تھا اسے بیان کر دیتا۔دوسرے دن ”شیر پنجاب“ میں ایک مضمون نکلا کہ کل ہم بھی امام جماعت احمدیہ قادیان کے لیکچر میں تھے،لیکچر اچھا تھا مگر ہم نے ذرا تجسّس کیا اور سٹیج کے پچھلی طرف گئے تو معلوم ہوا کہ انہوں نے اپنے پیچھے ایک عالم کو چھپایا ہوا تھا۔وہ مضمون بتاتا جاتا تھا اور مرزا صاحب دہراتے جاتے تھے۔واقف کار لوگوں میں کئی دن اس پر ہنسی اُڑتی رہی اور سردار صاحب سے بھی کسی نے

جا ذکر کیا۔ وہ بہت شرمندہ ہوئے اور کہا کہ میں نے تو سمجھا تھا کہ میں نے اپنی ہوشیاری سے راز معلوم کرلیا ہے۔

ایسی ہی ہوشیاری مکّہ والوں نے دکھائی تھی۔ کام والے لوگوں کو صبح وشام ہی فرصت مل سکتی تھی۔ وہ صبح اور شام کی نمازیں ادا کرنے کے لئے قرآن پڑھنے کے لئے دارارقم میں جمع ہوجاتے تھے۔ کفار کے بعض زیادہ عقلمند لوگ خیال کرتے تھے کہ ہم نے راز معلوم کرلیا ہے۔ یہ قرآن کی تصنیف کے لئے جمع ہوتے ہیں۔

عقلمند کے لئے اس میں بھی ایک نشان ہے کیونکہ اس میں بھی یہ اعتراف پایا جاتا ہے کہ قرآن کو کوئی ایک شخص نہیں بنا سکتا۔ تبھی انہوں نے اس کے بنانے میں مدد دینے والی ایک جماعت قرار دی۔ جن میں سے بعض عقلی باتیں جمع کرتے تھے اور بعض پرانی کتب کی تعلیم جمع کرتے تھے۔

اب میں سورۃ فرقان میں اس اعتراض کے جو جواب دئے گئے ہیں بیان کرتا ہوں۔ کفار کے اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے اس کے دو پہلوؤں کو مدنظر رکھنا ضروری ہے:۔

(۱) اول یہ کہ جن کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ قرآن کریم کے بنانے میں مدد دیتے ہیں۔ کیا وہ ایسا کرسکتے تھے؟

(۲) دوسرے یہ کہ جس چیز کی نسبت کہا جاتا ہے کہ بعض غلاموں نے لکھائی ہے۔ کیا وہ انسانوں کی لکھائی ہوئی ہوسکتی ہے؟

پہلے سوال کا جواب قرآن کریم یہ دیتا ہے کہ یہ سوال نہایت ظالمانہ اور جھوٹا ہے۔ اس جواب میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جن غلاموں کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ آ آکر رسول کریمؐ کو قرآن سکھایا کرتے تھے ان کے متعلق دیکھنا چاہئے کہ وہ اسلام کی خاطر کیا کیا تکالیف اٹھا رہے تھے۔ یہ کیونکر ممکن ہوسکتا تھا کہ ایسے لوگ جو خود قرآن بنا بنا کر محمد رسول اللہؐ کو دیتے تھے۔ اس جھوٹے کلام کی خاطر رات اور دن تکلیفیں اٹھا رہے تھے۔ اسلام کی خاطر ان غلاموں میں سے بعض نے جانیں دیں۔ بعض کی آنکھیں نکالی گئیں۔ ایک میاں بیوی کو اس

طرح قتل کیا گیا کہ خاوند کی دونوں لاتوں کو دو اونٹوں سے باندھ کر دو طرف چلا دیا اور اس کی بیوی کی شرمگاہ میں نیزہ مار کر اس کے سامنے قتل کیا۔ اور ان کے لڑکے کو بھی سخت ایذائیں دیں۔ اس دوران میں انہیں بار بار کہا جاتا تھا کہ محمدؐ رسول اللہ کا انکار کر دیں تو چھوڑ دیئے جائیں گے۔ مگر میاں بیوی مرتے مر گئے پر صداقت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ یہ آزادوں کا سردار نام نہاد غلام یاسر بھی انہی غلاموں میں سے تھا جن کے متعلق یہ اتہام لگایا جاتا تھا کہ وہ محمدؐ رسول اللہ کو سکھاتے ہیں۔ کیا کوئی انسان مان سکتا ہے کہ کہ خود ہی قرآن بنا کر دینے والے محمدؐ رسول اللہ کے نام پر ایسا ایسے عذاب اٹھا کر جانیں قربان کر رہے تھے۔

مکّہ کے کافر تو وقتی جوش میں اندھے ہو رہے تھے۔ کیا آج کل کی عیسائی دنیا میں بھی کوئی دیکھنے والی آنکھ نہیں؟ کوئی بولنے والی زبان نہیں جو اس بار بار دہرائے جانے والے ظالمانہ اور جھوٹے اعتراض کے خلاف آواز اٹھائے؟

اعتراض کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ کیا وہ کلام ان غلاموں کا سکھایا ہوا ہو سکتا ہے؟ اس کا جواب یہ دیا کہ جنہیں تم قصے کہتے ہو وہ قصے ہیں ہی نہیں بلکہ پیشگوئیاں ہیں۔ ان کا اتارنے والا تو آسمانوں اور زمین کے غیبوں کا جاننے والا خدا ہے۔ یعنی ان میں آئندہ کے حالات بیان کئے گئے ہیں نہ پرانے واقعات اور انسان آئندہ کے حالات نہیں جان سکتا اور نہ بتا سکتا ہے۔ اب دیکھو تو یہ جواب کیسا واضح اور صحیح ہے۔

غرض سورۃ نحل میں یہ اعتراض نہیں کہ دوسرا کوئی شخص اسے مضمون سکھاتا ہے۔ وہ اعتراض فرقان میں بیان ہوا ہے اور اس کا ایسا دندان شکن جواب دیا گیا ہے کہ شریف آدمی اسے سن کر پھر اس اعتراض کو نہیں دہرا سکتا۔ اور سورۃ نحل میں وہ اعتراض نہیں بلکہ یہ اعتراض بیان ہوا ہے کہ فلاں غلام قرآن سکھاتا ہے حالانکہ وہ غلام عربی نہیں جانتا تھا۔ صرف کچھ آیات انجیل کی جو غالباً یونانی زبان میں ہوں گی کام کرتے وقت پڑھا کرتا تھا۔ محمدؐ رسول اللہ اس کے جوش کو دیکھ کر تبلیغ کے لئے اس کے پاس ٹھہر جاتے تھے کہ کوئی بات اس کے کان میں پڑ جائے تو شاید کسی وقت ہدایت کا موجب بنے۔ تبھی اس نے خود اقرار کیا ہے کہ یہ مجھے سکھاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ جواب

میں فرماتا ہے کہ اسے عربی بولنی اس قدر نہیں آتی کہ کوئی علمی مضمون بیان کر سکے۔ یہ اتنی ہی مدد کر سکتا ہے کہ انجیل کی عبارتیں عبرانی یا یونانی زبانوں میں آپ کو یاد کرا دے۔ لیکن اگر ایسا ہوتا تو قرآن کا ایک حصہ عبرانی یا یونانی ہوتا۔ مگر قرآن تو سارا عربی میں ہے۔ پھر جبکہ ترجمانی وہ غلام کر نہیں سکتا اور عبرانی یونانی کی عبارتیں قرآن میں موجود نہیں تو سکھایا کس نے اور سیکھا کس نے؟ اس سے زبردست جواب اور کیا ہو سکتا ہے اور اسے بودا کہنے والے کو سوائے متعصب یا موٹی عقل والے کے اور کیا کہہ سکتے ہیں۔

یہ بھی یاد رہے کہ روایت میں دو غلاموں کا ذکر آتا ہے لیکن میں نے ایک غلام کا ذکر کیا ہے۔ اس کی دو وجہیں ہیں۔ ایک یہ کہ قرآن کریم کی آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک غلام کے متعلق اعتراض کیا کرتے تھے۔ دوسرے ایک روایت جس میں ذکر ہے کہ اس شخص سے لوگوں نے پوچھا کہ کیا تو محمد (صلعم) کو سکھاتا ہے؟ تو اس نے کہا کہ نہیں۔ اس میں بھی ایک ہی آدمی کا ذکر ہے۔ پس خواہ دو غلام ہی اس جگہ اکٹھے کام کرتے ہوں پر شبہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی کے متعلق کیا جاتا تھا۔

اس جگہ ایک اور سوال بھی غور طلب ہے جو اس اعتراض کے متعلق ہماری صحیح راہنمائی کر سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ کیا اس وقت تورات اور انجیل کے عربی تراجم ہو چکے تھے اور وہ اس قدر رائج تھے کہ غلام بھی ان کو کام کے وقت پڑھا کرتے تھے؟ کیونکہ اگر یہ صورت نہ ہو تو عبرانی اور یونانی کتب کی عبارتوں سے نہ رسول اللہ ﷺ کوئی فائدہ اٹھا سکتے تھے اور نہ غلام خود ہی فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ کیونکہ عبداللہ بن سلام کے سوا کسی ایک مسلمان کے متعلق بھی تاریخ سے ثابت نہیں کہ وہ عبرانی جانتا تھا اور یونانی سے واقف کا تو تاریخ میں میرے علم میں کوئی ذکر ہی نہیں آتا۔ جہاں تک میری تحقیق ہے اس وقت تک عربی زبان میں تورات اور انجیل کے تراجم نہیں ہوئے تھے۔ اور جب ان کتب کے تراجم نہیں ہوئے تو طالمود وغیرہ جو یہود کی روایتوں کی کتب ہیں ان کے تراجم کس نے کرنے تھے۔ میرے اس خیال کی تائید مندرجہ ذیل دلائل سے ہوتی ہے۔

(۱) اس وقت تک انجیل کے تراجم کا رواج ہی نہ تھا۔ تراجم کا رواج تیرہویں، چودہویں

صدی میں شروع ہوا اور یہی وجہ ہے کہ ہمارے مفسرین جنہوں نے تفسیر میں مدد لینے کے لئے ہر قسم کے علوم پڑھ ڈالے تھے۔ جب تورات اور انجیل کے حوالے دینے بیٹھتے ہیں تو بالکل بے ثبوت کہانیاں ان کی طرف منسوب کر دیتے ہیں جن کا نام ونشان بھی بائبل میں نہیں ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ ان کو عربی کی انجیل میسر نہ تھی۔ اگر عربی میں تورات اور انجیل ہوتی تو کیا یونان کا فلسفہ اور حکمت پڑھنے والے ان کتب کو نہ پڑھتے؟

(۲) اسلامی روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت اناجیل یونانی یا عبرانی زبان میں ہی تھیں۔ بخاری باب بدء الوحی میں ورقہ بن نوفل کے متعلق لکھا ہے:

قَدْ تَنَصَّرَ فِي الْجَاهِلِيَّةِ وَكَانَ يَكْتُبُ الْكِتَابَ الْعِبْرَانِيَّ فَيَكْتُبُ مِنَ الْإِنْجِيلِ بِالْعِبْرَانِيَّةِ مَا شَآءَ اللّٰهُ اَنْ يَكْتُبَ۔ یعنی ورقہ عبرانی زبان میں انجیل لکھا کرتے تھے۔

بعض روایات میں بجائے عبرانی کے عربی کا لفظ بھی ہے مگر ہم اس روایت کو ترجیح دینے پر مجبور ہیں کیونکہ اگر عربی میں تورات وانجیل ہوتی تو بہت سے لوگ اس کے پڑھنے والے نکلتے۔ بلکہ میرے نزدیک تو یہ بھی ممکن ہے کہ عبرانی بھی راوی کی غلطی سے لکھا گیا ہو۔ کیونکہ اس وقت یونانی اناجیل ہی مروّج تھیں اور عبرانی انجیل قریباً مفقود ہو چکی تھی۔

(۳) تیسرا ثبوت اس امر کا تورات کا ترجمہ عربی میں نہ ہوا تھا یہ ہے کہ یہودی جن کے بعض قبائل مدینہ میں آ کر بس گئے تھے ان کے پاس بھی تورات کا عربی ترجمہ نہ تھا۔ چنانچہ اگر کبھی آنحضرت ﷺ کو کسی حوالہ کی ضرورت ہوتی تو عبداللہ بن سلام سے آپ کو مدد لینی پڑتی تھی جو عبرانی جانتے تھے۔

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے عبرانی پڑھنی شروع کی تھی تا کہ وہ تورات وانجیل کو پڑھ سکیں۔ (مشکوٰۃ المصابیح کتاب الایمان باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ)

(۴) چوتھے ثبوت کے طور پر میں ایک مسیحی مضمون نویس کی شہادت پیش کرتا ہوں۔ ڈاکٹر الیگزنڈر رسوٹر ایم۔اے۔ایل۔ایل۔ڈی اپنی کتاب نام ٹیکسٹ اینڈ کینن آف دی نیو ٹیسٹیمنٹ کے صفحہ ۱۸۷ (ایڈیشن ثانی مطبوعہ ۱۹۲۵ء) پر لکھتے ہیں:

" ARABIC VERSIONS:

THESE COME PARTLY DIRECTLY FROM GREEK PARTLY THROUGH SYRIAC AND PARTLY THROUGH CAPTIC.

MUHAMMAD HIMSELF KNEW THE GOSPEL STORY ONLY ORALLY.

THE OLDEST MENUSCRIPT GOES NO FURTHER BACK THAN 8TH CENTURY.....TWO VERSIONS OF THE ARABIC ARE REPORTED TO HAVE TAKEN PLACE AT ALAXANDRIA IN THE 13TH CENTURY.

" TIME TEXT & CANNON OF THE NEW TESTAMENT."

(BY DR. ALEXANDER SOUTER M.A.L.L.D. PAGE:74 2nd Edition 1925)

انجیل کے عربی تراجم کے عنوان کے نیچے لکھتے ہیں:

''ان تراجم کے کچھ ٹکڑے تو براہ راست یونانی سے ہوئے۔ کچھ ٹکڑے سریانی زبان سے ترجمہ ہوئے اور کچھ قبطی زبان سے۔ محمد (صلعم) بھی اناجیل کے متعلق صرف زبانی معلومات رکھتے تھے۔ پرانے سے پرانا ترجمہ عربی کا آٹھویں صدی سے اوپر نہیں جاتا۔ (رسول کریم صلعم چھٹی صدی میں پیدا ہوئے تھے)۔''

پھر لکھتے ہیں کہ بیان کیا جاتا ہے وہ ترجمے عربی کے تیرھویں صدی میں اسکندریہ کے مقام پر کیے گئے تھے۔

ان دلائل سے معلوم ہوتا ہے کہ انجیل کا عربی ترجمہ اس وقت تک نہ ہوا تھا اور جن لوگوں نے انجیل پڑھنی ہوتی تھی وہ عبرانی یا یونانی میں پڑھا کرتے تھے۔

پس یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا کہ جبرؔ عربی زبان میں تورات اور انجیل پڑھتا تھا اور آپ اس سے سیکھتے لیتے تھے۔ وہ عبرانی یونانی زبان کے الفاظ جو اس نے رٹے ہوئے ہوں گے پڑھا کرتا ہوگا۔ پس آپ زیادہ سے زیادہ یہ کرسکتے تھے کہ اس کے بولے ہوئے لفظوں کو یاد کرلیں۔ مگر اس سے آپ کو کیا فائدہ ہوسکتا تھا؟

آخر میں ایک باریک اشارہ کو بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ جس اعتراض کا ذکر کیا گیا ہے وہ جؔبر کے متعلق تھا اور وہ اشارہ یہ ہے کہ اس اعتراض کی تفصیلات کے بعد جو سب سے پہلی آیت ہے اس میں مرتدوں کا ذکر ہے اور جبر کی زندگی کے ایک اہم واقعہ کا تعلق بھی ایک مرتد سے ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ جؔبر دل سے مسلمان ہو گئے تھے مگر ظاہر نہ کرتے تھے۔ رسول کریم صلعم جب مدینہ تشریف لے گئے تو ایک شخص کو کاتب وحی مقرر کیا جس کا نام عبداللہ بن ابی سرح تھا۔ یہ وہاں قرآن کریم ہی کے متعلق ایک شبہ میں پڑ کر مرتد ہو گیا اور جب مکہ میں آیا تو لوگوں کو جؔبر کے مسلمان ہونے کی اطلاع دے دی۔ جس کی وجہ سے سالہا سال تک ان کو سخت تکالیف دی گئیں۔ پس اس اعتراض کے معاً بعد آیت ارتداد رکھ کر ایک باریک اشارہ اس طرف کیا گیا ہے کہ اس متّہم غلام پر ایک زمانہ میں ایک مرتد کی طرف سے بھی ظلم ٹوٹنے والا ہے۔

مذکورہ بالا اعتراضات کے بارہ میں مَیں بعض اور امور بھی بیان کر دیتا ہوں تا حسب ضرورت کام آئیں:

(۱) قرآن کریم نے کسی ایک فرقہ کو نہیں لیا بلکہ سب سے اختلاف کیا ہے۔ وہ کس فرقہ کا آدمی تھا جو اس کام میں آپ کی مدد کرتا تھا؟ کیا وہ خود اپنے مذہب کے خلاف تعلیم بھی آپ کو سکھاتا تھا؟

(۲) قرآن کریم نے بائبل کے غلط واقعات کی اصلاح کی ہے۔ یہ اصلاح کس غلام کی مدد سے آپ کر سکتے تھے۔ جیسے مثلاً ہارونؑ کا شرک نہ کرنا اور داؤدؑ وسلیمانؑ ونوحؑ کی پاکیزگی ثابت کرنا یہ ایسے واقعات ہیں کہ آج تیرہ سو سال کے بعد یورپین مسیحی مصنف ان کے بارہ میں قرآن کریم کی تائید پر مجبور ہو رہے ہیں۔

(۳) آپ نے بائبل کے واقعات کے متعلق بعض نئی باتیں بیان کی ہیں جن کا اس وقت کسی یہودی اور عیسائی فرقہ کو بھی علم نہ تھا لیکن وہ آج سچی ثابت ہو رہی ہیں۔ جیسے فرعون کی لاش کا محفوظ رہنا اور آخر مل جانا۔

(۴) روایات سے ثابت ہے کہ آنحضرت صلعم چوتھے یا پانچویں سال بعد دعویٰ کے اس غلام کے پاس کھڑے ہوا کرتے تھے ۔کیونکہ روایات میں آتا ہے کہ جب آنحضرت صلعم کا بائیکاٹ ہوا ہے اس وقت اس کے پاس کھڑے ہوا کرتے تھے ۔لیکن قرآن کریم کی بعض سورتیں اس واقعہ سے پہلے اتر چکی تھیں اوران میں عیسائیوں کا ذکر موجود تھا جیسے سورۃ طٰہٰ ،سورۃ فرقان، کہف ،مریم وغیرہ ۔چنانچہ حضرت ابن مسعودؓ جو بالکل ابتدائی زمانہ میں اسلام لانے والے ہیں فرماتے ہیں کہ سورۃ بنی اسرائیل، کہف،سورۃ طٰہٰ ،سورۃ مریم ،سورۃ انبیاء

اِن ھُنَّ العَتَاقِ الْاَوَّلِ وَھُنَّ مِنْ تَلَاوِیْ (بخاری کتاب التفسیر)

یہ قرآن کی ابتدائی سورتوں میں سے ہیں اور میرا پرانا مال ہیں ۔یعنی میں نے ابتدائے اسلام میں یہ سورتیں یاد کی تھیں ۔ان سورتوں میں کثرت سے یہودیوں اور عیسائیوں کے واقعات آتے ہیں۔'' (تفسیر کبیر جلد ۴ صفحہ ۲۴۲ تا ۲۵۲)

☆

آپؐ پر یہ اعتراض کیا گیا کہ آپؐ معلَّم ہیں یعنی کوئی اور آپ ﷺ کو باتیں سکھاتا ہے جو آپؐ بیان کرتے ہیں ۔اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے حضرت مصلح موعودؓ فرماتے ہیں ۔

''اعتراض یہ کیا گیا کہ یہ معلم ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اَنّٰى لَهُمُ الذِّكْرٰى وَقَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مُّبِيْنٌ ۙ

ثُمَّ تَوَلَّوْا عَنْهُ وَقَالُوْا مُعَلَّمٌ مَّجْنُوْنٌ ۘ (الدخان:۱۴، ۱۵)

فرمایا ان نامعقولوں کو کہاں سے نصیحت حاصل ہوگئی حالانکہ ان کے پاس اعلیٰ درجہ کے معارف بیان کرنے والا رسول آیا مگر یہ لوگ اس سے منہ پھیر کر چلے گئے اور کہہ دیا کہ اسے کوئی سکھا جاتا ہے اور مجنون ہے ۔مطلب یہ کہ یہ ایسا نادان ہے کہ لوگ اس کو اس کے باپ دادا کے دین کے خلاف باتیں بتا جاتے ہیں اور یہ آگے ان کو بیان کر دیتا ہے۔

بعض لوگ رسول کریم ﷺ پر اعتراض کرتے تھے اور اب تک کرتے ہیں کہ قرآن نہ آپ

پر نازل ہوا نہ آپ نے بنایا بلکہ کوئی اور شخص ان کو سکھا دیتا ہے۔ مکہ والے کہتے تھے کہ مکہ کا ہو کر محمد (صلی اللہ علیہ والہ وسلم) کس طرح اپنی قوم کے بتوں کی مذمت کر سکتا ہے اور ان کے مقابلہ میں دوسری قوم کے نبیوں کی تعریف کر سکتا ہے۔ اسے کوئی اور اس قسم کی باتیں سکھا جاتا ہے۔ جب وہ حضرت موسیٰؑ کی تعریف قرآن میں سنتے تو کہتے کہ کوئی یہودی سکھا گیا ہے اور جب حضرت عیسیٰؑ کی تعریف سنتے تو کہتے کوئی عیسائی بتا گیا ہے۔ اس میں ان کو اس بات سے بھی تائید مل جاتی کہ قرآن کریم میں پہلے انبیاء کے واقعات بھی بیان ہوئے ہیں۔ اس جگہ مجنون حقیقی معنوں میں نہیں آیا بلکہ غصہ کا کلام ہے کیونکہ معلّم اور مجنون یکجا نہیں ہو سکتے۔ مطلب یہ کہ پاگل ہے۔ اتنا نہیں سمجھتا کہ لوگ اسے اپنے مذہب اور قوم کے خلاف باتیں سکھاتے ہیں۔

قرآن کریم میں دو جگہ بھی یہ ذکر آیا ہے۔ سورہ نحل رکوع ۱۴ میں ہے:

قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ لِيُثَبِّتَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ۝ وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ ؕ لِسَانُ الَّذِيْ يُلْحِدُوْنَ اِلَيْهِ اَعْجَمِيٌّ وَّهٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِيْنٌ۝ (النحل:۱۰۳،۱۰۴)

فرمایا اے محمد (صلی اللہ علیہ والہ وسلم) تو مخالفوں سے کہہ دے کہ قرآن کو روح القدس نے اتارا ہے۔ تیرے رب کی طرف سے ساری سچائیاں اس میں موجود ہیں اور اس لئے اتارا ہے کہ مومنوں کے دل مضبوط ہوں اور مسلمانوں کے لئے ہدایت اور بشارت ہو۔ اور ہم جانتے ہیں کہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ کسی اور نے قرآن سکھایا ہے مگر جس کی طرف وہ یہ بات منسوب کرتے ہیں وہ عجمی ہے (عجمی وہ ہوتا ہے جو عرب نہ ہو یا عرب تو ہو مگر اپنے مافی الضمیر کو اچھی طرح عربی میں بیان نہ کر سکے) اور یہ جو کلام ہے یہ تو زبان عربی میں ہے اور وہ بھی معمولی نہیں بلکہ خوب کھول کھول کر بیان کرنے والی۔

دوسری جگہ فرماتا ہے:

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ هٰذَاۤ اِلَّاۤ اِفْكُ ۟افْتَرٰىهُ وَاَعَانَهٗ عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ ۚ فَقَدْ جَآءُوْ ظُلْمًا وَّزُوْرًا۝ وَقَالُوْۤا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ

اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلَىٰ عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّأَصِيلًا ۝ قُلْ أَنْزَلَهُ الَّذِي يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۚ إِنَّهُ كَانَ غَفُورًا رَّحِيمًا ۝ (الفرقان:۵تا۷)

یعنی یہ لوگ کہتے ہیں کہ قرآن خدا کا کلام نہیں ہے بلکہ صرف ایک جھوٹ ہے جو اس نے بنا لیا ہے اور اس بنانے میں کچھ اور بھی لوگ اس کی مدد کرتے ہیں۔ یہ بات کہنے میں انہوں نے بڑا ظلم کیا ہے اور بڑا افترا باندھا ہے۔ وَقَالُوْٓا أَسَاطِيْرُ الْأَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا اور وہ کہتے ہیں کہ اس میں پرانے قصے ہیں جو لکھوالیتا ہے۔ یعنی دو جماعتیں ہیں ایک مضمون بناتی ہے اور ایک لکھ لکھ کر دیتی ہے۔ فَهِيَ تُمْلَىٰ عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّأَصِيلًا پھر اس کی مجلس میں اسے خوب پڑھتے ہیں تا کہ یاد ہو جائے قُلْ أَنْزَلَهُ الَّذِي يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ کہہ دے اسے خدا نے اتارا ہے جو آسمانوں اور زمین کے رازوں کو جاننے والا ہے۔ إِنَّهُ كَانَ غَفُوراً رَّحِيماً وہ بڑا بخشنے والا اور بار بار رحم کرنے والا ہے۔

اس اعتراض میں آج کل عیسائی بھی شامل ہو گئے ہیں اور بڑے بڑے مصنف مزے لے لے کر اسے بیان کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں محمد (ﷺ) کو کیا پتہ تھا کہ عیسائیوں اور یہودیوں کی کتابوں میں کیا لکھا ہے۔ وہ عیسائی اور یہودی تھے جو باتیں بنا کر ان کو دیتے تھے۔ چونکہ اب بھی یہ اعتراض کیا جاتا ہے اور اسے بہت اہمیت دی جاتی ہے اس لئے میں کسی قدر تفصیل سے اس کا جواب بیان کرتا ہوں۔

مفسرین لکھتے ہیں کہ یہ جو کہا گیا ہے کہ اسے بشر سکھاتا ہے۔ اس بشر سے مراد جبر رومی غلام تھا۔ جو عامر بن حضرمی کا غلام تھا۔ اس نے تورات اور انجیل پڑھی ہوئی تھی۔ جب رسول کریم ﷺ کو لوگ تکلیف دینے لگے تو آپ اس کے پاس جا کر بیٹھا کرتے تھے۔ اس پر لوگوں نے یہ اعتراض کیا۔ دوسری روایتوں میں آتا ہے کہ فرّا اور زجاج کہتے ہیں کہ حویطب ابن عبد العزّیٰ کا ایک غلام عائش یا یعیش نامی پہلی کتب پڑھا کرتا تھا بعد میں پختہ مسلمان ہو گیا اور رسول کریم ﷺ کی مجلس میں آتا تھا۔ اس کی نسبت لوگ یہ الزام لگاتے تھے۔ مقاتل اور ابن جبیر کا قول ہے کہ ابو فکیہہ پر لوگ شبہ کرتے تھے ان کا نام یسار تھا۔ مذہباً یہودی تھے اور مکہ کی ایک عورت کے

غلام تھے۔ بیہقی اور آدم بن ابی ایاس نے عبداللہ بن مسلم الحضرمی سے روایت لکھی ہے کہ ہمارے دو غلام یسار اور جبر نامی تھے۔ دونوں نصرانی تھے اور عین التجر کے رہنے والے تھے۔ دونوں لوہار تھے اور تلواریں بنایا کرتے تھے اور کام کرتے ہوئے انجیل پڑھا کرتے تھے۔ رسول کریم ﷺ وہاں سے گزرتے تو ان کے پاس ٹھہر جاتے۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ ان میں سے ایک غلام سے لوگوں نے پوچھا کہ اَنَّکَ تُعَلِّمُ مُحَمَّداً فَقَالَ لَا هُوَ يُعَلِّمُنِيْ۔ کیا تم محمد (ﷺ) کو سکھاتے ہو؟ اسے نے کہا میں نہیں سکھاتا بلکہ وہ مجھے سکھاتا ہے۔ ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ ایک اعجمی رومی غلام مکہ میں تھا۔ اس کا نام بلعام تھا۔ رسول کریم ﷺ اسے اسلام سکھایا کرتے تھے۔ اس پر قریش کہنے لگے کہ یہ محمد (ﷺ) کو سکھاتا ہے۔

مسیحی مؤرخ لکھتے ہیں کہ غالباً آپؐ نے بحیرہ راہب سے سیکھا تھا۔ چونکہ مسیحی تاریخوں میں بحیرہ کا کہیں پتہ نہیں ملتا اس وجہ سے وہ ابتداءً تو اس کے وجود سے ہی منکر تھے لیکن اب مسعودی کی ایک روایت کی وجہ سے وہ اس کو تسلیم کرنے لگے ہیں۔ اور اس اعتراض کے رنگ میں اس سے فائدہ اٹھانے لگے ہیں۔ وہ روایت یہ ہے کہ بحیرہ کو مسیحی لوگ سرگیس (SURGUIS) کہا کرتے تھے اور SURGUIS نامی ایک پادری کا پتہ مسیحی کتب میں مل جاتا ہے۔ پس اب وہ کہتے ہیں کہ اس شخص سے سیکھ کر رسول کریم (ﷺ) نے نعوذباللہ قرآن بنالیا۔ سیل (SALE) اس خیال کو رد کرتا ہے اور کہتا ہے کہ بحیرہ کا مکہ جانا ثابت نہیں۔ اور یہ خیال کہ آپؐ نے جوانی میں دعویٰ سے بہت پہلے بحیرہ سے قرآن سیکھا ہو عقل کے خلاف ہے۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ اس سے مسیحیت کا کچھ علم سیکھا ہو۔

وہیری ان روایتوں سے خوش ہوکر کہتا ہے کہ خواہ ناموں میں اختلاف ہی ہو لیکن یہ روایت اتنی کثرت سے آتی ہے کہ اس میں شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ محمد (ﷺ) کے پاس بعض مسیحی اور یہودی آتے تھے اور یہ کہ انہوں نے ان کی گفتگو سے خاص طور پر فائدہ اٹھایا اور جواب کی کمزوری بتاتی ہے کہ کچھ دال میں کالا کالا ضرور ہے ورنہ یہ کیا جواب ہوا کہ اس کی زبان اعجمی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ اپنی ٹوٹی پھوٹی زبان میں بنادیتا ہو۔ اور محمد (ﷺ) اسے عربی میں ڈھال

لیتے ہوں (وہ اپنے اس خیال کی تائید میں آرنلڈ کو بھی پیش کرتا ہے) اس کے بعد وہ لکھتا ہے:

" It is because of this that we do not hesitate to reterate the old charge of deliberate imposture."

یعنی ہم یہ پرانا الزام دہراتے ہوئے اپنے دل میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے کہ محمد (ﷺ) نے جان بوجھ کر جھوٹ بنایا۔

اوپر کے مضمون سے معلوم ہو سکتا ہے کہ کفار مکہ اس اعتراض کو خاص اہمیت دیتے تھے۔ اور ان کے وارث مسیحیوں نے اس اہمیت کو اب تک قائم رکھا ہے۔ میں پہلے مسیحیوں کے اعتراضات کو لیتا ہوں۔ اور اس شخص کو جواب میں پیش کرتا ہوں جسے عیسائی خدا کا بیٹا کہتے ہیں۔ حضرت مسیح پر یہ اعتراض ہوا تھا۔ کہ ان کے ساتھ شیطان کا تعلق ہے اور دیوؤں کو اس کی مدد سے نکالتے ہیں۔ چنانچہ لکھا ہے:

> ''پھر وہ گونگی بدروح کو نکال رہا تھا اور جب وہ بدروح اتر گئی تو ایسا ہوا کہ گونگا بولا اور لوگوں نے تعجب کیا۔ لیکن ان میں سے بعض نے کہا یہ تو بدروحوں کے سردار بعل زبول کی مدد سے بدروحوں کو نکالتا ہے۔ بعض اور لوگ آزمائش کے لئے اس سے ایک آسمانی نشان طلب کرنے لگے مگر اس نے ان کے خیالوں کو جان کر ان سے کہا کہ جس کسی بادشاہت میں پھوٹ پڑے وہ ویران ہو جاتی ہے اور جس گھر میں پھوٹ پڑے وہ برباد ہو جاتا ہے۔ اور اگر شیطان بھی اپنا مخالف ہو جائے تو اس کی بادشاہت کس طرح قائم رہے گی۔ کیونکہ تم میری بابت کہتے ہو کہ یہ بدروحوں کو بعل زبول کی مدد سے نکالتا ہے۔''

یہاں حضرت مسیح نے ایک قانون پیش کیا ہے جب ان کے متعلق کہا گیا کہ وہ شیطان کو شیطان کی مدد سے نکالتے ہیں۔ تو انہوں نے کہا شیطان شیطان کو کیوں نکالے گا۔ اس قانون کے ماتحت غور کر لو کہ کیا قرآن کسی یہودی یا عیسائی کا بنایا ہوا نظر آتا ہے۔ اگر کسی عیسائی کا بنایا ہوا

ہوتا تو عیسائیت کے رد سے کس طرح بھرا ہوا ہوتا؟ اور اگر کسی یہودی نے بنایا ہوتا تو اس میں یہودیت کا کس طرح رد ہوتا؟ عیسائیت کا کوئی فرقہ بتا دو اس کا رد قرآن سے دکھایا جائے گا۔ اسی طرح کوئی یہودی فرقہ پیش کرو اس کا رد قرآن میں موجود ہے۔ کیا کوئی خیال کر سکتا ہے کہ کوئی عیسائی اور یہودی اپنے مذہب کی آپ تردید کرے گا۔ قرآن پورے طور پر عیسائیت کو رد کرتا ہے۔ ہم دور نہیں جاتے پہلی سورت میں ہی قرآن نے عیسائیت کی جڑیں اکھیڑ کر رکھ دی ہیں۔ پہلی سورۃ جو رسول کریم ﷺ پر نازل ہوئی یہ ہے:

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَۚ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍۚ۝ اِقْرَاْ وَ رَبُّكَ الْاَكْرَمُۙ۝ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِۙ۝ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْؕ۝ كَلَّاۤ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَیَطْغٰۤىۙ۝ اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰىؕ۝ اِنَّ اِلٰى رَبِّكَ الرُّجْعٰىؕ۝ اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یَنْهٰىۙ۝ عَبْدًا اِذَا صَلّٰىؕ۝ اَرَءَیْتَ اِنْ كَانَ عَلَى الْهُدٰۤىۙ۝ اَوْ اَمَرَ بِالتَّقْوٰىؕ۝ اَرَءَیْتَ اِنْ كَذَّبَ وَ تَوَلّٰىؕ۝ اَلَمْ یَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰهَ یَرٰىؕ۝ كَلَّا لَىٕنْ لَّمْ یَنْتَهِ لَنَسْفَعًۢا بِالنَّاصِیَةِۙ۝ نَاصِیَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍۚ۝ فَلْیَدْعُ نَادِیَهٗۙ۝ سَنَدْعُ الزَّبَانِیَةَۙ۝ كَلَّاؕ لَا تُطِعْهُ وَ اسْجُدْ وَ اقْتَرِبْ۠۝ (العلق)

یہ سورۃ جو سب سے پہلی سورت ہے اسی میں عیسائیت کے تمام مسائل کو رد کر دیا گیا ہے۔

پہلا حملہ عیسائیت پر یہ ہے کہ فرمایا۔ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ عیسائیت کی بنیاد اس عقیدہ پر ہے کہ انسان کی فطرت میں گناہ ہے۔ عیسائیت کہتی ہے انسان فطرتاً گنا ہگار ہے اور عمل سے نیک نہیں بن سکتا۔ اس لئے مسیح کو جو پاک اور بے عیب تھا صلیب پر چڑھا دیا گیا۔ اسی طرح وہ انسانوں کے گناہ اپنے اوپر اٹھا کر قربان ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ انسان کی فطرت میں خدا کی محبت رکھی گئی ہے اور اس کی بناوٹ میں ہی خدا سے تعلق رکھا گیا ہے۔ اس طرح عیسائیت کا پہلا عقیدہ باطل کر دیا گیا اور بتا دیا گیا کہ کفارہ کوئی چیز نہیں ہے۔ اس کی بنیاد

اس امر پر ہے کہ انسان گناہ گار ہے۔لیکن اسلام شروع ہی اس بات سے ہوتا ہے کہ انسان نیک ہے اوراس کی فطرت میں خدا سے محبت رکھی گئی ہے نہ کہ گناہ۔

دوسرا جواب یہ دیا کہ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ خدا جو تیرا رب ہے اس کی یہ شان ہے کہ دوسری چیزوں میں جو صفات پائی جاتی ہیں ان سب سے اعلیٰ صفات اس میں جلوہ گر ہیں ۔عیسائیت کہتی ہے کہ خدا میں رحم کی صفت نہیں ۔وہ گناہ گار کو نہیں بخش سکتا مگر اسلام کہتا ہے جب انسان اپنے قصور وار کو بخش سکتا ہے اور انسان میں عفو کی صفت ہے تو خدا کیوں نہیں بخش سکتا مگر اسلام کہتا ہے جب انسان اپنے قصور وار کو بخش سکتا ہے اوراس میں کیوں یہ صفت نہیں۔ اس میں تو بدرجہ اتم یہ صفت موجود ہے۔کیونکہ وہ اکرم ہے یعنی تمام صفات حسنہ میں سب سے بڑھ کر ہے۔

تیسرا ردّ یہ کیا کہ فرمایا عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ يَعْلَمْ عیسائیت کی تیسری بنیاد یہ ہے کہ شریعت لعنت ہے۔لیکن قرآن نے بتایا ہے کہ شریعت وہ باتیں ہیں جو انسان عقل سے دریافت نہیں کرسکتا۔انسان اپنی کوشش سے شرعی احکام نہیں بنا سکتے اس لئے شریعت آتی ہے۔

چوتھی ردّ عیسائیت پر یہ کی کہ فرمایا كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰٓى اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى انسان بڑا ہی سرکش ہے جو یہ کہتا ہے کہ مجھے خدا کی شریعت کی ضرورت نہیں ۔میں خود اپنی راہنمائی کے سامان مہیا کرلوں گا۔یہ کہنے والے بہت نامعقول لوگ ہیں۔

پانچواں ردّ یہ کیا کہ فرمایا۔ كَلَّا ؕ لَا تُطِعْهُ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ایسے لوگوں کی باتیں کبھی نہ سننا اور اللہ کی خوب عبادت اور فرماں برداری کرنا۔رسول کریم ﷺ کو فرمایا کہ کسی راہب کی بات نہ سننا جو شریعت کو لعنت قرار دیتا ہے بلکہ خدا کی فرمانبرداری میں لگا رہ۔گویا نجات اور قربِ الٰہی کا ذریعہ بجائے کسی کفارہ پر ایمان لانے کے سجدہ یعنی فرمانبرداری یا بالفاظ دیگر اسلام کو قرار دیا ہے۔

پس قرآن کی تو پہلی سورۃ نے ہی مسیحیت کو ردّ کیا ہے اور بادلیل ردکیا ہے۔اسی طرح سورۃ فاتحہ میں عیسائیت اور یہودیت کو رد کیا گیا ہے۔پھر کیا کوئی شخص مان سکتا ہے کہ عیسائی اور یہودی

اپنے مذہب کے خلاف خود دلائل بتایا کرتے تھے۔ دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں یا تو عیسائی راہب اپنے مذہب کو ماننے والا ہو گا یا نہ ماننے والا۔ اگر ماننے والا تھا تو اسے چاہئے تھا کہ اپنے مذہب کی تائید کرتا نہ کہ اس کے خلاف باتیں بتاتا۔ اور اگر نہ ماننے والا تھا اور سمجھتا تھا کہ جو باتیں اس کے ذہن میں آئی ہیں وہ اعلیٰ درجہ کی ہیں تو اس نے ان کو خود اپنی طرف منسوب کر کے کیوں نہ پیش کیا۔ اسے چاہئے تھا کہ اپنے نام پر کتاب لکھتا نہ کہ لکھ کر دوسرے کو دے دیتا۔

اب میں ان آیتوں اور ان میں مذکور جوابات کو لیتا ہوں۔ سورہ نحل کی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کا اعتراض یہ تھا کہ اسے کوئی اور آدمی سکھاتا ہے۔ اس کا جواب اللہ تعالیٰ نے یہ دیا ہے کہ وہ شخص تو عجمی ہے اور قرآن کی زبان عربی ہے۔ وہیری کہتا ہے کہ یہ جواب بالکل بودا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دال میں کچھ کالا کالا ہے۔ مضمون وہ عجمی بنا کر دیتا تھا آگے عربی میں وہ خود ڈھال لیتے تھے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا قرآن کے دوسرے جواب بھی ایسے ہی بودے ہوتے ہیں؟ اگر قرآن کی دوسری باتیں ارفع اور اعلیٰ ہیں تو ہمیں سوچنا چاہئے کہ یہ جواب بھی ضرور اعلیٰ ہوگا اور جو مطلب ہم سمجھتے ہیں وہ غلط ہوگا۔ دوسرے اگر یہ جواب بے جوڑ تھا تو کیوں مکہ والوں نے اسے رد نہ کر دیا اور کیوں وہیری والا جواب انہوں نے نہ دیا۔ ان کا تو اپنا اعتراض تھا اور وہ اپنے اعتراض کو وہیری وغیرہ سے بہتر سمجھتے تھے۔ وہ کہہ سکتے تھے کہ یہ تو بے معنی جواب ہے۔ مگر کسی ضعیف سے ضعیف روایت میں بھی یہ نہیں آتا کہ مکہ والوں نے کہا ہو یہ جواب بے جوڑ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا جو اعتراض تھا اس کا جواب انہیں صحیح اور مسکت مل گیا تھا اسی لئے وہ خاموش ہو گئے۔

اب رہا یہ امر کہ اچھا سوال و جواب کا مطلب کیا تھا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اصل میں کفار کا سوال ایک نہ تھا بلکہ دو تھے۔ اور ان سوالوں کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ہی قرآنی جواب کو بے جوڑ قرار دے دیا گیا ہے۔ ان میں سے ایک کا ذکر سورۃ نحل میں ہے اور دوسرے کا سورۃ فرقان میں۔ سورۃ نحل کا وہ سوال نہیں جو سورۃ فرقان کا ہے اور سورۃ فرقان میں وہ نہیں جو سورۃ نحل میں ہے۔ چنانچہ سورۃ نحل میں میں یہ اعتراض نقل ہے کہ ایک عجمی شخص آپ کو سکھاتا ہے۔ قرآن کریم

نے اس کا نام نہیں لیا مگر یہ کہا ہے کہ لِسَانُ الَّذِیْ یُلْحِدُوْنَ اِلَیْهِ اَعْجَمِیٌّ (النحل:۱۰۴) کہ وہ جس کی طرف قرآن کو منسوب کرتے ہیں وہ عجمی ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مخالف کسی خاص شخص کا نام لیتے تھے۔پھر یہ بھی پتہ لگتا ہے کہ وہ شخص معروف تھا اور مسلمان بھی اس شخص کا نام جانتے تھے۔

سورۃ فرقان کی آیت اس سے مختلف ہے۔اس میں بتایا گیا ہے کہ کفار کسی خاص آدمی کا نام لئے بغیر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ ایک جماعت رسول کریم ﷺ کو سکھاتی ہے اور رات دن آپ کے پاس رہتی ہے اور آپ بعض دوسرے لوگوں سے اس جماعت کے بتائے ہوئے واقعات کو لکھوا لیتے ہیں۔

یہ فرق نمایاں ہے۔ایک میں ایک خاص شخص کا ذکر ہے اور دوسری میں غیر معین جماعت کا ذکر ہے۔ایک میں صرف سیکھنے کا ذکر ہے اور دوسری میں بعض لوگوں سے لکھوانے کا بھی ذکر ہے۔ایک میں محض تعلیم کا ذکر ہے اور دوسری میں پہلوں کے واقعات اور خیالات کے نقل کرنے کا ذکر ہے اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ دونوں جگہ جواب الگ الگ دیا گیا ہے۔یہ فرق اتنے نمایاں ہیں کہ ہر شخص آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ جب رسول کریم ﷺ نے دعویٰ کیا تو شروع میں ہی بعض غلام آپ پر ایمان لے آئے تھے۔وہ پہلے بت پرست یا عیسائی یا یہودی تھے۔انہیں جب صبح و شام فرصت ملتی رسول کریم ﷺ کے گھر پہنچ جاتے اور دوسرے صحابہؓ کے ساتھ دین سیکھتے اور نمازیں پڑھتے۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے واقعہ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ایک مکان پر یہ اجتماع ہوتا تھا۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ ابھی ایمان نہ لائے تھے کہ ایک دن اپنے گھر سے رسول کریم ﷺ پر حملہ کرنے کے ارادہ سے نکلے۔کسی نے پوچھا کہ کیا ارادہ ہے؟ انہوں نے کہا محمد جو صابی ہو گیا ہے اس کی خبر لینے جا رہا ہوں۔اس نے کہا پہلے اپنے گھر کی خبر تو لو۔انہوں نے کہا کیا ہو گیا ہے؟ اس نے بتایا کہ تمہاری بہن اور بہنوئی دونوں مسلمان ہو گئے ہیں۔یہ سن کر وہ اپنی بہن کے گھر گئے اور جا کر دستک دی۔اس وقت ایک صحابی ان کو قرآن پڑھا رہے تھے۔جب انہیں معلوم ہوا کہ عمرؓ ہیں تو

صحابی کو چھپا دیا گیا اور بہن اور بہنوئی سامنے ہوئے۔انہوں نے پوچھا کس طرح آئے ہو؟عمر نے کہا بتاؤ تم کیا کر رہے تھے۔میں نے سنا ہے تم بھی صابی ہو گئے ہو۔انہوں نے کہا یہ غلط ہے ہم تو صابی نہیں ہوئے۔عمرؓ نے کہا میں نے خود تمہاری آواز سنی ہے تم کچھ پڑھ رہے تھے اور بہنوئی پر حملہ کر دیا۔یہ دیکھ کر بہن آگے آ گئی اور ضرب اس کے سر پر پڑی جس سے اس کا سر پھٹ گیا اور خون بہنے لگا۔اس پر انہوں نے بڑے جوش سے کہا ہم مسلمان ہو گئے ہیں۔اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لے آئے ہیں تم جو کچھ کرنا چاہتے ہو کر لو۔جب حضرت عمرؓ نے یہ حالت دیکھی تو چونکہ وہ ایک بہادر انسان تھے اور ان کا وار ایک عورت پر پڑا جو ان کی بہن تھی۔اس سے انہیں سخت شرمندگی محسوس ہوئی اور انہوں نے کہا تم جو کچھ پڑھ رہے تھے وہ مجھے بھی دکھاؤ۔اس نے کہا تم مشرک اور ناپاک ہو پہلے جا کر نہاؤ پھر بتائیں گے۔چنانچہ وہ نہائے اور رہا سہا غصہ بھی دور ہو گیا۔اس کے بعد قرآن کی جو آیات پڑھ رہے تھے وہ انہیں سنائی گئیں۔حضرت عمرؓ کا دل ان کو سن کر پگھل گیا اور وہ بے اختیار کہہ اٹھے اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰـہُ وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ۔

اس وقت وہ صحابی جن کو انہوں نے چھپایا ہوا تھا وہ بھی باہر آ گئے۔حضرت عمرؓ نے کہا بتاؤ تمہارا سردار کہاں ہے میں اس کے پاس جانا چاہتا ہوں۔انہیں بتایا گیا کہ فلاں گھر میں مسلمان جمع ہوتے ہیں۔حضرت عمرؓ وہاں گئے۔وہاں رسول کریم ﷺ اور بعض صحابہؓ موجود تھے اور دروازہ بند تھا۔جب حضرت عمرؓ نے دستک دی تو صحابہ نے پوچھا کون ہے؟ حضرت عمرؓ نے اپنا نام بتایا تو صحابہؓ نے ڈرتے ہوئے رسول کریم ﷺ سے عرض کیا عمرؓ آیا ہے۔دروازہ کے سوراخ سے انہوں نے دیکھا کہ تلوار ان کے گلے میں لٹکی ہوئی ہے۔رسول کریم ﷺ نے فرمایا دروازہ کھول دو۔جب عمرؓ اندر داخل ہوئے تو رسول کریم ﷺ نے ان کا کُرتا پکڑ کر کہا عمر کس نیت سے آئے ہو۔انہوں نے کہا اسلام قبول کرنے کے لئے۔آپ نے فرمایا اللہ اکبر۔یہ سن کر باقی صحابہؓ نے بھی زور سے نعرہ تکبیر بلند کیا۔اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم ﷺ کی عادت تھی کہ صحابہؓ کو دین سکھانے کے لئے الگ مکان میں بلا لیتے۔چونکہ آپ دروازہ

بند کر کے بیٹھتے تھے تا کہ کفار شرارت نہ کریں اس لئے کفار کے نزدیک اس قسم کا اجتماع بالکل عجیب بات تھی۔ وہ خیال کرتے تھے کہ وہاں قرآن بنایا جاتا ہے۔ اور چونکہ انبیاءِ سابق کے بعض واقعات کی طرف قرآن کریم میں اشارہ تھا وہ یہ خیال کرتے کہ مسیحی اور یہودی غلام یہ باتیں ان لوگوں کو بتاتے ہیں اور دوسرے صحابہؓ سے رسول کریم ﷺ لکھوا لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس کا جواب دیتا ہے کہ:۔

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوٓا إِنْ هَٰذَآ إِلَّآ إِفْكٌ ٱفْتَرَىٰهُ وَأَعَانَهُۥ عَلَيْهِ قَوْمٌ ءَاخَرُونَ ۖ فَقَدْ جَآءُو ظُلْمًا وَزُورًا ۝ (الفرقان:۵)

یعنی منکر لوگ کہتے ہیں کہ یہ جھوٹ بنالیا گیا ہے اور کچھ لوگ اس میں مدد دیتے ہیں۔ مگر ان کا یہ اعتراض بالبداہت ظلم اور جھوٹ پر مبنی ہے۔ کیونکہ کیا مسیحی غلام ایسا کر سکتے ہیں کہ خود اپنے دین پر ہنسی کرائیں۔ آخر انہیں اس کی کیا ضرورت ہے اور کیا فائدہ ہے کہ وہ اسی بات پر رات دن ماریں کھائیں اور گرم ریت پر گھسیٹے جائیں اور ایک بے فائدہ فریب میں شامل ہوں۔ پس ایسے مخلص لوگوں پر یہ اعتراض کر کے ان لوگوں نے ظلم اور جھوٹ سے کام لیا ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ ایسے لوگ ایسا جھوٹ بنا سکیں۔

دوسرا جواب یہ دیا ہے کہ جن کو تم پرانے قصے سمجھتے ہو وہ قصے نہیں بلکہ آئندہ کے متعلق خبریں اور پیشگوئیاں ہیں۔ چنانچہ فرماتا ہے۔ قُلْ أَنزَلَهُ ٱلَّذِى يَعْلَمُ ٱلسِّرَّ فِى ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضِ (الفرقان:۹) تو کہہ دے کہ یہ خدا کا کلام ہے جو آسمانوں اور زمین کے رازوں سے واقف ہے۔ کوئی انسان ایسا کلام نہیں بنا سکتا۔ یہ تو غیب کی باتیں ہیں اور غیب خدا ہی جانتا ہے۔

اب ان جوابوں کو دیکھو کہ کس قدر صحیح اور مضبوط ہیں۔ اور وہیری کا خیال کس قدر بے معنی ہے۔ اگر یہاں بھی وہی اعتراض سورۃ نحل والا ہوتا تو اس کا وہی جواب کیوں نہ دیا جاتا جو وہاں دیا گیا ہے۔ آخر کیا وجہ تھی کہ اگر یہی سوال سورۃ نحل میں تھا تو اس کا جواب بقول وہیری کے بیہودہ دیا جاتا۔ ایک شخص جو صحیح جواب جانتا ہے اور وہ جواب دے بھی چکا ہے اسے وہ جواب چھوڑ کر اور جواب دینے کی کیا ضرورت تھی۔ پس یہ جواب لغو نہیں بلکہ معترضین کی اپنی سمجھ ناقص ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ سورۃ نحل میں یہ سوال ہی نہیں کہ کوئی اسے مضمون بنا دیتا ہے بلکہ یہ ذکر ہے کہ نادان لوگ ایک ایسے شخص کی نسبت یہ بیان کرتے ہیں کہ وہ محمد رسول اللہ کو سکھاتا ہے جو خود عجمی ہے۔ یعنی اپنا مفہوم اچھی طرح بیان نہیں کر سکتا تھا۔ صرف تھوڑی سی عربی جانتا تھا۔ (عجمی کے یہ بھی معنی ہیں کہ جو اپنا مفہوم اچھی طرح ادا نہ کر سکے چنانچہ لغت میں یہ معنی بھی لکھے ہیں)۔ اس کا جواب اللہ تعالیٰ یہ دیتا ہے کہ کہ دوسرے کا قول انسان دو طرح نقل کر سکتا ہے۔ ایک تو اس طرح کہ اس کا مطلب سمجھ کر اپنے الفاظ میں ادا کر دے اور دوسرا طریق یہ ہے کہ اس کے الفاظ رٹ کر ادا کر دے۔ جیسے طوطا میاں مٹھو کہتا ہے۔ نقل انہی دو طریق سے ہو سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے تم جانتے ہو کہ جس شخص کی طرف تم یہ بات منسوب کرتے ہو وہ اپنا مطلب عربی زبان میں پوری طرح ادا نہیں کر سکتا پس جب وہ مطلب ہی بیان نہیں کر سکتا تو وہ رسول کریم ﷺ کو مضامین کس طرح سمجھاتا ہے کہ وہ عربی میں اس کو بیان کر دیتے ہیں۔ یہ جواب ہے آدھے حصے کا۔ دوسری صورت یہ ہو سکتی تھی کہ اس کے قول کو نقل کیا جاتا۔ مگر یہ کس طرح ہو سکتا تھا وہ تو عبرانی میں کہتا تھا اور اس کی بات اگر دہرائی جاتی تو عبرانی ہوتی۔ مگر قرآن تو عبرانی یا یونانی میں نہیں جس میں تورات یا انجیل لکھی ہوئی ہیں بلکہ عربی میں ہے۔ پس جب نہ وہ شخص اپنا مطلب عربی میں ادا کر سکتا ہے نہ قرآن کسی دوسری زبان کی نقل ہے تو اس کی طرف یہ کتاب کس طرح منسوب کی جا سکتی ہے۔

یہ امر یاد رکھنا چاہئے کہ اس وقت تک تورات اور انجیل کا کوئی ترجمہ عربی زبان میں نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ تاریخوں سے ثابت ہے کہ بعض صحابہؓ کو عبرانی اس لئے پڑھوائی گئی کہ وہ تورات و انجیل پڑھ سکیں۔ دوسرا ثبوت اس کا یہ ہے کہ مفسرین دنیا بھر کے علوم کا ذکر تفسیروں میں کرتے ہیں مگر جب بائبل کا حوالہ دیتے ہیں تو بالعموم غلط دیتے ہیں۔ جس کی وجہ یہی تھی کہ عربی میں بائیبل نہ تھی۔ وہ سن سنا کر لکھتے اس لئے غلط ہوتا۔

تیسرا ثبوت یہ ہے کہ بخاری میں ورقہ بن نوفل کے متعلق لکھا ہے کہ كَانَ يَكْتُبُ الْكِتٰبَ بِالْعِبْرَانِيِّ وہ عبرانی میں تورات لکھا کرتے تھے۔ گویا اس وقت توریت اور انجیل عربی میں نہ تھی۔

پس یقیناً وہ غلام عبرانی یا یونانی میں انجیل پڑھتا تھا اور عربی میں اس کا مفہوم بیان نہ کر سکتا تھا۔ اس طرح اس اعتراض کو رد کر دیا گیا۔

تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ جیسا کہ جبیر نے کہا تھا کہ **بَلْ هُوَ يُعَلِّمُنِي** جبیر آخر کار مسلمان ہو گیا تھا۔ عبداللہ بن ابی سرح نے مرتد ہونے پر اس کا راز کفار کو بتا دیا تھا اور وہ اسے سخت تکالیف دیتے تھے۔ آخر فتح مکہ پر آنحضرت نے روپیہ دے کر اسے آزاد کروا دیا۔ اس سے جب پوچھا گیا تو اس نے کہا میں نہیں سکھاتا بلکہ وہ مجھے سکھاتے تھے۔"

(انوار العلوم جلد ۱۲ صفحہ ۴۴۹ تا ۴۴۹)

☆

اعتراض کہ آپ لکھنا پڑھنا جانتے تھے

سورۃ یونس کی آیت ۱۷ کی تفسیر میں عیسائی پادری کے اعتراض کا جواب دیتے ہوئے حضرت خلیفۃ المسیح الثانی فرماتے ہیں:۔

"بعض مسیحی مصنفوں نے اس آیت پر اعتراض کیا ہے چنانچہ ریورنڈ ویری صاحب جو ان میں سے قرآن کریم کے مفسر ہیں اس آیت کے نیچے سیل (ایک دوسرا انگریز جو قرآن کا مترجم تھا) کا حوالہ دے کر لکھتے ہیں کہ اس نے لکھا ہے۔ کہ جب اس عمر تک میں تمہارے اندر رہا ہوں اور نہ میں نے کسی سے پڑھا نہ علماء کی مجلس میں بیٹھا۔ اور نہ کبھی شعر یا خطبہ کہا۔ تو اب اس بڑھاپے کی عمر میں میری نسبت کس طرح خیال کیا جا سکتا ہے کہ یہ عبارتیں میری اپنی تصنیف ہیں۔ اس پر پادری ویری صاحب اعتراض کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ (۱) کیا یہ عجیب بات نہیں کہ علیؓ کے ساتھ ایک ہی گھر میں پل کر علی تو تعلیم پائے مگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم نہ پائیں۔ دوم۔ کیا یہ تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ سالوں تک ایک اہم تجارتی کام کرنے کے باوجود انہیں لکھنا نہ آتا ہو۔ سوم۔ آخری سالوں میں آپؐ یقیناً پڑھنا جانتے تھے کیونکہ حدیث میں آتا ہے کہ آپؐ نے حضرت معاویہ کو جو آپ کے کاتبوں میں سے ایک کاتب تھے۔ حکم دیا۔ کہ "ب" سیدھی ڈالو اور

"س" کے دندانوں کو واضح کرو۔ چہارم۔ انہوں نے اپنی وفات سے پہلے قلم دوات منگائی تھی۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لکھنا جانتے تھے۔ اب سوال یہ ہوتا ہے کہ فن کتابت انہوں نے کب سیکھا تھا۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ خدا نے انہیں اسی طرح سکھایا تھا۔ جس طرح الہام سکھایا تھا یعنی الہاماً لکھنا پڑھنا بتایا تھا۔ اور وہ اس کی سند میں۔ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ کو پیش کرتے ہیں۔ یہ لکھ کر ویری صاحب کہتے ہیں کہ یہ رائے کہ وہ لکھنا پڑھنا جانتے تھے تو ان کی رائے ہے اور اس آیت سے ثابت ہے کہ آپ کو پڑھنا لکھنا آتا تھا۔ لیکن یہ امر یہاں سے نہیں نکلتا کہ ان کو یہ علم معجزانہ طور پر سکھایا گیا تھا۔ اور نہ یہ نکلتا ہے کہ اس سے پہلے وہ لکھنا پڑھنا نہ جانتے تھے۔ پھر ویری صاحب لکھتے ہیں۔ اگر کوئی یہ پیش کرے کہ آپ لکھنے کے لئے کاتب رکھا کرتے تھے تو اس دلیل سے ثابت نہیں ہوتا۔ کہ آپؐ کو لکھنا نہ آتا تھا کیونکہ کاتبوں کا رکھنا اس وقت کے بڑے بڑے عالموں میں رائج تھا۔ پھر پادری ویری صاحب خود ہی سوال اٹھاتے ہیں کہ پھر یہ خیال کہاں سے پیدا ہو گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو لکھنا نہ آتا تھا۔ اس کا جواب وہ یہ دیتے ہیں کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے قرآن مجید میں النبی الامی آتا ہے۔ اس الامی کے لفظ سے مسلمانوں کو دھوکا لگا ہے کہ آپ ان پڑھ تھے۔ حالانکہ اس لفظ کے استعمال کی وجہ یہ تھی کہ یہود عربوں کو امی کہا کرتے تھے۔ اس لئے النبی الامی کے معنی قرآن میں یہ تھے کہ غیر اسرائیلی اور غیر یہودی نبی۔ پھر وہ لکھتے ہیں کہ جو یہ غلط فہمی ہوئی کہ آپ امی (ان پڑھ) ہیں۔ اس سے آپ کے دعویٰ کے پھیلنے میں بڑی مدد ملی۔ کیونکہ یہ قرآن کریم کے معجز نما ہونے کی دلیل بن گیا حالانکہ مجموعی نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ بچپن سے ہی پڑھے ہوئے تھے۔

یہ ویری صاحب کے اعتراضات کا خلاصہ ہے اب ان کا جواب حسب ذیل ہے:

(۱) آیت کی تفسیر میں میں بتا چکا ہوں کہ اس آیت میں آپ کے پڑھنے لکھنے کی طرف اشارہ نہیں بلکہ پاکیزہ زندگی کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ سیاق و سباق سے ظاہر ہے۔ کفار کا یہ سوال تھا کہ اس کتاب کی تحریر کو بدل دیں بلکہ یہ مطالبہ تھا کہ اس کی تعلیم کو بدل دیں۔ اور جواب

میں خدا تعالیٰ نے یہ نہیں کہا کہ اسے لکھنا نہیں آتا بلکہ یہ کہا ہے کہ خدا تعالیٰ چاہتا تو اس تعلیم کو یہ رسول پیش نہ کرتا۔ اور خدا تعالیٰ اس تعلیم کو نازل نہ کرتا پس اس جگہ لکھنے یا نہ لکھنے کا سوال ہی نہیں۔ نہ کفار نے اس جگہ یہ سوال کیا ہے کہ یہ تعلیم تم اپنے ہاتھ سے لکھتے ہو کہ اس کے جواب میں لکھنے کا سوال اٹھایا جاتا۔ ان کا مطالبہ تو یہ تھا کہ اس تعلیم کو بدل دو اور ان کی غرض یہ تھی کہ اگر یہ بدل دیں گے تو ان کا جھوٹا ہونا ثابت ہوگا نہ بدلیں گے تو ہم قوم کو جوش دلائیں گے کہ دیکھو قومی اتحاد کے لئے یہ اتنی قربانی بھی نہیں کرسکتا۔ پس جب آیت کے وہ معنی ہی نہیں جو پادری صاحب نے سمجھے ہیں تو اعتراض خود بخود ہی باطل ہوگیا۔ لیکن بفرض محال اگر یہ ہی سمجھ لیا جائے کہ اس آیت میں آپ کے علم کتابت کے جاننے یا نہ جاننے کا سوال اٹھایا گیا ہے تو بھی پادری صاحب کے اعتراض فضول اور بودے ہیں۔

پہلی دلیل کہ حضرت علیؓ کے ساتھ ایک ہی گھر میں پل کر کس طرح ممکن تھا کہ علیؓ تو تعلیم پائیں اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نہ پائیں کوئی دلیل نہیں اور صرف اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ ریورنڈ ویری صاحب تاریخ سے بالکل ناواقف ہیں۔ جو لوگ تاریخ کا تھوڑا سا بھی علم رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عمر میں قریباً انتیس سال کا فرق تھا اس قدر فرق جن کی عمر میں ہو ان کی نسبت یہ کہنا کہ وہ ایک ساتھ ایک گھر میں تربیت پا رہے تھے ایک ایسی بعید از عقل بات ہے کہ جسے غالباً پادری ویری اور ان کی طرح کے چند لوگ ہی جو تاریخ اسلامی سے ناواقف ہیں صحیح سمجھ سکتے ہوں گے۔

جس وقت حضرت علیؓ پیدا ہوئے ہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شادی حضرت خدیجہؓ سے ہوچکی تھی اور آپ ان کے گھر میں آچکے تھے۔ اور خدیجہؓ نے اپنا سب مال آپ کے سپرد کردیا تھا۔ اور آپ ایک مالدار رئیس کی حیثیت پاچکے تھے۔ پس ایک جگہ دونوں کا تربیت پانا ایک بے دلیل اور خلاف عقل دعویٰ ہے لطف یہ ہے کہ تاریخ ہمیں پادری صاحب کے اس دعویٰ کے بالکل خلاف بتاتی ہے۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ ایک گھر میں پرورش نہیں پائی۔ بلکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے رسول کریم

صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں پرورش پائی تھی کیونکہ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابو طالب کی حالت غربت کو دیکھ کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علیؓ کو بچپن میں ہی اپنے گھر میں لے آئے تھے اور حضرت علیؓ نے آپ ہی کے گھر پر پرورش پائی تھی (الایام فی خلفاء الاسلام ص ۱۹۶) پس اگر حضرت علیؓ نے اوائل عمر میں ہی لکھنا پڑھنا سیکھا تھا تو یہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت کا نتیجہ تھا اور کوئی عقلمند نہیں کہہ سکتا کہ کس طرح ممکن ہے کہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے علی کو تعلیم دلائی تھی تو آپ کے چچا نے آپ کو تعلیم نہ دلائی ہو۔ تعلیم دلانا تو زمانہ کے حالات اور مربی کے اپنے خیالات پر منحصر ہوتا ہے اور یہاں زمانہ بھی مختلف ہے اور مربی بھی الگ الگ ہیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تعلیم کے رائج کرنے کا شوق تھا۔ آپ نے تعلیم دلائی۔ آپ کے دادا اور چچا کو اپنے زمانہ کے دستور کے مطابق شوق نہ تھا انہوں نے کوشش نہ کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شوق تعلیم کا یہ حال تھا کہ بڑی عمر میں کئی صحابہ نے تعلیم حاصل کی۔ حتیٰ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بڑی عمر میں مدینہ جا کر عبرانی سیکھی۔

دوسری دلیل۔ اگر آپ لکھنا نہ جانتے تو اتنے بڑے اہم تجارتی کام کو کس طرح کر سکتے۔ یہ اعتراض بھی یورپ کی موجودہ حالت پر قیاس کر کے کیا گیا ہے۔ ایشیا میں اب بھی ایسی مثالیں پائی جاتی ہیں کہ بغیر تعلیم کے لوگ بڑے بڑے تجارتی کام کرتے ہیں۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ مکہ کے لوگ لکھنے کو زیادہ اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ اور صرف چند لوگ لکھنا پڑھنا جانتے تھے لیکن تاجر سینکڑوں تھے تجارت کے لئے قافلے کے قافلے جایا کرتے تھے۔ پس یہ کہنا کہ جو تاجر جاتے تھے۔ پڑھے ہوئے ہوتے تھے غلط اور قیاس مع الفارق ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت خدیجہؓ نے ایک غلام میسرہ نامی جو پڑھا لکھا تھا۔ آپ کے ساتھ کر دیا تھا۔ پس اس سے یہ دلیل اور بھی کمزور ہو جاتی ہے۔

حضرت معاویہؓ کے متعلق جو کہا گیا ہے کہ ان کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے س اور ب ٹھیک لکھنے کے لئے کہا۔ اول تو یہ حدیث ایسی معتبر نہیں۔ بنو امیہ اور بنو عباس میں اس قدر دشمنی تھی کہ بنو عباس کے زمانہ میں بہت سی ایسی روایات گھڑی گئی ہیں جن میں یہ بتانا مقصود ہے کہ یہ

لوگ علم کی طرف راغب نہ تھے اور کچھ لیاقت وقابلیت نہ رکھتے تھے لیکن اگر یہ حدیث صحیح بھی ہو تو ایک شخص جو ہدایت دینے اور قرآن لکھوانے کا دیر سے عادی ہو چکا ہو۔ اس کے لئے س اور ب کے لئے ہدایت دینا کچھ مشکل نہیں۔ اور نہ اس کے لئے پڑھنے کی شرط ہے۔ بالکل ممکن ہے کسی شخص نے کسی وقت کسی تحریر کے پڑھنے میں دیر کی ہوا۔ آپ نے پوچھا ہو کہ دیر کی کیا وجہ ہے تو اس نے عرض کیا ہو کہ س کے دندانے ملے ہوئے تھے یا ب لمبی نہ تھی اس لئے جلدی پڑھا نہ گیا تو آپ نے سمجھ لیا کہ س کے دندانے کھلے ہونے چاہئیں اور ب لمبی ہونی چاہئے اور اس وجہ سے معاویہ کو آپ نے ہدایت دی ہو تا کہ تحریر مشتبہ نہ ہو جائے۔ ہمارے ملک میں عورتیں روٹی پکاتی ہیں۔ مرد بعض دفعہ انہیں کہہ دیتے ہیں کہ گول دائرہ بناؤ۔ اب کوئی اس سے یہ سمجھ لے کہ شاید ہم بڑے اچھے روٹی پکانے والے ہیں کیونکہ ہم ہدایت دے رہے ہیں تو یہ اس کی غلطی ہو گی۔ پس س کے دندانوں کو کھلا کرنے اور ب کو لمبا کرنے کا حکم دینے سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حضور لکھنا جانتے تھے۔

آپ کے قلم دوات منگانے سے استدلال کرنا بھی غلط ہے۔ کیونکہ قلم دوات حضور ساری عمر منگاتے رہے۔ جب قرآن مجید لکھواتے تھے تو قلم دوات منگواتے تھے۔ اس سے یہ کیونکر ثابت ہو گیا کہ آپ لکھنا بھی جانتے تھے اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ کی آیت بھی کوئی دلیل نہیں کہ آپ لکھنا پڑھنا جانتے تھے کیونکہ قرأت کے معنی صرف لکھا ہوا پڑھنے ہی کے نہیں ہیں بلکہ دوسرے کی بات کو دوہرانے کے لئے بھی یہ لفظ آتا ہے۔ جو شخص قرآن مجید کو زبانی اچھی طرح پڑھتا ہو۔ اس کی نسبت خواہ وہ اندھا ہو۔ عربی زبان میں کہیں گے **هو يُحْسِنُ قِرَأةَ الْقُرْاٰن**۔ پس اقرأ سے لکھا ہوا پڑھنے کا استدلال کرنا کسی صورت میں درست نہیں۔ صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلی قرآنی وحی ہوئی اور حضرت جبرائیل نے آپ سے اقرأ کہا تو اس وقت اس نے کوئی تحریر آپ کے سامنے نہیں رکھی تھی پس اقرأ کے یہ معنی نہیں کہ دیکھ کر پڑھ بلکہ یہ معنی ہیں کہ جو میں کہتا ہوں اسے دہرا۔

ریورنڈ ویری صاحب کا یہ استدلال بھی کہ لوگوں کو امّی کے لفظ سے دھوکا لگ گیا ایک

عجیب استدلال ہے۔حیرت کا مقام ہے کہ ہر وقت آپ کے سامنے رہنے سے تو لوگوں کو یہ معلوم نہ ہوسکا کہ آپ لکھنا پڑھنا جانتے ہیں لیکن ایک امی کے لفظ سے ان کو یقین ہو گیا کہ آپ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے۔سوال یہ ہے کہ آیا آپ کے سامنے والوں کو دھوکا لگا تھا یا بعد میں آنے والوں کو۔اگر کہو سامنے والوں کو تو ان کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہ آپ لکھنا پڑھنا جانتے ہیں کیسے دھوکا لگ سکتا تھا اور اگر کہو بعد والوں کو دھوکا لگا تو سوال یہ ہے کہ دلیل تو یہ دی گئی ہے کہ لوگوں نے یہ خیال کر کے کہ آپ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے اور پھر بھی ایسی کتاب بنالی ہے یہ سمجھ لیا کہ یہ ایک معجزانہ کمال ہے۔اور معجزہ کے طور پر قرآن کریم کو صحابہ کے زمانہ سے پیش کیا جاتا ہے۔پس اگر اس کے معجزہ ہونے کی یہی دلیل تھی تو صحابہ جو جانتے تھے کہ آپ لکھنا پڑھنا جانتے ہیں۔کس دلیل پر اسے معجزہ قرار دیا کرتے تھے۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ عرب تو آپ کی زندگی میں مسلمان ہو گئے تھے اور وہی عربی زبان کے معجزہ کو سمجھ سکتے تھے۔پس ان پر تو اس دھوکے کا کوئی اثر نہ ہوسکتا تھا اور بعد میں آنے والے عجمی عربی زبان کے کمالات کو سوائے شاذونادر کے سمجھ نہیں سکتے تھے۔پس اس دھوکے سے ان پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا تھا پھر اس غلط فہمی سے قرآن کریم کے معجزہ ہونے کا نتیجہ کس نے نکالا۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ امی کے معنی عربی زبان میں ان پڑھ کے بھی ہیں اور اصل معنی ماں سے نسبت رکھنے والے کے ہیں اور اسی وجہ سے اس کے معنی ان پڑھ کے بھی ہیں کیونکہ وہ ویسا ہی رہتا ہے جیسا کہ پیدا ہوا۔اور میرے نزدیک پاکیزہ کے بھی ہیں۔کیونکہ نوزائیدہ بچہ پاک ہوتا ہے اور انہی معنوں میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔

یہودی لوگ جو عربوں کو امی کہہ کر پکارتے تھے تو حقارت کے طور پر ان کے جاہل ہونے کی طرف اشارہ کرنے کے لئے استعمال کرتے تھے۔اب کیا یہ بات کوئی عقلمند تسلیم کرسکتا ہے کہ قرآن کریم میں یہ لفظ اپنے اصلی معنوں میں تو استعمال نہیں ہوا لیکن ان معنوں میں استعمال ہوا ہے جسے ایک دشمن قوم حقارت کے لئے استعمال کیا کرتی تھی۔قرآن کریم کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہی کلام سمجھ لو۔پھر بھی کیا عقل اجازت دیتی ہے کہ آپ اپنی اور اپنی قوم کی نسبت

اس لفظ کو ان تحقیر آمیز معنوں میں استعمال کرتے۔ جو یہودیوں میں رائج تھے۔

پادری صاحب کی آخری دلیل کہ اس زمانہ میں علماء کاتب رکھا کرتے تھے ایک اور شدید تاریخی غلطی ہے۔ پادری صاحب نے عباسی خلافت کے زمانہ کا کوئی واقعہ پڑھ کر اس سے زمانہ جاہلیت پر استدلال کرلیا۔ حالانکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں نہ عرب میں کوئی علماء ہوتے تھے نہ وہ کاتب رکھا کرتے تھے۔ یہ ایک ایسا دعویٰ ہے جس کی تائید میں قومی رواج تو الگ رہا۔ ایک مثال بھی مسیحی مورخ نہیں پیش کرسکے۔ مکہ کے ایک ہی عالم کا ذکر تاریخ میں ہے یعنی ورقہ بن نوفل اور وہ خود لکھا کرتے تھے۔ ان کا کوئی کاتب نہ تھا۔ افسوس ہے کہ مسیحی مصنف اپنے تعصب میں تاریخی حقائق بھی اپنے پاس سے بنالیتے ہیں۔"

(تفسیر کبیر جلد ۴ ص ۵۱ تا ۵۴)

☆

دوسری کتب سے تعلیمات اخذ کرنے کا الزام

انبیاء پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ انہوں نے کلام چرایا ہے اور دوسری کتب سے اخذ کیا ہے۔ یہ الزام آپؐ پر بھی لگایا گیا۔ اس الزام کے جواب میں حضرت مصلح موعودؓ سورۃ الحجر آیت ۱۹ کی تفسیر میں بیان فرماتے ہیں۔

"چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ حملہ سب نبیوں سے زیادہ ہوا ہے۔ مسیحی اور آریہ مصنفین کثرت سے قرآن کریم کی تعلیمات کے ٹکڑے لے کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ ان کے مذاہب کی کتب میں پائے جاتے ہیں۔ لیکن جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے نور کو ظاہر کیا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ جس ٹکڑے کو تم نے لے لیا ہے وہ تو ایک لمبی زنجیر کی کڑی ہے اور وہ ساری زنجیر ایسے وسیع مطالب رکھتی ہے کہ تمہارے خواب وخیال میں بھی موجود نہیں۔ تو ان کی پردہ دری ہوجاتی ہے۔ ایسے ہی حملہ کرنے والوں میں "ینابیع الاسلام" کا مصنف ہے۔ جس نے نہایت دیدہ دلیری سے قرآنی مطالب کے ٹکڑوں کو لے کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ گویا وہ پہلے مذاہب کی کتب سے لئے گئے ہیں۔

حالانکہ وہ ٹکڑے ایک کُل کا حصہ ہیں۔اور ان کو کُل سے الگ کیا ہی نہیں جا سکتا۔اور اس کُل میں وہ اس طرح جُوڑے ہوئے ہیں کہ ان کو کسی اور شئے کا جزو قرار دیا ہی نہیں جا سکتا۔اس کے لئے دیکھو سورۃ فاتحہ کے شروع میں بسم اللہ پر بحث۔جسے مصنف ''ینابیع الاسلام'' نے زردشتی کتب کی چوری قرار دیا ہے۔

دوسرے معنے جو کلام چُرا لینے کے میں نے یہ کئے ہیں کہ الٰہی کلام کے بعض ٹکڑوں کو لے کر غلط طور پر انہیں دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں۔یہ بھی سب نبیوں سے ہوتا چلا آیا ہے۔ہر نبی کے الہام کو اس کے مخالف بگاڑ کر پیش کرتے رہے ہیں تا لوگوں کو ان کے خلاف جوش دلائیں۔ وہ اصل مطلب کو بگاڑ بگاڑ کر ان کے الہامات کو پھیلاتے رہے ہیں اور چوروں کی طرح ان کا ناجائز استعمال کرتے رہے ہیں۔یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء کے نشانات اور معجزات سے مدد کی۔اور ایک طرف تو دلائل سے معترضین کے غلط معنوں کو رد کیا اور دوسری طرف قہری اور قدرت نمائی کے نشانات کے ذریعہ سے اپنے نبیوں کی تائید کر کے ان کے دشمنوں کو ہلاک کروایا۔اور اس طرح اپنے کلام کی حفاظت کی۔

بعض دفعہ نبی کے اتباع بھی دین سے بے بہرہ ہو کر اور بے دینی کا شکار ہو کر دین کو بگاڑ لیتے ہیں اور کلام الٰہی کے معنے کچھ کے کچھ کر دیتے ہیں اور اس کی خوبیوں کو غلط تفسیروں سے چھپا دیتے ہیں۔تب اللہ تعالیٰ اپنے نبی کے اتباع میں سے کسی کو شہابِ ثاقب یا شہاب مبین بنا کر یعنی اپنے تازہ الہام دے کر اور اپنے نشانات سے مؤید کر کے آسمان روحانی سے نازل کرتا ہے تا وہ ایسے شیاطین کی سرکوبی کر کے کلام الٰہی کو پھر اس کی اصل جگہ پر لے آئیں اور اس طرح وہ کلام جو بکھر جانے اور تباہ ہونے کے خطرہ میں پڑ گیا تھا پھر محفوظ ہو جائے اور اس کے صحیح مطالب پھر لوگوں پر آشکار ہو جائیں۔اوپر کے مضمون سے واضح ہو جاتا ہے کہ ان آیات میں ستاروں سے انبیاء مراد ہیں اور شہاب مبین یا شہاب ثاقب سے مراد وقت کا نبی ہے۔کیونکہ ہر نبی ایک ستارہ ہے اور آسمان روحانی کے لئے زینت کا موجب ہے لیکن ہر نبی ہر وقت شہاب کا کام

نہیں دے رہا۔یعنی وہ شیطان جو دین میں رخنہ اندازی کر رہے ہیں ان کی ہلاکت کا موجب نہیں بن رہا۔یہ کام صرف وقت کا نبی کرتا ہے یا وہ نبی کرتا ہے جس کی نبوت زندہ ہو اور جس کی شریعت قابل عمل ہو۔ایسے نبی کی امت میں خرابی پیدا ہو کر اگر دوسرا تابع نبی مبعوث بھی ہو تب بھی چونکہ اس کی قوت قدسیہ اس تابع نبی کے ذریعہ سے کام کر رہی ہوتی ہے وہ شہاب ہی کہلاتا ہے۔چنانچہ اس تشریح کے ماتحت حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ علیہما السلام اور دوسرے سابق انبیاء آسمان روحانی کے ستارے تو ہیں مگر شہاب نہیں کیونکہ اس وقت شیطانوں کے مارنے کے لئے اللہ تعالیٰ انہیں استعمال نہیں کر رہا مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شہاب ہیں کیونکہ ان کے اظلال یہ کام قیامت تک کریں گے۔"

(تفسیر کبیر جلد ۴ صفحہ ۲۲)

باب پنجم

دین میں جبر سے کام لینے

اور

آپؐ کی جنگوں پر اعتراضات

دین میں جبر کا الزام

دین میں جبر سے کام لینے کا بھی الزام آپؐ پر لگایا گیا ہے۔اس کے ردّ میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام ’’مسیح ہندوستان میں‘‘ تحریر فرماتے ہیں:

’’اور یہ ظاہر ہے کہ اسلام نے کبھی جبر کا مسئلہ نہیں سکھایا۔اگر قرآن شریف اور تمام حدیث کی کتابوں اور تاریخ کی کتابوں کو غور سے دیکھا جائے اور جہاں تک انسان کے لئے ممکن ہے تدبر سے پڑھایا سنا جائے تو اس قدر وسعت معلومات کے بعد قطعی یقین کے ساتھ معلوم ہوگا کہ یہ اعتراض کہ گویا اسلام نے دین کو جبراً پھیلانے کے لئے تلوار اٹھائی ہے نہایت بے بنیاد اور قابلِ شرم الزام ہے اور یہ ان لوگوں کا خیال ہے جنہوں نے تعصب سے الگ ہو کر قرآن اور حدیث اور اسلام کی معتبر تاریخوں کو نہیں دیکھا بلکہ جھوٹ اور بہتان لگانے سے پورا پورا کام لیا ہے۔مگر میں جانتا ہوں کہ اب وہ زمانہ قریب آتا جاتا ہے کہ راستی کے بھوکے اور پیاسے ان بہتانوں کی حقیقت پر مطلع ہو جائیں گے۔کیا اس مذہب کو ہم جبر کا مذہب کہہ سکتے ہیں جس کی کتاب قرآن میں صاف طور پر یہ ہدایت ہے کہ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (البقرہ:۲۵۷) یعنی دین میں داخل کرنے کے لئے جبر جائز نہیں۔کیا ہم اس بزرگ نبی کو جبر کا الزام دے سکتے ہیں جس نے مکہ معظّمہ کے تیرہ برس میں اپنے تمام دوستوں کو دن رات یہی نصیحت دی کہ شر کا مقابلہ مت کرو اور صبر کرتے رہو۔ہاں جب دشمنوں کی بدی حد سے گذر گئی اور دین اسلام کے مٹا دینے کے لئے تمام قوموں نے کوشش کی تو اس وقت غیرتِ الٰہی نے تقاضا کیا کہ جو لوگ تلوار اٹھاتے ہیں وہ تلوار ہی سے قتل کئے جائیں۔ورنہ قرآن شریف نے ہرگز جبر کی تعلیم نہیں دی۔اگر جبر کی تعلیم ہوتی تو ہمارے نبی ﷺ کے اصحاب جبر کی تعلیم کی وجہ سے اس لائق نہ ہوتے کہ امتحانوں کے موقع پر سچے ایمانداروں کی طرح صدق دکھلا سکتے۔لیکن ہمارے سید و مولیٰ نبی صلی اللہ کے صحابہ کی وفاداری ایک ایسا امر ہے کہ اس کے اظہار کی ہمیں ضرورت نہیں۔یہ بات کسی پر پوشیدہ نہیں کہ ان سے صدق اور وفاداری کے نمونے اس درجہ پر ظہور میں آئے کہ دوسری قوموں میں

ان کی نظیر ملنا مشکل ہے۔اس وفادار قوم نے تلواروں کے نیچے بھی اپنی وفاداری اور صدق کو نہیں چھوڑا بلکہ اپنے بزرگ اور پاک نبی کی رفاقت میں وہ صدق دکھلایا کہ کبھی انسان میں وہ صدق نہیں آسکتا جب تک ایمان سے اس کا دل اور سینہ منور نہ ہو۔غرض اسلام میں جبر کو دخل نہیں۔ اسلام کی لڑائیاں تین قسم سے باہر نہیں (۱) دفاعی طور پر یعنی بطریق حفاظت خود اختیاری۔(۲) بطور سزا یعنی خون کے عوض میں خون۔(۳) بطور آزادی قائم کرنے کے یعنی بغرض مزاحموں کی قوت توڑنے کے جو مسلمان ہونے پر قتل کرتے تھے۔پس جس حالت میں اسلام میں یہ ہدایت ہی نہیں کہ کسی شخص کو جبر اور قتل کی دھمکی سے دین میں داخل کیا جائے تو پھر کسی خونی مہدی یا خونی مسیح کی انتظار کرنا سراسر لغو اور بیہودہ ہے"۔

(مسیح ہندوستان میں، روحانی خزائن جلد نمبر ۱۵ صفحہ ۱۱،۱۲)

☆

حضرت حکیم مولانا نورالدین صاحبؓ اس الزام کے ردّ میں فرماتے ہیں:

"ہمیں کتب مغازی میں (خواہ کیسی ہی ناقابلِ وثوق کیوں نہ ہوں) کوئی ایک بھی ایسی مثال نظر نہیں آتی کہ آنحضرتؐ نے کسی شخص، کسی خاندان، کسی قبیلے کو بزور شمشیر و اجبار مسلمان کیا ہو۔سر ولیم میور کا فقرہ کیسا صاف صاف بتاتا ہے کہ شہر مدینہ کے ہزاروں مسلمانوں میں سے کوئی ایک شخص بھی بزور و اکراہ اسلام میں داخل نہیں کیا گیا اور مکہ میں بھی آنحضرتؐ کا یہی رویہ اور سلوک رہا بلکہ ان سلاطین عظام (محمود غزنوی، سلطان صلاح الدین، اورنگ زیب) کی محققانہ اور صحیح تواریخ میں کوئی ایک بھی مثال نہیں ملتی کہ کسی شخص کو انہوں نے بالجبر مسلمان کیا ہو۔ہاں ہم ان کے وقت میں غیر قوموں کو بڑے بڑے عہدوں اور مناصب پر ممتاز و سرفراز پاتے ہیں۔پس کیسا بڑا ثبوت ہے کہ اہلِ اسلام نے قطع نظر مقاصدِ ملکی کے اشاعت اسلام کے لئے کبھی تلوار نہیں اُٹھائی۔

آنحضرت ﷺ کے دشمنوں، اسلام کے مخالفوں نے اکثر یہ طعن کیا ہے کہ آپ کا دین

بزور شمشیر شائع ہوا ہے اور تلوار ہی کے زور سے قائم رہا۔ جن مؤرخین عیسائیوں نے آنحضرت ﷺ کا تذکرہ یعنی لائف لکھی ہے آپؐ پر طعن کرنا انہوں نے اپنا شعار کر لیا ہے اور ان کے طعن کی وجہ فقط یہ معلوم ہوتی ہے کہ آپؐ نے اپنے تئیں اور اپنے رُفقاء کو دشمنوں کے حملوں سے بچایا۔ یہ سچ ہے کہ بعض برگزیدگانِ خدا دنیا میں وقتاً فوقتاً پیدا ہوئے ہیں اور سوءِ اتفاق اور گردشِ تقدیر سے خدا کی راہ میں اور اعلائے کلمۃ اللہ کی کوشش میں شہید ہوئے ہیں اور بعض لوگ ایسے بھی گزرے ہیں جنہوں نے خللِ دماغ کی وجہ سے اس امر کا دعویٰ کیا جس کی تکمیل ان سے نہ ہوسکی۔ الغرض مخبوط بھی گزرے ہیں اور مجذوب بھی ہوئے ہیں جنہوں نے اپنی مجنونانہ حرکات کی سزا پائی مگر اس سے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ مثلاً اگر حضرت مسیح مصلوب ہوئے یا مسیلمہ کذاب اپنی کذّابیت اور مجذوبیت کی سزا کو پہنچا تو معاذاللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ان کی تقلید کرنا فرض تھا اور بغیر اپنی رسالت کے اتمام و تکمیل کے شہید ہو جانا لازم تھا؟

قوانینِ اسلام کے موافق ہر قسم کی آزادی مذہبی اور مذہب والوں کو بخشی گئی جو سلطنت اسلام کے مطیع و محکوم تھے۔ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (البقرۃ:۲۵۷) دین میں کوئی اجبار نہیں۔ یہ آیت کھلی دلیل اس امر کی ہے کہ اسلام میں اور اہلِ مذاہب کو آزادی بخشنے اور ان کے ساتھ نیکی کرنے کا حکم ہے۔ (فصل الخطاب ایڈیشن دوم جلد اوّل صفحہ ۸۲،۸۳)

تصدیق براہین احمدیہ میں بیان فرماتے ہیں:

”اسلام کے معنے صُلح کے ساتھ زندگی بسر کرنا، چین سے رہنا۔ کیونکہ یہ لفظ سَلم سے مُشتق ہے جس کے معنے صُلح اور آشتی کے ہیں۔ بعضے پادریوں کی دشمنانہ تحریر نے، مَیں سچ کہتا ہوں، آپ کو دھوکا دیا ہے۔ جبر و اکراہ سے اسلام اور تصدیق قلبی کا حصول ممکن نہیں۔ قرآن کی دوسری سورۃ کو جو مدینہ میں نازل ہوئی اور جس میں جہاد کا حکم ہوا پڑھ لیجئے اور غور کیجئے آپ کا کلام کہاں تک سچ ہے۔ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۙ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ اس میں زبردستی نہیں اور حق و باطل واضح ہو گیا۔

اسلام میں شرط ہے کہ آدمی صدق دل سے باری تعالیٰ کی الوہیّت اور اس کی

معبودیت اور اس کے رسولوں کی رسالت وغیرہ وغیرہ ضروریات دین پر یقین لاوے تب مسلمان کہلاوے اور ظاہر ہے کہ دلی یقین جبر واکراہ سے کبھی ممکن نہیں ہے۔میں بڑی جرأت سے کہتا ہوں کہ حضور علیہ السلام اور ان کے راشد جانشینوں کے زمانے میں کوئی شخص جبر واکراہ سے مسلمان نہیں بنایا گیا بلکہ محمود غزنوی اور عالمگیر کے زمانے میں بھی کوئی شخص عاقل و بالغ جبر سے مسلمان نہیں کیا گیا۔دنیا میں تاریخ موجود ہے۔صحیح تاریخ سے اس الزام کو ثابت کیجئے۔میں نے زمانہ نبویؐ اور خلافتِ راشدہ کے وقت اور محمود، عالمگیر کی تاریخ کو اچھی طرح دیکھ بھال کر یہ دعویٰ کیا ہے۔

زمانہ رسالت مآب میں اور خلافتِ راشدہ میں صلح اور معاہدہ امن کے بعد کُل مذہب کے لوگ مذہبی آزادی حاصل کر لیتے تھے۔خیبر کے یہود، بحرین اور غسان کے عیسائی حضرت خاتم الانبیاء کے اور خلیفہ عمر رضی اللہ عنہ کے وقت شام کے یہود اور عیسائی اسلام کی رعایا تھے اور اپنے مذہبی فرائض کی بجا آوری میں بالکل آزاد تھے۔عالمگیر کے عہد میں بڑے بڑے عہدوں پر ممتاز ہندوستان کے پُرانے باشندے اپنی بُت پرستی پر قائم دکھلائی دیتے۔اگر عالمگیر کی لڑائیوں سے اسلام پر الزام ہے تو عالمگیر نے تانا شاہ سے جو ایک سیّد تھا دکن کے ملک میں جنگ کی۔پھر اپنے مسلمان باپ اور عیسائیوں کے ساتھ جو معاملہ کیا وہ مخفی نہیں۔پس عالمگیر کی جنگ مذہبی جنگ کیوں خیال کی جاتی ہے؟ عالمگیر نے کبھی کسی ہندو کو تلوار اس سبب سے نہیں لگائی کہ وہ ہندو تھا اور کبھی اس نے زبردستی ان کو مسلمان نہیں کیا۔ان کی جو مذہبی عبادت اور رسومات جو قدیم سے چلی آتی تھیں ان کو نہیں روکا۔محمود کی نسبت کہیں تاریخ سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اس نے اشاعتِ اسلام اور دعوتِ اسلام میں ہمت صرف کی ہو۔گجرات میں اتنے دنوں تک پڑا رہا مگر ایک ہندو کو مسلمان نہ بنایا۔اپنے بھائی مسلمان امیر اسمٰعیل سے جنگ کی۔کیا وہ لڑائی بھائی کو مسلمان بنانے کے لئے تھی اور ہند کے حملے تو راجہ جے پال نے خود کرائے جس نے محمود سے لڑنے کی ابتداء کی حالانکہ محمود کا تو یہ منشاء تھا کہ تاتار کے بلاد کو فتح کرے نہ ہند کو۔

(تصدیق براہین احمدیہ صفحہ ۴۷،۴۸)

حضرت خلیفۃ المسیح الاولؓ اس کے ردّ میں ایک دوسرے مقام پر فرماتے ہیں:۔

''بعض لوگ آنحضرت ﷺ کے تلوار پکڑنے پر اعتراض کرتے ہیں۔ یہ ان کی بڑی بیوقوفی ہے۔ ہم پوچھتے ہیں کہ کیا آنحضرت ﷺ کے بالمقابل عرب کے پاس تلوار نہ تھی۔ اعتراض تو تب ہوتا کہ ان کے پاس تلوار نہ ہوتی اور اہلِ اسلام پھر ان پر تلوار چلاتے۔ جب مقابلہ پر بھی تلوار ہے تو پھر اعتراض کس بات کا علاوہ ازیں مسلمان تو قانون کے پابند تھے ان کو حکم تھا کہ عورتیں اور بچے اور بوڑھے قتل نہ کئے جائیں۔ پھل دار درخت نہ جلائے جاویں لیکن مخالف تو کسی ایسے قانون کے پابند نہ تھے۔'' (البدر ۲؍جون ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۶۵)

☆

اس اعتراض کا جواب اور مولانا مودودی کے غلط نظریہ کا ردّ کرتے ہوئے حضرت صاحبزادہ مرزا طاہر احمد صاحب اپنی تصنیف لطیف **''مذہب کے نام پر خون''** میں تحریر فرماتے ہیں:

''ہم آنحضرت ﷺ کے دعویٰ نبوت سے لے کر آپؐ کے وصال تک کی تاریخ اسلام پر ایک متجسسانہ نظر ڈال کر دیکھیں کہ کسی دور میں شاید کسی اور طریق سے جبری طور پر مسلمان بنانے کا کوئی ثبوت ملتا ہو۔ مثلاً ہوسکتا ہے کہ فتوحات کے معاً بعد خوفزدہ مخالفین کو بشدّت اسلام قبول کرنے کی تلقین کی گئی ہو یا ان کی جان بخشی یا آزادی کے لئے مسلمان ہونا بطور شرط کے رکھ دیا گیا ہو۔

حضرت رسول کریم ﷺ کی زندگی کو فتح مکہ تک تین ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

اوّل وہ انتہائی مظلومی کا دور جو دعویٰ نبوت سے لے کر ہجرت تک ممتد ہے اور جسے عرفِ عام میں مکی دور کہا جاتا ہے۔ **دوسرے** وہ مدنی دور جو سنہ ہجرت سے لے کر صلح حدیبیہ تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ دور بھی دراصل ایک سخت مظلومی ہی کا دور ہے کیونکہ اگرچہ مسلمانوں کو دفاع کی اجازت دے دی گئی تھی مگر وہ اپنے دشمن کے مقابل پر کیا بلحاظ تعداد اور کیا بلحاظ جنگی ساز و سامان کوئی بھی حیثیت نہ رکھتے تھے۔ خطۂ عرب میں صرف مدینہ ہی ایک ایسی بستی تھی جہاں مسلمان

جمعیت آباد تھی اور اس ایک بستی پر بھی ان کا مکمل قبضہ نہ تھا بلکہ یہود کے تین متمول قبائل اس کے ایک بڑے حصہ پر قابض تھے اور اوس وخزرج کے تمام افراد بھی حلقہ بگوش اسلام نہ ہوئے تھے۔ ان کی مثال ایسی ہی تھی جیسے ایک مضبوط پہلوان کے مقابل پر ایک کمزور بچہ کو اپنے دفاع کی اجازت دے دی جائے۔وہ پہلوان تو زرہ بکتر میں ملبوس ہو، اس کے ہاتھ میں نیزہ ہو اور تلوار زیب کمر ہو اور ایک قد آور جنگی گھوڑے پر سوار ہو مگر وہ بچہ ننگے پاؤں، نیم عُریاں، ایک ٹوٹی ہوئی تلوار لے کر اس کے مقابل پر نکلے۔سارے عرب کی قوت تو مدینہ میں بسنے والے ان چند مسلمانوں کے مقابل پر بہت ہی زیادہ تھی۔صرف جنگِ بدر ہی میں حملہ آور دشمنوں اور مسلمانوں کی دفاعی فوج کا موازنہ کیا جائے تو وہ کچھ اسی قسم کا موازنہ ہوگا۔پس اس دور کو بھی مَیں سخت مظلومی کا دور ہی کہوں گا۔مانا کہ دفاع کی اجازت مل چکی تھی۔

تیسرا دور وہ دور ہے جو صلح حدیبیہ سے شروع ہو کر فتح مکہ تک پھیلا ہوا ہے۔یہ صلح اور امن کا دور تھا جس میں کفارِ مکہ کی طرف سے مسلمانوں پر کوئی حملہ نہیں کیا گیا تاہم یہود اور بعض دیگر قبائل کی عہد شکنیوں کے نتیجہ میں بعض غزوات وسَرایا وقوع پذیر ہوئے۔

مکی دور

دورِ اول سے متعلق جو تیرہ سال کی انتہائی مظلومی کا عرصہ ہے اسلام کے اشد ترین معاندین بھی یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ اس دور میں اسلام کی طرف سے کسی بھی غرض کے لئے تلوار اٹھائی گئی ہو۔ہاں یہ ضرور تھا کہ دشمنانِ اسلام کی تلواروں کے خوف کے باوجود بہت سے متلاشیانِ حق اسلام میں داخل ہوتے رہے۔پس مکہ میں ہونے والے تمام مسلمان جو بعد میں مہاجرین کہلائے اس الزام سے قطعاً بری ہیں کہ ان کے قبولِ اسلام میں تلوار کو کوئی دخل تھا۔

ہجرت تا صلح حدیبیہ

دوسرے دور سے متعلق اس خیال سے کہ اس دور میں مسلمانوں نے اپنے دفاع کے لئے تلوار اٹھائی۔شاید بعض بدظن طبیعتیں یہ کہہ سکیں کہ ہوسکتا ہے اس دفاعی تلوار کے خوف سے اسلام پھیلا ہو۔مگر اس دور کے اسلام قبول کرنے والوں پر اگر ایک اُچٹتی ہوئی نگاہ بھی ڈالی جائے تو یہ

واہمہ اس طرح معدوم ہو جاتا ہے جیسے طلوعِ آفتاب پر رات کی تاریکی۔

اس دور کے وہ مسلمان جو مدینہ کے باشندے تھے انصار کہلاتے تھے اور یہ تقریباً سارے کے سارے اوس اور خزرج کے قبائل سے تعلق رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ چند افراد نے یہود میں سے اسلام قبول کیا تھا اور کچھ وہ مسلمان تھے جو مدینہ کے علاوہ دوسری بستیوں کے رہنے والے تھے۔ مکہ میں بھی اسلام کی ترویج کلّیتہً بند نہ ہو سکی تھی اور کفارِ مکہ کی شدید ایذاء رسانی کے باوجود وہاں قبولِ اسلام کا سلسلہ ہنوز جاری تھا۔

اس مدنی دور کے مسلمانوں کی بھاری اکثریت انصار پر مشتمل تھی اور انصار کا بلا جبر و اکراہ اسلام قبول کرنا بھی ایک ایسی واضح اور نکھری ہوئی حقیقت ہے کہ دوست تو دوست دشمن بھی یہ کہہ نہیں سکتے کہ انصار کو مہاجرین کی تلوار نے مسلمان بنایا تھا یا ان کے قبولِ اسلام میں تلوار کو ذرّہ بھر بھی کوئی دخل تھا۔ آنحضرت ﷺ نے اوس و خزرج کے ساتھ سرے سے کوئی جنگ ہی نہیں لڑی۔ پس بزورِ شمشیر مسلمان بنانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ یہود میں سے مسلمان ہونے والوں کی تعداد بہت تھوڑی تھی اور ان میں سے بھی کسی پر اس شک کی گنجائش موجود نہیں کہ وہ تلوار کے خوف سے مسلمان ہوا بلکہ ان کا مسلمان ہونا ایسے شدید مخالف اور خطرناک حالات میں ہوا جبکہ خود مسلمانوں کا مستقبل بھی بظاہر سخت مخدوش تھا۔ بیرونی قبائل کے نومسلمین بھی جن کی تعداد انصار کی نسبت بہت ہی تھوڑی تھی قطعاً کسی تلوار کے خوف سے مسلمان نہیں ہوئے بلکہ سخت خطرناک حالت میں اسلام قبول کیا۔

اب رہیں اس دور کی جنگیں اور مہمّات تو ان کے نتیجہ میں تلوار کے ڈر سے مسلمان ہونے والوں کی زیادہ سے زیادہ امکانی تعداد جنگی قیدیوں کی ہی ہو سکتی ہے۔ اس امر کی چھان بین کے لئے ضروری ہے کہ ہم ہجرت سے لے کر صلح حدیبیہ تک کے تمام غزوات و سرایا پر نظر ڈالیں۔ ان غزوات و سرایا کی کُل تعداد پچاس ہے۔

غزوہ یا سَرِیّہ سے بعض لوگ غلطی سے جنگ مراد لے لیتے ہیں لیکن یہ خیال لاعلمی کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے۔ غزوہ سے مراد محض ایسی مہم ہے جس میں رسول اللہ ﷺ بنفسِ نفیس شریک

ہوئے۔خواہ لڑائی ہو، چور ڈاکو کا تعاقب ہو یا دیکھ بھال کے لئے کوئی پارٹی باہر جائے وغیرہ وغیرہ۔اسی طرح سریّہ سے مراد بھی مہمات ہی ہیں۔فرق صرف یہ ہے کہ سریّہ میں رسول اللہ ﷺ شامل نہیں ہوئے۔اس کے علاوہ تبلیغی سفر بھی غزوہ اور سریّہ میں شمار ہوتے ہیں اور کسی صحابیؓ کی انفرادی مہم بھی سریّہ ہی کہلاتی ہے۔چنانچہ اس دور میں کُل پچاس غزوات وسرایا ہوئے جن میں سے جنگ کہلانے کے مستحق صرف تین ہیں: جنگِ اُحد، جنگِ بدر اور جنگِ اَحزاب۔ ان پچاس میں سے 42 میں کوئی اسیر نہیں ہوا۔جن آٹھ میں اسیر ہوئے ان میں سے قابلِ ذکر تعداد جنگ بدر کے اسیروں کی ہے۔کُل 72 اسیر تھے جن میں سے دو پرانے جرموں کی پاداش میں قتل کئے گئے اور باقی سب کو فدیہ لے آزاد کر دیا گیا۔ان میں سے بعض کا فدیہ یہ تھا کہ انصار بچوں کو لکھنا سکھا دیں۔جنگِ اُحد میں کوئی دشمن قید نہیں ہوا نہ ہی جنگِ اَحزاب میں کوئی قید ہوا۔ غزوۂ بنی مصطلق میں سو سے اوپر زن و مرد اسیر ہوئے مگر سب کو بلا معاوضہ و بلا شرط آزاد کر دیا گیا۔اس کے علاوہ چند ایک سریّوں میں ایک ایک دو دو قیدی ہاتھ آئے جو بلا معاوضہ و بلا شرط رِہا کئے گئے۔یہ سب حقائق وہ ہیں جو خود مولانا (مودودی۔ناقل) کو بھی تسلیم ہیں۔مگر مَیں کہتا ہوں کہ اگر بفرضِ محال یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ یہ سب جنگی قیدی بزورِ شمشیر مسلمان بنا لئے گئے تھے تو بھی ان کی تعداد اتنی قلیل اور نا قابلِ ذکر ہے کہ اس کی مہاجرینؓ اور انصارؓ کے سوادِ اعظم کے مقابل پر کوئی بھی حیثیت نہیں اور اس کو بنیاد بنا کر وہ نتیجہ بہر حال مترتّب نہیں ہوتا جو مولانا مودودی نے مرتّب فرمایا ہے۔یہ انہیں زیب نہیں دیتا۔ایسی باتیں تو ان متعصّب معاندین کا شیوہ ہے جو اپنے بُغضِ باطنی سے مجبور ہو کر آنحضرت ﷺ پر الزام تراشی کے لئے تنکوں کے سہارے ڈھونڈا کرتے ہیں۔

تیسرا دور۔صلح حدیبیہ تا فتح مکہ

اس دور میں ہونے والے غزوات وسرایا کی تعداد بائیس[22] ہے۔ان میں سے صرف تین ایسے تھے جن میں جنگی قیدی ہاتھ آئے۔ایک سریّہ حسمی (جمادی الآخر 7ھ) ہے جس میں حضرت زید بن حارثہؓ نے ھنید ڈاکو اور اس کے ساتھی لٹیروں پر چڑھائی کی اور سو لٹیروں کو اسیر

بنایا مگر تو بہ کا وعدہ لے کر چھوڑ دیا۔ اس کے علاوہ سریہ بنوکلاب اور سریہ بشیر بن سعد انصاری میں چند گنتی کے قیدی ہاتھ آئے مگر ان کے حالات نا معلوم ہیں۔

پس اس امر میں کوئی بھی شک نہیں کہ ہجرت سے لے کر فتح مکہ تک ایک بھی قیدی کو بزورِ شمشیر مسلمان بنانے کا ذکر نہیں ملتا اور نہ ہی ان سے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ تلوار نے تو صرف زنگ صاف کیا تھا۔ اس کے بعد اسلام کا رنگ ان کے دلوں پر چڑھایا گیا۔ کیونکہ واقعہ یہ ہے کہ انہیں پھر اسی زنگ آلود شرک کی دنیا میں واپس جانے کی اجازت دے دی گئی۔ پھر کیا مولانا مودودی بتا سکتے ہیں کہ آخر وہ کون لوگ تھے جن کو اپنی تمام اَخلاقی اور روحانی قوّتوں کی ناکامی کے بعد رسول اللہ ﷺ نے نعوذ باللہ تلوار کی چمک دکھلا کر مسلمان بنایا تھا؟ وہ کب پیدا ہوئے؟ کس جگہ کے رہنے والے تھے؟ کہاں سے آئے تھے اور کہاں چلے گئے؟ کیا انہیں زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا؟ اور اگر ان کا وجود محض مولانا کے تصور کی پیداوار ہے اور یقیناً انہیں کے تصور کی پیداوار ہے تو پھر کیوں سیّد ولدِ آدمؑ پر ایسی سنگین اور بے بنیاد الزام تراشی سے نہیں رُکتے۔ اگر آنحضرت ﷺ مذہب میں جبر کے قائل ہوتے تو کیوں نوکِ خنجر پر ان بے بس قیدیوں کو مسلمان نہ بنالیا؟

بنوقینقاع۔ بنونضیر اور بنوقریظہ

مؤخرالذکر دونوں ادوار کے قیدیوں کی تعداد میں یہود قبائل بنوقینقاع، بنونضیر اور بنوقریظہ کے قیدیوں کا شمار شامل نہیں جن کے ساتھ مختلف وقتوں میں مسلمانوں کو مقابلہ کرنا پڑا۔ ان کا مختصر ذکر اب علیحدہ طور پر کیا جا رہا ہے۔

اس حصۂ مضمون کا تعلق محض اس الزام سے ہے کہ نعوذ باللہ آنحضرت ﷺ کا غلبۂ اسلام اَخلاقی قوّتوں کی بجائے تلوار کے زور سے ہوا تھا اور ہم اس وقت صرف اس امر کی چھان بین کر رہے ہیں کہ اس تمام جنگی دور میں کُل کتنے ایسے قیدی ہاتھ آئے تھے جن کو بزور مسلمان بنالیا گیا تھا یا جن کے قبولِ اسلام پر یہ شُبہ بھی پڑ سکتا ہے۔

اب تک جو ہم نے جستجو کی ہے اس سے تو معاملہ بالکل برعکس نظر آ رہا ہے۔ بجائے اس کے

کہ ہم قیدیوں کے گروہ کے گروہ دیکھیں جو مسلمانوں کی تلواروں کے نیچے کانپتے ہوئے لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰـــه پڑھ رہے ہوں نظر یہ آتا ہے کہ مسلمانوں کی تلواروں کی وجہ سے نہیں بلکہ دشمن کی تلواروں کے خوف کے باوجود اہلِ عرب مسلسل مسلمان ہوتے چلے جا رہے ہیں اور ہم دیکھتے یہ ہیں کہ باوجود اس کے کہ مظلوم مسلمان عملاً مدینہ کی ایک چھوٹی سی بستی میں قید ہیں جو اندر سے بھی محفوظ نہیں کیونکہ سارا عرب ان کی جان کا دشمن ہو رہا ہے مگر پھر بھی کچھ سرفروش ایسے ہیں جو مسلمان ہو ہو کر اس جماعت میں شامل ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اگر مخالفت کو ایک آگ سے تشبیہ دی جا سکتی ہے تو مدینہ میں مسلمانوں کا یہ حال تھا کہ ایک بھڑکتی ہوئی آگ کے بیچ گویا ایک نقطہ کی طرح تھے جسے جلا کر بھسم کر دینے کے لئے اس آگ کی شوریدہ لپٹیں بار بار بلند ہوتیں اور اس کی طرف لپکتی تھیں۔ ایک غضبناک اور مشتعل عرب کے درمیان مدینہ کی کمزور مسلمان اقلیت کی فی الواقعہ یہی مثال تھی۔ یہ مَیں اس دور کا ذکر کر رہا ہوں جسے دشمنانِ اسلام آنحضرت ﷺ کی طاقت اور شمشیر کا دور کہتے ہیں۔ پس اس دور میں جو لوگ مسلمان ہو کر مدینہ آ بیٹھتے تھے وہ تو جلانے والوں کو چھوڑ کر جلنے والوں میں شامل ہونے آیا کرتے تھے۔ اکثریت کو چھوڑ کر اقلیت کی طرف بھاگتے تھے اور جو لوگ مدینہ کی طرف ہجرت نہیں کر سکتے تھے اور مخالف ماحول ہی میں رہنے پر مجبور تھے ان کی مثال بھی کچھ اس قسم کی تھی جیسے وحشی بھیڑیوں کے ایک غول میں کوئی بھیڑ یا برضا و رغبت اچانک بھیڑ بن جائے۔ اس بے چارے کے متعلق یہ کہنا کہ ایک چھوٹے سے بھیڑوں کے گلّہ نے جو ایک بھیڑیوں سے بھرے ہوئے جنگل میں گھرا ہوا تھا اسے ڈرا دھمکا کر اور مجبور کر کے بھیڑ بنایا ہے اس سے زیادہ تمسخر آمیز دعویٰ اور کیا ہو سکتا ہے؟

یہود قبائل اور ان کے ''قیدیوں'' کا ذکر مَیں اس لئے الگ کر رہا ہوں کہ اس اندرونی خطرہ کی طرف بھی قارئین کی توجہ مبذول کراؤں جو ہر وقت مدینہ کے اندر سے انہیں لاحق تھا۔ یہ تینوں قبائل ایسے بدعہد، کمینہ فطرت اور دغا باز تھے کہ امن میں بھی مسلمانوں کو چین نہیں لینے دیتے تھے اور جنگ کے زمانے میں تو ان کی شرارتیں غیر مشکوک غدّاری میں بدل جاتی تھیں۔ چنانچہ مسلمانوں سے دوستی کے معاہدہ کے باوجود اس وقت جبکہ مٹھی بھر مسلمان جنگِ بدر میں حملہ

آوروں سے برسرِ پیکار تھے قبیلہ بنو قینقاع نے مدینہ پر بلوہ کیا اور فساد برپا کیا اور سراسر جھوٹی اور سراسیمہ کرنے والی خبریں ان پھیلائیں۔ آج بھی اس جرم کی سزا ہر رحم دل حکومت کے نزدیک قتل کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتی۔ خصوصاً اس معاہدہ کے پیشِ نظر جو آنحضرت ﷺ نے مدنی دور کے پہلے سال ہی میں یہود سمیت مدینہ کی تمام اقوام سے کیا تھا۔ یہ تمام غدّار قتل کئے جانے کے سزاوار تھے ''سیرت ابن ہشام'' جلد اوّل (مطبوعہ مطبع بولاق مصریہ) کے صفحہ 178 پر یہ معاہدہ درج ہے۔ اس معاہدہ کی شرائط میں سے تین یہ تھیں:

☆ ''جنگ کے دنوں میں یہودی مسلمانوں کے ساتھ مصارف میں شریک رہیں گے۔

☆ کوئی شخص اپنے معاہد کے مقابل پر مخالفانہ کارروائی نہیں کرے گا۔

☆ مدینہ کے اندر گشت و خون کرنا اس معاہدہ کرنے والی سب قوموں پر حرام ہوگا۔''

مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ازراہ شفقت محض جلاوطنی کی سزا پر اکتفا فرمائی میرا ایمان ہے کہ اگر یہ خطرہ نہ ہوتا کہ بعد کے حملہ آوروں کے ساتھ مل کر یہ بدعہد یہود مسلمانوں کو اس سے بھی زیادہ نقصان پہنچائیں گے تو آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ان کو یہ سزا بھی نہ دیتے اور بالکل معاف فرما دیتے۔ بہر حال امرِ واقعہ یہ ہے کہ اس قبیلے کو باوجود غلبہ کے بزورِ شمشیر مسلمان نہیں بنایا گیا۔

دوسرا یہودی قبیلہ جسے ارتکابِ بغاوت پر اور اس جرم کی پاداش میں کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو زہر دے کر ہلاک کرنے کی کوشش کی جلاوطن کیا گیا، قبیلہ بنو نضیر تھا۔ چونکہ مسلمانوں کے خلاف شرارتوں میں اور عہد شکنی میں سارا قبیلہ شامل تھا اور رسول اللہ ﷺ کو ہلاک کرنے کی کوشش ایک منظّم سازش کا نتیجہ تھی اس لئے دراصل یہ کینہ تو زبھی عہد شکنی کے نتیجہ میں اور آنحضور ﷺ کے اقدام قتل کے جرم میں انصاف اور خود بائیبل کے قانون کے مطابق بھی جو یہود کا قانون تھا اپنی زندگی کے حق سے محروم ہو چکے تھے لیکن ان کے ساتھ بھی اس لحاظ سے غیر معمولی نرمی کا سلوک کیا گیا اور صرف شہر بدر کرنے پر اکتفا کی گئی اور بہر حال یہ امر یقینی طور پر ثابت ہے کہ وہ تلوار کے زور سے مسلمان نہیں بنائے گئے۔

تیسرا بدقسمت یہودی قبیلہ بنو قریظہ ہے۔ اس قبیلہ کی غداری باقی تمام قبیلوں سے زیادہ سنگین تھی کیونکہ اس وقت جب کہ جنگ احزاب کے موقع پر دل ہلا دینے والے خطرات نے مسلمانوں کو چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا اور مدینہ میں محصور قلیل التعداد مسلمانوں اور کفار کے عظیم حملہ آور لشکر کے درمیان صرف ایک تنگ خندق حائل تھی۔ انہوں نے انتہائی کمینگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے خطرناک بدعہدی کی اور دشمن کے ساتھ خفیہ سازشیں کرنے لگے۔ اگر کوئی شخص آج اس خطرہ کا کچھ تصور باندھنا چاہئے تو اس کا صرف ایک طریق ہے کہ قرآن کریم کی ان آیات کا مطالعہ کرے جن میں خود خدا تعالیٰ اپنے الفاظ میں اس کا نقشہ کھینچتا ہے:۔

اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَ بَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا ۝ هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ زُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا (سورۃ الاحزاب: 11-12)

”جب وہ (دشمن) تمہارے اوپر سے بھی (حملہ کرتے ہوئے) آئے اور نیچے سے بھی (یعنی بلندی کی طرف سے بھی اور ڈھلوان کی طرف سے بھی۔ یا معنوی لحاظ سے جب تمہاری نجات کے سارے دروازے بند ہو گئے۔ زمین بھی تنگ ہو گئی اور آسمان بھی) اور جب آنکھیں پھر گئیں اور دل (مارے دہشت کے) گلوں تک پہنچ گئے اور تم خدا کی نسبت طرح طرح کے گمان کرنے لگے۔ یہ تھا وہ مقام اور وہ وقت جبکہ مومن آزمائے گئے اور شدید زلازل کے جھٹکوں میں انہیں مبتلا کیا گیا“

یعنی جس طرح خوفناک زلزلوں کے جھٹکوں کے وقت عمارتوں کی مضبوطی آزمائی جاتی ہے اور ان عمارتوں کے سوا جن کی دیواروں میں سیسہ پلایا گیا ہو یا فولادی بندھنوں سے مضبوط کی گئی ہوں اور وہ گہری بنیادوں پر مضبوط چٹانوں کی طرح قائم ہوں باقی تمام عمارتیں ان جھٹکوں کا شکار ہو کر پیوندِ خاک ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح مومنین کی اس عمارت کے لئے ایک دل ہلا دینے والی آزمائش کا دن تھا۔ یہ وہ وقت تھا کہ خدا تعالیٰ اہلِ مدینہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”تم (اس شدید خطرہ کو دیکھ کر) اللہ تعالیٰ پر طرح طرح کے گمان کرنے لگ گئے تھے“

پس ایک طرف تو قرآنی بیان کے مطابق بیرونی خطرہ ایسا شدید تھا دوسری طرف اندرونی خطرہ کی یہ حالت تھی کہ منافق کھلّم کھلاّ مومنوں کے حوصلے پست کرنے میں مصروف تھے۔اسی اندرونی خطرہ کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ اگلی آیت میں فرماتا ہے:

وَاِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اِلَّا غُرُوْرًا۝ وَاِذْ قَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ يٰٓاَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوْا (سورۃ الاحزاب:13۔14)

اور جب منافق اور دلوں کے مریض یہ کہہ رہے تھے کہ خدا اور اس کے رسولؐ نے ہم سے دھوکہ کے سوا اور کوئی وعدہ نہیں کیا اور جب ان میں سے ایک گروہ یہ کہتا تھا کہ یثرب کے رہنے والو! (بھاگنے کا تو کیا سوال) تمہارے لئے ٹھہرنے تک کو کوئی جگہ نہیں اس لئے (اپنے پہلے دین میں) پھر جاؤ۔

پس ان ہولناک ابتلاؤں کے وقت جبکہ مسلمانوں کو خطرات نے اوپر سے بھی آلیا تھا اور نیچے سے بھی۔اندر سے بھی اور باہر سے بھی،بنو قریظہ جن کو معاہدہ کی رُو سے مسلمانوں کا ساتھ دینا چاہئے تھا ان کی کمینگی اور غدّاری کا یہ حال تھا کہ حملہ آوروں کے ساتھ مسلمانوں کے خلاف عہدو پیمان کرنے لگے۔چنانچہ اس غدّاری کے نتیجہ میں جنگِ احزاب کے بعد جب مسلمانوں نے ان پر غلبہ پالیا اور سزا کی تعیین کا وقت آیا تو ان بدبختوں نے اپنی قسمت کا فیصلہ **رحمة للعالمین** کے ہاتھ میں چھوڑنے کی بجائے حضرت سعد بن معاذؓ کے ہاتھ میں دے دیا جن کے حکم سے سارے مردتہ تیغ کئے گئے۔یہاں سوال زیرِ بحث یہ ہے کہ کیا ان کو بھی بزورِ شمشیر مسلمان بنایا گیا؟ نہیں! ہرگز نہیں! پھر کیا مَیں مولانا سے یہ پوچھنے میں حق بجانب نہیں ہوں کہ آخر وہ کون لوگ تھے جو اسلام کی تلوار کے اثر سے مسلمان ہوئے؟

مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ تاریخ کے سبق کے دوران یونیورسٹی آف لنڈن کے تاریخ کے ایک متعصب پروفیسر نے اسی واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ظلم کا الزام لگایا۔مَیں اور میرے ایک عزیز دوست میر محمود احمد صاحب ناصر اسے برداشت نہ کرسکے اور

جواب دینے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔اس پر اس پروفیسر نے کہا یہاں بحث کا وقت نہیں تم کو جو کچھ کہنا ہو میرے کمرہ میں آ کر کہنا۔مگر ہم نے اسے یہ جواب دیا کہ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ ہمارے آقاؐ پر حملہ تو تم بر سرِ عام کرو اور جواب ہم علیحدگی میں دیں؟ چنانچہ جب ہم نے اس بارہ میں اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کی تو ایک یہودی طالب علم اُٹھ کھڑا ہوا اور اس نے یہ اعلان کیا کہ "اگرچہ میں یہودی ہوں اور سب سے زیادہ مجھے اس بات پر غصہ ہونا چاہئے تھا مگر یہ بحث سننے کے بعد مَیں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ محمد (ﷺ) پر اس واقعہ سے ہرگز کوئی حرف نہیں آتا کیونکہ اوّل تو یہ فیصلہ ان کا نہیں تھا دوسرے سعد بن معاذؓ کا فیصلہ بھی میرے نزدیک درست تھا اور وہ غدّار اسی لائق تھے کہ تہ تیغ کئے جاتے۔"

آج تک اس شریف النفس یہودی کے الفاظ میرے کانوں میں گونج رہے ہیں اور مَیں تا دمِ مرگ اس کا ممنونِ احسان رہوں گا اور ہمیشہ دل سے اس کے لئے دعا نکلتی رہے گی کہ اس نے انصاف کو ہاتھ سے نہ چھوڑا اور غیر معمولی شرافت اور جرأت کا اظہار کرتے ہوئے میرے محبوب آقاؐ کی بریّت کی۔مگر جب میری نظر ان لوگوں کی طرف لوٹتی ہے جن کے نزدیک بانیٔ اسلام کے ایک ہاتھ میں تلوار تھی اور دوسرے میں قرآن تھا تو سینہ میں دل خون ہونے لگتا ہے۔

فتح مکہ

صلح حدیبیہ تک کا دور ختم ہوا اور فتح مکہ کا دن آ گیا جو دراصل حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذات پر سے ہر تشدّد کے الزام کو دور کرنے کا دن تھا۔اس دن آنحضورؐ نے کفّارِ مکہ پر ایک عظیم فتح حاصل کی مگر کسی ایک شخص کو بھی تلوار کے زور سے مسلمان نہ بنایا۔پس میں اسی دن کا واسطہ دے کر یہ الزام لگانے والوں سے پوچھتا ہوں کہ جب وہ نبیوں کا سردارؐ دس ہزار قدّوسیوں کے ساتھ فاران کی چوٹیوں سے جلوہ گر ہوا اور مکّے کو اس کی شوکت اور جلال نے ڈھانپ لیا تو وہ جبر کی تلوار کیوں زیرِ نیام چلی گئی۔کیوں فتح مکّہ کے دن جب مشرکین مکہ کی گردنیں اس رسولؐ کے ہاتھ میں دی گئیں۔جب تلواروں کے سائے تلے سرکشوں کے سرخم

کرنے کا وقت آیا اور نوکِ خنجر پر ایمان قلوب میں اتارنے کی مبارک گھڑی آ پہنچی۔ وہ ساعت جب کہ مسلمان فاتحین کے خوف سے عرب سرداروں کے جسم لرزاں تھے اور سینوں میں دل کانپ رہے تھے۔ جب مکہ کی بستی ایک دھڑکتا ہوا دل بن گئی تھی تو کیوں اس فاتحین کے سردار نے شمشیر کی قوت سے ان کو مسلمان نہیں بنالیا؟ اگر ایسا نہیں کیا اور یقیناً نہیں کیا تو پھر حیرت ہے کہ کس دل کے ساتھ یہ لوگ اس سب محبوبوں کے محبوب اور اس بے مثال دلوں کے فتح کرنے والے سے متعلق یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اس کی ہر قوتِ جاذبہ کی ناکامی کے بعد تلوار کی قوت کارگر ثابت ہوئی۔ مولانا کے دل کا حال مَیں نہیں جانتا کہ یہ لکھتے ہوئے اس پر کیا گزری تھی یا کیا گزر سکتی تھی مگر اے کاش! کہ ان کا قلم پھٹ جاتا اور سیاہی خون ہو جاتی۔

فتح مکہ کا دن تو وہ دن ہے کہ جو ابدالآباد تک آنحضرت ﷺ کی پاک ذات سے جبر و تشدّد کے الزام کی نفی کرتا رہے گا۔ اس دن کی گواہی ایک ایسی پُرشوکت اور بلند بانگ گواہی ہے کہ کتنی ہی صدیاں گزر گئیں مگر آج بھی مؤرخین کے کان اس کو سنتے اور ان کے دل اس پر ایمان لاتے ہیں۔ یہ گواہی تو عیسائیوں نے بھی سنی اور اہلِ ہنود نے بھی اسے قبول کیا۔ پھر حیرت ہے کہ مولانا کے کان اس بے مثال دن کی آواز سننے سے کیوں محروم رہ گئے؟ اسی دن کی گواہی کا ذکر کرتے ہوئے ایک عیسائی مستشرق مسٹر سٹینلے لین پول لکھتے ہیں:

''اب وقت تھا کہ پیغمبر (ﷺ ۔ناقل) خونخوارانہ فطرت کا اظہار کرتے۔ آپ کے قدیم ایذا دہندے آپ کے قدموں میں آپڑے ہیں۔ کیا آپ اس وقت اپنے بے رحمانہ طریقہ سے ان کو پامال کریں گے؟ سخت عقوبت میں گرفتار کریں گے یا ان سے انتقام لیں گے؟

یہ وقت اس شخص کے اپنے اصلی روپ میں ظاہر ہونے کا ہے۔ اس وقت ہم ایسے مظالم کے پیش آنے کے متوقع ہیں جن کے سننے سے رونگٹے کھڑے ہوں اور جن کا خیال کرکے اگر ہم پہلے ہی سے نفرین وملامت کا شور مچائیں تو بجا ہے۔

مگر یہ کیا معاملہ ہے؟ کیا بازاروں میں کوئی خون ریزی نہیں ہوئی؟ ہزاروں مقتولوں کی لاشیں کہاں ہیں؟ واقعات سخت اور بے درد ہوتے ہیں (کسی کی رعایت نہیں کرتے)

اور یہ ایک واقعی بات ہے کہ جس دن آنحضرت (ﷺ۔ناقل) کو اپنے دشمنوں پر فتح حاصل ہوئی وہی دن آپ کو اپنے نفس پر سب سے زیادہ عالی شان فتح حاصل کرنے کا دن بھی تھا۔قریش نے سالہا سال تک جو کچھ رنج اور صدمے دیئے تھے اور بے رحمانہ تحقیر وتذلیل کی مصیبت آپ پر ڈالی تھی آپ نے کشادہ دلی کے **ساتھ ان تمام باتوں سے درگزر کی** اور مکہ کے تمام باشندوں کو **ایک عام معافی نامہ** دے دیا۔"　　　("انتخاب قرآن' مقدمہ صفحہ ۶۷)

یا شاید ہمارے بعض علماء کے دل کی آواز یہ کہے کہ مکہ کے تمام باشندوں کو ایک عام معافی نامہ دے دیا اور اہلِ مکہ کو بزور مسلمان بنانے کا ایک عظیم الشان موقع خود اپنے ہاتھوں سے کھو دیا ......مگر واقعات سخت اور بے درد ہوتے ہیں اور کسی کی رعایت نہیں کرتے ہاں مگر واقعات سے آنکھیں موند لی جائیں تو......؟

اور واقعات سے آنکھیں موندی جا رہی ہیں۔آنحضرت ﷺ کی سراسر دفاعی جنگوں کو جارحیت اور تشدّد کی جنگیں قرار دیا جا رہا ہے اور حد یہ ہے کہ یہ بے بنیاد الزام واضح تاریخی حقائق کے باوجود لگایا جاتا ہے۔

فتح مکہ سے لے کر وصالِ نبویؐ تک

ممکن ہے کوئی یہاں پہنچ کر اس وہم میں مبتلا ہو جائے کہ جبری مسلمان کہیں فتح مکہ کے بعد کی جنگوں میں نہ بنائے گئے ہوں مگر فتح مکہ کے بعد کی جنگوں پر ایک نظر ڈالنے سے ہی اس وہم کی قلعی کُھل جاتی ہے جو غالبؔ کے اس شعر کے مصداق ہے کہ:

تھی خبر گرم کہ غالب کے اُڑیں گے پُرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

چنانچہ فتح مکہ کے بعد کے غزوات وسرایا کے اعداد وشمار یہ ہیں:

فتح مکہ کے بعد ایسے سرایا جن میں نہ کوئی لڑائی ہوئی نہ کوئی اسیر ہوا، نہ مالِ غنیمت ہاتھ آیا=۳

ایسے غزوات یا سرایا جن جنگی قیدی ہاتھ آئے=۴

جنگی قیدیوں کی کل تعداد=۶۰۰۰+۶۲+اسیرانِ بنو طے+۱

اس دور میں اسیروں کی تعداد گزشتہ سب ادوار سے غیر معمولی طور پر زیادہ ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ صرف ایک جنگِ حنین ہی میں چھ ہزار کی تعداد میں دشمن اسیر ہوئے۔ آیئے ہم دیکھیں کہ ان اسیروں سے رحمۃ للعالمینؐ نے کیا سلوک کیا۔ کیا سب تہِ تیغ کر دیئے گئے یا نوکِ خنجر پر مسلمان بنا لئے گئے؟ نہیں ایک بھی نہیں بلکہ بلا استثناء سارے کے سارے غیر مشروط طور پر رہا کر دیئے گئے۔ جنگِ حنین کے چھ ہزار اسیروں کو رحمۃ اللعالمینؐ نے نہ صرف غیر مشروط طور پر رہا فرما دیا بلکہ ان میں سے بعض کو خلعتیں بھی عطا فرمائیں اور انعام و اکرام سے نوازا۔ رحم و کرم کی حد یہ ہے کہ ان میں سے بعض قیدیوں کا فدیہ بھی اپنی جیب سے ادا فرمایا۔ اس قسم کے رحم و کرم کا سلوک بنی طے کے اسیران سے کیا اور حاتم کی بیٹی کو تو غیر معمولی اکرام کے ساتھ رخصت فرمایا۔

اس کے علاوہ اس دور میں سریۂ عُیَینہ بن حصین میں قبیلہ بنو تمیم کے باسٹھ[62] اسیر مدینہ لائے گئے مگر اس قبیلہ کے سردار آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور رحم کی درخواست کی جس پر اس رحمِ مجسّم نے ان سب کو رہا فرما دیا۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ہمیشہ جو سلوک جنگی قیدیوں سے روا رکھا وہ نہایت کریمانہ اور فیاضانہ تھا۔ ظالم تو ظلم کا بہانہ ڈھونڈا کرتا ہے مگر آپؐ رحم و کرم کا بہانہ ڈھونڈتے نظر آتے ہیں۔ بنو ہَوازِن کے قیدیوں کو معاف کرنے کا واقعہ بھی عجیب ہے اور اسی ایک واقعہ ہی سے مفتوحین کے بارہ میں آپؐ کے جذبات اور طرزِ فکر کا پوری طرح اندازہ ہو جاتا ہے۔ ان قیدیوں کے بارہ میں رحم کی درخواست کی غرض سے بنو ہَوازِن کا ایک وفد آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپؐ کو حضرت حلیمہ دائی کا واسطہ دے کر جو اسی قبیلہ کی تھیں آپؐ سے معافی کا طلبگار ہوا۔ اس وقت آپؐ نے ان سے یہ نہیں پوچھا کہ اب ہار کھا جانے کے بعد تمہیں اپنے قبیلہ کی وہ دائی یاد آ گئی جس نے مجھے دودھ پلایا تھا مگر جب تم مکہ پر حملہ کی تیاریاں کر رہے تھے یا جب حُنین کی وادی میں مجھ پر اور میرے ساتھ چند نرغے میں آئے ہوئے فدائیوں پر تیروں کی بارش برسا رہے تھے تو اس وقت کیا تمہیں یاد نہ آیا کہ یہ تو وہی معصوم یتیم بچہ ہے جس نے ہمارے قبیلہ میں پرورش پائی تھی؟ نہیں! آپؐ نے ایسا کوئی سوال نہیں کیا بلکہ فرمایا کہ جس قدر قیدی میرے اور

بنو عبدالمطلب کے حصہ کے ہیں ان کو لے جاؤ وہ آزاد ہیں۔ یہ چند کلمات آپؐ کے بے مثال خُلق اور گہری فراست پر وسیع روشنی ڈالتے ہیں۔ اوّل تو ایک دور کی رضاعی ماں کی یاد میں اس قبیلہ کے بعد میں آنے والے ظالموں کو جو اپنی فطرت سے تو آپؐ کو ہلاک کرنے کی پوری کوشش کر چکے تھے اس طرح معاف فرما دینا ایک بے حد پیارا اور کریمانہ فعل ہے۔ دوسرے آپؐ کا یہ فرمانا کہ صرف بنو عبدالمطلب کے حصہ کے قیدی آزاد ہیں آپؐ کی فراست اور خُلق کے بعض اور پہلوؤں پر بھی عجیب روشنی ڈالتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دل تو یہی چاہتا تھا کہ سب کو معاف کر کے آزاد کر دوں مگر چونکہ حضرت حلیمہ کی رضاعت کا تعلق محض آپ کی ذات یا زیادہ سے زیادہ اس واسطہ سے آپؐ کے خاندان کے ساتھ ہو سکتا تھا اس لئے آپؐ نے یہ پسند نہ فرمایا کہ ایک ذاتی تعلق کی بنا پر باقی مسلمانوں کو بھی اس احسان کا پابند کر دوں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ آپؐ کے رحم و کرم کی خصلت تمام انسانوں میں اپنی وسعت اور گہرائی کے لحاظ سے بے مثال تھی لیکن غیر متوازن نہ تھی۔ آپؐ ایک ایسے رحم دل انسان کی طرح نہ تھے جو اپنے رحم و کرم کے جوش میں دوسروں کے حقوق بھی لوگوں کو بخش دیتا ہے۔ چنانچہ آپؐ نے ایسا نہ کیا بلکہ جو طریق اختیار کیا وہ جود و کرم کے آسمان پر ہمیشہ چاند ستاروں کی طرح چمکتا رہے گا۔ آپؐ جانتے تھے کہ اگر اس بارہ میں لوگوں سے مشورہ کرنے کی بجائے مَیں نے قیدیوں کو آزاد کرنے کی ایک عملی مثال قائم کر دی تو کسی مسلمان گھر میں کوئی قیدی نہ رہے گا۔ پس آپؐ نے ایسا ہی کیا اور جب آپؐ کے اس فرمان کی خبر عُشّاق کے کانوں تک پہنچی کہ "میرے اور بنو عبدالمطلب کے حصہ کے سب قیدی آزاد ہیں" تو انہوں نے بے اختیار عرض کی کہ اے ہمارے محبوب "مَا کَانَ لَنَا فَھُوَ لِرَسُوْلِ اللّٰہِ جو کچھ ہمارا ہے وہ تو سب رسول اللہ ہی کا ہے" اور یہ کہتے ہوئے ان قیدیوں کو آزاد کرنے میں وہ ایک دوسرے پر سبقت لے جانے لگے اور فضا نعرہ ہائے جنگ اور زخمیوں کی چیخ و پکار کی بجائے آزادی کے ترانوں سے گونج اُٹھی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بے حد رحیم و کریم تھے۔ بنو طَی کے قیدیوں کی آزادی بھی آپؐ کے خُلق کے ایک خاص پہلو پر روشنی ڈالتی ہے۔ ان قیدیوں کو صرف اس وجہ سے بغیر کسی

معاوضہ کے آزاد کر دیا گیا کہ عرب کے ایک مشہور سخی حاتم طائی کی بیٹی جو خود ان قیدیوں میں شریک تھی اپنی آزادی صرف اس طرح پر قبول کرنے کے لئے تیار تھی کہ باقی قیدیوں کو بھی ساتھ رہا کیا جائے چنانچہ ایک گزرے ہوئے حاتم کی سخاوت کے نام پر اس کی قوم کے شریروں کو رہا کر دیا گیا اور اس موقع پر بنو عبد المطلب کے قیدیوں کی کوئی شرط نہ رکھی کیونکہ یہاں جس بنا پر قیدیوں کو رہا کیا جا رہا تھا وہ سارے عرب میں مُشترک تھی۔ حاتم کی سخاوت ایک قومی سرمایہ تھی جس پر فخر کرنے میں سارا عرب شریک تھا۔

ان حالات پر جب نظر پڑتی ہے تو بے اختیار دل آپؐ پر درود بھیجنے لگتا ہے اور کسی طرح یقین نہیں آتا کہ اس سراپا رحمت وشفقت اور سب کریموں سے بڑھ کر کریم نبیؐ پر بھی کوئی یہ الزام لگا سکتا ہے کہ آپؐ کی کوئی ایک جنگ بھی اسلام پھیلانے کی غرض سے تھی یا اس غرض سے تھی کہ تلوار کے پھل سے دلوں کی زمین میں ہل چلا کر اسلام کا بیج بویا جائے۔ نظریات کی اشاعت کے یہ تصوّرات تو کارل مارکس، لینن اور سٹالن کے تصوّرات تھے۔ پھر مولانا کیوں نہیں سوچتے کہ اس اِشترا کی سطح سے بہت بالا تھے اس سیدِ ولدِ آدمؑ کے خیالات، جس کی اُڑان سِدرۃ المنتہیٰ کی بلندیوں تک تھی اور جو تمام مخلوقات میں سب سے اعلیٰ اور ارفع مقام تک جا پہنچا تھا۔"

("مذہب کے نام پر خون" صفحہ 55 تا 71۔ از حضرت مرزا طاہر احمد خلیفۃ المسیح الرابع)

آپ ﷺ کی جنگوں پر بے جا اعتراضات

عیسائی پادری صاحبان نے بالخصوص آنحضورؐ کی جنگوں پر اعتراض اٹھایا ہے اس کا جواب دیتے ہوئے حضرت مسیح موعود علیہ السلام اپنی کتاب آریہ دھرم میں فرماتے ہیں:۔

ایک بڑا اعتراض جس سے بڑھ کر شاید ان کی نظر میں اور کوئی اعتراض ہمارے نبی پر نہیں ہے وہ لڑائیاں ہیں جو آنحضرت ﷺ کو باذن اللہ ان کفار سے کرنی پڑیں جنہوں نے آنحضرت ﷺ پر مکہ میں تیرہ برس تک انواع اقسام کے ظلم کئے اور ہر یک طریق سے ستایا اور دکھ دیا اور پھر قتل کا ارادہ کیا جس سے آنحضرت ﷺ کو معہ اپنے اصحاب کے مکہ چھوڑنا پڑا اور پھر بھی باز نہ آئے اور تعاقب کیا اور ہر یک بے ادبی اور تکذیب کا حصہ لیا اور جو مکہ میں ضعفاء مسلمانوں میں سے رہ گئے تھے ان کو غایت درجہ دکھ دینا شروع کیا لہذا وہ لوگ خدا تعالیٰ کی نظر میں اپنے ظالمانہ کاموں کی وجہ سے اس لائق ٹھہر گئے کہ ان پر موافق سنت قدیمہ الٰہیہ کے کوئی عذاب نازل ہو اور اس عذاب کی وہ قومیں بھی سزاوار تھیں جنہوں نے مکہ والوں کو مدد دی اور نیز وہ قومیں بھی جنہوں نے اپنے طور سے ایذا اور تکذیب کو انتہا تک پہنچایا۔ اور اپنی طاقتوں سے اسلام کی اشاعت سے مانع آئے سو جنہوں نے اسلام پر تلواریں اٹھائیں وہ اپنی شوخیوں کی وجہ سے تلواروں سے ہی ہلاک کئے گئے اب اس صورت کی لڑائیوں پر اعتراض کرنا اور حضرت موسیٰ اور دوسرے اسرائیلی نبیوں کی ان لڑائیوں کو بھلا دینا جن میں لاکھوں شیر خوار بچے قتل کئے گئے کیا یہ دیانت کا طریق ہے یا ناحق کی شرارت اور خیانت اور فساد انگیزی ہے۔ اس کے جواب میں حضرات عیسائی یہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کی لڑائیوں میں بہت ہی نرمی پائی جاتی ہے کہ اسلام لانے پر چھوڑا جاتا تھا اور شیر خوار بچوں کو قتل نہیں کیا۔ اور نہ عورتوں کو اور نہ بڈھوں کو اور نہ فقیروں اور مسافروں کو مارا۔ اور نہ عیسائیوں اور یہودیوں کے گرجاؤں کو مسمار کیا۔ لیکن اسرائیلی نبیوں نے ان سب باتوں کو کیا۔ یہاں تک کہ تین لاکھ سے بھی کچھ زیادہ شیر خوار بچے قتل کئے گئے گویا حضرات پادریوں کی نظر میں اس نرمی کی وجہ سے اسلام کی لڑائیاں قابل اعتراض ٹھہریں

کہ ان میں وہ سختی نہیں جو حضرت موسیٰ اور دوسرے اسرائیلی نبیوں کی لڑائیوں میں تھی اگر اس درجہ کی سختی پر یہ لڑائیاں بھی ہوئیں تو قبول کر لیتے کہ درحقیقت یہ بھی خدا تعالیٰ کی طرف سے ہیں۔ اب ہر یک عقلمند کے سوچنے کے لائق ہے کہ کیا یہ جواب ایمانداری کا جواب ہے حالانکہ آپ ہی کہتے ہیں کہ خدا رحم ہے اور اس کی سزا رحم سے خالی نہیں۔ پھر جب موسیٰ کی لڑائیاں باوجود اس سختی کے قبول کی گئیں اور خدا تعالیٰ کیطرف سے ٹھہریں تو کیوں اور کیا وجہ کہ یہ لڑائیاں جو الٰہی رحم کی خوشبو ساتھ رکھتی ہیں خدا تعالیٰ کی طرف سے نہ ہوئیں اور ایسے لوگ کہ ان باتوں کو بھی خدا تعالیٰ کے احکام سمجھتے ہیں کہ شیر خوار بچے ان کی ماؤں کے سامنے ٹکڑے ٹکڑے کئے جائیں اور ماؤں کو ان کے بچوں کے سامنے بے رحمی سے مارا جاوے وہ کیوں ان لڑائیوں کو خدا تعالیٰ کی طرف سے نہ سمجھیں جن میں یہ شرط ہے کہ پہلے مظلوم ہو کر پھر ظالم کا مقابلہ کرو۔

(آریہ دھرم، روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۸۱ تا ۸۳ حاشیہ)

☆

حضرت مسیح موعود علیہ السلام آنحضورؐ پر آپ کی جنگوں کے حوالہ سے پادریوں کے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے انجام آتھم میں فرماتے ہیں:۔

’’بعض پلید فطرت پادریوں نے اپنی تالیفات میں اس طرح ہمارے سید و مولیٰ خاتم الانبیا ﷺ کی تصویر کھینچ کر دکھلائی ہے کہ گویا وہ ایک ایسا شخص ہے جس کی خونی صورت ہے اور غصہ سے بھرا ہوا کھڑا ہے اور ایک ننگی تلوار ہاتھ میں ہے اور بعض غریب عیسائیوں وغیرہ کو ٹکڑہ ٹکڑہ کرنا چاہتا ہے لیکن اگر ان لوگوں کو کچھ انصاف اور ایمان میں سے حصہ ہوتا تو اس تصویر سے پہلے موسیٰ کی تصویر کھینچ کر دکھلاتے اور اس طرح کھینچتے کہ گویا ایک نہایت سخت دل اور بے رحم انسان ہاتھ میں تلوار لے کر شیر خوار بچوں کو ان کی ماؤں کے سامنے ٹکڑے ٹکڑے کر رہا ہے اور ایسا ہی یشوع بن نون کی تصویر پیش کرتے اور اس تصویر میں یہ دکھلاتے کہ گویا اس نے لاکھوں بے گناہ بچوں کو ان کی ماؤں کے سمیت ٹکڑے ٹکڑے کر کے میدان میں پھینک دیا ہے۔

اور چونکہ ان کے عقیدہ کے موافق یسوع خدا ہے اور یہ ساری بے رحمی کی کارروائیاں اس کے حکم سے ہوئی ہیں اور وہ مجسم خدا ہے جیسا کہ بیان ہو چکا تو اس صورت میں نہایت ضروری تھا کہ سب سے پہلے اس کی تصویر کھینچ کر اس کے ہاتھ میں کم سے کم تین تلواریں دی جاتیں۔ پہلی وہ تلوار جو اس نے موسیٰ کو دی اور بے گناہ شیر خوار بچوں کو قتل کروایا۔ دوسری وہ تلوار جو یشوع بن نون کو دی۔ تیسری وہ تلوار جو داؤد کو دی۔ افسوس! کہ اس حق پوش قوم نے بڑے بڑے ظلموں پر کمر باندھ رکھی ہے۔

اگر تلوار کے ذریعہ سے خدا کا عذاب نازل ہونا خدا کی صفات کے مخالف ہے تو کیوں نہ یہ اعتراض اول موسیٰ سے ہی شروع کیا جائے جس نے قوموں کو قتل کر کے خون کی نہریں بہا دیں اور کسی کی توبہ کو بھی قبول نہ کیا۔ قرآنی جنگوں نے تو توبہ کا دروازہ بھی کھلا رکھا جو عین قانون قدرت اور خدا کے رحم کے موافق ہے کیونکہ اب بھی جب خدا تعالیٰ طاعون اور ہیضہ وغیرہ سے اپنا عذاب دنیا پر نازل کرتا ہے تو ساتھ ہی طبیبوں کو ایسی ایسی بوٹیاں اور تدبیروں کا بھی علم دے دیتا ہے جس سے اس آتش وبا کا انسداد ہو سکے سو یہ موسیٰ کے طریق جنگ پر اعتراض ہے کہ اس میں قانون قدرت کے موافق کوئی طریق بچاؤ قائم نہیں کیا گیا۔ ہاں بعض بعض جگہ قائم بھی کیا گیا ہے مگر کلّی طور پر نہیں الغرض جبکہ یہ سنت اللہ یعنی تلوار سے ظالم منکروں کو ہلاک کرنا قدیم سے چلی آتی ہے تو قرآن شریف پر کیوں خصوصیت کے ساتھ اعتراض کیا جاتا ہے۔ کیا موسیٰ کے زمانہ میں خدا کوئی اور تھا اور اسلام میں کوئی اور ہو گیا یا خدا کو اس وقت لڑائیاں پیاری لگتی تھیں اور اب بُری دکھائی دیتی ہیں۔

اور یہ بھی فرق یاد رہے کہ اسلام نے صرف ان لوگوں کے مقابل پر تلوار اٹھانا حکم فرمایا ہے کہ جو اول آپ تلوار اٹھائیں اور انہیں کو قتل کرنے کا حکم دیا ہے جو اول آپ قتل کریں۔ یہ حکم ہرگز نہیں دیا کہ تم ایک کافر بادشاہ کے تحت میں ہو کر اور اس کے عدل اور انصاف سے فائدہ اٹھا کر پھر اسی پر باغیانہ حملہ کرو۔ قرآن کے رو سے یہ بدمعاشوں کا طریق ہے نہ نیکوں کا۔ لیکن توریت نے یہ فرق کسی جگہ کھول کر بیان نہیں فرمایا اس سے ظاہر ہے کہ قرآن شریف اپنے جلالی

اور جمالی احکام میں اس خط مستقیم عدل اور انصاف اور رحم اور احسان پر چلتا ہے جس کی نظیر دنیا میں کسی کتاب میں موجود نہیں مگر اندھے دشمن پھر بھی اعتراض کرتے ہیں کیونکہ ان کی فطرت روشنی سے عداوت اور ظلمت سے محبت رکھتی ہے۔

اب اس اشتہار کی تحریر سے یہ غرض ہے کہ ہم نے بڑے لمبے تجربہ سے آزما لیا ہے کہ یہ لوگ بار بار ملزم اور لاجواب ہو کر پھر بھی نیش زنی سے باز نہیں آتے اور اس شخص کو تمام عیبوں سے مبرّا سمجھتے ہیں جس نے خود اقرار کیا کہ **"میں نیک نہیں"** اور جس نے شراب خواری اور قمار بازی اور کھلے طور پر دوسروں کی عورتوں کو دیکھنا جائز رکھ کر بلکہ آپ ایک بدکار کنجری سے اپنے سر پر حرام کی کمائی کا تیل ڈلوا کر اور اس کو یہ موقعہ دے کر کہ وہ اس کے بدن سے بدن لگاوے اپنی تمام اُمت کو اجازت دے دی کہ ان باتوں میں سے کوئی بات بھی حرام نہیں۔ سو ایسے شخص کو تو انہوں نے خدا بنا لیا مگر خدا کے مقدس نبیوں کو جن کی زندگی محض خدا کے لئے تھی اور جو تقویٰ کی باریک راہوں کو سکھا گئے برا کہنا اور گالیاں دینا شروع کر دیا چنانچہ اب تک یہ لوگ باز نہیں آئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو میں نہایت ناپاک اور رنجدہ تھیٹر نکالتے ہیں اور نہایت بری تصویروں میں اس پاک وجود کو دکھلاتے ہیں" (انجام آتھم، روحانی خزائن جلد نمبر ۱۱ صفحہ ۳۶ تا ۳۸)

☆

سراج الدین عیسائی نے یہ اعتراض بھی پیش کیا کہ آپؐ کو **مکہ میں چونکہ جمعیت حاصل نہیں تھی اس لئے مدینہ آ کر لڑائیاں کیں**۔ اس کے جواب میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام تحریر فرماتے ہیں:

"اسلام نے یہودیوں کے ساتھ توحید منوانے کیلئے لڑائیاں نہیں کیں بلکہ اسلام کے مخالف خود اپنی شرارتوں سے لڑائیوں کے محرک ہوئے۔ بعض نے مسلمانوں کے قتل کرنے کیلئے خود پہلے پہل تلوار اٹھائی۔ بعض نے ان کی مدد کی۔ بعض نے اسلام کی تبلیغ روکنے کیلئے بے جا مزاحمت کی۔ سو ان تمام موجبات کی وجہ سے مفسدین کی سرکوبی اور سزا اور شر کی مدافعت کیلئے

خدا تعالیٰ نے ان ہی مفسدوں کے مقابل پر لڑائیوں کا حکم کیا۔ اور یہ کہنا کہ آنحضرت ﷺ نے تیرہ برس تک اس وجہ سے مخالفوں سے لڑائی نہیں کی کہ اس وقت تک پوری جمعیت حاصل نہیں ہوئی تھی یہ محض ظالمانہ اور مفسدانہ خیال ہے۔ اگر صورت حال یہ ہوتی کہ آنحضرت ﷺ کے مخالف تیرہ برس تک ان ظلموں اور خونریزیوں سے باز رہتے جو مکہ میں ان سے ظہور پذیر ہوئے اور پھر آپ منصوبہ کر کے یہ تجویز نہ کرتے کہ یا تو آنحضرت ﷺ کو قتل کر دینا چاہئے اور یا وطن سے نکال دینا چاہئے اور آنحضرت ﷺ آپ ہی بغیر حملہ مخالفین کے مدینہ کی طرف چلے جاتے تو ایسی بدظنیوں کی کوئی جگہ بھی ہوتی لیکن یہ واقعہ تو ہمارے مخالفوں کو بھی معلوم ہے کہ تیرہ برس کے عرصہ میں ہمارے نبی ﷺ دشمنوں کی ہر ایک سختی پر صبر کرتے رہے اور صحابہ کو سخت تاکید تھی کہ بدی کا مقابلہ نہ کیا جائے چنانچہ مخالفوں نے بہت سے خون بھی کئے اور غریب مسلمانوں کو زدوکوب کرنے اور خطرناک زخم پہنچانے کا تو کچھ شمار نہ رہا۔ آخر آنحضرت ﷺ کے قتل کرنے کے لئے حملہ کیا۔ سو ایسے حملہ کے وقت خدا نے اپنے نبی کو شرِّ اعدا سے محفوظ رکھ کر مدینہ میں پہنچا دیا اور خوشخبری دی کہ جنہوں نے تلوار اٹھائی وہ تلوار ہی سے ہلاک کئے جائیں گے۔ پس ذرا عقل اور انصاف سے سوچو کہ کیا اس روئداد سے یہ نتیجہ نکل سکتا ہے کہ جب آنحضرت ﷺ کے پاس کچھ جمعیت لوگوں کی ہوگئی تو پھر لڑائی کی نیت جو پہلے سے دل میں پوشیدہ تھی ظہور میں آئی؟ افسوس ہزار افسوس کہ تعصب مذہبی کے رو سے عیسائی دین کے حامیوں کی کہاں تک نوبت پہنچ گئی ہے۔ یہ بھی نہیں سوچتے کہ مدینہ میں جا کر جب مکہ والوں کے تعاقب کے وقت بدر کی لڑائی ہوئی جو اسلام کی پہلی لڑائی ہے تو کونسی جمعیت پیدا ہو گئی تھی۔ اس وقت تو کل تین سو تیرہ ۳۱۳ آدمی مسلمان تھے اور وہ بھی اکثر نوعمر ناتجربہ کار جو میدان بدر میں حاضر ہوئے تھے۔ پس سوچنے کا مقام ہے کہ کیا اس قدر آدمیوں پر بھروسہ کر کے عرب کے تمام بہادروں اور یہود اور نصاریٰ اور لاکھوں انسانوں کی سرکوبی کیلئے میدان میں کسی کا نکلنا عقل فتویٰ دے سکتی ہے؟!!!

اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ نکلنا ان تدبیروں اور ارادوں کا نتیجہ نہیں تھا جو انسان دشمنوں کے ہلاک کرنے اور اپنی فتح یابی کیلئے سوچتا ہے۔ کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو کم سے کم تین ۳۰

چالیس[۴۰] ہزار فوج کی جمعیّت حاصل کر لینا ضروری تھا اور پھر اس کے بعد لاکھوں انسانوں کا مقابلہ کرنا۔ لہٰذا صاف ظاہر ہے کہ یہ لڑائی مجبوری کے وقت خدا تعالیٰ کے حکم سے ہوئی تھی نہ ظاہری سامان کے بھروسہ پر‘‘۔

(سراج الدین عیسائی کے چار سوالوں کے جواب، روحانی خزائن جلد نمبر ۱۲ صفحہ ۳۶۴ تا ۳۶۵)

☆

اس اعتراض کا جواب ملفوظات میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام یوں بیان فرماتے ہیں:

’’پادری جو آنحضرت ﷺ کی لڑائیوں پر اعتراض کرتے ہیں اپنے گھر میں نگاہ نہیں کرتے۔ آنحضرت ﷺ کی لڑائیاں بالکل دفاعی تھیں مگر مسیح کو اس قدر شوق تھا کہ اس نے شاگردوں کو کہا کہ کپڑے بیچ کر بھی ہتھیار خریدو۔ اصل میں مسیح کا لڑائیاں نہ کرنا ’’ستر بی بی از بے چادری‘‘ کا مصداق ہے۔ اگر انہیں موقع ملتا تو وہ ہرگز تامل نہ کرتے بلکہ اس قسم کی تعلیم سے جو انہوں نے ہتھیاروں کے خریدنے کی دی صاف معلوم ہوتا ہے کہ انہیں کس قدر شوق تھا اور داؤد کے تخت کی وراثت کا خیال لگا ہوا تھا۔ آنحضرت ﷺ نے جب مکہ فتح کیا تو آپؐ نے ان مخالفوں سے جنہوں نے سخت ایذائیں دی ہوئی تھیں اور جواب واجب القتل ٹھہر چکے تھے پوچھا تمہارا میری نسبت کیا خیال ہے۔ انہوں نے کہا تو کریم ابن کریم ہے تو آپؐ نے فرمایا اچھا میں نے تم سب کو بخش دیا۔ آپ کے اس رحم و کرم نے ان پر ایسا اثر کیا کہ وہ سب مسلمان ہو گئے۔ حضرت مسیحؑ کو اپنے ایسے اخلاق کے اظہار کا موقع ہی نصیب نہیں ہوا اور حواریوں کے لئے تو مسیح کا آنا ایک قسم کا ابتلاء تھا کیونکہ ان کو کوئی فائدہ نہ ہوا اور انہوں نے کچھ نہ سیکھا۔‘‘

(ملفوظات جلد ۲ صفحہ ۶۲۴ مطبوعہ نظارت اشاعت ربوہ ایڈیشن ۲۰۰۳ء)

پھر حضور علیہ السلام فرماتے ہیں:

’’اب تلوار سے کام لینا تو اسلام پر تلوار مارنا ہے۔ اب تو دلوں کو فتح کرنے کا وقت ہے اور یہ بات جبر سے نہیں ہو سکتی۔ یہ اعتراض کہ آنحضرت ﷺ نے پہلے تلوار اٹھائی بالکل غلط ہے۔

تیرہ برس تک آنحضرت ﷺ اور صحابہ کرام صبر کرتے رہے پھر باوجود اس کے کہ دشمنوں کا تعاقب کرتے تھے مگر صلح کے خواستگار ہوتے تھے کہ کسی طرح جنگ نہ ہو اور جو شرک قومیں صلح اور امن کی خواستگار ہوتیں ان کو امن دیا جاتا اور صلح کی جاتی۔ اسلام نے بڑے بڑے پیچوں سے اپنے آپ کو جنگ سے بچانا چاہا ہے۔ جنگ کی بنیاد کو خود خدا تعالیٰ بیان فرماتا ہے کہ چونکہ یہ لوگ بہت مظلوم ہیں اور ان کو ہر طرح دکھ دیا گیا ہے اس لئے اب اللہ تعالیٰ اجازت دیتا ہے کہ یہ بھی ان کے مقابلہ میں لڑیں۔ ورنہ اگر تعصب ہوتا تو یہ حکم پہنچتا کہ مسلمانوں کو چاہئے کہ دین کی اشاعت کے واسطے جنگ کریں لیکن ادھر حکم دیا کہ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (البقرہ:۲۵۷) یعنی دین میں کوئی زبردستی نہیں ہے اور ادھر جب غایت درجہ کی سختی اور ظلم مسلمانوں پر ہوئے تو پھر مقابلہ کا حکم دیا''۔ (ملفوظات جلد۲ صفحہ ۵۸۸ مطبوعہ نظارت اشاعت ربوہ ایڈیشن ۲۰۰۲ء)

جنگوں پر اعتراضات کے جواب میں حضور علیہ السلام فرماتے ہیں:۔

''بعض لوگ جن کو حق کے ساتھ دشمنی ہوتی ہے۔ جب ایسی تعلیم سنتے ہیں تو اور کچھ نہیں تو یہی اعتراض کر دیتے ہیں کہ اسلام میں ہمدردی اگر ہوتی تو آنحضرت ﷺ نے لڑائیاں کیوں کی تھیں؟ وہ نادان اتنا نہیں جانتے کہ آنحضرت ﷺ نے جو جنگ کئے وہ تیرہ برس تک خطرناک دکھ اٹھانے کے بعد کئے اور وہ بھی مدافعت کے طور پر۔ تیرہ برس تک ان کے ہاتھوں سے آپ تکالیف اٹھاتے رہے۔ مسلمان مرد اور عورتیں شہید کی گئیں۔ آخر جب آپ مدینہ تشریف لے گئے اور وہاں بھی ان ظالموں نے پیچھا نہ چھوڑا تو خدا تعالیٰ نے مظلوم قوم کو مقابلہ کا حکم دیا اور وہ بھی اس لئے کہ شریروں کی شرارت سے مخلوق کو بچایا جائے اور ایک حق پرست قوم کے لئے راہ کھل جائے۔ آنحضرت ﷺ نے کبھی کسی کے لئے بدی نہیں چاہی۔ آپ تو رحم مجسّم تھے۔ اگر بدی چاہتے تو جب آپ نے پورا تسلّط حاصل کر لیا تھا اور شوکت اور غلبہ آپ کو مل گیا تھا تو آپ ان تمام ائمۃ الکفر کو جو ہمیشہ آپ کو دکھ دیتے رہتے تھے، قتل کروا دیتے اور اس میں انصاف اور عقل کی رُو سے آپ کا پلّہ بالکل پاک تھا۔ مگر باوجود اس کے کہ عرفِ عام کے لحاظ سے اور عقل اور انصاف کے لحاظ سے آپ کو حق تھا کہ ان لوگوں کو قتل کروا دیتے مگر نہیں، آپؐ نے سب کو

چھوڑ دیا۔ آج کل جو لوگ غداری کرتے ہیں اور باغی ہوتے ہیں انہیں کون پناہ دے سکتا ہے۔ جب ہندوستان میں غدر ہو گیا تھا اور اس کے بعد انگریزوں نے تسلّط عام حاصل کر لیا تو تمام شریر باغی ہلاک کر دیئے گئے اور ان کی یہ سزا بالکل انصاف پر مبنی تھی۔ باغی کے لئے کسی قانون میں رہائی نہیں۔ لیکن یہ آپ ہی کا حوصلہ تھا کہ اس دن آپ نے فرمایا کہ جاؤ تم سب کو بخش دیا۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کو نوعِ انسان سے بہت بڑی ہمدردی تھی۔ ایسی ہمدردی کہ اس کی نظیر دنیا میں نہیں مل سکتی۔"

(ملفوظات جلد۴ صفحہ ۲۱۸ مطبوعہ نظارت اشاعت ربوہ ایڈیشن ۲۰۰۳ء)

☆

تلوار اُٹھانے کے بارے میں الزام کے جواب میں حضرت خلیفۃ المسیح الاوّلؓ بیان فرماتے ہیں:۔

"کئی ایک تاریخوں میں مَیں نے پڑھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جن دنوں میں مکہ میں بودوباش رکھتے تھے۔ آپ نے مخالفین کی ایذا رسانی کے مقابلہ میں کچھ نہ کیا مگر مدینہ جاتے ہی جب جتھا ہو گیا تو لڑائی شروع کر دی۔ یہ بالکل غلط ہے کہ نبی جتھے کے منتظر رہتے ہیں۔ تین طرح سے اس کی تردید ہو گی۔ ایک جگہ فرمایا۔ لَا تُكَلَّفُ اِلَّا نَفْسَكَ اور مومنوں کے لئے صرف حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ (النساء:۸۵) فرمایا پھر نبی کریم ﷺ کے سایہ عاطفت میں بارہ ہزار تھی۔ جب آپؐ غزوہ حنین کو جا رہے تھے کسی کو خیال اُٹھا کہ اب ہم اتنے ہزار میں ہمارا کون مقابلہ کر سکتا ہے۔ وہاں آیتیں نازل ہوئیں۔ وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ ۙ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ چنانچہ یہ کہنا تھا کہ ہوازن کے سو آدمیوں نے شکست دی اور اس وقت صحابہؓ کی یہ حالت ہوئی۔ وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ (التوبہ:۲۵) بھاگنے کی بھی جگہ نہ رہی۔

رسول کریم ﷺ ایک خچر پر سوار تھے۔ جب دیکھا کہ لوگ پیٹھ پھیرے بھاگے جا رہے ہیں تو حارث کو کہا کہ باگ موڑ دو اور ایسے خطرے کے وقت میں فرمایا:

اَنَا النَّبِيُّ لَا كَذِب　　　　اَنَا ابْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِب

جس سے صاف ظاہر ہے کہ آپؐ کو جتھے کی پرواہ نہ تھی۔ تیسری بات وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ (المائدہ:۶۸) کا نزول ہے جس پر آپ ﷺ نے پہرہ دینے سے منع کر دیا۔ ایسا ہی اس رکوع میں حضرت نوحؑ کے حالات پر غور کرو کہ اکیلا شخص پکارتا ہے فَاَجْمِعُوْٓا اَمْرَكُمْ وَشُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ اَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوْٓا اِلَيَّ وَلَا تُنْظِرُوْنِ (یونس:۷۲) کیا اس کلام کو پڑھ کر یہ شک بھی رہ سکتا ہے کہ نبیوں کو جتھوں کی پرواہ ہوتی ہے۔ پھر حضرت موسیٰ کے واقعات پر غور کرو کہ جب آگے دریائے نیل تھا اور پیچھے فرعون کی فوج۔ اس وقت اصحاب موسیٰ نے کہا اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ (الشعراء:۶۲) مگر حضرت موسیٰ کس اطمینان سے کہتے ہیں کہ كَلَّا ۚ اِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ (الشعراء:۶۳)
پس مکہ شریف میں نبی کریم ﷺ کا صبر اس لئے تھا کہ یہ لوگ کسی طرح سمجھ جاویں۔

(ضمیمہ اخبار بدر قادیان ۹ دسمبر ۱۹۰۹ء)

☆

آپ ﷺ نے جنگیں کیوں کیں اور فوجیں کیوں روانہ کیں اس اعتراض کا جواب

حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز نے مورخہ ۱۱ رمئی ۲۰۱۳ء کو لاس اینجلس امریکہ کی ایک پر وقار استقبالیہ میں خطاب کے دوران ان الفاظ میں ارشاد فرمایا:

پس یہ بہت بڑی ناانصافی ہے کہ آج کے دور میں بہت سے لوگ آپؐ کے مبارک کردار کو یہ کہتے ہوئے داغدار کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ نعوذ باللہ آپؐ نے ظلم وستم اور ناانصافی کی تعلیمات دیں۔

آج جب ہم بطور احمدیہ مسلم جماعت دنیا میں محبت سب کے لئے نفرت کسی سے نہیں کا نعرہ جو کہ دنیا میں امن کے قیام کا ایک ذریعہ ہے بلند کرتے ہیں تو ہم رسول کریم ﷺ کی تعلیمات اور آپؐ کے اسوہ کے مطابق ہی ایسا کرتے ہیں۔

آپؐ کے دل میں انسانیت کی خدمت کرنے اور حقوق العباد ادا کرنے کی اس قدر شدید

خواہش تھی کہ آپ ساری زندگی اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے ہمیشہ تیار رہے۔ حتیٰ کہ نبوت کے مقام پر فائز ہونے کے بعد بھی جو کہ ایک بہت بڑی ذمہ داری اور انتہائی مشکل کام تھا۔ آپؐ نے فرمایا کہ اگر کوئی بھی شخص خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم آپ کو انسانیت کی خدمت کے لئے بلائے گا تو آپؐ لازماً اس انسانیت کی خدمت کرنے کی کوشش میں شامل ہوں گے۔

تو یہ آپ ﷺ کا نمونہ تھا کہ اگر کوئی ضرورتمند شخص یا معاشرہ کے محروم طبقہ سے تعلق رکھنے والا کوئی بھی شخص مدد مانگنے کے لئے آتا تو آپؐ بغیر کسی مذہب کی تفریق کئے اس کی مدد کرنا اپنا فرض سمجھتے۔

بحیثیت بانی اسلام اور نبی اللہ ہونے کے آپ کا رتبہ انتہائی بلند تھا۔ لیکن اس کے باوجود بھی آپ غیر مسلموں کے ساتھ مل کر اس نیک مقصد پر کام کرنے کو بہت زیادہ اہمیت دیتے۔

بعض افراد کے ذہن میں یہ سوال اٹھ سکتا ہے کہ اگر آنحضرت ﷺ کا دل انسانیت کی محبت سے معمور تھا تو کیونکر آپؐ کا نام جنگ وجدل کے ساتھ منسلک کیا جاتا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے کیونکر بعض جنگوں میں حصہ لیا اور کیونکر بعض فوجیں تیار کر کے لشکر کشی کے لئے روانہ کیں؟

اس سوال کے جواب کے لئے ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ کیا یہ نظریہ درست ہے کہ جنگ کسی بھی صورت میں نہ کی جائے اور ہر حال میں ہی نرم رویہ اختیار کیا جائے؟ یا پھر بعض انتہائی ناگزیر حالات میں جنگ کی اجازت دی جاسکتی ہے؟ اور اگر بعض حالات میں جنگ کی اجازت دی جاسکتی ہے تو وہ کونسے ایسے حالات ہیں جن میں جنگ جائز ہو جاتی ہے اور پھر جنگ کس حد تک جائز ہے؟ اسلام ہمیں اس بارے میں کیا بتاتا ہے؟

جیسا کہ میں نے پہلے بھی واضح کیا ہے جب ایک مسلمان تمام جہانوں کے رب کی مدح کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی مخلوق کا حسن اس کے سامنے آجاتا ہے اور وہ خدا کے ساتھ ساتھ اس کی مخلوق کی بھی مدح کرتا ہے اور اس کی طرف کھچا جاتا ہے۔ جب انسان اس حسن کا ادراک حاصل کرتا ہے تو پھر اس کے دل میں مخلوق کے لئے کسی بھی قسم کی بری سوچ یا نقصان پہنچانے کا خیال نہیں رہ سکتا۔

تاہم ایسے لوگ بھی ہیں جو اس تعلیم پر عمل نہیں کرتے، ایسے لوگ اپنے اردگرد کے معاشرے اور پھر تمام دنیا میں فساد پھیلانے کے درپے ہیں۔ایسے لوگوں کی اصلاح کے لئے اسلام نے بڑی واضح اور تفصیلی راہنمائی فرمائی ہے تا کہ عالمی امن اور ہم آہنگی کو یقینی بنایا جا سکے۔اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے: اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے لوگوں کو ایک دوسرے کے ہاتھوں بچانے کا سامان نہ کیا جاتا تو زمین ضرور فساد سے بھر جاتی۔لیکن اللہ تعالیٰ تمام جہانوں پر بہت فضل کرنے والا ہے۔ (البقرہ:۲۵۲)

اگر ہم اس آیت کریمہ کے معنی پر غور کریں تو ہم دیکھتے ہیں کہ بلاشبہ امن کا قیام سب سے اہم ترین مقصد ہے اور اسی وجہ سے قدرتی طور پر اللہ تعالیٰ نے انسانی فطرت میں امن کی کشش رکھی ہوئی ہے۔لیکن ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض اوقات انسان اپنی فطرتی صلاحیتوں یا فطرتی ترجیحات کے برخلاف عمل کرتا ہے۔انسان کی لالچ، حسد، خودغرضی اور نفرت کے جذبات اس پر حاوی ہو جاتے ہیں اور اسے اس حد تک مجبور کر دیتے ہیں کہ دوسروں کے حقوق کا اسے بالکل خیال نہیں رہتا۔نتیجتاً معاشرے میں بدامنی پھیلتی ہے اور پھر یہی بدامنی سارے ملک اور وسیع دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ایسے لوگ امن کی راہ سے بہت دور ہٹے ہوئے ہیں۔معاشرہ جس آزادی کو پسند کرتا ہے، اس آزادی کو پامال کرنے کی خواہش ان کا اولین مقصد بن جاتا ہے۔یہ لوگ پھر جبر کرتے ہوئے اور طاقت کا استعمال کرتے ہوئے بنیادی انسانی حقوق جیسا کہ آزادی ضمیر اور سوچ کی آزادی پر پابندیاں لگاتے ہیں۔یقیناً ایسے لوگ مذہبی آزادی پر بھی حملہ کرتے ہیں اور یہ آزادی بھی لوگوں سے چھیننے کی کوشش کرتے ہیں۔

جب اسلام کے ابتدائی دور میں ان حالات کا سامنا کرنا پڑا تو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اجازت دی کہ وہ طاقت کا مقابلہ طاقت سے کریں۔یہ اجازت صرف اس مقصد کے لئے دی گئی کہ فساد ختم ہو، اس وجہ سے اس کی اجازت دی گئی کہ ظلم وسفا کی کا خاتمہ ہو اور امن اور ہم آہنگی کا دور دورہ ہو۔

اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے کہ خدا تمام جہانوں کے لئے رحمت اور فضل نازل کرتا

ہے، خدا کسی ایک قوم یا علاقہ کو ترجیح نہیں دیتا۔ وہ یہ نہیں چاہتا کہ امن صرف چند ایک افراد کے لئے ہو بلکہ وہ ساری دنیا کو امن، پیار اور ہم آہنگی کا گہوارہ بنتے دیکھنا چاہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی نظر میں اس کی تمام مخلوق برابر اور مساوی ہے۔

اگر خدا نے ایک شخص کو کشادگی دی ہے تو اسے یہ حق حاصل نہیں ہو جاتا کہ وہ ایک غریب شخص کے حقوق پامال کرے۔ اسی طرح اگر ایک ملک طاقتور اور امیر ہو جاتا ہے تو اسے یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ غریب ممالک کے حقوق سلب کرے۔ خدا تعالیٰ نے واضح طور پر فرمادیا ہے کہ ایسے مظالم صرف تفریق اور جھگڑوں کا باعث بنتے ہیں۔

خدا تعالیٰ کی نظر میں امن اور اس کا قیام ایک عظیم اور اہم ترین مقصد ہے۔ اگر کبھی کبھار آپ کو کسی چھوٹے پیمانے پر (امن کی) قربانی دینی پڑے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ یہ قربانی پھر انسانیت کے وسیع تر مفاد میں ہوتی ہے۔

جب اسلام میں پہلی مرتبہ دفاعی جنگ کرنے کی اجازت دی گئی تو اس کی بھی یہی وجہ تھی کہ مسلمان حقیقی امن چاہتے ہیں اور کفار اس امن کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔ اگر اس موقع پر جوابی لڑائی کی اجازت نہ دی جاتی تو تمام مذاہب انتہائی خطرہ میں پڑ جاتے۔ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے:۔

ان لوگوں کو جن کے خلاف قتال کیا جا رہا ہے (قتال کی) اجازت دی جاتی ہے کیونکہ ان پر ظلم کئے گئے اور یقیناً اللہ تعالیٰ ان کی مدد پر پوری پوری قدرت رکھتا ہے۔

(یعنی) وہ لوگ جنہیں ان کے گھروں سے ناحق نکالا گیا محض اس بنا پر کہ وہ کہتے تھے کہ اللہ ہمارا رب ہے اور اگر اللہ کی طرف سے لوگوں کا دفاع ان میں سے بعض کو بعض دوسروں سے بھڑا کر نہ کیا جاتا تو راہب خانے منہدم کر دیئے جاتے اور گرجے بھی اور یہود کے معابد بھی اور مساجد بھی جن میں بکثرت اللہ کا نام لیا جاتا ہے اور یقیناً اللہ ضرور اس کی مدد کرے گا جو اس کی مدد کرتا ہے۔ یقیناً اللہ بہت طاقتور (اور) کامل غلبہ والا ہے۔ (الحج: ۴۰۔۴۱)

لہٰذا یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسلام نے امن کے قیام کے لئے ہر ممکن کوشش کی اور اسی طرح تمام

مذاہب کی حفاظت کرنے کے لئے بھی اسلام تمام ذرائع بروئے کار لایا۔ یہاں تک کہ جہاں مسلمانوں کو دفاعی جنگ کی اجازت دی گئی وہاں پر بھی آنحضرت ﷺ نے مسلمان لشکروں کو انتہائی سخت احکامات صادر فرمائے جن پر عمل کرنا ان پر واجب تھا۔

آنحضرت ﷺ نے تعلیم دی کہ جنگ میں صرف ان لوگوں سے لڑنا ہے جو کہ جنگ میں براہ راست شامل ہوئے ہیں۔ آپؐ نے بڑا واضح حکم دیا کہ کسی بھی معصوم شخص پر ہرگز حملہ نہ کیا جائے۔ نہ ہی کسی عورت، بچے اور معمر شخص پر حملہ کیا جائے۔ آپؐ نے یہ بھی حکم دیا کہ کسی بھی مذہبی راہنما یا پادری کو اس کی عبادت گاہ میں نشانہ نہ بنایا جائے۔ مزید آنحضرت ﷺ نے تعلیم دی کہ کسی بھی شخص کو جبری مسلمان نہ بنایا جائے۔ آپؐ نے تعلیم دی کہ اگر مسلمانوں کو امن کی خاطر جنگ کرنا پڑے تو عوام الناس میں خوف و ہراس نہ پیدا کریں اور نہ ہی عوام الناس پر سختی کی جائے۔ آپؐ نے تعلیم دی کہ جنگی قیدیوں کو توجہ دی جائے اور ان کا ایسا خیال رکھا جائے کہ جیسے انسان خود اپنا خیال رکھتا ہے۔ آپؐ نے تعلیم دی کہ نہ کوئی عمارت گرائی جائے اور نہ ہی درخت کاٹے جائیں۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جہاں حالات اس قدر سنگین ہو گئے کہ جنگ کرنا پڑی، ان حالات میں بھی آنحضرت ﷺ نے مسلمانوں کو بیشمار ایسی ہدایات دیں جن پر عمل ضروری تھا۔ میں نے صرف چند ایک کا ذکر کیا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے بڑے واضح انداز میں فرما دیا کہ جو کوئی بھی ان ہدایات پر عمل نہ کرے گا وہ خدا تعالیٰ کی نظر میں امن قائم کرنے کی خاطر لڑنے والا نہیں ہوگا۔ بلکہ ایسا شخص اپنے ذاتی مفادات کی خاطر لڑنے والا ہوگا۔

دور حاضر میں جو لوگ بانی اسلام حضرت محمد ﷺ پر اعتراض کرتے ہیں انہیں دیکھنا چاہئے کہ کیا آجکل ہونے والی جنگوں میں ان تعلیمات پر عمل ہو رہا ہے؟ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ آجکل ایسے ہولناک ہتھیار نکل آئے ہیں جن کے ذریعے بغیر کسی تفریق کے معصوم لوگ مارے جا رہے ہیں؟ آنحضرت ﷺ نے تو بڑی سختی سے منع فرمایا تھا کہ عوام الناس کو کسی بھی طور کوئی نقصان نہ پہنچے۔ یہاں تک کہ ایک جنگ کے موقع پر کسی صحابیؓ سے غلطی سے ایک بچے کا قتل ہو گیا تو

آنحضرت ﷺ نے اس بات کو انتہائی برا منایا اور اس عمل پر سخت ناراضگی کا اظہار فرمایا۔

ایک اور واقعہ ظاہر کرتا ہے کہ آنحضرت ﷺ انسانیت کی کس قدر عزت کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک جنازہ گزر رہا تھا تو آنحضرت ﷺ اس کی تکریم میں کھڑے ہو گئے۔ اس پر ایک صحابیؓ نے عرض کی کہ یہ جنازہ تو ایک یہودی کا تھا۔ آنحضرت ﷺ نے جواباً فرمایا کیا وہ انسان نہیں؟ تمام انسانوں کا احترام لازم ہے۔

یہ وہ خصوصیات ہیں اور وہ اقدار ہیں جو کہ معاشرے میں باہمی احترام اور امن پیدا کرنے میں ممد ہوتی ہیں۔

اس حقیقت کے باوجود کہ اسلامی تعلیمات اور آنحضرت ﷺ کی تعلیمات انسانیت کی محبت سے بھرپور ہیں اور ہر تعلیم معاشرہ میں قیام امن کے گرد گھومتی ہے، آج کی دنیا پہلے سے بھی بڑھ کر اسلام اور بانی اسلام پر حملے کر رہی ہے۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ آج کی دنیا اس بات کا ادراک نہیں رکھتی کہ ارد گرد دنیا میں کیا ہو رہا ہے جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ مسلمان ہونے کا دعویٰ کرنے والے چند انتہا پسند افراد کی جانب سے کئے جانے والے برے اعمال کا اسلام کی حقیقی تعلیمات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

اگر مسلمان ممالک میں عوام پر ظلم ہو رہا ہے اور عوام کے بنیادی حقوق سلب کئے جا رہے ہیں تو یہ بھی کلیۃً اسلامی تعلیمات کے برخلاف ہے۔ آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے کہ ایسی حرکتیں خدا تعالیٰ کی خاطر نہیں ہیں بلکہ ان کا مقصد ذاتی مفادات کا حصول ہوتا ہے۔

ان تمام باتوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے وقت کی عین ضرورت ہے کہ اسلام کے بارے میں برے خیالات رکھنے اور اسلام کے بارے میں غلط فہمیوں میں مبتلا ہونے کی بجائے وہ تمام افراد جو امن قائم کرنے کے خواہاں ہیں باہم اکٹھے سر جوڑ کر بیٹھیں اور اس بات پر غور کریں کہ یہ غیر منصفانہ اور ظالمانہ طریق کس طرح روکے جائیں؟

اسلام کو بدنام کرنا اور زیادتی کرتے ہوئے الزام لگانا ٹھیک طریق نہیں ہے۔ مسلمان ممالک اور بعض مسلمان گروپس کے علاوہ اور بھی بہت سے ایسے غیر مسلم افراد ہیں جو کہ امن قائم کرنے

کے نام پر ایسے اقدامات کر رہے ہیں جن کی وجہ سے معصوم لوگ، خواتین اور بچے مر رہے ہیں۔

دنیا جس جہت میں جا رہی ہے اس سے تو یہی لگ رہا ہے کہ دنیا کا ایک بڑا حصہ ہولناک جنگ کی لپیٹ میں آنے والا ہے۔ اگر یہ جنگ لگ گئی تو معصوم خواتین، بچے اور معمر افراد اس کا نشانہ بنیں گے اور اس کی تباہی گزشتہ دو عالمی جنگوں سے بھی بڑھ کر ہوگی اور مجھے علم ہے کہ گزشتہ دو عالمی جنگوں میں کروڑوں افراد اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ دنیا کی آبادی اب بہت بڑھ چکی ہے اور اسی طرح تباہی پھیلانے والے ہتھیار بھی اور وہ ممالک بھی تعداد میں پہلے سے زیادہ بڑھ چکے ہیں جو جنگ وجدل کے پیاسے ہیں۔ ان حالات میں تباہی کئی گنا زیادہ ہوگی۔

اس تمام پس منظر میں ضروری ہے کہ یہ دنیا اور خاص طور پر اہم طاقتیں ان اقدامات پر غور کریں جن کے ذریعہ اس ہولناک تباہی سے دنیا کو بچایا جا سکتا ہے۔

اسلام کا خوف اور اسلام کو بدنام کرنے کی کوششیں کچھ فائدہ نہ دیں گی اور ایسے اقدامات سے امن ومفاہمت کی راہ ہموار نہیں ہو سکتی۔ بلکہ امن حاصل کرنا ہے تو اس کی راہ صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ جہاں کہیں بھی ظلم وزیادتی ہوا سے عدل وانصاف کے ذریعے ختم کیا جائے۔ عالمی امن صرف اور صرف اس طور قائم کیا جا سکتا ہے کہ اس راہنما اصول پر کاربند رہا جائے اور یہ صرف اسی وقت ہوگا کہ جب دنیا میں بسنے والے افراد اپنے خالق کو پہچان لیں گے۔

میری شدید خواہش اور دعا ہے کہ قبل اس سے کہ بہت دیر ہو جائے تمام دنیا فوری طور پر وقت کی ضرورت کو پہچان لے۔ (روزنامہ الفضل ۶؍جون ۲۰۱۲ء)

اپنے مخالفین کو قتل کروانے کے الزامات

آنحضرتؐ پر معاندین نے اپنے مخالفین کو قتل کرنے کے الزامات لگائے ہیں۔ ان الزامات کے ردّ اور پیش کی جانے والی روایات کی وضاحت میں حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ اپنے

افتتاحی خطاب جلسہ سالانہ برطانیہ ۱۹۹۴ء میں فرماتے ہیں:۔

دشمنان اسلام دو ایسے واقعات پیش کرتے ہیں جن پر وہ بہت بڑھ بڑھ کر آنحضورؐ کے کردار کے خلاف باتیں کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دیکھو محمدؐ کا چہرہ بے داغ نہیں رہا کیونکہ اس نے بعض لوگوں کے قتل کا حکم جاری کیا۔

ان دو قتل کے واقعات میں سے ایک کعب بن اشرف کا قتل ہے اور دوسرا ابو رافع کا قتل ہے۔ یہ وہ یہودی لیڈر تھے جو مدینہ چھوڑ کر دوسری جگہوں میں آباد ہو گئے تھے، جن کی شرارتوں اور بدعہدیوں کے نتیجے میں ان کو مدینے سے نکال دیا گیا تھا مگر نکلنے کے باوجود یہ اپنی بدعہدیوں کے اوپر قائم رہے اور جو نئے معاہدے اس اخراج کے وقت ہوئے ان کو بھی انہوں نے توڑا اور بار بار توڑا اور اسلام کے خلاف قوموں کو بھڑکانا یعنی عرب قوموں کو بھڑکانا اور ان کی اموال سے مدد کرنا انہوں نے اپنا پیشہ بنا رکھا تھا۔

وہ زمانہ آج کا زمانہ نہیں تھا جہاں کہ Established حکومتیں، مستحکم حکومتیں قائم ہوں اور ایک حکومت کا دائرہ خاص طور پر ایک جغرافیائی حدود سے تعلق رکھتا ہو، ایک دوسری حکومت کا دائرہ ایک اور جغرافیائی حدود سے تعلق رکھتا ہو بلکہ عرب سب کا ایک مشترک ملک تھا۔ اس ملک میں علاقائی تقسیمیں سیاسی علاقائی تقسیمیں نہیں تھیں بلکہ محض قبائلی اور خطی تقسیمیں تھیں جو حکومتوں کے درمیان کوئی خط نہیں کھینچتی تھیں، کوئی Demarcation لائن قائم نہیں کیا کرتی تھیں۔ پس عرب میں سب مشترکہ طور پر حقیقت میں باہمی دوستیوں کے معاہدے اور دشمنوں کے خلاف اکٹھے ہونے کے معاہدوں کی صورت میں رہا کرتے تھے۔ اس لئے آج کا مستشرق جب آنحضور ﷺ کے ان دو فیصلوں کے خلاف احتجاج کرتا ہے تو اس کو اس کا کوئی حق نہیں، کیونکہ وہ آج کے حالات کو اس زمانے کے حالات پر صادق کرنے کی کوشش کرتا ہے حالانکہ بالکل مختلف حالات ہیں۔ اس زمانے میں اگر عہد شکنی کی جائے تو جس کی عہد شکنی کی جاتی تھی اس کو تمام اخلاقی اور رواجی حق تھا کہ وہ اس کا انتقام لے۔

پس آنحضور ﷺ نے ان دونوں ظالموں کے ظلم و ستم پر بہت صبر کیا لیکن یہ اسلام کے

خلاف سازشوں میں اور ان سازشوں کی مدد میں روپیہ پیسہ خرچ کرنے سے باز نہیں آئے۔ تب بعض صحابہؓ نے جب اجازت لی تو آنحضورﷺ نے ان کو اجازت دی۔ پس ان دونوں کے قتل کو آنحضرتﷺ کی گستاخی کے نتیجے میں قتل قرار دینا حد سے بڑھی ہوئی حماقت ہے اور دشمنان اسلام کے ہاتھوں کو مضبوط کرنے والی بات ہے۔

اس بات کا قطعی ثبوت خود ان واقعات کی تاریخ میں ملتا ہے۔ مثلاً جب کعب بن اشرف کا قتل ہوا اور یہودی اس پر بہت تیخ پا ہوئے یہ بنو قینقاع سے تعلق رکھتے تھے۔ تو انہوں نے اپنا ایک وفد آنحضورﷺ کی خدمت میں اس قتل کے خلاف احتجاج کے لئے بھیجا۔ اس وفد نے آنحضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر احتجاج کیا کہ آپؐ کو کیا اخلاقی حق تھا کہ آپؐ ہمارے اس رہنما کے قتل کا حکم دیتے یا صحابہؓ کو اجازت دیتے کہ وہ قتل کرتے۔ آنحضورﷺ نے فرمایا! بیٹھو، میری بات سنو۔ یہ واقعہ ہوا ہے ان کی بدعہدی کا، یہ واقعہ ہوا ہے ان کے ظلم وستم کا، یہ واقعہ ہوا ہے ان کی مفسدانہ کارروائیوں کا، ایک ایک کر کے وہ واقعات بیان فرمائے۔ جن کو سن کر وہ وفد لاجواب ہو کر بغیر کسی بعد میں پیدا ہونے والی انتقامی کارروائی کے خیال کے وہاں سے رخصت ہوا اور پھر یہ معاملہ اس وقت کی تاریخ میں ہمیشہ کے لئے دفن کر دیا گیا۔

پس یہ حقیقت حال ہے اس کے خلاف اور کوئی کسی قسم کی گواہی نہیں ملتی کہ یہ دو واقعات آنحضورﷺ نے، یعنی یہ دو قتل جن کی اجازتیں وقت کے دستور کے مطابق اور اخلاقی دستور کے مطابق اور شریعت کی اجازت کے مطابق ظالموں کو بدعہدی کی سزا کے طور پر صادر ہوئیں، یہ دونوں احکامات ظالموں کو ان کے ظلم کی سرکوبی کے لئے بدعہدی کے نتیجے میں وہ سزائیں وارد کرنے کے لئے جو ان کا طبعی نتیجہ تھیں، آپ نے جاری فرمائے اور اس کا ہتک رسولؐ سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ ورنہ ہتک رسولؐ تو مدینے کی گلیوں میں ہو رہی تھی، گستاخان رسولؐ وہاں آزادانہ دندناتے پھرتے تھے۔ وہ کون لوگ تھے جن کا قرآن کریم کی اس سورۃ میں ذکر کیا گیا ہے جو میں نے آپ کے سامنے تلاوت کی تھی کہ مدینے کی گلیوں میں آنحضورؐ کی گستاخیاں ہو رہی تھیں، صحابیاتؓ کی گستاخیاں ہو رہی تھیں اور قرآن کریم بتاتا ہے کہ پردے کے احکام میں حکم کی

ایک وجہ یہ تھی تا کہ یہ لوگ پہچان لیں کہ کون ہیں؟ یہ نہ کہہ سکیں کہ ہمیں پتا نہیں تھا کہ یہ مسلمان عورتیں ہیں اس لئے جیسا کہ ہمارا اپنا رواج ہے ہم نے اوباشی کا طریق اختیار کیا۔ پس قرآن کریم نے آنحضرت ﷺ اور آنحضرت ﷺ کے صحابہؓ کی ہتک کے کوئی ایسے واقعات پیش نہیں کئے جن کے نتیجے میں خدا تعالیٰ نے مسلمانوں کو جوابی حملے میں قتل عام کی اجازت دی ہو۔

پس سنت رسولؐ کو سنت رسولؐ کے خلاف کیسے تم استعمال کر سکتے ہو، یہ ناممکن ہے کہ آنحضورؐ کے کردار میں تضاد ہو، اگر تضاد ہو تو قرآن کی رُو سے آپؐ سچے نبی نہیں بنتے کیونکہ قرآن کریم فرماتا ہے کہ اگر اس نے جھوٹ گھڑا ہوتا، تو تم اس کی باتوں میں بہت سا اختلاف دیکھتے۔ پس نہ آپؐ کے کلام میں کوئی اختلاف ہے نہ آپؐ کی سنت میں کوئی اختلاف ہے، نہ آپؐ کا قرآن کریم کی تعلیم سے کوئی اختلاف ہے اور ہر وہ تاریخی واقعہ جس سے یہ استنباط کیا جائے کہ گویا **نعوذ باللہ من ذالک** آنحضور ﷺ ایسے ہی حالات میں ایک جگہ ایک اور حکم جاری فرمارہے تھے اور ایک دوسری جگہ ایک اور حکم جاری فرمارہے تھے بالکل غلط اور جھوٹا الزام ہے۔ آنحضور ﷺ کا کردار وہی پاک یکساں کردار ہے جس کا ظاہر و باطن ایک تھا، ظاہر بھی نور تھا اور باطن بھی نور تھا۔ آپؐ کے کردار میں آپ کو کہیں کوئی تضاد دکھائی نہیں دے گا۔

ان کے علاوہ ایک واقعہ اُس یہودیہ کے قتل کا پیش کیا جاتا ہے جس نے آنحضرت ﷺ کو زہر دینے کی کوشش کی تھی بلکہ دیا تھا۔ آنحضور ﷺ کو دستی کا گوشت پسند تھا (بکرے کا بازو ہے اس کو دستی کہا جاتا ہے) اس عورت نے اخلاص ظاہر کیا دھوکہ بازی کے طور پر اور کہا کہ مجھے شوق ہے میں کچھ پکا کے بھیجوں اور دستی بھجوائی۔ جس کے اندر نہایت ہی خوفناک زہر داخل کیا گیا آنحضور ﷺ نے تھوڑا سا چکھا اور چھوڑ دیا اور آپؐ کے ساتھ ایک صحابی تھے جنہوں نے جلدی میں کئی لقمے کھا لئے۔ آنحضرت ﷺ کو اسی وقت پتا چلا کہ یہ زہر والی دستی ہے، آپؐ نے تحقیق کا حکم دیا۔ تحقیق ہوئی اور ثابت ہوا کہ اس یہودیہ نے آپ کو زہر دیا تھا چنانچہ آنحضرت ﷺ نے اس کو معاف فرمادیا۔ یہ قطعی تاریخی حقیقت ہے جس کا کوئی انکار کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا لیکن جب وہ صحابیؓ جو آپ کے ساتھ بیٹھے تھے اور آپؐ کی دعوت میں شریک

ہوئے تھے، اس زہر سے مارے گئے جو آپؐ کے لئے بنایا گیا تھا تو آنحضرت ﷺ نے قصاص کے طور پر پھر اس یہودیہ کو اس صحابیؓ کے قتل کے جرم میں قتل کرنے کا حکم دیا (ابوداؤد کتاب الدیات حدیث نمبر: ۲۹۰۹)۔اب بتایئے! اس میں ہتک رسولؐ کا کون سا موقع، کون سا محل ہے، اس کا کوئی دُور سے بھی اس مضمون سے تعلق نہیں ہے۔

......سنن بیہقی کی روایت ہے۔اب سنن بیہقی وہ کتاب ہے جس میں تمام حدیث کی کتابوں میں سب سے زیادہ غلط روایتیں اکٹھی کی گئی ہیں۔ایسی فرضی باتیں ہیں کہ ان کو پڑھتے پڑھتے انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کی طرف یہ باتیں منسوب ہیں اور چھ سو سال کے بعد وہ محدث صاحب حدیثیں اکٹھی کر رہے ہیں۔وہ حدیثیں جن کا پہلی صدیوں میں نام و نشان بھی نہیں ہے اگر ڈھونڈنی ہوں تو بیہقی میں جا کے ڈھونڈ لیں چنانچہ انہوں نے بیہقی کو ایک مستند کتاب بنا کر اس سے ایک روایت پیش کی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت ابو علی روزباری کی روایت ہے کہتے ہیں ابوعلی الروزباری نے ہم سے روایت کی ہے اور آخری روایت یہ بنتی ہے کہ ایک یہودی عورت آنحضرت ﷺ کو گالیاں دیا کرتی تھی، آنحضرتؐ کے متعلق بدگوئی کرتی تھی۔ایک شخص نے اس کا گلا گھونٹ دیا یہاں تک کہ وہ مرگئی تو رسول اللہ ﷺ نے اس کا خون باطل قرار دے دیا (یعنی اس کا بدلہ نہ دلوایا)۔اس سے کیا استنباط ہوتا ہے اگر یہ حدیث درست ہو تو اس سے کیا استنباط ہوتا ہے؟ وہی جو میں بیان کر چکا ہوں کہ ہر مسلمان کو حق ہے کہ کسی کا گلا دبا دے، گھونٹ دے، مار دے، قتل کر دے اور بعد میں اگر وہ یہ کہہ دے کہ یہ رسول اللہ ﷺ کو گالیاں دیتا تھا یا دیتی تھی تو اس کا خون حرام اور جس کو قتل کیا گیا اس کا حلال ہو گیا۔یہ اسلام ہے؟ **نعوذ باللہ من ذالک** جو دنیا میں پنپنے کے لائق اسلام ہے؟ انسانی فطرت اس تصور کو دھکے دیتی ہے، قبول کر ہی نہیں سکتی۔

لیکن اب میں بتاتا ہوں کہ اس حدیث کی اصل کیا ہے اس کی حیثیت علماء نے کیا بیان فرمائی ہے؟ اس روایت میں ابوعلی الروزباری کا ذکر ہے جسے اسماء الرجال نے ضعیف قرار دیا ہے۔اسماعیل الصفاء لکھتے ہیں کہ ابوعلی الروزباری احمد بن عطا **لا یعتمد علیہ** کبھی اس پر اعتماد

نہ کیا جائے۔وہ نا قابل اعتبار انسان ہے، ایک ایسا شخص جس پہ محقق علماء لکھ چکے ہیں کہ وہ نا قابل اعتماد ہے۔اس کی روایت پر تمام بنی نوع انسان کا امن اٹھا دیا جائے، یہ کہاں سے عقل انہوں نے حاصل کی ہے۔اللہ ہی بہتر جانتا ہے کیونکہ خدا کی پیدا کردہ عقل کو مسخ کئے بغیر یہ نتیجے نہیں نکالے جاسکتے۔

لسان المیز ان میں اور تہذیب التہذیب میں جو اسماء الرجال کی چوٹی کی کتابیں ہیں۔ جن میں راویوں پر ابن حجر نے بہت ہی عمدہ تحقیق فرمائی ہے اور بہت عمدہ بحث فرمائی ہے وہ لکھتے ہیں کہ یہ جو حدیث ہے وہم کا نتیجہ ہے، وہم کے سوا کچھ نہیں۔ **غلط غلطاً فاحشاً** اس ظالم راوی نے فحش غلطی کی ہے **غلط غلطاً فاحشاً** پر گورنر صاحب پنجاب فتوے جاری کر رہے ہیں۔اسی طرح ابن جریر نے ان کی بہت سی، اکثر روایتوں کو یا بہت سی روایتوں کو موضوع قرار دیا ہے کہ جان بوجھ کر جھوٹ گھڑا گیا ہے، ان میں کوئی اصل نہیں۔یہ ہیں وہ So called حدیثیں یعنی مبینہ حدیثیں جن پر ان ظالموں کے فتووں کی بنیادیں ہیں۔

ایک حدیث مجمع الزوائد ومنبع الفوائد للہیثمی المتوفی ۸۰۷ھ، ۸۰۷ ہجری کے ایک مصنف کی ایک کتاب کا حوالہ دے کر جو رسول کریم ﷺ کے ۸۰۷ سال بعد مرا ہے۔اس پر بنا کرتے ہوئے یہ روایت ایک بیان کرتے ہیں یہاں حضرت علی والی روایت ہے کہ حضرت علی بن ابی طالب سے منسوب روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ایک شخص کو قتل کا حکم دیا، جو رسول کریم ﷺ کی گستاخی کرتا تھا یا عورت تھی جو گستاخی کرتی تھی اس کے قتل کا حکم دیا۔اس حدیث کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے کہ حدیث طبرانی اور جامع الصغیر للسیوطی اور دوسری بعض کتب میں بھی یہ حدیث ملتی ہے لیکن اس کا راوی عبداللہ ابن محمد الامری وہ کیسا انسان تھا۔اس کے متعلق علماء حق لکھتے ہیں **رماہ النسائی بالکذب** امام نسائی نے اس کے قطعی طور پر جھوٹا ہونے کا فتویٰ دیا۔ ایک ایسا راوی جس کے قطعی طور پر جھوٹا ہونے کا فتویٰ امام نسعی دے چکے ہیں، یہ معلوم ہونے کے باوجود اس کو فتووں میں داخل کیا جا رہا ہے اور اس کے نتیجے میں قرآنی تعلیم تبدیل کی جارہی ہے۔محمد ناصر الدین البانی اپنی کتاب سلسلۃ الاحادیث الضعیفہ والموضوعہ میں اس روایت کو

بطور مثال کے ایک جھوٹی گھڑی ہوئی روایت کے طور پر پیش کرتے ہیں۔انہوں نے بھی لسان المیزان کے حوالے سے عبید اللہ بن محمد الامری کو قیم بالکذب بیان فرمایا ہے۔یعنی ایسا جھوٹا ہے جو جھوٹ پر پوری طرح قائم اور ہمیشہ قائم رہنے والا تھا۔

ابن حجر العسقلانی متوفی ۸۵۲ھ اپنی کتاب لسان المیزان جلد ۴ صفحہ ۱۱۲ میں اسے غیر ثقہ قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔رماہ النسعی بالکذب کہ یہ وہی شخص ہے جس کو نسعی نے قطعی طور پر جھوٹا قرار دیا تھا۔لسان المیزان جلد ۴ صفحہ ۱۱۲ میں بھی عبید اللہ الامری کو ضعیف قرار دیا گیا اور مذکور حدیث کو خاص طور پر اس مثال کے طور پر پیش کیا ہے کہ موضوع حدیثیں گھڑی ہوئی حدیثیں کیسی ہوتی تھیں ان میں یہی حدیث بیان کی ہے۔جس میں حضرت علیؓ کی طرف روایت منسوب ہوئی اور جس کو آج کے بعض علماء اور بعض اسلامی صوبوں کے گورنر اپنے علم کی شیخی بگھارتے ہوئے وہ پیش کرتے ہیں کہ دیکھو! ہم کتنے بڑے عالم ہیں، ہم نے وہ حدیث بھی معلوم کر لی جس میں ہتک رسول کی قطعی سزا حضرت علیؓ سے مروی ہے۔

ایک اور کتاب ہے جس پہ ان صاحب نے بنا کی ہے اس کے مصنف ہیں عبد الرزاق، ان کا پورا نام ہے ابوبکر عبد الرزاق بن ہمام الصنعانی ۱۲۶ ہجری میں پیدا ہوئے اور ۲۱۱ھ میں وفات پائی۔بہت سی حدیثیں عبد الرزاق کی کتاب سے لی گئی ہیں، جن پر بنا کی گئی ہے۔میں اصل کا حال بتا دیتا ہوں، باقی حدیثوں کی تفصیلی بحث کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔ان کے متعلق تہذیب التہذیب میں لکھا ہے۔وقال العباس العنبری انه لکذابٌ والواقدیُّ اَصْدَقُ مِنہ لکھا ہے یہ ایسا جھوٹا ایسا کذاب انسان ہے کہ واقدی بھی اس کے مقابل پر بہت سچا دکھائی دیتا ہے۔اور واقدی وہ مورخ ہے جس نے سب سے زیادہ رطب و یابس تاریخ اسلام کے حوالے سے اکٹھا کیا ہوا ہے اور جس کو مغربی مصنف سب سے زیادہ پیار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کیونکہ جو گند ان کو چاہئے واقدی میں دکھائی دے دے گا اور یہ تہذیب التہذیب میں جو ایک مستند کتاب ہے لکھتے ہیں۔کہتے ہیں! یہ اتنا جھوٹا انسان ہے جس کی یہ روایتیں ہیں مصنف عبد الرزاق صاحب کہ واقدی کو اس کے مقابل پر دیکھو تو واقدی سچا دکھائی دیتا ہے۔اور زید ابن

مبارک کے حوالے سے کہا گیا ہے کہ **کان عبدالرزاق کذاب یسرق الحدیث** وہ صرف کذاب ہی نہیں تھا بلکہ دوسروں کی حدیثیں بھی چوری کیا کرتا تھا اور اپنی طرف سے منسوب کر دیا کرتا تھا۔انہوں نے ایک باب میں پانچ حدیثیں پیش کی ہیں، جس کو آج کل کے زمانے کے علماء اور گورنر ہتک کرنے والے کے قتل کے حق میں فتووں کے طور پر پیش کر رہے ہیں۔جن کا منبع جھوٹ ہو ان کے فتوے کا کیا حال ہوگا؟

یہ مثالیں سن لیجئے ان کی، وہی بات ہر جگہ یہی مصنف عبدالرزاق صاحب ہیں جو حدیثیں گھڑ گھڑ کے پیش کئے چلے جا رہے ہیں کہ ایک موقع پر رسول اللہ ﷺ کو کسی نے گالی دی۔آپؐ نے فرمایا کون ہے جو مجھے میرے دشمن سے بچائے؟ یہ فقرہ تو ٹکسالی کا ہر جگہ چلایا جا رہا ہے اور ایک شخص کھڑا ہوتا ہے اور وہ کون تھا حضرت زبیرؓ انہوں نے اس کو قتل کر دیا، یہ حوالہ دیا جا رہا ہے اور اصل بات کیا ہے وہ یہ ہے کہ جنگ کے موقع پر جب کہ مبارزہ ہو رہا تھا، یعنی جب پرانے زمانے میں جنگ ہوا کرتی تھی تو ایک ایک دشمن کا ہیرو یا بہادر پہلوان نکلا کرتا تھا اور اس کے مقابل پر وہ آواز دیتا تھا تو ایک دوسرا نکلتا تھا۔تو اس وقت ایک دشمن اسلام نے جنگ کے دوران نکل کر للکارا ہے۔آنحضرت ﷺ نے اعلان فرمایا اور یہی آپؐ کا دستور تھا کہ اس دشمن سے نپٹنے کے لئے کون ہے جو نکلے گا؟ اس وقت حضرت زبیرؓ نکلے اور اس کو قتل کر دیا۔اس کا ہتک رسول کے مضمون سے کیا تعلق ہے، دور کا بھی کوئی تعلق نہیں۔پس جو ایک حدیث سچی نکلی اس جھوٹے کی اس کا حال میں نے آپ کے سامنے کھول دیا ہے، باقی حدیثوں کی تو نہ کوئی سند نہ کوئی بنیاد، کوئی لائق ہی اس بات کے نہیں ہے کہ ان پر غور کیا جائے۔کیونکہ مصنف جھوٹا اور اول درجے کا جھوٹا، ایسا جھوٹا کہ واقدی بھی اس کے چہرے کے سامنے سچا دکھائی دے۔

اب سنیئے ایک ایسی حدیث درج کرتے ہیں **نعوذ باللہ من ذالک** کہ وہ حدیث اس لائق ہے یعنی مصنوعی حدیث کہ جس شخص کے منہ سے نکلے اسے اول درجے کا گستاخ رسول قرار دیا جائے، جس قلم سے نکلے اس قلم کے خلاف فتویٰ دینا جائز ہے کہ وہ نہایت ہی منحوس اور بدبخت قلم ہے، جس نے اس حدیث کو اختیار کر کے لکھنے کی جرأت کی ہے۔اب آپ سنیں گے

تو آپ حیران رہ جائیں گے اور یہ احمدیوں کے خون مباح کرنے والے کورنر صاحب کا حال ہے، اس حدیث کو قبول کر کے اپنی کتاب میں جگہ دینے کے نتیجے میں اگر پاکستان کے قانون میں کسی کی جان حلال ہوتی ہے تو ان کورنر صاحب کی ہے، پہلے ان کو پھانسی چڑھانا چاہئے۔

اب سن لیجئے حدیث یہ بیان کرتے ہیں۔عنوان یہ لگایا ''حضرت علیؓ کا حضرت ماریہ کے چچازاد بھائی کے قتل کے لئے بھیجا جانا''۔حضرت ماریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا آنحضرت ﷺ کے حرم میں تھیں جن کے بطن سے حضرت ابراہیم پیدا ہوئے یہ وہ مقدس عورت ہے جس کے پیٹ سے ایک ایسا وجود پیدا ہوتا ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ کا رسول گواہی دیتا ہے کہ: **لو عاش ابراھیم لکان صدیقاً نبیاً** (سنن ابن ماجہ کتاب الجنائز حدیث نمبر:۱۵۰۰)

خدا کی قسم ہے کہ اگر یہ بچہ زندہ رہتا جو ماریہ کے پیٹ سے مجھے عطا ہوا ہے تو ضرور صدیق نبی بنتا۔ان بدبختوں کا یہ حال ہے ان کے متعلق یہ لکھا ہے کہ حضرت رسول کریم ﷺ کو یہ اطلاع پہنچی کہ اس ماریہ کے پاس ان کا ایک چچازاد بھائی آتا جاتا ہے اور لوگ ان پر الزام لگا رہے ہیں۔آنحضرت ﷺ نے قرآنی تعلیم کے بالکل برخلاف یکطرفہ بات سن کر، نہ ماریہ کو سوال جواب کا موقع دیا نہ تحقیق فرمائی، حضرت علیؓ کو مامور کیا کہ جاؤ اور اس کو قتل کر دو، اس کے سوا اور کوئی سزا نہیں ہے اس کی اور اگلا واقعہ سنیں۔یعنی یہ وہ حدیثیں ہیں جن کے بطن سے ہزار سلمان رشدی پیدا ہو سکتے ہیں اور ایسی ہی وہ حدیثیں ہیں جن سے سلمان رشدی پیدا ہوتے ہیں۔لکھا ہے کہ حضرت علیؓ نے اس شخص کو ایسے حال میں جالیا کہ جب وہ نہا رہا تھا کنویں میں، اس کو ننگی تلوار کر کے کھینچ کر جو باہر نکالا قتل کرنے کے لئے تو پتا لگا وہ تو زنخا ہے نامرد ہے، خدا نے اس کو وہ اعضاء ہی نہیں دیئے جن کے ساتھ انسان کسی عورت سے مباشرت کر سکے۔اسی وقت تلوار نیام میں ڈالی اور رسول اللہ ﷺ سے جا کے عرض کیا کہ میں مار نہیں سکا، مجبوری ہے۔ اناللہ، یعنی ہنسنے کی بات ہے لیکن میرا تو خون کھول اٹھا جب میں نے یہ پڑھا۔انا للہ ایسا خبیثانہ، ایسا ناپاک حملہ حضرت اقدس محمد مصطفیٰ ﷺ کی ذات پر کیا گیا ہے کہ ایک نہیں، میں نے صحیح کہا ہے ہزار سلمان رشدی اس روایت کے بطن سے پیدا ہو سکتے ہیں۔

آنحضورﷺ جن پر قرآن نازل ہوا ہے، جو فرماتا ہے کہ اگر کوئی فاسق اطلاع کرے تو تحقیق کرلیا کرو۔ وہ قرآن جو کہتا ہے کہ پاکباز عورتوں پر جو الزام لگاتے ہیں ان کو اَسّی کوڑوں کی سزا دو، وہ جھوٹے ہیں جب تک وہ چار گواہ پیش نہ کریں۔ ساری قرآنی تعلیم اگر کوئی بھولا تو محمد رسول اللہؐ بھول گئے۔ اے بدبخت دماغو! تمہیں ادنیٰ بھی، ذرا بھی ہوش نہیں کہ کیا بکواس کررہے ہو۔ محمد رسول اللہؐ جن پر قرآن نازل ہوا ہے، جو زندہ قرآن تھے، ان کو قرآن کی تعلیم کا ایک ادنیٰ بھی پاس نہیں تھا۔ اور پھر اس مقدس خاتون پر آنحضرتﷺ نے بغیر کسی تحقیق کے بغیر سوچے سمجھے وہ الزام قبول کرلیا جس کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ پاکباز عورتوں کے متعلق اگر کوئی بات کہے تو وہ لعنتی اور ملعون ہے۔ اور فتویٰ صادر فرمادیا اور یہ نہ سوچا کہ خدا نے اس کے بطن سے مجھے وہ بیٹا عطا کیا تھا، جس کے متعلق خدا سے خبر پا کر میں نے اعلان کیا تھا **لو عاش ابراھیم لکان صدیقاً نبیاً** اس ماریہ کے پیٹ سے جو بیٹا پیدا ہوا ہے، خدا کی قسم! اگر یہ زندہ رہتا تو صدیق نبی بنتا۔ اور پھر نکلا کیا **نعوذباللہ من ذالک** آنحضورؐ غلط ثابت ہوئے اور ثابت ہوا کہ یہ جلد بازی کا فیصلہ تھا، قرآنی اور خدا کی تعلیم کے خلاف تھا اس لئے اس پر عمل بھی نہ ہوسکا۔ یہ محمد رسول اللہؐ کا کردار ہے جو تم پیش کرتے ہو اور ناموس رسولؐ کے محافظ ہونے کے دعوے کرتے ہو۔ تم ہی سے ناموس رسول کو خطرہ ہے، تم ہی سے سب دنیا میں آنحضرتؐ اور اسلام اور قرآن کی عزت کو خطرہ ہے۔

ایک اور روایت، وہ بھی ایسی بدبخت روایت ہے۔ وہ کنویں کی بجائے، ایک تو کنویں سے نکالنے والی روایت ہے، ایک کھجور سے اتارنے والی ہے۔ کہتے ہیں وہ بیچارہ بدنصیب آدمی کھجور پر چڑھا کھجوریں کھا رہا تھا، چھوٹا سا کپڑا اس کے اوپر لپٹا ہوا تھا۔ اس نے جو حضرت علیؓ کے ہاتھ میں تلوار دیکھی تو ڈر کے مارے ایسا کانپا کہ کپڑا اتر گیا۔ (کھجور سے بعد میں اترا کپڑا پہلے اتر چکا تھا۔) اتنی جاہلانہ باتیں ایک انسان پاؤں کی ٹھوکر سے بھی ان چیزوں کو رد کرنے میں تردّد محسوس کرے گا۔ اس لائق نہیں ہیں یہ چیزیں، یہ حیثانہ باتیں جو رسول اللہﷺ کی طرف منسوب کی گئی ہیں۔ اس لائق بھی نہیں ہیں کہ ان کو ٹھوکر ماری جائے، اعراض اور استغفار کا مقام

تھا لیکن ان لوگوں نے اپنے ذاتی گند کو اس طرح اچھالا ہے، اپنے دماغوں کو اس طرح ننگا کیا ہے کہ شاید ہی کم کسی دنیا کے مذہب کے علماء کی تحریروں میں ایسی مثال ملتی ہو۔ اور وہ لفظ تو میں نے پڑھ کے سنائے نہیں، وہ میں آپ کو پڑھ کے سناؤں تو شرم کے مارے آپ پسینہ پسینہ ہو جائیں، جس طرح بیان کیا ہے وہ مزے لے لے کر قلم نے۔ یہ واقعہ یوں ہوا، پھر یہ دیکھا گیا، پھر یہ دیکھا گیا۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ، یہ لوگ تو اس دنیا کے اس دور کے انسان کیا ازمنہ گزشتہ کے بھی انسان نہیں ہیں۔ قرآن کریم جب نازل ہوا، تو محاورہ عربوں میں رائج ہوا تھا، یہ زمانہ جاہلیت کی باتیں ہیں۔ یہ باتیں جو ہیں زمانہ جاہلیت سے بھی پہلے کی جب ابھی انسان نہیں بنا تھا، جانوروں کی دنیا کی باتیں ہیں۔

(خطابات طاہر جلد دوم صفحہ ۳۲۹_۳۳۰)

باب ششم

معجزات اور پیشگوئیوں

پر اعتراضات

معجزہ نہ ملنے کے اعتراضات

ایک عیسائی عبداللہ جیمز نے یہ اعتراض پیش کیا کہ آپؐ کو کوئی معجزہ نہیں ملا اس نے یہ استدلال سورۃ عنکبوت سے اور سورۃ بنی اسرائیل سے کیا اور کہا کہ اگر معجزہ ملتا تو نبوت اور قرآن پر متشکی نہ ہوتے۔ اس کا جواب دیتے ہوئے حضرت مسیح موعود علیہ السلام فرماتے ہیں کہ:

''پوشیدہ نہ رہے کہ ان دونوں آیتوں سے معترض کا مدعا جو استدلال بر نفی معجزات ہے، ہرگز ثابت نہیں ہوتا بلکہ برخلاف اس کے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ضرور ایسے معجزات ظہور پذیر ہوتے رہے ہیں کہ جو ایک صادق و کامل نبی سے ہونے چاہئیں۔ چنانچہ تصریح اس کی نیچے کے بیانات سے بخوبی ہو جائے گی۔

پہلی آیت جس کا ترجمہ معترض نے اپنے دعویٰ کی تائید کیلئے عبارات متعلقہ سے کاٹ کر پیش کر دیا ہے مع اس ساتھ کی دوسری آیتوں کے جن سے مطلب کھلتا ہے، یہ ہے۔

وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ۔ اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ۔ (العنکبوت: ۵۱، ۵۲) وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ؕ وَلَوْلَآ اَجَلٌ مُّسَمًّى لَّجَآءَهُمُ الْعَذَابُ ؕ وَلَيَاْتِيَنَّهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ (العنکبوت: ۵۴)

یعنی کہتے ہیں کیوں نہ اُتریں اس پر نشانیاں کہ وہ نشانیاں (جو تم مانگتے ہو یعنی عذاب کی نشانیاں) وہ تو خدائے تعالیٰ کے پاس اور خاص اس کے اختیار میں ہیں اور میں تو صرف ڈرانے والا ہوں۔ یعنی میرا کام فقط یہ ہے کہ عذاب کے دن سے ڈراؤں نہ یہ کہ اپنی طرف سے عذاب نازل کروں اور پھر فرمایا کہ کیا ان لوگوں کیلئے (جو اپنے پر کوئی عذاب کی نشانی وارد کرانی چاہتے ہیں) یہ رحمت کی نشانی کافی نہیں جو ہم نے تجھ پر (اے رسول اُمّی) وہ کتاب (جو جامع کمالات ہے) نازل کی جو اُن پر پڑھی جاتی ہے یعنی قرآن شریف جو ایک رحمت کا نشان ہے۔ جس سے

درحقیقت وہی مطلب نکلتا ہے جو کفار عذاب کے نشانوں سے پورا کرنا چاہتے ہیں کیونکہ کفار مکہ اس غرض سے عذاب کا نشان مانگتے تھے کہ تا وہ ان پر وارد ہو کر انہیں حق الیقین تک پہنچا دے۔صرف دیکھنے کی چیز نہ رہے کیونکہ مجرد رویت کے نشانوں میں ان کو دھوکے کا احتمال تھا اور چشم بندی وغیرہ کا خیال سوا سوہم اور اضطراب کے دور کرنے کے لئے فرمایا کہ ایسا ہی نشان چاہتے ہو جو تمہارے وجودوں پر وارد ہو جائے تو پھر عذاب کے نشان کی کیا حاجت ہے؟ کیا اس مدّعا کے حاصل کرنے کے لئے رحمت کا نشان کافی نہیں؟ یعنی قرآن شریف جو تمہاری آنکھوں کو اپنی پُرنور اور تیز شعاعوں سے خیرہ کر رہا ہے اور اپنی ذاتی خوبیاں اور اپنے حقائق اور معارف اور اپنے فوق العادت خواص اس قدر دکھلا رہا ہے جس کے مقابلہ ومعارضہ سے تم عاجز رہ گئے ہو اور تم پر اور تمہاری قوم پر ایک خارق عادت اثر ڈال رہا ہے ☆ اور دلوں پر وارد ہو کر عجیب در عجیب تبدیلیاں دکھلا رہا ہے۔مدت ہائے دراز کے مردے اس سے زندہ ہوتے چلے جاتے ہیں

☆ یہ تمام خارق عادت خاصیتیں قرآن شریف کی، جن کی رو سے وہ معجزہ کہلاتا ہے ان مفصلہ ذیل سورتوں میں بہ تفصیل ذیل کہتے ہیں۔ سورۃ البقرۃ، سورۃ ال عمران، سورۃ النساء، سورۃ المائدہ، سورۃ الانعام، سورۃ الاعراف، سورۃ الانفال، سورۃ التوبۃ، سورۃ یونس، سورۃ ھود، سورۃ الرعد، سورۃ ابراھیم، سورۃ الحجر، سورۃ الواقعہ، سورۃ النمل، سورۃ الحج، سورۃ البیّنہ سورۃ المجادلۃ چنانچہ بطور نمونہ چند آیات یہ ہیں فرماتا ہے عزّوجلّ۔

يَهْدِي بِهِ اللَّهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهُ سُبُلَ السَّلَامِ وَيُخْرِجُهُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ (المائدۃ:۱۷) شِفَاءٌ لِمَا فِي الصُّدُورِ (یونس:۵۸) أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا (النحل:۶۶) أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسَالَتْ أَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا

أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَتُصْبِحُ الْأَرْضُ مُخْضَرَّةً (الحج:۶۴)

تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُودُ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ثُمَّ تَلِينُ جُلُودُهُمْ وَقُلُوبُهُمْ إِلَى ذِكْرِ اللَّهِ (الزمر:۲۴)

أَلَا بِذِكْرِ اللَّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ (الرعد:۲۹)

أُولَئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ وَأَيَّدَهُمْ بِرُوحٍ مِنْهُ (المجادلۃ:۲۳)

قُلْ نَزَّلَهُ رُوحُ الْقُدُسِ مِنْ رَبِّكَ بِالْحَقِّ لِيُثَبِّتَ الَّذِينَ آمَنُوا وَهُدًى وَبُشْرَى لِلْمُسْلِمِينَ (النحل:۱۰۳) إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ (الحجر:۱۰) فِيهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ (البینہ:۴)

اور مادرزاد اندھے جو بے شمار پشتوں سے اندھے ہی چلے آتے تھے۔ آنکھیں کھول رہے ہیں اور کفر اور الحاد کی طرح طرح کی بیماریاں اس سے اچھی ہوتی چلی جاتی ہیں اور تعصب کے سخت جذامی اس سے صاف ہوتے جاتے ہیں۔ اس سے نور ملتا ہے اور ظلمت دُور ہوتی ہے اور وصل الٰہی میسر آتا ہے اور اس کی علامات پیدا ہوتی ہیں۔ سوتم کیوں اس رحمت کے نشان کو چھوڑ کر جو ہمیشہ کی زندگی بخشتا ہے عذاب اور موت کا نشان مانگتے ہو؟ پھر بعد اس کے فرمایا کہ یہ قوم تو جلدی سے عذاب ہی مانگتی ہے۔ رحمت کے نشانوں سے فائدہ اُٹھانا نہیں چاہتی۔ اُن کو کہہ دے کہ اگر یہ بات نہ ہوتی کہ عذاب کی نشانیاں وابستہ باوقات ہوتی ہیں تو یہ عذابی نشانیاں بھی کب کی نازل ہوگئی ہوتیں اور عذاب ضرور آئے گا اور ایسے وقت میں آئے گا کہ ان کو خبر بھی نہیں ہوگی۔

اب انصاف سے دیکھو! کہ اس آیت میں کہاں معجزات کا انکار پایا جاتا ہے یہ آیتیں تو بآواز بلند پکار رہی ہیں کہ کفار نے ہلاکت اور عذاب کا نشان مانگا تھا۔ سو اوّل انہیں کہا گیا کہ دیکھو تم میں

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا (بنی اسرائیل : ۸۹) یعنی قرآن کے ذریعہ سے سلامتی کی راہوں کی ہدایت ملتی ہے اور لوگ ظلمت سے نور کی طرف نکالے جاتے ہیں وہ ہر ایک اندرونی بیماری کو اچھا کرتا ہے۔ خدا نے ایک ایسا پانی اُتارا ہے جس سے مردہ زمین زندہ ہو رہی ہے ایسا پانی اُتارا جس سے ہر ایک وادی میں بقدر اپنی وسعت کے بہہ نکلا ہے۔ ایسا پانی اُتارا جس سے گلی سڑی ہوئی زمین سرسبز ہوگئی۔ اس سے خدا خوف بندوں کی جلدیں کانپتی ہیں۔ پھر ان کی جلدیں اور ان کے دل ذکر الٰہی کیلئے نرم ہو جاتے ہیں۔ یاد رکھو کہ قرآن سے دل اطمینان پکڑتے ہیں جو لوگ قرآن کے تابع ہو جائیں اُن کے دلوں میں ایمان لکھا جاتا ہے اور روح القدس انہیں ملتا ہے۔ روح القدس نے ہی قرآن کو اُتارا تا قرآن ایمانداروں کے دلوں کو مضبوط کرے اور مسلمین کیلئے ہدایت اور بشارت کا نشان ہو۔ ہم نے ہی قرآن کو اُتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں، یعنی کیا صورت کے لحاظ سے اور کیا خاصیت کے لحاظ سے ہمیشہ قرآن اپنی حالت اصلی پر رہے گا اور الٰہی حفاظت کا اس پر سایہ ہوگا۔ پھر فرمایا کہ قرآن میں تمام معارف وحقائق و صداقتیں ہیں جو حقانی کتابوں میں پائی جاتی ہیں۔ اور اس کی مثل بنانے پر کوئی انسان و جن قادر نہیں اگرچہ اس کام کیلئے باہم مدد و معاون ہو جائیں۔

زندگی بخش نشان موجود ہے یعنی قرآن جو تم پر وارد ہو کر تمہیں ہلاک کرنا نہیں چاہتا بلکہ ہمیشہ کی حیات بخشتا ہے مگر جب عذاب کا نشان تم پر وارد ہوا تو وہ تمہیں ہلاک کرے گا۔ پس کیوں تم ناحق اپنا مرنا ہی چاہتے ہو اور اگر تم عذاب ہی مانگتے ہو تو یاد رکھو کہ وہ بھی جلد آئے گا۔ پس اللہ جل شانہٗ نے ان آیات میں عذاب کے نشان کا وعدہ دیا ہے اور قرآن شریف میں جو رحمت کے نشان ہیں اور دلوں پر وارد ہو کر اپنا خارق عادت اثر ان پر ظاہر کرتے ہیں ان کی طرف توجہ دلائی۔ پر معترض کا یہ گمان کہ اس آیت میں **لا نافیہ** جنس معجزات کی نفی پر دلالت کرتا ہے۔ جس سے کل معجزات کی نفی لازم آتی ہے۔ محض صرف ونحو سے ناواقفیت کی وجہ سے ہے۔ یاد رکھنا چاہئے کہ نفی کا اثر اُسی حد تک محدود ہوتا ہے جو متکلم کے ارادہ میں متعین ہوتی ہے۔ خواہ وہ ارادہ تصریحاً بیان کیا گیا ہو یا اشارۃً۔ مثلاً کوئی کہے کہ اب سردی کا نام ونشان باقی نہیں رہا، تو ظاہر ہے کہ اس نے اپنے بلدہ کی حالت موجودہ کے موافق کہا ہے اور گو اس نے بظاہر اپنے شہر کا نام بھی نہیں لیا مگر اس کے کلام سے یہ سمجھنا کہ اس کا یہ دعویٰ ہے کہ کل کوہستانی ملکوں سے بھی سردی جاتی رہی اور سب جگہ سخت اور تیز دھوپ پڑنے لگی اور اس کی دلیل یہ پیش کرنا کہ جس **لا** کو اس نے استعمال کیا ہے وہ نفی جنس کا **لا** ہے۔ جس کا تمام جہان پر اثر پڑنا چاہئے، درست نہیں۔ مکہ کے مغلوب بت پرست جنہوں نے آخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور آنجناب کے معجزات کو معجزہ کرکے مان لیا اور جو کفر کے زمانہ میں بھی صرف خشک منکر نہیں تھے بلکہ روم اور ایران میں بھی جاکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو **متعجبانہ** خیال سے ساحر مشہور کرتے تھے اور گو بے جا پیرایوں میں ہی سہی، مگر نشانوں کا اقرار کرلیا کرتے تھے۔ جن کے اقرار قرآن شریف میں موجود ہیں۔ وہ اپنے ضعیف اور کمزور کلام میں جو انوار ساطعہ نبوت محمدیہ کے نیچے دبے ہوئے تھے کیوں **لا** نافیہ استعمال کرنے لگے۔ اگر ان کو ایسا ہی لمبا چوڑا انکار ہوتا تو وہ بالآخر نہایت درجہ کے یقین سے جو انہوں نے اپنے خونوں کے بہانے اور اپنی جانوں کے فدا کرنے سے ثابت کردیا تھا مشرف بالاسلام کیوں ہوجاتے؟ اور کفر کے ایام میں جو اُن کے بار بار کلمات قرآن شریف میں درج ہیں وہ یہی ہیں کہ وہ اپنی کوتہ بینی کے دھوکہ سے آنحضرت صلی

اللہ علیہ وسلم کا نام ساحر رکھتے تھے۔ جیسا کہ اللہ جل شانہٗ فرماتا ہے:

وَإِنْ يَرَوْا آيَةً يُعْرِضُوا وَيَقُولُوا سِحْرٌ مُسْتَمِرٌّ (القمر:۳) یعنی جب کوئی نشان دیکھتے ہیں تو منہ پھیر لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ پکا جادو ہے۔ پھر دوسری جگہ فرماتا ہے وَعَجِبُوا أَنْ جَاءَهُمْ مُنْذِرٌ مِنْهُمْ وَقَالَ الْكَافِرُونَ هَٰذَا سَاحِرٌ كَذَّابٌ (ص:۵) یعنی انہوں نے اس بات سے تعجب کیا کہ انہیں میں سے ایک شخص اُن کی طرف بھیجا گیا اور بے ایمانوں نے کہا کہ یہ تو جادوگر کذّاب ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جبکہ وہ نشانوں کو دیکھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جادوگر کہتے تھے اور پھر اس کے بعد انہیں نشانوں کو معجزہ کر کے مان بھی لیا اور جزیرہ کا جزیرہ مسلمان ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاک معجزات کا ہمیشہ کیلئے سچے دل سے گواہ بن گیا تو پھر ایسے لوگوں سے کیونکر ممکن ہے کہ وہ عام طور پر نشانوں سے صاف منکر ہو جاتے اور انکار معجزات میں ایسا **لا** نافیہ استعمال کرتے جو اُن کی حد حوصلہ سے باہر اور ان کی مستمر رائے سے بعید تھا بلکہ قرائن سے آفتاب کی طرح ظاہر ہے کہ جس جس جگہ پر قرآن شریف میں کفّار کی طرف سے یہ اعتراض لکھا گیا ہے کہ کیوں اس پیغمبر پر کوئی نشانی نہیں اُتری؟ ساتھ ہی یہ بھی بتلا دیا گیا ہے کہ اُن کا مطلب یہ ہے کہ جو نشانیاں ہم مانگتے ہیں۔ اُن میں سے کوئی نشانی کیوں نہیں اُترتی۔ ☆

☆ **حاشیہ**: واضح ہو کہ قرآن شریف میں نشان مانگنے کے سوالات کفّار کی طرف سے صرف ایک دو جگہ نہیں بلکہ کئی مقامات میں یہی سوال کیا گیا ہے اور ان سب مقامات کو بنظر یکجائی دیکھنے سے ثابت ہوتا ہے کہ کفّارِ مکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تین قسم کے نشانات مانگا کرتے تھے۔

(۱) وہ نشان جو عذاب کی صورت میں فقط اپنے اقتراح سے کفّارِ مکہ نے طلب کئے تھے۔

(۲) دوسرے وہ نشان جو عذاب کی صورت میں یا مقدمہ عذاب کی صورت میں پہلی اُمتوں پر وارد کئے گئے تھے۔

(۳) تیسرے وہ نشان جس سے پردہ غیبی بکلّی اُٹھ جائے۔ جس کا اُٹھ جانا ایمان بالغیب کے بکلّی برخلاف ہے۔ سو عذاب کے نشان ظاہر ہونے کے لئے جو سوال کئے گئے ہیں ان کا جواب تو قرآن شریف میں یہی دیا

اب قصہ کوتاہ یہ کہ آپ نے آیت متذکرہ بالا کے لانافیہ کو قرائن کی حد سے زیادہ کھینچ دیا ہے ایسا لانافیہ عربوں کے کبھی خواب میں بھی نہیں آیا ہوگا۔ان کے دل تو اسلام کی حقیت سے بھرے ہوئے تھے۔تب ہی تو سب کے سب بجز معدودے چند کہ جو اس عذاب کو پہنچ گئے تھے جس کا اُن کو وعدہ دیا گیا تھا بالآخر مشرف بالاسلام ہو گئے تھے اور یاد رہے کہ ایسا لانافیہ حضرت مسیح کے کلام میں بھی پایا جاتا ہے اور وہ یہ ہے۔فریسیوں نے مسیح کے نشانات طلب کئے اُس نے آہ کھینچ کر کہا کہ اس زمانہ کے لوگ کیوں نشان چاہتے ہیں میں تم سے سچ کہتا ہوں اِس زمانہ کے لوگوں کو کوئی نشان نہیں دیا جائے گا۔دیکھو مرقس ۸ باب ۱۱۔

اب دیکھو کیسا حضرت مسیح نے صفائی سے انکار کر دیا ہے اگر غور فرمائیں تو آپ کا اعتراض اس اعتراض کے آگے کچھ بھی چیز نہیں کیونکہ آپ نے فقط کفار کا انکار پیش کیا اور وہ بھی نہ عام انکار

(بقیہ حاشیہ) گیا ہے کہ تم منتظر رہو عذاب نازل ہوگا۔ہاں ایسی صورت کا عذاب نازل کرنے سے انکار کیا گیا ہے جس کی پہلے تکذیب ہو چکی ہے تاہم عذاب نازل ہونے کا وعدہ دیا گیا ہے جو آخر غزوات کے ذریعہ سے پورا ہو گیا۔لیکن تیسری قسم کا نشان دکھلانے سے بکلی انکار کیا گیا ہے اور خود ظاہر ہے کہ ایسے سوال کا جواب انکار ہی تھا نہ اور کچھ۔کیونکہ کفار کہتے تھے کہ تب ہم ایمان لائیں گے کہ جب ہم ایسا نشان دیکھیں کہ زمین سے آسمان تک نردبان رکھی جائے اور تو ہمارے دیکھتے دیکھتے اس نردبان کے ذریعہ سے زمین سے آسمان پر چڑھ جائے اور فقط تیرا آسمان پر چڑھنا ہم ہرگز قبول نہیں کریں گے جب تک آسمان سے ایک ایسی کتاب نہ لاوے جس کو ہم پڑھ لیں اور پڑھیں بھی اپنے ہاتھ میں لے کر۔یا تو ایسا کر کہ مکہ کی زمین میں جو ہمیشہ پانی کی تکلیف رہتی ہے۔شام اور عراق کے ملک کی طرح نہریں جاری ہو جائیں اور جس قدر ابتدا دنیا سے آج تک ہمارے بزرگ مر چکے ہیں، سب زندہ ہو کر آ جائیں اور اس میں قصی بن کلاب بھی ہو کیونکہ وہ بڈھا ہمیشہ سچ بولتا تھا۔اس سے ہم پوچھیں گے کہ تیرا دعویٰ حق ہے یا باطل؟ یہ سخت خود تراشیدہ نشان تھے جو وہ مانگتے تھے، اور پھر بھی نہ صاف طور پر بلکہ شرط پر شرط لگانے سے جن کا ذکر قرآن شریف میں جابجا آیا ہے۔پس سوچنے والے کیلئے عرب کے شریروں کی ایسی درخواستیں ہمارے سیّد و مولیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات ظاہرہ و آیات

بلکہ خاص نشانات کے بارے میں اور ظاہر ہے کہ دشمن کا انکار بکلّی قابل اطمینان نہیں ہوتا کیونکہ دشمن خلاف واقعہ بھی کہہ جاتا ہے مگر حضرت مسیح تو آپ اپنے مُنہ سے معجزات کے دکھلانے سے انکار کر رہے ہیں اور نفی صدورِ معجزات کو زمانہ کے ساتھ متعلق کر دیا ہے اور فرماتے ہیں کہ اس زمانے کے لوگوں کو کوئی نشان دیا نہ جائے گا پس اس سے بڑھ کر انکار معجزات کے بارے میں اور کون سا بیان واضح ہو سکتا ہے اور اس **لا** نافیہ سے بڑھ کر پھر اور کونسا لا نافیہ ہوگا۔

پھر دوسری آیت کا ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔ اس میں بھی سیاق سباق کی آیتوں سے بالکل الگ کر کے اس پر اعتراض وارد کر دیا ہے مگر اصل آیت اور اس کے متعلقات پر نظر ڈالنے سے ہر ایک منصف بصیر سمجھ سکتا ہے کہ آیت میں ایک بھی ایسا لفظ نہیں ہے کہ جو انکار معجزات پر دلالت کرتا ہو بلکہ تمام الفاظ صاف بتلا رہے ہیں کہ ضرور معجزات ظہور میں آئے۔ چنانچہ وہ آیت معہ اس کے دیگر آیات متعلقہ کے یہ ہے۔

بقیہ حاشیہ: بینہ و رسولانہ ہیبت پر صاف اور کھلی کھلی دلیل ہے۔ خدا جانے ان دل کے اندھوں کو ہمارے مولیٰ و آقا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے انوار صداقت نے کس درجہ تک عاجز و تنگ کر رکھا تھا اور کیا کچھ آسمانی تائیدات و برکات کی بارشیں ہو رہی تھیں کہ جن سے خیرہ ہو کر اور جن کی ہیبت سے منہ پھیر کر سراسر ٹالنے اور بھاگنے کی غرض سے ایسی دور از صواب درخواستیں پیش کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے معجزات کا دکھلانا ایمان بالغیب کی حد سے باہر ہے۔ یوں تو اللہ جلشانہٗ قادر ہے کہ زمین سے آسمان تک زینہ رکھ دیوے۔ جس کو سب لوگ دیکھ لیویں اور دو چار ہزار کیا دو چار کروڑ آدمیوں کو زندہ کر کے ان کے منہ سے اُن کی اولاد کے سامنے صدق نبوت کی گواہی دلا دیوے۔ یہ سب کچھ وہ کر سکتا ہے مگر ذرا سوچ کر دیکھو کہ اس انکشاف تام سے ایمان بالغیب جو مدار ثواب اور اجر ہے دور ہو جاتا ہے اور دنیا نمونہ محشر ہو جاتی ہے۔ پس جس طرح قیامت کے میدان میں جو انکشاف تام کا وقت ہوگا ایمان کام نہیں آتا۔ اسی طرح اس انکشاف تام سے بھی ایمان لانا کچھ مفید نہیں بلکہ ایمان اسی حد تک ایمان کہلاتا ہے کہ جب کچھ اخفا بھی باقی رہے جب سارے پردے کھل گئے تو پھر ایمان ایمان نہیں رہتا اسی وجہ سے سارے نبی ایمان بالغیب کی رعایت سے معجزے دکھلاتے رہے ہیں کبھی کسی نبی نے ایسا نہیں کیا کہ ایک شہر کا شہر زندہ کر کے ان سے اپنی نبوت کی گواہی دلاوے یا آسمان تک نردبان رکھ کر اور سب کے روبرو چڑھ کر تمام دنیا کو تماشا دکھلاوے۔

وَاِنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اِلَّا نَحْنُ مُهْلِكُوْهَا قَبْلَ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ اَوْ مُعَذِّبُوْهَا عَذَابًا شَدِيْدًا ؕ كَانَ ذٰلِكَ فِي الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا ۔ وَمَا مَنَعَنَآ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ اِلَّآ اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ ؕ وَاٰتَيْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوْا بِهَا ؕ وَمَا نُرْسِلُ بِالْاٰيٰتِ اِلَّا تَخْوِيْفًا (بنی اسرائیل:۵۹،۶۰) فرماتا ہے عزوجل کہ یوں تو قیامت سے پہلے ہر ایک بستی کو ہم نے ہی ہلاک کرنا ہے یا عذاب شدید نازل کرنا ہے یہی کتاب میں مندرج ہو چکا ہے۔مگر اس وقت ہم بعض ان گذشتہ قہری نشانوں کو(جو عذاب کی صورت میں پہلی اُمتوں پر نازل ہو چکے ہیں)اس لئے نہیں بھیجتے جو پہلی اُمت کے لوگ اس کی تکذیب کر چکے ہیں ۔چنانچہ ہم نے ثمود کو بطور نشان کے جو مقدمہ عذاب کا تھا ناقہ دیا جو حق نما نشان تھا۔(جس پر انہوں نے ظلم کیا۔یعنی وہی ناقہ جس کی بسیار خوری اور بسیار نوشی کی وجہ سے شہر حجر کے باشندوں کے لئے جو قوم ثمود میں سے تھے۔پانی تالاب وغیرہ کا پینے کے لئے باقی رہا تھا اور نہ اُن کے مویشی کیلئے کوئی چراگاہ رہی تھی اور ایک سخت تکلیف اور رنج اور بلا میں گرفتار ہوگئی تھی)اور قہری نشانوں کے نازل کرنے سے ہماری غرض یہی ہوتی ہے کہ لوگ اُن سے ڈریں یعنی قہری نشان تو صرف تخویف کیلئے دکھلائے جاتے ہیں پس ایسے قہری نشانوں کے طلب کرنے سے کیا فائدہ جو پہلی اُمتوں نے دیکھ کر انہیں جھٹلا دیا اور اُن کے دیکھنے سے کچھ بھی خائف وہراساں نہ ہوئے ۔

اس جگہ واضح ہو کہ نشان دو قسم کے ہوتے ہیں۔

(۱)نشان تخویف و تعذیب جن کو قہری نشان بھی کہہ سکتے ہیں۔

(۲)نشان تبشیر و تسکین جن کو نشان رحمت سے بھی موسوم کر سکتے ہیں ۔

تخویف کے نشان سخت کافروں اور کج دلوں اور نافرمانوں اور بے ایمانوں اور فرعونی طبیعت والوں کیلئے ظاہر کئے جاتے ہیں تا وہ ڈریں اور خدائے تعالیٰ کی قہری اور جلالی ہیبت ان کے دلوں پر طاری ہو۔اور تبشیر کے نشان اُن حق کے طالبوں اور مخلص مومنوں اور سچائی کے متلاشیوں کیلئے ظہور پذیر ہوتے ہیں جو دل کی غربت اور فروتنی سے کامل یقین اور زیادت ایمان کے طلبگار ہیں

اور تبشیر کے نشانوں سے ڈرانا اور دھمکانا مقصود نہیں ہوتا بلکہ اپنے اُن مطیع بندوں کو مطمئن کرنا اور ایمانی اور یقینی حالات میں ترقی دینا اور ان کے مضطرب سینہ پر دستِ شفقت و تسلّی رکھنا مقصود ہوتا ہے۔ سو مومن قرآن شریف کے وسیلہ سے ہمیشہ تبشیر کے نشان پاتا رہتا ہے اور ایمان اور یقین میں ترقی کرتا جاتا ہے۔ تبشیر کے نشانوں سے مومن کو تسلی ملتی ہے اور وہ اضطراب جو فطرتاً انسان میں ہے جاتا رہتا ہے اور سکینت دل پر نازل ہوتی ہے۔ مومن ببرکت اتباع کتاب اللہ اپنی عمر کے آخری دن تک تبشیر کے نشانوں کو پاتا رہتا ہے اور تسکین اور آرام بخشنے والے نشان اس پر نازل ہوتے رہتے ہیں تا وہ یقین اور معرفت میں بے نہایت ترقیاں کرتا جائے اور حق الیقین تک پہنچ جائے اور تبشیر کے نشانوں میں ایک لطف یہ ہوتا ہے کہ جیسے مومن ان کے نزول سے یقین اور معرفت اور قوتِ ایمان میں ترقی کرتا ہے ایسا ہی وہ بوجہ مشاہدہ آلاء و نعماءِ الٰہی و احسانات ظاہرہ و باطنہ و جلیہ و خفیہ حضرت باری عزّ اسمہٗ جو تبشیر کے نشانوں میں بھرے ہوئے ہوتے ہیں محبت و عشق میں بھی دن بدن بڑھتا جاتا ہے۔ سو حقیقت میں عظیم الشان اور قوی الاثر اور مبارک اور موصل الی المقصود تبشیر کے نشان ہی ہوتے ہیں جو سالک کو معرفتِ کاملہ اور محبتِ ذاتیہ کے اس مقام تک پہنچا دیتے ہیں جو اولیاء اللہ کے لئے منتہی المقامات ہے اور قرآن شریف میں تبشیر کے نشانوں کا بہت کچھ ذکر ہے یہاں تک کہ اس نے اُن نشانوں کو محدود نہیں رکھا بلکہ ایک دائمی وعدہ دے دیا ہے کہ قرآن شریف کے سچے متبع ہمیشہ ان نشانوں کو پاتے رہیں گے جیسا کہ وہ فرماتا ہے:

لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۚ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۚ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (یونس: ۶۵) یعنی ایماندار لوگ دنیوی زندگی اور آخرت میں بھی تبشیر کے نشان پاتے رہیں گے۔ جن کے ذریعے سے وہ دنیا اور آخرت میں معرفت اور محبت کے میدانوں میں ناپیدا کنار ترقیاں کرتے جائیں گے۔ یہ خدا کی باتیں ہیں جو کبھی نہیں ٹلیں گی اور تبشیر کے نشانوں کو پالینا یہی **فوز عظیم** ہے (یعنی یہی ایک امر ہے جو محبت اور معرفت کے منتہی مقام تک پہنچا دیتا ہے)۔

اب جاننا چاہئے کہ خدا تعالیٰ نے اس آیت میں جو معترض نے بصورت اعتراض پیش کی ہے صرف تخویف کے نشانوں کا ذکر کیا ہے۔ جیسا کہ آیت وَ مَا نُرۡسِلُ بِالۡاٰیٰتِ اِلَّا تَخۡوِیۡفًا (بنی اسرائیل:۶۰) سے ظاہر ہو رہا ہے۔ کیونکہ اگر خدائے تعالیٰ کے کل نشانوں کو قہری نشانوں میں ہی محصور سمجھ کر اس آیت کے یہ معنی کئے جائیں کہ ہم تمام نشانوں کو محض تخویف کی غرض سے ہی بھیجا کرتے ہیں اور کوئی دوسری غرض نہیں ہوتی۔ تو یہ معنی بہ بداہت باطل ہیں۔ جیسا کہ ابھی بیان ہو چکا ہے کہ نشان دو غرضوں سے بھیجے جاتے ہیں یا تخویف کی غرض سے یا تبشیر کی غرض سے۔ انہیں دو قسموں کو قرآن شریف اور بائیبل بھی جا بجا ظاہر کر رہی ہے۔ پس جب کہ نشان دو قسم کے ہوئے تو آیت ممدوحہ بالا میں جو لفظ الآیـــات ہے (جس کے معنی وہ نشانات) بہرحال اسی تاویل پر بصحت منطبق ہوگا کہ نشانوں سے قہری نشان مراد ہیں کیونکہ اگر یہ معنی نہ لئے جائیں تو پھر اس سے یہ لازم آتا ہے کہ تمام نشانات جو تحت قدرت الٰہی داخل ہیں۔ تخویف کی قسم میں ہی محصور ہیں حالانکہ فقط تخویف کی قسم میں ہی سارے نشانوں کا حصر سمجھنا سراسر خلاف واقعہ ہے کہ جو نہ کتاب اللہ کی رو سے اور نہ عقل کی رو سے اور نہ کسی پاک دل کے کانشنس کی رو سے درست ہو سکتا ہے۔

اب چونکہ اس بات کا صاف فیصلہ ہو گیا کہ نشانوں کی دو قسموں میں سے صرف تخویف کے نشانوں کا آیات موصوفہ بالا میں ذکر ہے تو یہ دوسرا امر تنقیح طلب باقی رہا کہ کیا اس آیت کے (جو مَامَنَعَنَا الخ ہے) یہ معنی سمجھنے چاہئیں کہ تخویف کا کوئی نشان خدائے تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر ظاہر نہیں کیا یا یہ معنی سمجھنے چاہئیں کہ تخویف کے نشانوں میں سے وہ نشان ظاہر نہیں کئے گئے جو پہلی اُمتوں کو دکھلائے گئے تھے اور یا یہ تیسرے معنی قابل اعتبار ہیں کہ دونوں قسم کے تخویف کے نشان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ سے ظاہر ہوتے رہے ہیں۔ بجز اُن خاص قسم کے بعض نشانوں کے جن کو پہلی پہلی اُمتوں نے دیکھ کر جھٹلا دیا تھا اور ان کو معجزہ نہیں سمجھا تھا۔

سو واضح ہو کہ آیات متنازعہ فیہا پر نظر ڈالنے سے بتمام تر صفائی کھل جاتا ہے کہ پہلے اور

دوسرے معنی کسی طرح درست نہیں۔ کیونکہ آیت ممدوحہ بالا کے یہ سمجھ لینا کہ تمام انواع واقسام کے وہ تخویفی نشان جو ہم بھیج سکتے ہیں اور تمام وہ وراء الوراء تعذیبی نشان جن کے بھیجنے پر غیر محدود طور پر ہم قادر ہیں اس لئے ہم نے نہیں بھیجے کہ پہلی اُمتیں اُس کی تکذیب کر چکی ہیں۔ یہ معنے سراسر باطل ہیں۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ پہلی اُمتوں نے انہیں نشانوں کی تکذیب کی جو انہوں نے دیکھے تھے وجہ یہ کہ تکذیب کیلئے یہ ضرور ہے کہ جس چیز کی تکذیب کی جائے۔ اوّل اس کا مشاہدہ بھی ہو جائے۔ جس نشان کو ابھی دیکھا ہی نہیں اس کی تکذیب کیسی حالانکہ نادیدہ نشانوں میں سے ایسے اعلیٰ درجہ کے نشان بھی تحت قدرت باری تعالیٰ ہیں جس کی کوئی انسان تکذیب نہ کر سکے اور سب گردنیں اُن کی طرف جھک جائیں۔ کیونکہ خدائے تعالیٰ ہر ایک رنگ کا نشان دکھلانے پر قادر ہے اور پھر چونکہ نشان ہائے قدرت باری غیر محدود اور غیر متناہی ہیں تو پھر یہ کہنا کیونکر درست ہو سکتا ہے کہ محدود زمانہ میں وہ سب دیکھے بھی گئے اور ان کی تکذیب بھی ہو گئی۔ وقت محدود میں تو وہی چیز دیکھی جائے گی جو محدود ہو گی۔ بہر حال اس آیت کے یہی معنی صحیح ہوں گے کہ جو بعض نشانات پہلے کفار دیکھ چکے تھے اور ان کی تکذیب کر چکے تھے۔ ان کا دوبارہ بھیجنا عبث سمجھا گیا۔ جیسا کہ قرینہ بھی انہیں معنوں پر دلالت کرتا ہے یعنی اس موقعہ پر جو ناقہ ثمود کا خدائے تعالیٰ نے ذکر کیا ہے وہ ذکر ایک بھاری قرینہ اس بات پر ہے کہ اس جگہ گذشتہ اور ردّ کردہ نشانات کا ذکر ہے جو تخویف کے نشانوں میں سے تھے اور یہی تیسرے معنی ہیں جو صحیح اور درست ہیں۔

پھر اس جگہ ایک اور بات منصفین کے سوچنے کے لائق ہے جس سے اُن پر ظاہر ہو گا کہ آیت وَمَا مَنَعَنَآ اَنۡ نُّرۡسِلَ بِالۡاٰيٰتِ الخ (بنی اسرائیل: ۶۰) سے ثبوت معجزات ہی پایا جاتا ہے نہ نفی معجزات کیونکہ الاٰیٰت کے لفظ پر جو الف لام واقعہ ہے وہ بموجب قواعد نحو کے دو صورتوں سے خالی نہیں۔ یا کل کے معنے دے گا یا خاص کے اگر کل کے معنے دے گا تو یہ معنے کئے جائیں گے کہ ہمیں کل معجزات کے بھیجنے سے کوئی امر مانع نہیں ہوا مگر اگلوں کا ان کو جھٹلانا اور اگر خاص کے معنی دے گا تو یہ معنی ہونگے کہ ہمیں ان خاص نشانیوں کے بھیجنے سے (جنہیں منکر طلب

کرتے ہیں) کوئی امر مانع نہیں ہوا مگر یہ کہ ان نشانیوں کو اگلوں نے تو جھٹلایا۔ بہر حال ان دونوں صورتوں میں نشانوں کا آنا ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر یہ معنی ہوں کہ ہم نے ساری نشانیاں بوجہ تکذیب اُمم گذشتہ نہیں بھیجیں تو اس سے بعض نشانوں کا بھیجنا ثابت ہوتا ہے جیسے مثلاً اگر کوئی کہے کہ میں نے اپنا سارا مال زید کو نہیں دیا تو اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ اس نے کچھ حصہ اپنے مال کا زید کو ضرور دیا ہے اور اگر یہ معنے لیں کہ بعض خاص نشان ہم نے نہیں بھیجے تو بھی بعض دیگر کا بھیجنا ثابت ہے۔ مثلاً اگر کوئی کہے کہ بعض خاص چیزیں میں نے زید کو نہیں دیں تو اس سے صاف پایا جائے گا کہ بعض دیگر ضرور دی ہیں۔ بہر حال جو شخص اوّل اس آیت کے سیاق وسباق کی آیتوں کو دیکھے کہ کیسی وہ دونوں طرف سے عذاب کے نشانوں کا قصہ بتلا رہی ہیں اور پھر ایک دوسری نظر اُٹھاوے اور خیال کرے کہ کیا یہ معنی صحیح اور قرین قیاس ہیں کہ خدائے تعالیٰ کے تمام نشانوں اور عجائب کاموں کی جو اس کی بے انتہا قدرت سے وقتاً فوقتاً پیدا ہونے والے اور غیر محدود ہیں پہلے لوگ اپنے محدود زمانہ میں تکذیب کر چکے ہوں۔ اور پھر ایک تیسری نظر منصفانہ سے کام لے کر سوچے کہ کیا اس جگہ تخویف کے نشانوں کا ایک خاص بیان ہے یا تبشیر اور رحمت کے نشانوں کا بھی کچھ ذکر ہے اور پھر ذرا چوتھی نگاہ اَلْآیَات کے ال پر بھی ڈال دیوے کہ وہ کن معنوں کا افادہ کر رہا ہے تو اس چار طور کی نظر کے بعد بجز اس کے کہ کوئی تعصب کے باعث حق پسندی سے بہت دور جا پڑا ہو ہر ایک شخص اپنے اندر سے نہ ایک شہادت بلکہ ہزاروں شہادتیں پائے گا کہ اس جگہ نفی کا حرف صرف نشانوں کی ایک قسم خاص کی نفی کیلئے آیا ہے جس کا دوسری اقسام پر کچھ اثر نہیں بلکہ اس سے ان کا متحقق الوجود ہونا ثابت ہو رہا ہے اور ان آیات میں نہایت صفائی سے اللہ جل شانہٗ بتلا رہا ہے کہ اس وقت تخویفی نشان جن کی یہ لوگ درخواست کرتے ہیں صرف اس وجہ سے نہیں بھیجے گئے کہ پہلی اُمتیں ان کی تکذیب کر چکی ہیں۔ سو جو نشان پہلے ردّ کئے گئے اب بار بار انہیں کو نازل کرنا کمزوری کی نشانی ہے اور غیر محدود قدرتوں والے کی شان سے بعید۔ پس ان آیات میں یہ صاف اشارہ ہے کہ عذاب کے نشان ضرور نازل ہوں گے مگر اور رنگوں میں۔ یہ کیا ضرورت ہے کہ وہی نشان حضرت موسیٰؑ کے یا وہی نشان حضرت نوحؑ

اور قوم لوط اور عاد اور ثمود کے ظاہر کئے جائیں۔ چنانچہ ان آیات کی تفصیل دوسری آیات میں زیادہ تر کی گئی ہے جیسا کہ اللہ جلّ شانہٗ فرماتا ہے۔

یعنی یہ لوگ تمام نشانوں کو دیکھ کر ایمان نہیں لاتے۔ پھر جب تیرے پاس آتے ہیں تو تجھ سے لڑتے ہیں اور جب کوئی نشان پاتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم کبھی نہیں مانیں گے۔ جب تک ہمیں خود ہی وہ باتیں حاصل نہ ہوں جو رسولوں کو ملتی ہیں۔ کہہ میں کامل ثبوت لے کر اپنے ربّ کی

طرف سے آیا ہوں اور تم اس ثبوت کو دیکھتے ہو اور پھر تکذیب کر رہے ہو۔ جس چیز کو تم جلدی سے مانگتے ہو (یعنی عذاب) وہ تو میرے اختیار میں نہیں۔ حکم اخیر صادر کرنا تو خدا ہی کا منصب ہے، وہی حق کو کھول دے گا اور وہی خیر الفاصلین ہے جو ایک دن میرا اور تمہارا فیصلہ کردے گا۔ خدا نے میری رسالت پر روشن نشان تمہیں دیئے ہیں۔ سو جو ان کو شناخت کرے اُس نے اپنے ہی نفس کو فائدہ پہنچایا اور جو اندھا ہو جائے اس کا وبال بھی اسی پر ہے میں تو تم پر نگہبان نہیں۔ اور تجھ سے عذاب کیلئے جلدی کرتے ہیں۔ کہہ وہی پروردگار اس بات پر قادر ہے کہ اوپر سے یا تمہارے پاؤں کے نیچے سے کوئی عذاب تم پر بھیجے اور چاہے تو تمہیں دو فریق بنا کر ایک فریق کی لڑائی کا دوسرے کو مزا چکھا دے اور یہ کہ سب خوبیاں اللہ کے لئے ہیں۔ وہ تمہیں ایسے نشان دکھائے گا جنہیں تم شناخت کر لو گے اور کہہ تمہارے لئے ٹھیک ٹھیک ایک برس کی میعاد ہے☆ نہ اس سے تم تاخیر کر سکو گے نہ تقدیم۔ اور تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا یہ سچ بات ہے۔ کہہ ہاں مجھے قسم ہے اپنے ربّ کی کہ یہ سچ ہے اور تم خدائے تعالیٰ کو اس کے وعدوں سے روک نہیں سکتے۔ ہم عنقریب ان کو اپنے نشان دکھلائیں گے۔ ان کے ملک کے اردگرد میں اور خود اُن میں بھی یہاں تک کہ اُن پر کھل جائے گا کہ یہ نبی سچا ہے۔ انسان کی فطرت میں جلدی ہے میں عنقریب تمہیں اپنے نشان دکھلاؤں گا سو تم مجھ سے جلدی تو مت کرو۔

اب دیکھو کہ ان آیات میں نشان مطلوبہ کے دکھلانے کے بارے میں کیسے صاف اور پختہ وعدے دیئے گئے ہیں یہاں تک کہ یہ بھی کہا گیا کہ ایسے کھلے کھلے نشان دکھلائے جائیں گے کہ تم ان کو شناخت کر لو گے اور اگر کوئی کہے کہ یہ تو ہم نے مانا کہ عذاب کے نشانوں کے بارے میں جابجا قرآن شریف میں وعدے دیئے گئے ہیں کہ وہ ضرور کسی دن دکھلائے جائیں گے اور یہ بھی ہم نے تسلیم کیا کہ وہ سب وعدے اس زمانہ میں پورے بھی ہو گئے کہ جب کہ خدائے تعالیٰ نے اپنی خداوندی قدرت دکھلا کر مسلمانوں کی کمزوری اور ناتوانی کو دور کر دیا اور معدودے چند سے

☆ یوم سے مراد اس جگہ برس ہے۔ چنانچہ بائیبل میں بھی یہ محاورہ پایا جاتا ہے سو پورے برس کے بعد بدر کی لڑائی کا عذاب مکہ والوں پر نازل ہوا۔ جو پہلی لڑائی تھی۔

ہزارہا تک ان کی نوبت پہنچا دی اور ان کے ذریعہ سے ان تمام کفار کو تہ تیغ کیا جو مکہ میں اپنی سرکشی اور جور و جفا کے زمانہ میں نہایت تکبر سے عذاب کا نشان مانگا کرتے تھے لیکن اس بات کا ثبوت قرآن شریف سے کہاں ملتا ہے کہ بجز اُن نشانوں کے اور بھی نشان آنحضرت ﷺ نے دکھلائے تھے سو واضح ہو کہ نشانوں کے دکھلانے کا ذکر قرآن شریف میں جا بجا آیا ہے بعض جگہ اپنے پہلے نشانوں کا حوالہ بھی دیا ہے دیکھو آیت

كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوْا بِهٖٓ اَوَّلَ مَرَّةٍ الجزو نمبر ۷ سورۂ انعام (الانعام: ۱۱۱) بعض جگہ کفار کی ناانصافی کا ذکر کر کے ان کا اس طور کا اقرار درج کیا ہے کہ وہ نشانوں کو دیکھ کر کہتے ہیں کہ وہ جادو ہے۔ دیکھو آیت وَاِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا وَيَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ (القمر: ۳) الجزو نمبر ۲۷ سورۃ القمر بعض جگہ جو نشانوں کے دیکھنے کا صاف اقرار منکرین نے کر دیا ہے وہ شہادتیں ان کی پیش کی ہیں۔ جیسا کہ فرماتا ہے:

وَشَهِدُوْٓا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّجَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ (اٰلِ عمران: ۸۷) یعنی انہوں نے رسول کے حق ہونے پر گواہی دی اور کھلے کھلے نشان ان کو پہنچ گئے اور بعض جگہ بعض معجزات کو بتصریح بیان کر دیا ہے جیسے معجزہ شق القمر جو ایک عظیم الشان معجزہ اور خدائی قدرت کا ایک کامل نمونہ ہے، جس کی تصریح ہم نے کتاب سرمہ چشم آریہ میں بخوبی کر دی ہے جو شخص مفصل دیکھنا چاہے اس میں دیکھ سکتا ہے۔ اس جگہ یہ بھی یاد رہے کہ جو لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے خود تراشیدہ نشان مانگا کرتے تھے اکثر وہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نشانوں کے آخر کار گواہ بھی بن گئے تھے کیونکہ آخر وہی لوگ تو تھے جنہوں نے مشرف باسلام ہو کر دین اسلام کو مشارق و مغارب میں پھیلایا اور نیز معجزات اور پیشگوئیوں کے بارے میں کتب احادیث میں اپنی رویت کی شہادتیں قلمبند کرائیں پس اس زمانہ میں ایک عجیب طرز ہے کہ ان بزرگان دین کے اس زمانہ جاہلیت کے انکاروں کو بار بار پیش کرتے ہیں جن سے بالآخر خود وہ دست کش اور تائب ہو گئے تھے لیکن اُن کی اُن شہادتوں کو نہیں مانتے جو راہ راست پر آنے کے بعد انہوں نے پیش کی ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات تو چاروں طرف سے چمک رہے ہیں وہ کیونکر

چھپ سکتے ہیں صرف معجزات جو صحابہ کی شہادتوں سے ثابت ہیں وہ تین ہزار معجزہ ہے اور پیش گوئیاں تو شاید دس ہزار سے بھی زیادہ ہوں گی جو اپنے وقتوں پر پوری ہو گئیں اور ہوتی جاتی ہیں۔ ماسوائے اس کے بعض معجزات و پیشگوئیاں قرآن شریف کی ایسی ہیں کہ وہ ہمارے لئے بھی جو اس زمانہ میں مشہود و محسوس کا حکم رکھتی ہیں اور کوئی ان سے انکار نہیں کرسکتا چنانچہ وہ یہ ہیں۔

(۱) عذابی نشان کا معجزہ جو اس وقت کے کفار کو دکھلایا گیا تھا یہ ہمارے لئے بھی فی الحقیقت ایسا ہی نشان ہے جس کو چشم دید کہنا چاہئے۔ وجہ یہ کہ یہ نہایت یقینی مقدمات کا ایک ضروری نتیجہ ہے جس سے کوئی موافق اور مخالف کسی صورت سے انکار نہیں کرسکتا۔ اوّل یہ مقدمہ جو بطور بنیاد معجزہ کے ہے نہایت بدیہی اور مسلّم الثبوت ہے کہ یہ عذابی نشان اس وقت مانگا گیا تھا کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور چند رفیق آنجناب کے مکہ میں دعوت حق کی وجہ سے خود صدہا تکالیف اور دردوں اور دکھوں میں مبتلا تھے اور وہ ایام دین اسلام کے لئے ایسے ضعف اور کمزوری کے دن تھے کہ خود کفار مکہ ہنسی اور ٹھٹھے کی راہ سے مسلمانوں کو کہا کرتے تھے کہ اگر تم حق پر ہو تو اس قدر عذاب اور مصیبت اور دکھ اور درد ہمارے ہاتھ سے کیوں تمہیں پہنچ رہا ہے اور وہ خدا جس پر تم بھروسہ کرتے ہو وہ کیوں تمہاری مدد نہیں کرتا اور کیوں تم ایک قدر قلیل جماعت ہو جو عنقریب نابود ہونے والی ہے اور اگر تم سچے ہو تو کیوں ہم پر عذاب نازل نہیں ہوتا؟ ان سوالات کے جواب میں جو کچھ کفار کو قرآن شریف کے متفرق مقامات میں ایسے زمانہ تنگی و تکالیف میں کہا گیا وہ دوسرا مقدمہ اس پیشگوئی کی عظمت شان سمجھنے کیلئے ہے کیونکہ وہ زمانہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے صحابہ پر ایسا نازک زمانہ تھا کہ ہر وقت اپنی جان کا اندیشہ تھا اور چاروں طرف ناکامی منہ دکھلا رہی تھی سو ایسے زمانہ میں کفار کو اُن سے عذابی نشان مانگنے کے وقت صاف صاف طور پر یہ کہا گیا تھا کہ عنقریب تمہیں اسلام کی فتح مندی اور تمہارے سزایاب ہونے کا نشان دکھلایا جائے گا اور اسلام جو اب ایک تخم کی طرح نظر آتا ہے کسی دن ایک بزرگ درخت کی مانند اپنے تئیں ظاہر کرے گا اور وہ جو عذاب کا نشان مانگتے ہیں وہ تلوار کی دھار سے قتل کئے جائیں گے اور تمام

جزیرہ عرب کفر اور کافروں سے صاف کیا جائے گا اور تمام عرب کی حکومت مومنوں کے ہاتھ میں آجائے گی اور خدائے تعالیٰ دین اسلام کو عرب کے ملک میں ایسے طور سے جما دے گا کہ پھر بت پرستی کبھی پیدا نہیں ہوگی اور حالت موجودہ جو خوف کی حالت ہے بکلّی امن کے ساتھ بدل جائے گی اور اسلام قوت پکڑے گا اور غالب ہوتا چلا جائے گا۔ یہاں تک کہ دوسرے ملکوں پر اپنی نصرت اور فتح کا سایہ ڈالے گا اور دور دور تک اس کی فتوحات پھیل جائیں گی اور ایک بڑی بادشاہت قائم ہو جائے گی جس کا اخیر دنیا تک زوال نہیں ہوگا۔

اب جو شخص پہلے ان دونوں مقدمات پر نظر ڈال کر معلوم کر لیوے کہ وہ زمانہ جس میں یہ پیشگوئی کی گئی، اسلام کے لئے کیسی تنگی اور ناکامی اور مصیبت کا زمانہ تھا اور جو پیشگوئی کی گئی وہ کس قدر حالت موجودہ سے مخالف اور خیال اور قیاس سے نہایت بعید بلکہ صریح محالات عادیہ سے نظر آتی تھی۔ پھر بعد اس کے اسلام کی تاریخ پر جو دشمنوں اور دوستوں کے ہاتھ میں موجود ہے ایک منصفانہ نظر ڈالے کہ کیسی صفائی سے یہ پیشگوئی پوری ہوگئی اور کس قدر دلوں پر ہیبت ناک اثر اس کا پڑا اور کیسے مشارق اور مغارب میں تمام تر قوت اور طاقت کے ساتھ اس کا ظہور ہوا تو اس پیشگوئی کو یقینی اور قطعی طور پر چشم دید معجزہ قرار دے گا جس میں اس کو ایک ذرہ بھی شک و شبہ نہیں ہوگا۔

پھر دوسرا معجزہ قرآن شریف کا جو ہمارے لئے حکم مشہود و محسوس کا رکھتا ہے وہ عجیب و غریب تبدیلیاں ہیں جو اصحاب رسول اللہ ﷺ میں ببرکت پیروی قرآن شریف و اثر صحبت آنحضرت ﷺ ظہور میں آئیں۔ جب ہم اس بات کو دیکھتے ہیں کہ وہ لوگ مشرف باسلام ہونے سے پہلے کیسے اور کس طریق اور عادت کے آدمی تھے اور پھر بعد شرف صحبت آنحضرت ﷺ واتباع قرآن شریف کس رنگ میں آگئے اور کیسے اخلاق میں، عقائد میں، چلن میں، گفتار میں، رفتار میں، کردار میں اور اپنی جمیع عادات میں خبیث حالت سے منتقل ہو کر نہایت طیّب اور پاک حالت میں داخل کئے گئے تو ہمیں اس تاثیر عظیم کو دیکھ کر جس نے ان کے زنگ خوردہ وجودوں کو ایک عجیب تازگی اور روشنی اور چمک بخش دی تھی اقرار کرنا پڑتا ہے کہ یہ تصرف ایک

خارقِ عادت تصرف تھا جو خاص خدائے تعالیٰ کے ہاتھ نے کیا۔قرآن شریف میں خدائے تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں نے ان کو مُردہ پایا اور زندہ کیا اور جہنم کے گڑھے میں گرتے دیکھا تو اُس ہولناک حالت سے چھڑایا۔ بیمار پایا اور اُنہیں اچھا کیا۔ اندھیرے میں پایا انہیں روشنی بخشی۔اور خدائے تعالیٰ نے اس اعجاز کے دکھلانے کے لئے قرآن شریف میں ایک طرف عرب کے لوگوں کی وہ خراب حالتیں لکھی ہیں جو اسلام سے پہلے وہ رکھتے تھے اور دوسری طرف ان کے وہ پاک حالات بیان فرمائے ہیں جو اسلام لانے کے بعد ان میں پیدا ہو گئے تھے کہ تا جو شخص ان پہلے حالات کو دیکھے جو کفر کے زمانہ میں تھے اور پھر مقابل اس کے وہ حالت پڑھے جو اسلام لانے کے بعد ظہور پذیر ہو گئی تو ان دونوں طور کے سوانح پر مطلع ہونے سے بہ یقینِ کامل سمجھ لیوے گا کہ یہ تبدیلی ایک خارق عادت تبدیلی ہے جسے معجزہ کہنا چاہئے۔

پھر تیسرا معجزہ قرآن شریف کا جو ہماری نظروں کے سامنے موجود ہے اس کے حقائق و معارف و لطائف و نکات ہیں جو اس کی بلیغ و فصیح عبارات میں بھرے ہوئے ہیں اس معجزہ کو قرآن شریف میں بڑی شدّ و مد سے بیان کیا گیا ہے اور فرمایا ہے کہ اگر تمام جن و انس اکٹھے ہو کر اس کی نظیر بنانا چاہیں تو اُن کے لئے ممکن نہیں یہ معجزہ اس دلیل سے ثابت اور متحقق الوجود ہے کہ اس زمانہ تک کہ تیرہ سو برس سے زیادہ گزر رہا ہے باوجودیکہ قرآن شریف کی منادی دنیا کے ہر ایک نواح میں ہو رہی ہے اور بڑے زور سے هَلْ مِنْ مُّعَارِضٍ کا نقارہ بجایا جاتا ہے مگر کبھی کسی طرف سے آواز نہیں آئی۔ پس اس سے اس بات کا صریح ثبوت ملتا ہے کہ تمام انسانی قوتیں قرآن شریف کے مقابلہ و معارضہ سے عاجز ہیں بلکہ اگر قرآن شریف کی صدہا خوبیوں میں سے صرف ایک خوبی کو پیش کر کے اس کی نظیر مانگی جائے تو انسان ضعیف البیان سے یہ بھی ناممکن ہے کہ اس ایک جزو کی نظیر پیش کر سکے مثلاً قرآن شریف کی خوبیوں میں سے ایک یہ بھی خوبی ہے کہ وہ تمام معارف دینیہ پر مشتمل ہے اور کوئی دینی سچائی جو حق اور حکمت سے تعلق رکھتی ہے، ایسی نہیں جو قرآن شریف میں پائی نہ جاتی ہو مگر ایسا شخص کون ہے کہ کوئی دوسری کتاب ایسی دکھلائے جس میں یہ صفت موجود ہو اور اگر کسی کو اس بات میں شک ہو کہ قرآن شریف جامع تمام

حقائق دینیہ ہے تو ایسا مشکک خواہ عیسائی ہو خواہ آریہ اور خواہ برہمو ہو، خواہ دہریہ اپنی طرز اور طور پر امتحان کر کے اپنی تسلی کرا سکتا ہے اور ہم تسلی کر دینے کے ذمہ دار ہیں۔ بشرطیکہ کوئی طالب حق ہماری طرف رجوع کرے۔ بائیبل میں جس قدر پاک صداقتیں ہیں یا حکماء کی کتابوں میں جس قدر حق اور حکمت کی باتیں ہیں جن پر ہماری نظر پڑی ہے یا ہندوؤں کے وید وغیرہ میں جو اتفاقاً بعض سچائیاں درج ہو گئی ہیں یا باقی رہ گئی ہیں جن کو ہم نے دیکھا ہے یا صوفیوں کی صدہا کتابوں میں جو حکمت و معرفت کے نکتے ہیں جن پر ہمیں اطلاع ہوئی ہے اُن سب کو ہم قرآن شریف میں پاتے ہیں اور اس کامل استقراء سے جو تیس برس کے عرصہ سے نہایت عمیق اور محیط نظر کے ذریعہ سے ہم کو حاصل ہے، نہایت قطع اور یقین سے ہم پر یہ بات کھل گئی ہے کہ کوئی روحانی صداقت جو تکمیل نفس اور دماغی اور دلی قویٰ کی تربیت کے لئے اثر رکھتی ہے ایسی نہیں جو قرآن شریف میں درج نہ ہو اور یہ صرف ہمارا ہی تجربہ نہیں بلکہ یہی قرآن شریف کا دعویٰ بھی ہے جس کی آزمائش نہ فقط میں نے بلکہ ہزار ہا علماء ابتداء سے کرتے آئے اور اس کی سچائی کی گواہی دیتے آئے ہیں۔

پھر چوتھا معجزہ قرآن شریف کا اس کی روحانی تاثیرات ہیں جو ہمیشہ اس میں محفوظ چلی آتی ہیں یعنی یہ کہ اس کی پیروی کرنے والے قبولیت الٰہی کے مراتب کو پہنچتے ہیں اور مکالماتِ الٰہیہ سے مشرف کئے جاتے ہیں۔ خدائے تعالیٰ ان کی دعاؤں کو سنتا اور انہیں محبت اور رحمت کی راہ سے جواب دیتا ہے اور بعض اسرارِ غیبیہ پر نبیوں کی طرح ان کو مطلع فرماتا ہے اور اپنی تائید اور نصرت کے نشانوں سے دوسری مخلوقات سے انہیں ممتاز کرتا ہے یہ بھی ایسا نشان ہے کہ جو قیامت تک اُمت محمدیہ میں قائم رہے گا اور ہمیشہ ظاہر ہوتا چلا آیا ہے اور اب بھی موجود اور متحقق الوجود ہے۔ مسلمانوں میں سے ایسے لوگ اب بھی دنیا میں پائے جاتے ہیں کہ جن کو اللہ جلّشانہٗ اپنی تائیداتِ خاصہ سے مؤیّد فرما کر الہامات صحیحہ و صادقہ و مبشرات و مکاشفات غیبیہ سے سرفراز فرماتا ہے۔

اب اے حق کے طالبو اور سچے نشانوں کے بھوکو اور پیاسو! انصاف سے دیکھو اور ذرا پاک نظر

سے غور کرو کہ جن نشانوں کا خدائے تعالیٰ نے قرآن شریف میں ذکر کیا ہے کس اعلیٰ درجہ کے نشان ہیں اور کیسے ہر زمانے کیلئے مشہود و محسوس کا حکم رکھتے ہیں ۔ پہلے نبیوں کے معجزات کا اب نام ونشان باقی نہیں، صرف قصے ہیں ۔ خدا جانے ان کی اصلیت کہاں تک درست ہے ۔ بالخصوص حضرت مسیحؑ کے معجزات جو انجیلوں میں لکھے ہیں باوجود قصوں اور کہانیوں کے رنگ میں ہونے کے اور باوجود بہت سے مبالغات کے جو اُن میں پائے جاتے ہیں ۔ ایسے شکوک وشبہات ان پر وارد ہوتے ہیں کہ جن سے انہیں بکلّی صاف و پاک کر کے دکھلانا بہت مشکل ہے ۔ اور اگر ہم فرض کے طور پر تسلیم بھی کر لیں کہ جو کچھ اناجیل مروجہ میں حضرت مسیح کی نسبت بیان کیا گیا ہے کہ لولے اور لنگڑے اور مفلوج اور اندھے وغیرہ بیمار ان کے چھونے سے اچھے ہو جاتے تھے ۔ یہ تمام بیان بلا مبالغہ ہے اور ظاہر پر ہی محمول ہے کوئی اور معنی اس کے نہیں ۔ تب بھی حضرت مسیح کی ان باتوں سے کوئی بڑی خوبی ثابت نہیں ہوتی ۔ اوّل تو انہیں دنوں میں ایک تالاب بھی ایسا تھا کہ اس میں ایک وقت خاص میں غوطہ مارنے سے ایسی سب مرضیں فی الفور دور ہو جاتی تھیں جیسا کہ خود انجیل میں مذکور ہے پھر ماسوائے اس کے زمانہ دراز کی تحقیقاتوں نے اس بات کو ثابت کر دیا ہے کہ ملکہ سلب امراض منجملہ علوم کے ایک علم ہے جس کے اب بھی بہت لوگ مشاق پائے جاتے ہیں ۔ جس میں شدت توجہ اور دماغی طاقتوں کے خرچ کرنے اور جذب خیال کا اثر ڈالنے کی مشق درکار ہے ۔ سو اس علم کو نبوت سے کچھ علاقہ نہیں بلکہ مردِ صالح ہونا بھی اس کے لئے ضروری نہیں اور قدیم سے یہ علم رائج ہوتا چلا آیا ہے ۔ مسلمانوں میں بعض اکابر جیسے محی الدین (ابن) عربی صاحب فصوص اور بعض نقشبندیوں کے اکابر اس کام میں مشاق گزرے ہیں ۔ ایسے کہ ان کے وقت میں ان کی نظیر پائی نہیں گئی بلکہ بعض کی نسبت ذکر کیا گیا ہے کہ وہ اپنی کامل توجہ سے باذنہٖ تعالیٰ تازہ مردوں سے باتیں کر کے دکھلا دیتے تھے ☆ اور دو دو تین تین سو

☆ **حاشیہ:** تازہ مردوں کا عمل توجہ سے چند منٹ یا چند گھنٹوں کیلئے زندہ ہو جانا قانون قدرت کے منافی نہیں جس حالت میں ہم بچشم خود دیکھتے ہیں کہ بعض جاندار مرنے کے بعد کسی دوا سے زندہ ہو جاتے ہیں تو پھر انسان کا زندہ ہونا کیا مشکل اور کیوں دور از قیاس ہے ۔ منہ

بیماروں کو اپنے دائیں بائیں بٹھلا کر ایک ہی نظر سے تندرست کر دیتے تھے اور بعض جو مشق میں کچھ کمزور تھے وہ ہاتھ لگا کر یا بیمار کے کپڑے کو چھو کر شفا بخشتے تھے۔ اس مشق میں عامل عمل کے وقت کچھ ایسا احساس کرتا ہے کہ گویا اس کے اندر سے بیمار پر اثر ڈالنے کے وقت ایک قوت نکلتی ہے اور بسا اوقات بیمار کو بھی یہ مشہود ہوتا ہے کہ اس کے اندر سے ایک زہریلا مادہ حرکت کر کے سفلی اعضا کی طرف اُترتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ بکلّی معدوم ہو جاتا ہے۔ اس علم میں اسلام میں بہت سی تالیفیں موجود ہیں اور میں خیال کرتا ہوں کہ ہندوؤں میں بھی اس کی کتابیں ہونگی۔ حال میں جو انگریزوں نے فن مسمریزم نکالا ہے حقیقت میں وہ بھی اسی علم کی ایک شاخ ہے۔ انجیل پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مسیح کو بھی کسی قدر اس علم میں مشق تھی مگر کامل نہیں تھے۔ اس وقت کے لوگ سادہ اور اس علم سے بے خبر تھے۔ اسی وجہ سے اس زمانہ میں یہ عمل اپنی حد سے زیادہ قابل تعریف سمجھا گیا تھا مگر پیچھے سے جوں جوں اس علم کی حقیقت کھلتی گئی لوگ اپنے علو اعتقاد سے تنزل کرتے گئے۔ یہاں تک کہ بعضوں نے یہ رائے ظاہر کی کہ ایسی مشقوں سے بیماروں کو چنگا کرنا یا مجنونوں کو شفا بخشنا کچھ بھی کمال کی بات نہیں بلکہ اس میں ایماندار رہنا بھی ضروری نہیں۔ چہ جائیکہ نبوت یا ولایت پر یہ دلیل ہو سکے۔ ان کا یہ بھی قول ہے کہ عمل سلب امراض بدنیہ کی کامل مشق اور اُسی شغل میں دن رات اپنے تئیں ڈالے رکھنا روحانی ترقی کیلئے سخت مضر ہے اور ایسے شخص کے ہاتھ سے روحانی تربیت کا کام بہت ہی کم ہوتا ہے اور قوتِ منوّرہ اُس کے قلب کی بغایت درجہ گھٹ جاتی ہے۔ خیال ہو سکتا ہے کہ اسی وجہ سے حضرت مسیح علیہ السلام اپنی روحانی تربیت میں بہت کمزور نکلے جیسا کہ پادری ٹیلر صاحب جو باعتبار عہدہ و نیز بوجہ لیاقت ذاتی کے ایک ممتاز آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ وہ نہایت افسوس سے لکھتے ہیں کہ مسیحؑ کی روحانی تربیت بہت ضعیف اور کمزور ثابت ہوتی ہے اور اُن کے صحبت یافتہ لوگ جو حواریوں کے نام سے موسوم تھے اپنے روحانی تربیت یافتہ ہونے میں اور انسانی قوتوں کی پوری تکمیل سے کوئی اعلیٰ درجہ کا نمونہ دکھلا نہ سکے۔ (کاش حضرت مسیح نے اپنے ظاہری شغل سلب امراض کی طرف کم توجہ کی ہوتی اور وہی توجہ اپنے حواریوں کی باطنی کمزوریوں اور بیماریوں پر ڈالتے خاص کر یہودا

اسکریوطی پر)اس جگہ صاحب موصوف یہ بھی فرماتے ہیں کہ اگر نبی عربی (ﷺ) کے صحابہ کے مقابلہ پر حواریوں کی روحانی تربیت یابی اور دینی استقامت کا موازنہ کیا جائے تو ہمیں افسوس کے ساتھ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ حضرت مسیح کے حواری روحانی طور پر تربیت پذیر ہونے میں نہایت ہی کچے اور پیچھے رہے ہوئے تھے اور ان کے دماغی اور دلی قویٰ کو حضرت مسیح کی صحبت نے کوئی ایسی توسیع نہیں بخشی تھی جو صحابہ نبی (ﷺ) کے مقابل تعریف ہو سکے بلکہ حواریوں کی قدم قدم میں بزدلی، سست اعتقادی، تنگدلی، دنیا طلبی، بیوفائی ثابت ہوتی تھی۔ مگر صحابہؓ نبی عربی (ﷺ) سے وہ صدق و وفا ظہور میں آیا جس کی نظیر کسی دوسرے نبی کے پیرووں میں ملنا مشکل ہے سو یہ اس روحانی تربیت کا جو کامل طور پر ہوئی تھی اثر تھا جس نے اُن کو بکلّی مبدّل کر کے کہیں کا کہیں پہنچا دیا تھا۔ اسی طرح بہت سے دانشمند انگریزوں نے حال میں ایسی کتابیں تالیف کی ہیں کہ جن میں اُنہوں نے اقرار کر لیا ہے کہ اگر ہم نبی عربی (ﷺ) کی حالت رجوع الی اللہ و توکّل و استقامت ذاتی و تعلیم کامل و مطہر والقائے تاثیر و اصلاح خلق کثیر از مفسدین و تائیدات ظاہری و باطنی قادر مطلق کو ان معجزات سے الگ کر کے بھی دیکھیں جو بمد منقول ان کی نسبت بیان کی جاتی ہیں تب بھی ہمارا انصاف اس اقرار کے لئے ہمیں مجبور کرتا ہے کہ یہ تمام امور جو اُن سے ظہور میں آئے یہ بھی بلاشبہ فوق العادت اور بشری طاقتوں سے بالاتر ہیں اور نبوت صحیحہ صادقہ کے شناخت کرنے کیلئے قوی اور کافی نشان ہیں۔ کوئی انسان جب تک اس کے ساتھ خدائے تعالیٰ نہ ہو کبھی ان سب باتوں میں کامل اور کامیاب نہیں ہو سکتا اور نہ ایسی غیبی تائیدیں اُس کے شامل ہوتی ہیں۔

(ایک عیسائی کے تین سوال اور انکے جوابات، روحانی خزائن جلد نمبر ۴ صفحہ ۴۴۷ تا ۴۵۴)

☆

اس اعتراض کا جواب حضرت حکیم مولانا نورالدین خلیفۃ المسیح الاوّل ان الفاظ میں تحریر فرماتے ہیں:

پہلا جواب۔ جن آیات کریمہ کا سائل نے حوالہ دیا ہے اور ان سے استدلال کیا ہے کہ حضور ہادی اسلام سے کوئی معجزہ ظہور پذیر نہیں ہوا ان میں معجزہ کا لفظ بالکل موجود نہیں پس آیات

سے کیونکر ثابت ہوا کہ حضور علیہ السلام سے کوئی معجزہ سرزد نہ ہوا۔

دوسرا جواب۔وہ کون سا لفظ ہے جس سے سائل کو ظاہر ہوا اور اُس نے کہا۔(''اس سے صاف ظاہر ہے خدا نے کوئی معجزہ نہیں دیا'') حالانکہ جو ترجمہ آیت کا سائل نے خود لکھا ہے اس میں بھی معجزے کا لفظ نہیں۔

تیسرا جواب۔اگر آیت یا آیات کے لفظ سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت خاتم الانبیا سرور اصفیا کے ہاتھ پر کوئی معجزہ نہیں ہوا تو سائل صاحب غور کریں اور خوب غور کریں کیونکہ سورۂ عنکبوت اور سورۂ بنی اسرائیل سے جن کا حوالہ سائل نے دیا ہے معاملہ بالعکس نظر آتا ہے۔ دونوں سورتیں بتاکید معجزات کے وجود کو ثابت کرتی ہیں۔

اوّل سورۂ عنکبوت کی آیت نشان دادہ معترض کے پہلے یہ آیات ہیں۔

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ ؕ فَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ۚ وَمِنْ هٰٓؤُلَآءِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ ؕ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الْكٰفِرُوْنَ (العنکبوت:۴۸) ایسے ہی ہم نے اتاری تجھ پر کتاب سمجھ والے اہل کتاب تو اس پر ایمان لاتے ہیں اور مکہ والوں سے بھی کچھ اس پر ایمان لانے والے ہیں اور ہماری نشانیوں (معجزوں) کا کافروں کے سوا کوئی منکر نہیں۔

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ (العنکبوت:۴۹) تو اس وقت سے پہلے لکھا پڑھا نہیں تھا ایسی بات ہوتی تو یہ جھوٹے دھوکا کھاتے۔ کیا معنے اب دھوکے کے باعث منکر نہیں صرف ضد اور ہٹ اور عداوت ہے کے سبب سے منکر ہو رہے ہیں۔

بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ؕ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ ○ وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ○ اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ؕ (العنکبوت:۵۰تا۵۲) بے ریب وہ (قرآن) کھلی نشانیاں ہیں علم والوں کے لئے اور ہماری نشانیوں سے وہی منکر ہیں جو بڑے ظالم ہیں اور کہتے ہیں کیوں نہ اتریں اس پر نشانیاں اس کے

رب سے تو کہہ نشانیاں تو اللہ پاس ہیں ۔ وہی بھیجتا ہے اور میں نہ ماننے والوں کو کھلا ڈر سے خبر دینے والا ہوں ۔ کیا اُن کو یہ نشانیاں کافی نہیں جو ہم نے اتاری تیری طرف کتاب پڑھی جاتی ان پر ۔

منصف عیسائیو! اگر لفظ آیت جس کے معنے نشانی کے ہیں اور لفظ آیت کی جمع لفظ آیات کے معنے معجزے کے ہیں ۔ تو قرآن کریم بہت جگہ معجزہ کو ثابت کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ محمدی معجزوں کے منکر جن کو آیہ کہا جاتا ہے کافر ہیں فاسق ہیں اور ظالم ۔ غور کرو۔

وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ ۚ وَمَا يَكْفُرُ بِهَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ (البقرة: ۱۰۰) اور بے شک ضرور ہی بھیجیں ہم نے تیرے پاس کھلی نشانیاں اور اُن کا منکر کوئی نہیں مگر فاسق لوگ ۔

بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ۚ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ (العنکبوت: ۵۰) بے ریب کھلے نشان ہیں علم والوں کے دلوں میں اور ہمارے نشانوں سے ظالموں کے سوا کوئی بھی منکر نہیں ۔

مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۚ كُلَّمَا خَبَتْ زِدْنٰهُمْ سَعِيْرًا ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمْ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا (بنی اسرائیل: ۹۸، ۹۹) عرب کے منکروں کو سورۃ بنی اسرائیل میں حکم ہوتا ہے ان لوگوں کا ٹھکانا جہنم ہی ہوگا جب بجھنے لگے اس کی آگ کو زیادہ تیز کریں گے یہ اس لئے کہ ان کو بدلہ ہے اس کفر کا جو انہوں نے ہمارے نشانوں سے کیا۔

یادداشت

ہم پہلے سوال کے جواب میں لکھ چکے ہیں قرآن کریم میں ہرگز ہرگز اختلاف نہیں ۔ جب قرآن کریم نے بتا دیا کہ محمد صلی اللہ علیہ کی صداقت پر ہم نے نشان بھیجے تو ایسا ہرگز ممکن نہ ہوگا کہ قرآن میں یہ بھی لکھا کہ ہم نے نشان نبوت حضرت نبی عرب کو نہیں دیئے کیونکہ ایسا ماننے سے قرآن میں اختلاف ہو جائے گا اور قرآن میں اختلاف نہیں ۔ علاوہ بریں کسی قرآنی آیت میں

یوں نہیں آیا کہ ہم نے نشانات نبوت محمد ﷺ کو نہیں دیئے۔ معجزوں کے انکار پر جن آیات سے سائل اور اس کے کسی ہم خیال عیسائی اور ان کے پیرو آریہ نے استدلال کیا ہے ان آیات پر مفصل گفتگو تصدیق براہین میں دیکھو اور بقدر ضرورت یہاں عرض ہے:۔

پہلے وہ آیت جس سے نبی عرب اور محسن تمام خلق صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے منکروں نے دھوکہ کھایا ہے اور جس کا ذکر بہت سننے میں آیا ہے یہ ہے:۔

وَمَا مَنَعَنَآ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ اِلَّآ اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ (بنی اسرائیل:٦٠)

اس آیت شریف سے منکرین نے یقین کیا ہے کہ حضرت نبی عرب پر معجزہ کا ظہور نہیں ہوا کیونکہ معنے اس آیت کے یہ سمجھے ہیں کہ پہلوں نے معجزات کو جھٹلایا۔ اس واسطے ہم معجزات کے بھیجنے سے رُک گئے **مگر یہ ان کا خیال غلط ہے۔**

اوّل اس لئے کہ معجزات اور آیات کے وجود کا تذکرہ قرآن کریم میں بکثرت موجود ہے اور محمد صاحب صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے معجزات کے نہ ماننے والوں کو اس لئے کہ بداہت اور موجودہ چیز کے منکر ہیں ظالم اور فاسق اور کافر کہا ہے۔ اور اِلَّا کا لفظ جو مَا مَنَعَنَآ والی آیت میں ہے عرب کی زبان میں جن کی بولی پر قرآن کریم ہے زائد بھی آتا ہے۔ دیکھو ذوا کرمہ کا یہ قول

حراجیح ماتنفک الّا مناختہ علی الخف اونرمی بھا بلدا فقراً

میرے لمبے قد کی اونٹنی ذلیل بیٹھی رہتی ہے یا اس پر دور دراز کے بے آب و گیاہ میدانوں کا سفر کرتا ہوں۔ **دیکھو اس تحقیق پر**۔ اُس آیت شریف کے معنی جس کو منکرین معجزہ پیش کرتے ہیں یہ ہوئے ''اور نہیں منع کیا ہم کو نشانوں کے بھیجنے سے پہلوں کی تکذیب نے'' کم سے کم یہ آیت انکار معجزہ پر صاف اور واضح دلیل نہ رہی کیونکہ اس آیت سے معجزہ کا ثبوت نکلتا ہے نہ نفی۔

وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ اِنْ هٰذَا اِلَّا بِتَائِيْدِ رُوْحِ الْقُدُسِ۔

دوم اس لئے کہ اِلَّا ایک حرف ہے جس کے معنے واؤ عاطفہ بھی آتے ہیں۔ دیکھو معانی اور

نحو کی بڑی بڑی کتابیں۔اور ثبوت کے لئے دیکھو یہ آیت شریف:۔

اِنِّیْ لَا یَخَافُ لَدَیَّ الْمُرْسَلُوْنَ اِلَّا مَنْ ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًا بَعْدَ سُوْٓءٍ

(النمل:۱۱،۱۲)

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے پاس میرے رسولوں اور انہیں خوف ہی نہیں جنہوں نے گناہ کرتے کرتے گناہوں کو چھوڑ دیا اور گناہوں کے جابجا نیکی کرنے لگے۔امام اخفش۔امام فراء امام ابوعبید ائمہ لغت ونحو نے کہا ہے یہاں اِلَّا واؤ کے معنے پر آیا ہے ایسے ہی آیت شریف

لِئَلَّا یَکُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَیْکُمْ حُجَّةٌ اِلَّا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ (البقرۃ:۱۵۱)

تو کہ نہ رہے تم پر عام لوگوں اور خاص کر بدکاروں کی کوئی حجت اور دلیل۔پھر اس تحقیق پر منکرین کے پیش کردہ آیت یہ معنی ہوں گے:۔

اور نہیں منع کیا ہم کو آیات کے بھیجنے سے کسی چیز نے اور منکروں کی تکذیب نے۔اور یہ عطف خاص کا ہوگا عام پر۔

غور کرو منکروں کی تکذیب ہرگز ہرگز معجزات کے روکنے والے نہیں۔اگر ان کی تکذیب روکتی تو فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بڑے بڑے معجزات کا انکار کیا تھا پھر کیا اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو معجزات عطا نہ کئے بلکہ منکر ہمیشہ انکار کرتے رہے اور معجزات بھی آتے رہے۔وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وھٰذَا بِتَائِیْدِ رُوْحِ الْقُدُسِ۔

تیسرا اس لئے کہ ہم نے مان لیا یہاں اِلَّا کا لفظ زائد نہیں۔عاطفہ بھی نہیں۔استثنا کے واسطے ہے۔اَلْاٰیات کا الف اور لام عہد اور خصوصیت کے معنے دے گا یا عموم اور استغراق کے۔

پہلی صورت عہد اور خصوصیت کی اگر ہوگی تو آیت کے یہ معنے ہوں گے ''اور نہیں منع کیا ہم کو خاص آیات کے بھیجنے سے مگر پہلوں کی تکذیب نے''۔اس سے یہ نکلا کہ خاص آیات اور کوئی خاص معجزات نہ آویں گے۔اس سے عموم معجزات کی نفی ثابت نہیں ہوتی۔

دوسری صورت یعنی اگر الف اور لام سے عموم اور استغراق لیا جاوے تو یہ معنی ہوں گے۔ ''کل آیات کے ارسال سے پہلوں کی تکذیب نے روکا''۔ مگر اس سے یہ نہیں نکلتا کہ کوئی بھی معجزہ نہیں بھیجیں گے۔

چہارم اس لئے کہ اس مَا مَنَعَنَآ والی آیت سے اتنا ہی نکلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو معجزات کے بھیجنے سے تکذیب کے ماورا کسی چیز نے نہیں روکا اور ظاہر ہے کہ یہ کوئی روک نہیں۔ کہیں منکروں کی تکذیب سے باری تعالیٰ حجت بند کر دیتا ہے؟ ہمیشہ انبیا علیہم الصلوٰۃ والسلام کی تکذیب ہوئی مگر وہ آتے رہے ہمیشہ معجزات پر تکذیب ہوا کی اور معجزات ہوا کئے۔

الٰہی طاقتیں اور قوتیں منکرین کی روک سے رکتی نہیں۔ مَنَعَنَآ لفظ کے معنے ہیں روکا ہم کو۔ اس لفظ کے یہ معنی نہیں کہ ہم رک گئے۔ ہاں اگر قرآن کریم میں یوں ہوتا۔ مَا امْتَنَعْنَا اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ اِلَّآ اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ جس کے معنی ہیں نہیں رکے ہم آیات اور نشانات کے بھیجنے سے مگر اس لئے کہ پہلوں نے تکذیب کی۔ تو البتہ منکرین معجزہ تقریر کچھ تھوڑی دور تک چل پڑتی مگر قرآن میں اِمْتَنَعْنَا نہیں مَنَعَنَآ ہے جس کے معنی ہیں روکا ہم کو نہ یہ کہ نہ رکے ہم۔

غرض تکذیب نے روکا اور باری تعالیٰ نہ رکا۔ روکنے کے ثبوت میں بفرض وتسلیم یہی آیت اور نہ روکنے کا ثبوت وہ آیات ہیں جن میں ثبوت آیات ہے وَالْقُرْاٰنُ مُتَشَابِهًا اَیْ يُصَدِّقُ بَعْضُهٗ بَعْضاً۔ قرآن کریم کی آیات متشابہ ہیں یعنی ایک آیت دوسری آیت کے مصدق ہوتی ہے نہ اس کے مخالف اور مکذب۔ هٰذَا اَيْضًا بِتَائِيْدِ رُوْحِ الْقُدُسِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔

پنجم اس لئے کہ بعض وہ معجزات جن کو یہودی اور عیسائی اور اہل مکہ اہل کتاب کے سمجھانے اور بہکانے سے پوچھتے تھے جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پیش گوئیوں اور بشارتوں کے بالکل

خلاف تھے۔اور ایسے معجزات کو مخالف لوگ اس واسطے طلب کرتے تھے کہ اگر یہ معجزات خلاف بشارات ظہور پذیر ہوئے تو ہم بشارات اور حضور کی ان پیش گوئیوں کے ذریعہ حضور پر اعتراض کریں گے جو انبیا نے کتب مقدسہ میں حضور کے حق میں کئے ہیں۔اور اگر ایسے معجزات بلحاظ ان بشارات کے ہم کو دکھائے نہ گئے تو معجزات کے نہ ہونے کا الزام قائم کر دیں گے مثلاً حضور علیہ السلام کی نسبت ایک بشارت میں یہ آیا ہے کہ جو کلام اس نبی موعود پر اترے گا وہ ایک دفعہ کتاب کے طور پر نازل نہ ہوگا بلکہ وہ کلام اس نبی موعود صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ میں رکھا جائے گا کچھ یہاں اور کچھ وہاں۔غور کرو کتب مقدسہ کی آیات ذیل:۔

ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا۔اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا۔استثنا ۱۸ باب ۱۸۔حکم پر حکم۔حکم پر حکم۔قانون پر قانون۔قانون پر قانون ہوتا جاتا۔تھوڑا یہاں تھوڑا وہاں۔ہاں وہ وحشی (عربی) کیسے ہونٹوں اور اجنبی زبان سے اس گروہ سے باتیں کرے گا۔یسعیا۔۲۸ باب ۹۔ان آیات سے صاف عیاں ہے کہ اس نبی موعود کو جو کلام عطا ہوگا وہ اس نبی کے منہ میں ڈالا جاوے گا اور بتدریج نازل ہوگا۔کچھ یہاں کچھ وہاں یعنی کچھ مکہ میں اور کچھ مدینہ میں کچھ کہیں کچھ کہیں۔اب قرآن کریم کی طرف نگاہ کرو اس میں ایک جگہ لکھا ہے۔کافر کہتے ہیں:۔

تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ ۚ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ

(بنی اسرائیل:۹۴) تو اے محمد چڑھ جا آسمان میں اور ہم تیرے چڑھنے پر تجھے نہ مانیں گے جب تک اوپر سے ایسی کتاب نہ لاوے جس کو ہم پڑھ لیں۔

اب بتلایئے اس طلب کا بجز اس کے کیا جواب ہوسکتا ہے کہ پاک ذات ہے میرا رب اس نے میرے لئے جو تجویز فرمادی وہ ناقص نہیں کہ اب اس تجویز کو بدلا وے اور میں تو بشر رسول ہوں۔بشر رسول تو ہمیشہ وہی معجزات دکھاتے رہے جو ان کی بشارت کے برخلاف نہ تھے اور وہی

نشان لائے جو اللہ تعالیٰ نے اُن کے واسطے مقرر فرمائے تھے۔

ششم اس لئے کہ معجزات کا ظہور اور انبیا کا فرمودہ کبھی بتدریج ظہور پذیر ہوتا ہے اور انبیا علیہم الصلوٰۃ والسلام چونکہ بشر اور رسول ہوتے ہیں وہ کوئی ایسی مخلوق نہیں ہوتے کہ خدائی ارادے کا خلاف چاہیں۔ شریر لوگ ایسے مؤقت معجزات کو قبل از وقت چاہتے ہیں۔ چونکہ وہ معجزات وقت معین پر ظاہر ہونے والے اور مشروط بشرائط ہوتے ہیں اس لئے قبل از تحقق شرائط اور اس وقت معین کے ظہور پذیر نہیں ہو سکتے۔ مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان بنی اسرائیل سے جو فرعون کی سخت تکالیف اٹھا رہے تھے وعدہ ہوا کہ تم کو کنعان وغیرہ وغیرہ کا ملک عطا ہوگا دیکھو توریت۔ میں نے اپنے لوگوں کی تکلیف جو مصر میں ہیں یقیناً دیکھی اور ان کی فریاد جو خراج کے محصولوں کے سبب سے ہے سنی اور میں ان کے دکھوں کو جانتا ہوں۔ اور میں نازل ہوا ہوں کہ انہیں مصریوں کے ہاتھ سے چھڑاؤں اور اس زمین سے نکال کے اچھی وسیع زمین میں جہاں دودھ اور شہد موج مارتا ہے لے جاؤں۔ کنعانیوں، حتّیوں، اموریوں، فرزیوں، حویوں، یبوسیوں کی جگہ میں لاؤں خروج ۳ باب ۷۔۹۔

مگر دیکھو یہ وعدہ اس قوم کے حق میں پورا نہ ہوا۔ جنہوں نے فرعون سے دکھ اٹھایا۔ دیکھو:۔

خداوند نے تمہاری باتیں سنیں اور غصہ ہوا اور قسم کھا کے یوں بولا کہ یقیناً ان شریر لوگوں میں ایک بھی اس اچھی زمین کو جس کے دینے کا وعدہ میں نے ان کے باپ دادوں سے قسم کھا کے کیا ہے نہ دیکھے گا۔ مگر یفُنّہ کا بیٹا کالب اسے دیکھے گا استثنا۔ ا باب ۳۵، ۳۶۔

ایسے ہی چند معجزات کفار مکہ نے طلب کئے ہیں جن کا ذکر ذیل میں ہے۔

۱۔ وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا (بنی اسرائیل:۹۱)

۲۔ اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا

اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا

أَوْ يَكُونَ لَكَ بَيْتٌ مِّن زُخْرُفٍ أَوْ تَرْقَىٰ فِي السَّمَاءِ وَلَن نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتَّىٰ تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتَابًا نَّقْرَؤُهُ ۗ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّي هَلْ كُنتُ إِلَّا بَشَرًا رَّسُولًا (بنی اسرائیل:۹۲تا۹۴)

آیات مرقومہ بالا سے معلوم ہوتا ہے کفار مکہ نے ایسے چھ معجزہ حضرت علیہ السلام سے طلب کئے جو اُس وقت سردست منکروں کو دکھائے نہیں گئے۔ مگر غور کرو یہ معجزے کیوں طلب کئے گئے اور کیوں ان کا فوری ظہور نہ ہوا۔

پہلا معجزہ جس کو کفار مکہ نے طلب کیا ہے کہ الارض یعنی اس خاص مکہ کی زمین میں چشمے چلیں۔ اور **دوسرا معجزہ**۔ جس کو انہوں نے مانگا یہ ہے کہ تیری کھجوروں اور انگوروں کے ایسے باغ ہوں جن میں نہریں چلتی ہوں۔

یہ دونوں معجزے اس واسطے طلب کئے گئے کہ کتب مقدسہ بضمن بشارات محمد یہ لکھا ہے ہاں میں بیابان میں ایک راہ اور صحرا میں ندیاں بناؤں گا۔ اور دشت کے گیدڑ اور شتر مرغ میری تعظیم کریں گے کہ تیں بیابان میں پانی اور صحرا میں ندیاں موجود کروں گا کہ وے میرے لوگوں کو میرے برگزیدوں کو پینے کے لئے ہوویں۔ میں نے ان لوگوں کو اپنے لئے بنایا وے میری ستائش کریں گے۔ یسعیا ۴۳ باب ۱۹۔۲۱ تک۔ اور دیکھو

کس نے یعقوب کو حوالہ کیا کہ غنیمت ہوویں اور اسرائیل کو کہ لٹیروں کے ہاتھ میں پڑے۔ کیا خداوند نے نہیں جس کے مخالف ہو کے انہوں نے گناہ کیا۔ کیونکہ انہوں نے نہ چاہا کہ اس کی راہ چلیں۔ یسعیا ۴۲ باب ۲۴۔ اور یسعیا کے ۲۱ باب میں عرب کی بابت الہامی کلام یوں ہیں۔ پانی لے کے پیاسے کا استقبال کرنے آؤ۔ اے تیما کی سرزمین کے باشندو! روٹی لے کے بھاگنے والے کے ملنے کو نکلو۔ یسعیا ۲۱ باب ۱۳۔ اور پھر کہا ہے۔ مزدور کے سے ٹھیک ایک برس میں قیدار کی ساری حشمت جاتی رہے گی اور تیراندازوں کے جو باقی رہے قیدار کے بہادر

لوگ گھٹ جائیں گے۔ان آیات سے اتنا تو معلوم ہوتا ہے کہ بیابان اور صحرا میں چشمے جاری ہوں گے ندیاں چلیں گی۔مگر اس میں یہ لکھا ہے کہ برگزیدوں کو پینے کے لئے ہوویں۔دیکھو یسعیا ۲۲ باب ۲۰۔

بنی اسرائیل کے ایسے باغ عربوں کے ہاتھ ضرور آویں گے جن میں نہریں چلتی ہوں مگر بنی اسرائیل مکہ میں آباد نہیں۔وہ زمانہ ہجرت کے بعد ہے جس میں یہ بشارت پوری ہوگئی۔

کفار اہل کتاب کے بہکائے پر دھوکہ دیتے ہیں مگر دیکھو نبوی معجزات اور محمد یہ کرامات کیسے زبردست ہیں۔اللہ تعالیٰ کے برگزیدوں کے واسطے اس بیابان اور صحرا میں ندیاں چل گئیں نہ کفار کے لئے۔دیکھو نہر زبیدہ مکہ میں اور نہر زرقا کی نہر مدینہ طیبہ میں برگزیدوں کے پینے کے واسطے موجود ہیں۔

بنو قُریظہ اور بنو نُضیر کے مکانات برگزیدوں کے قبضہ میں آچکے اور کھجوروں اور انگوروں کے ایسے باغ جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں حضور کیا حضور کے خادمان کے پاس وہاں موجود ہیں۔موسیٰ علیہ السلام کے وعدوں سے (ملک کنعان وغیرہ کی حکومت سے وہ نسل اکثر محروم رہی)اور حضور کے بابرکات معجزوں سے آپ کی اکثر قوم وعدہ کو دیکھ چکی اور انشاءاللہ یقیناً حقیقی کنعان میں بھی پہنچ جائیں گے۔

تیسرا اور چوتھا معجزہ یہ کہ منکروں پر آسمان ٹوٹ پڑے اور اللہ تعالیٰ اور ملائکہ کی افواج کفار کو تباہ کردے یہ دونوں معجزہ بھی جن کو کفار نے طلب کیا کتب مقدسہ میں موجود ہیں۔دیکھو

خدا سینا سے آیا اور شعیر سے ان پر طلوع ہوا۔فاران ہی کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا۔دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آیا۔استثنا ۳۳ باب ۲۔

یہ پیشگوئی نہایت عمدگی سے اس دن پوری ہوئی جس دن حضور علیہ السلام نے مکہ معظّمہ کو فتح فرمایا۔

غور کرو بخاری مطبع میرٹھ کا صفحہ ۶۱۳ اور بخاری مصری کا جلد ۲ صفحہ ۵۰ حضور کے ساتھ اس دن دس ہزار ہاں ٹھیک دس ہزار قدوس اصحابی جن کے ساتھ ملائکہ تھے موجود تھے اور اس دن مکہ کے کفار پر آسمان ایسا ٹوٹ پڑا کہ وہاں ان کا نام ونشان بھی نہ رہا۔

یاد رہے ہاجرہ عرب کا کوہ سینا ہے دیکھو نامہ گلیتاں ۴ باب ۲۵۔ پس معنے ہوں گے ہاجرہ کی پشت سے۔ اور فاران خود وادی حجاز کو کہتے ہیں اور شعیر میں دو دفعہ حضور بطور تجار تشریف لے گئے اور بدر کی لڑائی میں بھی ملائکہ کا لشکر اسلام کا گہر امدد گار تھا دیکھو قرآن سورہ ال عمران۔

پانچواں معجزہ کہ تیرا گھر بڑا زینت والا ہو۔ یہ کتب مقدسہ سے لیا گیا۔ تیرے پتھروں کو سرمہ لگاؤں گا اور تیری بنیاد نیلموں سے ڈالوں گا۔ میں تیری فصیلوں کو لعلوں سے اور تیرے پھاٹکوں میں چمکتے ہوئے جواہر سے اور تیرا سارا احاطہ بیش قیمت پتھروں سے بناؤں گا۔ تیرے سب فرزند بھی خدا سے تعلیم پاویں گے۔ یسعیاہ ۵۴ باب ۱۲، ۱۳۔

اب اگر یہاں مراد حقیقت ہے تو سرمہ میں وہاں کے پتھروں کا لگنا حاجیوں کے سرمہ سے دیکھ لو وہاں کے کھرلوں میں تیار ہوتا ہے اور ان کا حصہ سرمہ میں گھس کر شامل ہوتا ہے۔ اور اس ایک صداقت سے یقین ہے جیسے مکاشفات یوحنا سے ظاہر ہے دیکھو مکاشفات ۲۱ باب ۱۱ باقی بھی پورا ہوگا۔ جلدی نہ کرو۔ اور اگر عام زینت ہی لیں جیسے قرآن کے لفظ زخرف اور حزقیل کی ۱۶ باب سے ظاہر ہے۔ تو اب دیکھ لو مکہ معظّمہ کس زینت سے سجایا گیا۔

اور اگر ہمارے حضور ہمارے ہادی کا گھر ہی لینا ہے جیسے لفظ بیتُ لکَ سے بظاہر معلوم ہوتا ہے تو اب روضہ اطہر واقدس کا نظارہ کرلو!

كيف الوصول الى مدينة مصطفٰی شتان بين الهند و الزوراء اللهم ارزقنی شهادة فی بلد رسولک امين۔

چھٹے معجزہ کا بیان سابق کر چکا ہوں۔ غور کرو کیسے یہ تمام معجزات پورے ہو گئے۔ والحمد

للہ رب العلمین۔

یادداشت عیسائی صاحبان اگر کسی امتحان اور معجزہ کاظہور پذیر نہ ہونا نقص ہے تو جواب دو جب کسی نے حضرت مسیح کو کہا۔

اگر تو خدا کا بیٹا ہے تو کہہ کہ یہ پتھر روٹی بن جاویں۔اس نے (مسیح نے) جواب میں کہا۔لکھا ہے انسان صرف روٹی سے نہیں بلکہ ہر ایک بات سے جو خدا کے منہ سے نکلتی ہے جیتا ہے۔پھر شیطان اسے (مسیح کو) مقدس شہر میں اپنے ساتھ لے گیا اور ہیکل کے کنگرے پر کھڑا کر کے اسے کہا اگر تو خدا کا بیٹا ہے تو اپنے تئیں نیچے گرا دے کیونکہ کہا ہے کہ وہ تیرے لئے اپنے فرشتوں کو فرمائے گا۔اور وے تجھے ہاتھوں پر اٹھا لیں گے۔ایسا نہ ہو کہ تیرے پاؤں کو پتھر سے ٹھس لگے۔یسوع نے اسے کہا یہ بھی لکھا ہے کہ تو خداوند اپنے خدا کو مت آزما۔متی ۴ باب۔

(ایک عیسائی کے تین سوال اوران کے جوابات ازحضرت حکیم نورالدینؓ)

پادریوں کا اعتراض کے آپؐ سے کوئی پیشگوئی ظہور میں نہیں آئی

پادریوں نے یہ اعتراض بھی کیا کہ نعوذ باللہ آپؐ سے کوئی پیشگوئی ظہور میں نہیں آئی۔ حضرت مسیح موعودؑ نے اپنی مثال دے کر کہ مجھ پر جو کہ ایک غلام احمدؐ ہے پر کئی نشانات اور افضال نازل ہوئے تو آقائے نامدار آنحضرتؐ کی پیشگوئیوں سے کیسے انکار کیا جا سکتا ہے۔اس بارہ میں آپ تحریر فرماتے ہیں:

''بہت سے اسرار مخفیہ سے اطلاع بخشی ہے اور بہت سے حقائق اور معارف سے اس ناچیز کے سینہ کو پُر کر دیا ہے اور بارہا بتلا دیا ہے کہ یہ سب عطیّات اور عنایات اور یہ سب تفضّلات اور احسانات اور یہ سب تلطّفات اور توجہات اور یہ سب انعامات اور تائیدات اور یہ سب مکالمات اور مخاطبات بیمن متابعت ومحبت حضرت خاتم الانبیا ﷺ ہیں۔

جمالِ ہم نشین درمن اثر کرد وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

اب وہ واعظانِ انجیل اور پادریانِ گُم کردہ سبیل کہاں اور کدھر ہیں کہ جو پرلے درجہ کی نبوت

آنحضرت ﷺ کی بدیہی طور پر ثابت ہوتی ہے اور یا یہ کہنا پڑتا ہے کہ جو کچھ توریت یعنی کتاب استثنا ۱۸ باب ۲۱ و ۲۲ آیت میں سچے نبی کی نشانی لکھی ہے وہ نشانی صحیح نہیں ہے سو اس پیچ میں آکر نہایت ہٹ دھرمی سے ان کو یہ کہنا پڑا کہ وہ پیشگوئیاں اصل میں فراستیں ہیں کہ اتفاقاً پوری ہوگئی ہیں لیکن چونکہ جس درخت کی بیخ مضبوط اور طاقتیں قائم ہیں وہ ہمیشہ پھل لاتا ہے۔ اس جہت سے آنحضرت ﷺ کی پیشگوئیاں اور دیگر خوارق صرف اسی زمانہ تک محدود نہیں تھے بلکہ اب بھی ان کا برابر سلسلہ جاری ہے اگر کسی پادری وغیرہ کو شک وشبہ ہو تو اس پر لازم و فرض ہے کہ وہ صدق اور ارادت سے اس طرف توجہ کرے پھر دیکھے کہ آنحضرت ﷺ کی پیشگوئیاں کس قدر اب تک بارش کی طرح برس رہی ہیں لیکن اس زمانہ کے متعصب پادری اگر خودکشی کا ارادہ کریں تو کریں مگر یہ امید اُن پر بہت ہی کم ہے کہ وہ طالب صادق بن کر کمال ارادت اور صدق سے اس نشان کے جویاں ہوں۔ بہر حال دوسرے لوگوں پر یہ بات واضح رہے کہ جس حالت میں آنحضرت ﷺ کی برکات اب بھی آفتاب کی طرح روشن ہیں اور دوسرے کسی نبی کی برکات کا نشان نہیں ملتا تو اس صورت میں لازم ہے کہ اگر ایسے متعصب اور دنیا پرست پادری کسی بازار یا کسی شہر یا گاؤں میں کسی کو برخلاف اس حق الامر کے بہکاتے نظر آویں تو یہی موقعہ اس کتاب کا ان کے سامنے کھول کر رکھ دیا جاوے۔ کیونکہ یہ کتاب دس ہزار روپیہ کے اشتہار پر تالیف کی گئی ہے اور اس سے معارضہ کرنے والا دس ہزار روپیہ پا سکتا ہے پس شرم اور حیا سے نہایت بعید ہے کہ جو لوگ نبوتِ آنحضرت ﷺ سے منکر ہیں وہ پنڈت ہوں یا پادری آریہ ہوں یا برہمو وہ صرف زبان سے طریق فضول گوئی کا اختیار رکھیں اور جو دلائل قطعیہ آنحضرت ﷺ کی نبوت اور رسالت پر ناطق ہو رہی ہیں ان کے جواب کا کچھ فکر نہ کریں یہ عاجز خواہ نخواہ ان کو دینِ اسلام کے قبول کرنے کے لئے مجبور نہیں کرتا لیکن اگر مقابلہ و معارضہ سے عاجز رہیں اور جو کچھ آسمانی نشان اور عقلی دلائل حقیتِ اسلام پر دلالت کر رہے ہیں اُن کی نظیر اپنے مذہب میں پیش نہ کر سکیں تو پھر یہی لازم ہے کہ جھوٹ کو چھوڑ کر سچے مذہب کو قبول کر لیں۔

(براہین احمدیہ حصہ چہارم روحانی خزائن جلد نمبر ۱ صفحہ ۶۴۶ تا ۶۵۰ حاشیہ نمبر ۱۱)

☆

مباحثہ امرتسر (جنگ مقدس) کے دوران پادری عبداللہ آتھم نے یہ اعتراض بھی پیش کیا کہ نبی اسلام کا چھوٹا یا بڑا معجزہ ثابت نہیں ہوا۔

اس کا جواب حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے ان الفاظ میں دیا:

قرآن معجزات سے بھرا ہے اور خود وہ معجزہ ہے توجہ سے دیکھیں اور پیشگوئیاں تو اس میں دریا کی طرح بہ رہی ہیں۔ اسلام کے غلبہ کی ضُعفِ اسلام کے وقت خبر دی۔ سلطنت روم کے غلبہ کی اُن کے مغلوب ہونے کے پہلے خبر دی۔ شق القمر کا معجزہ بھی موجود ہے اگر نظام کے مخالف وسوسہ گزرے تو یوشع بن نون اور یسعیاہ نبی کی نظیر دیکھ لیجئے مگر حضرت مسیح کے معجزات کا ہمیں کچھ پتہ نہیں لگتا۔ بیت حسدا کے حوض نے اُن کی رونق کھودی۔ پیشگوئیاں نری اٹکل معلوم ہوتی ہیں اور زیادہ افسوس یہ ہے کہ بعض پوری بھی نہ ہوئیں مثلاً یہ پیشگوئی کب اور کس وقت پُوری ہُوئی کہ تم سے ابھی بعض نہیں مریں گے کہ مَیں آسمان پر سے اُتر آؤں گا۔ بادشاہت کہاں ملی جس کے لئے تلواریں خریدی گئی تھیں۔ بارہ حواریوں کو بہشتی تختوں کا وعدہ ہوا تھا یہودا اسکریوطی کو تخت کہاں ملا۔

(جنگ مقدس، روحانی خزائن جلد نمبر ۶ صفحہ ۲۷۹)

آنحضورؐ کے معجزہ شق القمر پر اعتراض

آنحضورؐ کے معجزہ شق القمر پر آریوں نے اعتراض کیا کہ آپؐ اس دعویٰ میں سچے نہ تھے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام اس کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

"سو میں پوچھتا ہوں کہ اگر آنحضرت ﷺ جنہوں نے عام اور علانیہ طور پر یہ دعویٰ مشہور کر دیا تھا کہ میرے ہاتھ سے معجزہ شق القمر وقوع میں آ گیا ہے اور کفار نے اس کو بچشم خود دیکھ بھی لیا ہے مگر اس کو جادو قرار دیا اپنے اس دعویٰ میں سچے نہیں تھے تو پھر کیوں مخالفین

آنحضرت جو اسی زمانہ میں تھے جن کو یہ خبریں گویا نقارہ کی آواز سے پہنچ چکی تھیں چپ رہے اور کیوں آنحضرت ﷺ سے مواخذہ نہ کیا کہ آپ نے کب چاند کو دو ٹکڑے کر کے دکھایا اور کب ہم نے اس کو جادو کہا اور اس کے قبول سے مونہہ پھیرا اور کیوں اپنے مرتے دم تک خاموشی اختیار کی اور مونہہ بند رکھا یاں تک کہ اس عالم سے گزر گئے کیا ان کی یہ خاموشی جو ان کی مخالفانہ حالت اور جوش مقابلہ کے بالکل برخلاف تھی اس بات کا یقین نہیں دلاتے کہ کوئی ایسی سخت روک تھی جس کی وجہ سے کچھ بول نہیں سکتے تھے مگر بجز ظہور سچائی کے اور کون سی روک تھی یہ معجزہ مکہ میں ظہور میں آیا تھا اور مسلمان ابھی بہت کمزور اور غریب اور عاجز تھے پھر تعجب یہ کہ ان کے بیٹوں یا پوتوں نے بھی انکار میں کچھ زبان کشائی نہ کی حالانکہ ان پر واجب و لازم تھا کہ اتنا بڑا دعویٰ اگر افترا محض تھا اور صدہا کوسوں میں مشہور ہو گیا تھا اس کی ردّ میں کتابیں لکھتے اور دنیا میں شائع اور مشہور کرتے اور جبکہ ان لاکھوں آدمیوں عیسائیوں، عربوں، یہودیوں، مجوسیوں وغیرہ میں سے ردّ لکھنے کی کسی کو جرأت نہ ہوئی اور جو لوگ مسلمان تھے وہ علانیہ ہزاروں آدمیوں کے روبرو چشم دید گواہی دیتے رہے جن کی شہادتیں آج تک اس زمانہ کی کتابوں میں مندرج پائی جاتی ہیں تو یہ صریح دلیل اس بات پر ہے کہ مخالفین ضرور شق القمر مشاہدہ کر چکے تھے اور ردّ لکھنے کے لئے کوئی بھی گنجائش باقی نہیں رہی تھی اور یہی بات تھی جس نے ان کو منکرانہ شور و غوغا سے چپ رکھا تھا سو جبکہ اسی زمانہ میں کروڑہا مخلوقات میں شق القمر کا معجزہ شیوع پا گیا مگر ان لوگوں نے خجلت زدہ ہو کر اس کے مقابلہ پر دم بھی نہ مارا تو اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس زمانہ کے مخالفین اسلام کا چپ رہنا شق القمر کے ثبوت کی دلیل ہے نہ کہ اس کے ابطال کی۔

(سرمہ چشم آریہ، روحانی خزائن جلد نمبر ۲ صفحہ ۱۲۴ تا ۱۲۶)

آپؐ کے دشمنوں کی تباہی کو اتفاقی حادثہ کہنے کا اعتراض

سورۃ النحل کی آیت ۷۸ کی تفسیر میں حضرت مصلح موعودؓ مخالفین کے اس اعتراض کا جواب

دیتے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ آپؐ کے دشمنوں کی تباہی ایک طبعی امر اور اتفاقی حادثہ تھا۔ آپ آیت مذکورہ کی تشریح میں فرماتے ہیں:

"اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ جب محمد رسول اللہؐ کے دشمن تباہ ہوں گے تو بعد میں آنے والے لوگ اس واقعہ کی قدر کم کرنے کے لئے کہیں گے کہ آپؐ کے دشمنوں کی تباہی ایک اتفاقی حادثہ تھا یا یہ کہ ان کے حالات ہی ایسے تھے کہ ہلاک ہو جاتے۔ چنانچہ آج کل کے مسیحی مصنف اس مضمون پر بہت ہی زور دیا کرتے ہیں اور آپؐ کے مخالفوں کی ہلاکت کو طبعی امور کا نتیجہ قرار دیا کرتے ہیں۔ دیکھو قرآن کریم کا اتارنے والا عالم الغیب اس آیت میں کس طرح ان لوگوں کے اعتراض کا جواب دیتا ہے۔ آیت کو شروع غیب کا علم رکھنے کے دعویٰ سے کرتا ہے اور پھر کفار کی ہلاکت کی خبر دیتا ہے۔ اور ختم اس پر کرتا ہے کہ یہ سب کچھ اتفاق نہ ہوگا بلکہ ہماری قدرت کے ذریعہ سے ہوگا۔ کس طرح اس آیت میں ایک طرف تو مکہ میں رہتے ہوئے جبکہ کفار کے ظلم زوروں پر تھے اور مسلمانوں کے پاس کوئی طاقت نہ تھی وہ ہجرت پر مجبور ہو رہے تھے۔ فرماتا ہے کہ ہم غیب کا علم رکھنے والے خدا تم کو بتا دیتے ہیں کہ کفار کی ہلاکت کا وقت اب آن پہنچا اور یہ بھی بتا دیتے ہیں کہ ان کی تباہی ہماری قدرت کے ذریعہ سے ہوگی اور ان حالات کے ذریعہ سے جو انسانی طاقت میں نہیں۔

اب دیکھو کس طرح اس آیت کے نزول کے بعد مدینہ کے سب لوگ مسلمان ہو گئے۔ حالانکہ پہلے صرف چند آدمی مسلمان ہوئے تھے اور کس طرح خود کفار نے محمد رسول اللہ کو مدینہ کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور کیا ورنہ آپؐ مکہ کو چھوڑنے پر آمادہ نہ تھے۔ صرف اسی وقت آپؐ نے مکہ چھوڑا جبکہ کفار نے آپؐ کو قتل کر دینے کا فیصلہ کر لیا اور پھر اسی رات آپؐ وہاں سے نکلے بلکہ اس وقت نکلے جبکہ کفار نے آپؐ کے گھر کا محاصرہ کر لیا۔ گویا کفار پر آخری حجت پوری کر دی کہ میں مکہ کو چھوڑنا نہیں چاہتا مگر چونکہ تم نے میرے لئے اور کوئی راستہ نہیں چھوڑا اس لئے یہاں

سے جاتا ہوں۔اس کے بعد کفار نے کس قدر زور آپؐ کو مدینہ میں کمزور کرنے کے لئے لگایا۔ مگر کس طرح آناً فاناً آپؐ کا زور بڑھتا چلا گیا اور آخر کفار تباہ ہوئے۔اسے کون اتفاقی امر کہہ سکتا ہے؟ کون طبعی نتائج کہہ سکتا ہے؟خصوصاً جبکہ قبل از وقت پیشگوئی بھی کر دی گئی تھی۔مسیحی مصنف یہ تو ثابت کر سکتے ہیں کہ جب مسلمانوں نے کسریٰ اور قیصر پر حملہ کیا ان کی حکومتیں تنزل کی طرف جا رہی تھیں۔مگر سوال یہ نہیں کہ محمد رسول اللہ ﷺ کے اتباع نے جب ایران اور روم پر حملہ کیا تھا اس وقت ایرانی اور رومی حکومت کی مسلمانوں کے مقابل پر کیا حیثیت تھی۔بلکہ سوال یہ ہے کہ جب محمد رسول اللہ صلعم نے مکہ میں بیٹھے اپنی فتح اور منکرین کی شکست کی خبر دی تھی اس وقت کون سی طاقت آپؐ کے پاس تھی؟اگر خدا نے آپؐ کو وہ طاقت دی جس نے ایک طرف عرب کو تہ وبالا کر دیا اور دوسری طرف ایران و روم کو تو اس کا نام معجزہ نہیں تو اور کس چیز کا نام معجزہ ہوا کرتا ہے؟

یہ پیشگوئی مکی زندگی کے آخر میں کی گئی تھی اور سب سے پہلی فتح بدر کے موقع پر ہوئی۔گویا کوئی اڑھائی تین سال بعد اور فتح مکہ کا واقعہ اس پیشگوئی کے بعد کوئی نو دس سال بعد ہوا۔لیکن اس آیت میں فتح کے وقت کی خبر ان الفاظ میں دی گئی ہے کہ آنکھ جھپکتے بلکہ اس سے بھی پہلے یہ واقعہ ہوگا۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم میں اس قسم کے الفاظ کے معنے قریب کے زمانہ کے ہوتے ہیں۔ضروری نہیں کہ پلک جھپکنے سے پلک جھپکنا ہی مراد ہو۔بعض لوگ ایسے الفاظ پیشگوئیوں میں دیکھ کر اعتراض کرنے لگ جاتے ہیں اور الہامی زبان کے محاورات کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔"

(تفسیر کبیر جلد ۴ صفحہ ۲۰۷، ۲۰۸)

مخالفین اسلام نے آپؐ کی معجزانہ کامیابی کو نہ ماننے کے بہانے میں اس کی مادی توجیہات

پیش کرنے کی ناکام کوشش کی ہے۔اس کے بارہ میں حضرت مصلح موعودؓ بیان فرماتے ہیں:

”آج یوروپین مصنف بڑے زور سے لکھتے ہیں کہ محمد رسول اللہ ﷺ اگر دنیا میں کامیاب ہو گئے تو اس میں اچنبھے کی کوئی بات نہیں۔قیصر کی حکومت اس وقت اپنے اندرونی زوال کی وجہ سے ٹوٹ رہی تھی۔کسریٰ کی حکومت میں ضعف واختلال کے آثار پیدا ہو چکے تھے اور سب لوگ سمجھ رہے تھے کہ یہ حکومتیں اب جلد مٹ جانے والی ہیں۔ایسی حکومتوں پر اگر محمد رسول اللہ ﷺ غالب آ گئے تو اس میں کوئی ایسی بات نہیں جسے معجزہ قرار دیا جا سکے۔مگر سوال تو یہ ہے کہ کیا عرب کی حالت قیصر وکسریٰ کی حکومتوں سے اچھی تھی؟اگر اچھی ہوتی تب تو کہا جا سکتا تھا کہ چونکہ عرب کی حالت اچھی تھی اور قیصر وکسریٰ کی حالت خراب تھی اس لئے اہل عرب نے قیصر وکسریٰ کی حکومتوں کو تاراج کر دیا۔مگر ہر شخص جو تاریخ سے معمولی واقفیت بھی رکھتا ہے جانتا ہے کہ قیصر و کسریٰ کے مقابلہ میں عرب کی کوئی حیثیت ہی نہیں تھی۔پس سوال یہ ہے کہ کیا قیصر وکسریٰ کی حکومتوں نے عرب کے مقابلہ میں ہی ٹوٹنا تھا اور پھر ان عربوں کے مقابلہ میں جن کا اپنا حال خراب تھا۔اور کیا عرب کے لوگوں میں سے بھی اس شخص کے ہاتھ سے قیصر وکسریٰ کی حکومتوں نے پاش پاش ہونا تھا جس کو کچلنے کے لئے خود عرب کے لوگ کھڑے ہو گئے تھے؟اور وہ سمجھتے تھے کہ قیصر وکسریٰ تو الگ رہے،عرب کے لوگ تو الگ رہے،صرف مکہ کے رہنے والے ہی اس کو کچلنے کے لئے کافی ہیں۔ہر شخص جو حالات پر غور کر کے صحیح نتائج اخذ کرنے کا ملکہ اپنے اندر رکھتا ہے وہ ایک لمحہ کے لئے بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ قیصر وکسریٰ کی حکومتوں کو وہ اکیلا شخص پاش پاش کرنے کی اپنے اندر اہلیت رکھتا تھا۔جس کے متعلق خود مکہ کی بستی والے یہ سمجھتے تھے کہ کہ یہ ہمارے مقابلہ میں نہیں ٹھہر سکتا ہم اسے کچل کر رکھ دیں گے۔مگر جب مکہ کی بستی والے یہ کہہ رہے تھے کہ ہم اس کو مٹا دیں گے۔اس وقت وہ اپنی کمزوری کے باوجود دنیا کو پکار کر کہتا تھا کہ مکہ اور عرب تو کیا ہے میں قیصر وکسریٰ کی حکومتوں کو بھی مٹا دوں گا۔اور ہم دیکھتے ہیں کہ جیسا کہ اس

نے کہا تھا ویسا ہی وقوع میں آ گیا۔ اگر یہ باتیں ایسی ہی ظاہر تھیں جیسے آج یوروپین مصنف لکھتے ہیں تو مکہ کے لوگ کیوں کہتے تھے کہ ہم محمد رسول اللہ ﷺ کو مٹا دیں گے۔ عرب کے لوگ کیوں کہتے تھے کہ ہم محمد رسول اللہ ﷺ کو مٹا دیں گے۔ ان کا بڑے زور سے یہ اعلان کرنا کہ ہم اسلام کو کچل کر رکھ دیں گے بتاتا ہے کہ وہ سمجھتے تھے کہ محمد رسول اللہ ﷺ اپنے اندر کوئی طاقت نہیں رکھتے۔ قیصر و کسریٰ کی حکومتیں تو کجا مکہ کی بستی والوں کا مقابلہ کرنا بھی ان کی طاقت سے باہر ہے۔ مگر پھر وہ زمانہ آیا جب وہ اکیلا اور کمزور شخص بڑھا اور بڑھتے بڑھتے اس مقام تک پہنچا کہ قیصر و کسریٰ بھی اس کے مقابلہ کی تاب نہ لا سکے‘‘۔

(تفسیر کبیر جلد ۹ صفحہ ۵۵۴، ۵۵۵)

باب ہفتم

تعدد ازدواج
اور
شہوت پرستی کے الزامات

غیر عورت کو دیکھ کر نفس پر کنٹرول نہ رہا تو اکمل کیونکر ہوسکتے ہیں

پادری فتح مسیح نے یہ اعتراض یوں کیا ہے کہ محمد صاحب کی ایک غیر عورت پر نظر پڑی۔ تو آپ نے گھر میں آ کر اپنی بیوی **سودہ** سے خلوت کی پس جو شخص غیر عورت کو دیکھ کر اپنے نفس پر غالب نہیں آسکتا۔ جب تک اپنی عورت سے خلوت نہ کرے اور اپنے نفس کی حرص کو پورا نہ کرے تو وہ فرد اکمل کیونکر ہوسکتا ہے۔

اس کے جواب میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام فرماتے ہیں کہ:

''میں کہتا ہوں کہ جس حدیث کے معترض نے الٹے معنے سمجھ لئے ہیں وہ **صحیح مسلم** میں ہے اور اس کے الفاظ یہ ہیں۔ **عن جابر ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم رأی امرأۃ فاتی امرأتہ زینب وھی تمعسُ منیّۃ لھا فقضی حاجتہ** ۔ اس حدیث میں سودہؓ کا کہیں ذکر نہیں اور معنے حدیث کے یہ ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک عورت کو دیکھا۔ پھر اپنی بیوی زینبؓ کے پاس آئے اور وہ چمڑہ کو مالش کر رہی تھی۔ سو آنحضرت ﷺ نے اپنی حاجت پوری کی۔ اب دیکھو کہ حدیث میں اس بات کا نام و نشان نہیں کہ آنحضرت ﷺ کو اس عورت کا حسن و جمال پسند آیا بلکہ یہ بھی ذکر نہیں کہ وہ عورت جوان تھی یا بڈھی تھی اور یہ بھی ثابت نہیں ہوتا کہ آنحضرتؐ نے اپنی بیوی سے آ کر صحبت کی۔ الفاظ حدیث صرف اس قدر ہیں کہ اس سے اپنی حاجت کو پورا کیا اور لفظ **قضٰی حَاجَتَہ'** لغت عرب میں مباشرت سے خاص نہیں ہے۔ قضاء حاجت پاخانہ پھرنے کو بھی کہتے ہیں اور کئی معنوں کے لئے مستعمل ہوتا ہے۔ یہ کہاں سے معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ نے اپنی بیوی سے صحبت کی تھی۔ ایک عام لفظ کو کسی خاص معنی میں محدود کرنا صریح شرارت ہے۔ علاوہ اس کے آنحضرت ﷺ کی زبان سے یہ بات مروی نہیں کہ میں نے ایک عورت کو دیکھ کر اپنی بیوی سے صحبت کی۔ اصل حقیقت صرف اس قدر ہے کہ **مسلم** میں جابر سے ایک حدیث ہے جس کا ترجمہ یہ ہے کہ اگر تم میں سے کوئی شخص کسی عورت کو دیکھے۔ اور وہ اس کی نظر میں خوبصورت معلوم ہو تو بہتر ہے کہ فی الفور گھر میں آ کر اپنی

عورت سے صحبت کر لے۔تا کہ کوئی خطرہ بھی دل میں گذرنے نہ پائے اور بطور حفظ ماتقدم علاج ہو جائے۔پس ممکن ہے کہ کسی صحابی نے اس حدیث کے سننے کے بعد دیکھا ہو کہ آنحضرت ﷺ کے کسی راہ میں کوئی جوان عورت سامنے آ گئی اور پھر اس کو یہ بھی اطلاع ہو گئی کہ اس وقت کے قریب ہی آنحضرت ﷺ نے اتفاقاً اپنی بیوی سے صحبت کی تو اس نے اس اتفاقی امر پر اپنے اجتہاد سے اپنے گمان میں ایسا ہی سمجھ لیا ہو کہ اس حدیث کے موافق آنحضرت ﷺ نے بھی عمل کیا۔

پھر اگر فرض بھی کر لیں کہ وہ قول صحابی کا صحیح تھا تو اس سے کوئی بد نتیجہ نکالنا کسی بد اور خبیث آدمی کا کام ہے بلکہ اصل بات تو یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام اس بات پر بہت حریص ہوتے ہیں کہ ہر یک نیکی اور تقویٰ کے کام کو عملی نمونہ کے پیرایہ میں لوگوں کے دلوں میں بٹھا دیں۔پس بسا اوقات وہ تنزل کے طور پر کوئی ایسا نیکی اور تقویٰ کا کام بھی کرتے ہیں جس میں محض عملی نمونہ دکھانا منظور ہوتا ہے اور ان کے نفس کو اس کی کچھ بھی حاجت نہیں ہوتی جیسا کہ ہم **قانون قدرت** کے آئینہ میں یہ بات حیوانات میں بھی پاتے ہیں۔مثلاً ایک مرغ صرف مصنوعی طور پر اپنی منقار دانہ پر اس غرض سے مارتی ہے کہ اپنے بچوں کو سکھاوے کہ اس طرح دانہ زمین پر سے اٹھانا چاہئے سو عملی نمونہ دکھانا کامل معلّم کے لئے ضروری ہوتا ہے اور ہر یک فعل معلّم کا اس کے دل کی حالت کا معیار نہیں ہوتا ماسوا اس کے ایک خوبصورت کو اگر اتفاقاً اس پر نظر پڑ جائے خوبصورت سمجھنا نفس الامر میں کوئی بات عیب کی نہیں۔ہاں بد خطرات کامل تقدس کے برخلاف ہیں لیکن جو شخص بد خطرات سے پہلے حفظ ماتقدم کے طور پر تقویٰ کی دقیق راہوں پر قدم مارے تا خطرات سے دور رہے تو کیا ایسا عمل کمال کے منافی ہوگا۔یہ تعلیم **قرآن شریف** کی نہایت اعلیٰ ہے کہ اِنَّ اَکۡرَمَکُمۡ عِنۡدَ اللّٰہِ اَتۡقٰکُمۡ (الحجرات:۱۴)یعنی جس قدر کوئی تقویٰ کی دقیق راہیں اختیار کرے اسی قدر خدا تعالیٰ کے نزدیک اس کا زیادہ مرتبہ ہوتا ہے پس بلاشبہ یہ نہایت اعلیٰ مرتبہ تقویٰ کا ہے کہ قبل از خطرات خطرات سے محفوظ رہنے کی تدبیر بطور حفظ ماتقدم کی جائے۔

اور اگر یہ دعویٰ ہو کہ کاملین بہر حال خطرات سے محفوظ رہتے ہیں ان کو تدبیر کی حاجت نہیں تو یہ دعویٰ سراسر حماقت اور قصور معرفت کی وجہ سے ہوگا کیونکہ انبیاء علیہم السلام کسی معصیت

اورنافرمانی پر ایک سیکنڈ کے لئے بھی دلی عزیمت نہیں کرسکتے اور ایسا کرنا ان کے لئے کبائر ذنوب کی طرح ہے لیکن انسانی قویٰ اپنے خواص اُن میں بھی دکھلا سکتے ہیں کو وہ بدخطرات پر قائم ہونے سے بکلّی محفوظ رکھے گئے ہیں مثلاً اگر ایک نبی بشدت بھوکا ہو اور راہ میں وہ بعض درخت پھلوں سے لدے ہوئے پائے تو یہ تو ہم تسلیم کرتے ہیں کہ وہ بغیر اجازت مالک پھلوں کی طرف ہاتھ لمبا نہیں کرے گا اور نہ دل میں ان پھلوں کے توڑنے کے لئے عزیمت کرے گا لیکن یہ خیال اس کو آسکتا ہے۔ کہ اگر یہ پھل میری ملک میں سے ہوتے تو میں ان کو کھا سکتا اور یہ خیال کمال کے منافی نہیں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ آپ کے **خدا صاحب** تھوڑی سی بھوک کے عذاب پر **صبر نہ کر کے** کیونکر **انجیر** کے درخت کی طرف دوڑے گئے کیا آپ ثابت کرسکتے ہیں کہ یہ درخت ان کا یا ان کے والد صاحب کی ملک میں سے تھا۔ پس جو شخص بیگانہ درخت کو دیکھ کر اپنے **نفس پر غالب نہ آسکا** اور پیٹ کو بھینٹ چڑھانے کے لئے اس کی طرف دوڑا گیا وہ خدا تو کیا بلکہ بقول آپ کے فرد اکمل بھی نہیں۔

الغرض کسی کے دل میں یہ خیال گذرنا کہ یہ چیز خوبصورت ہے یہ ایک علیحدہ امر ہے جس کو خدا نے آنکھیں دی ہیں جیسے وہ کانٹے اور پھول میں فرق کرسکتا ہے۔ ایسا ہی وہ خوبصورت اور بدصورت میں فرق کرسکتا ہے آپ کے خدا صاحب کو شاید یہ قوت ممیّزہ فطرت سے نہیں ملی ہوگی مگر **پیٹ کی شہوت** کے لئے تو انجیر کے درخت کی طرف دوڑے یہ بھی نہ سوچا کہ یہ کس کا انجیر ہے۔

تعجب کہ ایک **شرابی** اور **کھاؤ پیو** کو **شہوت پرست** نہ کہا جائے اور وہ پاک ذات جس کی زندگی اور جس کا ہر یک فعل خدا کے لئے تھا اس کا نام اس زمانہ کے پلید طبع شہوت پرست رکھیں عجب تاریکی کا زمانہ ہے۔ یہ **اسلام** کی اعلیٰ تعلیم کا ایک نمونہ ہے کہ ہرگز قصداً کسی عورت کی طرف نظر اٹھا کر نہ دیکھو کہ یہ بدنظری کا پیش خیمہ ہے اور اگر اتفاقاً کسی خوبصورت عورت پر نظر پڑے اور وہ خوبصورت معلوم ہو تو اپنی عورت سے صحبت کرکے اس خیال کو ٹال دو۔ خوب یاد رکھو کہ یہ تعلیم اور یہ حکم حفظ ماتقدم کے طور پر ہے جو شخص مثلاً ہیضہ کے دنوں میں ہیضہ سے بچنے کے لئے

حفظ ماتقدم کے طور پر کوئی دوا استعمال کرتا ہے تو کیا کہہ سکتے ہیں کہ اس کو ہیضہ ہو گیا ہے یا ہیضہ کے آثار اس میں ظاہر ہو گئے ہیں بلکہ یہ بات اس کی دانشمندی میں محسوب ہو گی اور سمجھا جائے گا کہ وہ اس بیماری سے طبعاً نفرت رکھتا ہے اور اس سے دور رہنا چاہتا ہے۔ اس بات میں آپ کے ساتھ کوئی بھی اتفاق نہیں کرے گا کہ تقویٰ کی راہوں کو اختیار کرنا کمال کے برخلاف ہے۔ اگر انبیاء علیہم السلام تقویٰ کا نمونہ نہ دکھلاویں تو اور کون دکھلاوے جو خدا ترسی میں سب سے بڑھ کر ہوتا ہے وہی سب سے بڑھ کر تقویٰ بھی اختیار کرتا ہے وہ بدی سے اپنے تئیں دور رکھتا ہے وہ ان راہوں کو چھوڑ دیتا ہے جس میں بدی کا احتمال ہوتا ہے مگر آپ کے **یسوع** صاحب کی نسبت کیا کہیں اور کیا لکھیں اور کب تک ان کے حال پر روویں کیا یہ مناسب تھا کہ **وہ ایک زانیہ عورت کو** یہ موقعہ دیتا کہ وہ عین جوانی اور حسن کی حالت میں ننگے سر اس سے مل کر بیٹھتی اور نہایت ناز و نخرہ سے اس کے پاؤں پر اپنے بال ملتی اور حرام کاری کے عطر سے اس کے سر پر مالش کرتی اگر **یسوع** کا دل بد خیالات سے پاک ہوتا تو وہ ایک کسبی عورت کو نزدیک آنے سے ضرور منع کرتا مگر ایسے لوگوں کو حرام کار عورتوں کے چھونے سے مزہ آتا ہے۔ وہ ایسے نفسانی موقعہ پر کسی ناصح کی نصیحت بھی نہیں سنا کرتے۔ دیکھو **یسوع** کو ایک غیرت مند بزرگ نے نصیحت کے ارادہ سے روکنا چاہا کہ ایسی حرکت کرنا مناسب نہیں مگر **یسوع** نے اس کے چہرہ کی ترش روئی سے سمجھ لیا کہ میری اس حرکت سے یہ شخص بیزار ہے تو **رندوں کی طرح** اعتراض کو باتوں میں ٹال دیا اور دعویٰ کیا کہ یہ کنجری بڑی اخلاص مند ہے۔ ایسا اخلاص تو تجھ میں بھی نہیں پایا گیا۔ سبحان اللہ یہ کیا عمدہ جواب ہے۔ **یسوع صاحب** ایک زنا کار عورت کی تعریف کر رہے ہیں کہ بڑی نیک بخت ہے۔ **دعویٰ خدائی کا اور کام ایسے**۔ بھلا جو شخص ہر وقت شراب سے سرمست رہتا ہے اور کنجریوں سے میل جول رکھتا ہے اور کھانے پینے میں بھی ایسا اول نمبر کا جو لوگوں میں یہ اس کا نام ہی پڑ گیا ہے کہ یہ **کھاؤ پیو** ہے۔ اس سے کس تقویٰ اور نیک بختی کی امید ہو سکتی ہے **ہمارے سیّد و مولیٰ افضل الانبیاء خیر الاصفیاء محمد مصطفیٰ ﷺ** کا تقویٰ دیکھئے کہ وہ ان عورتوں کے ہاتھ سے بھی ہاتھ نہیں ملاتے تھے جو پاک دامن اور نیک بخت ہوتی تھیں اور بیعت کرنے کے لئے آتی تھیں بلکہ دور بٹھا کر صرف

زبانی تلقین تو یہ کرتے تھے مگر کون عقلمند اور پرہیز گار ایسے شخص کو پاک باطن سمجھے گا جو جوان عورتوں کے چھونے سے پرہیز نہیں کرتا ایک کنجری خوبصورت ایسی قریب بیٹھی ہے گویا **بغل** میں ہے کبھی **ہاتھ** لمبا کر کے **سر پر** عطر مل رہی ہے کبھی **پیروں** کو پکڑتی ہے اور کبھی اپنے خوشنما اور سیاہ **بالوں** کو **پیروں** پر رکھ دیتی ہے اور گود میں تماشہ کر رہی ہے **یسوع** صاحب اس حالت میں **وجد** میں بیٹھے ہیں اور کوئی **اعتراض** کرنے لگے تو اس کو **جھڑک** دیتے ہیں۔ اور طرفہ یہ کہ **عمر جوان** اور **شراب** پینے کی عادت اور پھر **مجرد** اور ایک خوبصورت **کسبی عورت** سامنے پڑی ہے۔ جسم کے ساتھ جسم لگا رہی ہے۔ کیا یہ نیک آدمیوں کا کام ہے اور اس پر کیا دلیل ہے کہ اس کسبی کے چھونے سے **یسوع** کی **شہوت** نے جنبش نہیں کی تھی۔ افسوس کہ یسوع کو یہ بھی میسر نہیں تھا کہ اس **فاسقہ** پر نظر ڈالنے کے بعد اپنی کسی بیوی سے صحبت کر لیتا۔ کم بخت **زانیہ** کے چھونے سے اور **نازو ادا** کرنے سے کیا کچھ نفسانی جذبا**ت** پیدا ہوئے ہوں گے اور **شہوت** کے جوش نے پورے طور پر کام کیا ہوگا اسی وجہ سے **یسوع** کے منہ سے یہ بھی نہ نکلا کہ اے حرام کار **عورت** مجھ سے دور رہ اور یہ **بات** انجیل سے ثابت ہوتی ہے کہ وہ **عورت** **طوائف** میں سے تھی اور زنا کاری میں سارے شہر میں مشہور تھی۔

(نور القرآن نمبر۲، روحانی خزائن جلد نمبر ۹ صفحہ ۴۴۸ تا ۴۴۹)

کم عمر بچی سے شادی کا اعتراض

پادری فتح مسیح نو برس کی لڑکی یعنی حضرت عائشہ سے شادی کو نعوذ باللہ زنا کے حکم میں لایا ہے اس پر حضرت مسیح موعود علیہ السلام تحریر فرماتے ہیں:

"پادری صاحب! آپ کا یہ خیال کہ نو۹ برس کی لڑکی سے جماع کرنا زنا کے حکم میں ہے سراسر غلط ہے آپ کی ایمانداری یہ تھی کہ آپ انجیل سے اس کو ثابت کرتے۔ انجیل نے آپ کو دھکے دیئے اور وہاں ہاتھ نہ پڑا تو گورنمنٹ کے پیروں پر آپڑے۔ یاد رکھیں کہ یہ گالیاں محض شیطانی تعصب سے ہیں۔ **جناب مقدس نبویؐ** کی نسبت فسق و فجور کی تہمت لگانا یہ افترا شیطانوں کا کام ہے ان دو مقدس نبیوں پر یعنی **آنحضرت ﷺ** اور حضرت **مسیح علیہ السلام** پر بعض بدذات

اور خبیث لوگوں نے سخت افترا کئے ہیں۔چنانچہ ان پلیدوں نے **لعنۃ اللہ علیھم** پہلے نبیؑ کو تو زانی قرار دیا جیسا کہ آپ نے اور دوسرے کو ولد الزنا کہا جیسا کہ **پلید طبع یہودیوں** نے۔آپ کو چاہئے کہ ایسے اعتراضوں سے پرہیز کریں"

(نور القرآن نمبر۲، روحانی خزائن جلد نمبر ۹ صفحہ ۳۸۰)

☆

قادیان کے آریہ صاحبان نے آنحضورؐ پر یہ اعتراض بھی کیا کہ: بھلا اس مسئلہ پر بھی کبھی توجہ فرمائی ہے کہ حضرت رسول خدا محمدؐ صاحب کا اپنی بیوی حضرت عائشہ نو سالہ سے ہم بستر ہونا کیا اولاد پیدا کرنے کی نیت سے تھا۔

اس کے جواب میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام میں تحریر فرماتے ہیں:۔

یہ اعتراض محض جہالت کی وجہ سے کیا گیا ہے۔کاش اگر نادان معترض پہلے کسی محقق ڈاکٹر یا طبیب سے پوچھ لیتا تو اس اعتراض کرنے کے وقت بجز اس کے کسی اور نتیجہ کی توقع نہ رکھتا کہ ہر یک حقیقت شناس کی نظر میں نادان اور احمق ثابت ہوگا۔ڈاکٹر مون صاحب جو علوم طبعی اور طبابت کے ماہر اور انگریزوں میں بہت مشہور محقق ہیں وہ لکھتے ہیں کہ گرم ملکوں میں عورتیں آٹھ یا نو برس کی عمر میں شادی کے لائق ہو جاتی ہیں۔کتاب موجود ہے تم بھی اسی جگہ ہو اگر طلب حق ہے تو آ کر دیکھ لو۔اور حال میں ایک ڈاکٹر صاحب جنہوں نے کتاب معدن الحکمت تالیف کی ہے۔وہ اپنی کتاب تدبیر بقاء نسل میں بعینہ یہی قول لکھتے ہیں جو اوپر نقل ہو چکا۔ اور صفحہ ۴۶ میں لکھتے ہیں کہ ڈاکٹروں کی تحقیقات سے یہ ثابت ہے کہ نو یا آٹھ یا پانچ یا چھ برس کی لڑکیوں کو حیض آیا۔یہ کتاب بھی میرے پاس موجود ہے جو چاہے دیکھ لے۔ان کتابوں میں کئی اور ڈاکٹروں کا نام لے کر حوالہ دیا گیا ہے اور چونکہ یہ تحقیقاتیں بہت مشہور ہیں اور کسی دانا پر مخفی نہیں اس لئے زیادہ لکھنے کی حاجت نہیں۔اور حضرت عائشہ کا نو سالہ ہونا تو صرف بے سروپا اقوال میں آیا ہے۔کسی حدیث یا قرآن سے ثابت نہیں لیکن ڈاکٹر واہ صاحب کا ایک چشم دید قصہ لینسٹ نمبر ۱۵ مطبوعہ اپریل ۱۸۸۱ء میں اس طرح لکھا ہے کہ انہوں نے ایسی عورت کو جنایا

جس کو ایک برس کی عمر سے حیض آنے لگا تھا اور آٹھویں برس حاملہ ہوئی اور آٹھ ۸ برس دس ۱۰ مہینہ کی عمر میں لڑکا پیدا ہوا۔

اب اے نادان آریو کسی کنوئیں میں پڑ کر ڈوب مرو کہ تحقیق کی رو سے تمہارا ہر یک الزام جھوٹا نکلا۔ یہی سزا ایسے لوگوں کی ہے جو ہمیشہ بخل اور تعصب سے بات کرتے ہیں کبھی ساری عمر میں بھی ان کو خیال نہیں آتا کہ کسی سچائی کو بھی قبول کرلیں۔ اے غافلو۔ کیا تم ہمیشہ زندہ رہو گے کیا کبھی تم پوچھے نہیں جاؤ گے۔ کیوں حد سے بڑھتے ہو کچھ اس مالک کا خوف کرو جو کبھی **شریر کو بے سزا نہیں چھوڑے گا**"۔ (آریہ دھرم، روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۶۲ تا ۶۴)

حضرت عائشہ سے شادی پر اعتراض

عیسائیوں نے بالخصوص آنحضورؐ کی تعدد ازدواج اور حضرت عائشہؓ کے ساتھ کم عمری میں شادی پر اعتراض کئے ہیں۔ حضرت مصلح موعودؓ اس پر بیان فرماتے ہیں:

"بعض عیسائی مصنفین لکھتے ہیں کہ آپ کے پاس دولت آئی تو آپ بگڑ گئے۔ حالانکہ آپ کی حالت یہ تھی کہ جب وفات پائی تو زرہ، چند صاع جَو کے عوض رہن تھی۔ غرض یہ کہ آپ پر غربت اور دولت مندی دونوں زمانے آئے مگر آپ نے ہر حالت میں اچھا نمونہ دکھایا۔ آپ کو روپیہ ملا مگر پھر بھی آپ نے غربت کو قائم رکھا۔ آپ مجرد رہے اور ایسا اعلیٰ نمونہ دکھایا کہ دنیا حیران ہے۔ آپ نے ۲۵ برس کی عمر میں شادی کی جو عرب میں بڑی عمر ہے۔ کیونکہ وہاں ۱۶، ۱۷ برس کا آدمی پورا بالغ ہو جاتا ہے اور اس عمر میں بھی جب آپ نے شادی کی تو چالیس سال کی ایک بیوہ کے ساتھ۔ گویا اس زمانہ میں جو امنگوں اور آرزوؤں کا زمانہ ہوتا ہے آپؐ نے ایسی عورت سے شادی کی جو اپنا زمانہ گزار چکی تھی۔ پھر شادی کے بعد حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے اپنی ساری دولت آپ کے حوالے کر دی مگر آپ نے سب سے پہلا کام جو کیا وہ یہ تھا کہ اس کے سب غلاموں کو آزاد کر دیا۔ گویا جب آپ نے شادی نہ کی تھی اس وقت بھی اعلیٰ نمونہ دکھایا اور جب کی

تو بھی ایسا نمونہ دکھایا کہ جس کی مثال نہیں ملتی۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ آپؐ کی شادی پر لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ ۹ سال کی عمر میں شادی کی جو ظلم ہے۔ اول تو یہ بھی غلط ہے۔ عمر کے بارہ میں مختلف روایتیں ہیں اور محقق یہی ہے کہ اس وقت آپ کی عمر تیرہ سال کی تھی۔ اگر چہ بعض روایتوں میں سترہ سال بھی ہے لیکن تیرہ سال ہی صحیح ہے اور یہ بھی چھوٹی عمر ہی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ سب سے زیادہ تکلیف خود انہیں ہی ہوسکتی تھی، عیسائی مصنفین کو تکلیف ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ تیرہ سال کی عمر میں آپ کی شادی ہوئی اور ۹ سال بعد آنحضرت ﷺ کا انتقال ہوگیا۔ گویا بائیس برس کی عمر میں ہی آپ بیوہ ہو گئیں۔ اس پر بعض لوگ کہتے ہیں کہ آپ کی عمر اس شادی کی وجہ سے ہی برباد ہوگئی۔ مگر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے دل کی گہرائیوں کو ہم ٹٹولتے ہیں تو اس میں آنحضرت ﷺ کی محبت کا بہت گہرا نقش پاتے ہیں۔ سالہا سال گزر جاتے ہیں اور آپ کے پاس کثرت سے روپیہ آنے لگتا ہے اور ثابت ہے کہ ایک ایک دن میں لاکھ لاکھ روپیہ آپ کے پاس آیا مگر آپ کی سادگی میں فرق نہیں آیا اور آپ نے وہ سب کا سب شام تک تقسیم کر دیا۔ ایک دن صبح سے شام تک آپ نے قریباً ایک لاکھ روپیہ تقسیم کر دیا۔ اس پر ایک سہیلی نے کہا کہ آپ روزہ سے تھیں اگر چار آنہ رکھ لیتیں تو کیا اچھا ہوتا۔ آپ نے جواب دیا کہ تم نے پہلے کیوں نہ یاد دلایا۔ اگر آنحضرتؐ کی محبت کا نقش اس قدر گہرا نہ ہوتا تو آپ روپیہ ملنے پر ضرور یہ طریق بدل دیتیں۔ مگر حالت یہ تھی کہ ایک دفعہ آپ میدہ کی روٹی کھانے لگیں۔ نرم نرم پھلکے تھے مگر آپ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اور کسی ہجولی نے دریافت کیا تو فرمایا میں اس لئے روتی ہوں کہ اگر آج آنحضرتؐ زندہ ہوتے تو یہ نرم نرم پھلکے انہیں کھلاتی۔ غور کرو یہ کتنا گہرا نقش ہے۔ کتنے ہیں جو وفات کے بعد مرنے والوں کو اس طرح یاد رکھتے ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی زندگی کا ایک ایک لمحہ بتاتا ہے کہ آپ کا دل آنحضرت ﷺ کی محبت سے لبریز تھا۔ بعض بد باطن کہتے ہیں کہ آپ نعوذ باللہ عیاش تھے۔ کیا عیاش لوگوں کی بیویاں ان کی موت کے بعد اسی طرح ان کے ساتھ اظہارِ محبت کرتی ہیں؟ وہ تو نفرت اور حقارت سے انہیں دیکھتی ہیں اور ان کی موت کو

اپنی نجات سے تعبیر کرتی ہیں۔ غرضیکہ شادی کے زمانہ میں بھی آپ نے نہایت اعلیٰ درجہ کا نمونہ دکھایا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں میں ہم دیکھتے ہیں آپ بیویوں سے ایسا برتاؤ کرتے جو محبت کے ازدیاد کا موجب ہو۔ حتیٰ کہ پیالہ کی جس جگہ منہ لگا کر وہ پانی پیتیں بعض اوقات آپ بھی وہیں ہونٹ لگا کر پیتے اور فرماتے یہ محبت بڑھانے کا ذریعہ ہے۔ اگر کسی اونچی جگہ چڑھنا ہوتا تو آپ اپنے گھٹنے کا سہارا دیتے۔

یورپ کے وہ نادان لوگ جو آج اعتراض کرتے اور کہتے ہیں عورت کی عزت کے لئے یہ ضروری ہے، جب رسول کریم ﷺ سے ایسی بات دیکھتے ہیں تو اسی کی بناء پر آپ کو عیاش کہہ دیتے ہیں۔" (انوار العلوم جلد ۱۲ صفحہ ۳۶۲، صفحہ ۳۶۲)

اپنی بیوی حضرت سودہ کو پیرانہ سالی کی وجہ سے طلاق پر مستعد ہو گئے

پادری فتح مسیح کے اس اعتراض کے جواب میں حضور علیہ السلام تحریر فرماتے ہیں:

"یہ اعتراض کہ آنحضرت ﷺ اپنی بیوی سودہ کو پیرانہ سالی کے سبب سے طلاق دینے کے لئے مستعد ہو گئے تھے۔ سراسر غلط اور خلاف واقعہ ہے اور جن لوگوں نے ایسی روائتیں کی ہیں وہ اس بات کا ثبوت نہیں دے سکے کہ کس شخص کے پاس آنحضرت ﷺ نے ایسا ارادہ ظاہر کیا پس اصل حقیقت جیسا کہ کتب معتبرہ احادیث میں مذکور ہے یہ ہے کہ خود سودہ نے ہی اپنی پیرانہ سالی کی وجہ سے دل میں یہ خوف کیا کہ اب میری حالت قابل رغبت نہیں رہی ایسا نہ ہو کہ آنحضرت ﷺ بباعث طبعی کراہت کے جو نشاء بشریت کو لازم ہے مجھ کو طلاق دے دیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی امر کراہت کا بھی اس نے اپنے دل میں سمجھ لیا ہو اور اس سے طلاق کا اندیشہ دل میں جم گیا ہو۔ کیونکہ عورتوں کے مزاج میں ایسے معاملات میں وہم اور وسوسہ بہت ہوا کرتا ہے اس لئے اس نے خود بخود وہی عرض کر دیا کہ میں اس کے سوا اور کچھ نہیں چاہتی کہ آپ کی ازواج میں میرا حشر ہو۔ چنانچہ **نیل الاوطار** کے ص ۱۴۰ میں یہ حدیث ہے: قَالَتْ السَّوْدَة

بنت زمعة حين اسنت و خافت آن يفارقها رسول الله قالت يا رسول الله وهبت يومي لعائشة فقبل ذلك منها... و رواه ايضًا سعد و سعيد ابن منصور والترمذی و عبد الرزاق قال الحافظ فی الفتح فتواردت هذه الروايات على انها خشيت الطلاق ۔یعنی سودہ بنت زمعہ کو جب اپنی پیرانہ سالی کی وجہ سے اس بات کا خوف ہوا کہ اب شائد میں آنحضرت ﷺ سے جدا ہو جاؤں گی تو اس نے کہا یا رسول اللہ میں نے اپنی نوبت عائشہ کو بخش دی۔ آپ نے یہ اس کی درخواست قبول فرمالی۔ ابن سعد اور سعید ابن منصور اور ترمذی اور عبدالرزاق نے بھی یہی روایت کی ہے اور فتح الباری میں لکھا ہے کہ اسی پر روایتوں کا توارد ہے کہ سودہ کو آپ ہی طلاق کا اندیشہ ہوا تھا۔ اب اس حدیث سے ظاہر ہے کہ دراصل آنحضرت ﷺ سے کوئی ارادہ ظاہر نہیں ہوا بلکہ سودہ نے اپنی پیرانہ سالی کی حالت پر نظر کر کے خود ہی اپنے دل میں یہ خیال قائم کر لیا تھا اور اگر ان روایات کے توارد اور تظاھر کو نظر انداز کر کے فرض بھی کر لیں کہ آنحضرتؐ نے طبعی کراہت کے باعث سودہ کو پیرانہ سالی کی حالت میں پا کر طلاق کا ارادہ کیا تھا تو اس میں بھی کوئی برائی نہیں۔ اور نہ یہ امر کسی اخلاقی حالت کے خلاف ہے۔ کیونکہ جس امر پر عورت مرد کے تعلقات مخالطت موقوف ہیں۔ اگر اس میں کسی نوع سے کوئی ایسی روک پیدا ہو جائے کہ اس کے سبب سے مرد اس تعلق کے حقوق کی بجا آوری پر قادر نہ ہو سکے تو ایسی حالت میں اگر وہ اصول تقویٰ کے لحاظ سے کوئی کاروائی کرے تو عند العقل کچھ جائے اعتراض نہیں“۔

(نورالقرآن نمبر۲، روحانی خزائن جلد نمبر ۹ صفحہ ۳۸۰ تا ۳۸۲)

مسئلہ طلاق پر اعتراض

ولیم میور نے آنحضورؐ کی طلاق کے بارہ میں تعلیم پر اعتراض کیا اور اس کو بہت خطرناک فعل قرار دیا ہے۔ اس بارہ میں حضرت مصلح موعودؓ بیان فرماتے ہیں:

”طلاق کے متعلق تو مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یا تو اس پر بڑے زور شور سے

اعتراض کیے جاتے تھے اور یا اب تمام ممالک میں اور تمام اقوام میں یہ مسئلہ جاری ہو رہا ہے اور دنیا نے فیصلہ کر دیا ہے کہ طلاق جائز نہ ہونا بہت بڑا ظلم ہے۔ بلکہ امریکہ تو طلاق کے جواز میں اسلامی احکام سے بھی آگے نکل گیا ہے۔" (انوار العلوم جلد ۱۰ صفحہ ۲۶۵ و ۲۶۶)

متبنّٰی کی مطلقہ سے شادی کا اعتراض

قادیان کے آریہ صاحبان نے آنحضرتؐ پر یہ اعتراض کیا کہ اب دیکھئے کہ لفظ زنا کس موقع کے لئے موزوں ہے رسول خدا حضرت محمد صاحب کا اپنے متبنّٰی بیٹے کی (بیوی یعنی اپنی) بہو مسماۃ زینب کی خواہش کرنا اور اس کے معقول عذر پر یہ بہانہ کرنا کہ خدا تعالیٰ نے عرش پر اپنی زبان مبارک سے میرا اور تیرا نکاح پڑھ دیا ہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام اس کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

اے لالہ صاحبان آپ لوگوں نے ہمارے سید و مولیٰ رسول اللہ ﷺ پر جو تمام پرہیز گاروں اور پاک دلوں کے سردار ہیں زنا کی تہمت لگائی اگر چہ **تعزیرات ہند دفعہ ۲۹۸** کی رو سے ایسے شخصوں کی توہین کے مقدمہ میں جو ایک عظیم الشان پیشوا کی نسبت کی گئی ہے۔ سزا تو یہ ہے کہ کم سے کم عدالت سے ڈاڑھی اور مونچھ منڈوا کر برس برس کی قید ہو اور پیچھے کھترانیوں اور مصرانیوں کو بجز نیوگ کرانے کے اور کوئی صورت کارروائی کے لئے باقی نہ رہے لیکن بالفعل ہم اس امید سے برداشت کرتے ہیں کہ تا شاید تم آئندہ باز آ جاؤ۔

اب ہم ان آریوں کے اس پر افترا اعتراض کی بیخ کنی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جو انہوں نے زینب کے نکاح کی نسبت تراشا ہے۔ ان مفتری لوگوں نے اعتراض کی بنا دو باتیں ٹھہرائی ہیں (۱) یہ کہ متبنّٰی اگر اپنی جورو کو طلاق دے دیوے تو متبنّٰی کرنے والے کو اس عورت سے نکاح جائز نہیں (۲) یہ کہ زینب آنحضرت کے نکاح سے ناراض تھی تو گویا آنحضرت نے زینب کے معقول عذر پر یہ بہانہ گھڑا کہ مجھ پر وحی نازل ہوئی ہے سو ہم ان دو باتوں کا ذیل میں جواب دیتے ہیں۔

امر اول کا جواب۔ یہ ہے کہ جو لوگ متبنّٰی کرتے ہیں ان کا یہ دعویٰ سراسر لغو اور باطل ہے کہ وہ حقیقت میں بیٹا ہو جاتا ہے اور بیٹوں کے تمام احکام اس کے متعلق ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ قانون قدرت اس بیہودہ دعویٰ کو رد کرتا ہے اس لئے کہ جس کا نطفہ ہوتا ہے اسی کے اعضاء میں سے بچہ کے اعضاء حصہ لیتے ہیں اسی کے قویٰ کے مشابہ اس کے قویٰ ہوتے ہیں اور اگر وہ انگریزوں کی طرح سفید رنگ رکھتا ہے تو یہ بھی اس سفیدی سے حصہ لیتا ہے اگر وہ حبشی ہے تو اس کو بھی اس سیاہی کا بخرہ ملتا ہے اگر وہ آتشک زدہ ہے تو یہ بیچارہ بھی اسی بلا میں پھنس جاتا ہے۔ غرض جس کا حقیقت میں نطفہ ہے اسی کے آثار بچہ میں ظاہر ہوتے ہیں جیسی گیہوں سے گیہوں پیدا ہوتی ہے اور چنے سے چنا نکلتا ہے پس اس صورت میں ایک کے نطفہ کو اس کے غیر کا بیٹا قرار دینا واقعات صحیحہ کے مخالف ہے۔ ظاہر ہے کہ صرف منہ کے دعویٰ سے واقعات حقیقیہ بدل نہیں سکتے مثلاً اگر کوئی کہے کہ میں نے سم الفار کے ایک ٹکڑہ کو طباشیر کا ٹکڑہ سمجھ لیا تو وہ اس کے کہنے سے طباشیر نہیں ہو جائے گا اور اگر وہ اس وہم کی بناء پر اسے کھائے گا تو ضرور مرے گا جس حالت میں خدا نے زید کو بکر کے نطفہ سے پیدا کر کے بکر کا بیٹا بنا دیا تو پھر کسی انسان کی فضول گوئی سے وہ خالد کا بیٹا نہیں بن سکتا اور اگر بکر اور خالد ایک مکان میں اکٹھے بیٹھے ہوں اور اس وقت حکم حاکم پہنچے کہ زید جس کا حقیقت میں بیٹا ہے اس کو پھانسی دیا جائے تو اس وقت خالد فی الفور عذر کر دے گا کہ زید حقیقت میں بکر کا بیٹا ہے میرا اس سے کچھ تعلق نہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ کسی شخص کے دو باپ تو نہیں ہو سکتے پس اگر متبنّٰی بنانے والا حقیقت میں باپ ہو گیا ہے تو یہ فیصلہ ہونا چاہئے کہ اصلی باپ کس دلیل سے لا دعویٰ کیا گیا ہے۔ ہو جائے مگر اس قابل شرم زنا کاری کے بعد بھی مرد کو اس نطفہ سے کچھ تعلق نہیں کیونکہ وہ غیر کا نطفہ ہے اب چونکہ عقل کسی طرح قبول نہیں کر سکتی کہ متبنّٰی درحقیقت اپنا ہی لڑکا ہو جاتا ہے اس لئے ایسے اعتراض کرنے والے پر واجب ہے کہ اعتراض سے پہلے اس دعوے کو ثابت کرے اور درحقیقت اعتراض تو ہمارا حق ہے کہ کیونکر غیر کا نطفہ جو غیر کے خواص اپنے اندر رکھتا ہے اپنا نطفہ بن سکتا ہے پہلے اس اعتراض کا جواب دیں اور پھر ہم پر اعتراض کریں اور یہ بھی یاد رہے کہ زید جو زینب کا پہلا خاوند تھا وہ دراصل آنحضرت ﷺ کا

غلام تھا آپ نے اپنے کرم ذاتی کی وجہ سے اس کو آزاد کردیا اور بعض دفعہ اس کو بیٹا کہا تا غلامی کا داغ اس پر سے جاتا رہے چونکہ آپ کریم النفس تھے اس لئے زید کو قوم میں عزت دینے کے لئے آپ کی یہ حکمت عملی تھی مگر عرب کے لوگوں میں یہ رسم پڑ گئی تھی کہ اگر کسی کا استاد یا آقا یا مالک اس کو بیٹا کر کے پکارتا تو وہ بیٹا ہی سمجھا جاتا یہ رسم نہایت خراب تھی اور نیز ایک بیہودہ وہم پر اس کی بنا تھی کیونکہ جبکہ تمام انسان بنی نوع ہیں تو اس لحاظ سے جو برابر کے آدمی ہیں وہ بھائیوں کی طرح ہیں اور جو بڑے ہیں وہ باپوں کی مانند ہیں اور چھوٹے بیٹوں کی طرح ہیں۔ لیکن اس خیال سے اگر مثلاً کوئی ہندو ادب کی راہ سے قوم کے کسی مُسن آدمی کو باپ کہہ دے یا کسی ہم عمر کو بھائی کہہ دے تو کیا اس سے یہ لازم آئے گا کہ وہ قول ایک سند متصور ہو کر اس ہندو کی لڑکی اس پر حرام ہو جائے گی یا اس کی بہن سے شادی نہیں ہو سکے گی اور یہ خیال کیا جائے گا کہ اتنی بات میں وہ حقیقی ہمشیرہ بن گئیں اور اس کے مال کی وارث ہو گئیں یا یہ ان کے مال کا وارث ہو گیا۔ اگر ایسا ہوتا تو ایک شریر آدمی ایک لاولد اور مالدار کو اپنے منہ سے باپ کہہ کر اس کے تمام مال کا وارث بن جاتا کیونکہ اگر صرف منہ سے کہنے کے ساتھ کوئی کسی کا بیٹا بن سکتا ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ صرف منہ سے کہنے سے باپ نہ بن جائے پس اگر یہی سچ ہے تو مفلسوں ناداروں کے لئے نقب زنی یا ڈاکہ مارنے سے بھی یہ عمدہ تر نسخہ ہو جائے گا یعنی ایسے لوگ کسی آدمی کو دیکھ کر جو کئی لاکھ یا کئی کروڑ کی جائیداد رکھتا ہو اور لاولد ہو کہہ سکتے ہیں کہ میں نے تجھ کو باپ بنایا پس اگر وہ حقیقت میں باپ ہو گیا ہے تو ایسے مذہب کی رو سے لازم آئے گا کہ اس لاولد کے مرنے کے بعد سارا مال اس شخص کو مل جائے اور اگر وہ باپ نہیں بن سکا تو اقرار کرنا پڑے گا کہ یہ مسئلہ ہی جھوٹا ہے۔ اور نیز ایسا ہی ایک شخص کسی کو بیٹا کہہ کر ایسا ہی فریب کر سکتا ہے **اب چلو کہاں تک چلتے ہو ذرا اپنے وید کی سچائی تو ثابت کرو**۔ بہتیرے راجے اور مہاراجے اپنی وفادار رعیت کو بیٹے اور بیٹیاں ہی سمجھتے ہیں اور ساتھ ہی ان کی لڑکیاں بھی لے لیتے ہیں اور بہتیرے لوگ محبت یا ادب سے کسی کو باپ اور کسی کو بیٹا کہہ دیتے ہیں مگر ان کے وارث نہیں ہو سکتے۔

اب جاننا چاہئے کہ خدا تعالیٰ نے قرآن کریم میں پہلے ہی یہ حکم فرما دیا تھا کہ تم پر صرف

ان بیٹوں کی عورتیں حرام ہیں جو تمہارے **صلبی بیٹے** ہیں۔جیسا کہ یہ آیت ہے۔

وَحَلَآئِلُ اَبۡنَآئِكُمُ الَّذِيۡنَ مِنۡ اَصۡلَابِكُمۡ (النساء:۲۴) یعنی تم پر فقط ان بیٹوں کی جوروان حرام ہیں جو تمہاری پشت اور تمہارے نطفہ سے ہوں۔پھر جبکہ پہلے سے یہی قانون تعلیم قرآنی میں خدا تعالیٰ کی طرف سے مقرر ہو چکا ہے اور یہ زینب کا قصہ ایک مدت بعد اس کے ظہور میں آیا تو اب ہر یک سمجھ سکتا ہے کہ قرآن نے یہ فیصلہ اسی قانون کے مطابق کیا جو اس سے پہلے منضبط ہو چکا تھا۔قرآن کھولو اور دیکھو کہ زینب کا قصہ اخیری حصہ قرآن میں ہے مگر یہ قانون کہ متبنّٰی کی جورو حرام نہیں ہو سکتی یہ پہلے حصہ میں ہی موجود ہے اور اس وقت کا یہ قانون ہے کہ جب زینب کا زید سے ابھی نکاح بھی نہیں ہوا تھا تم آپ ہی قرآن شریف کو کھول کر ان دونوں مقاموں کو دیکھ لو اور ذرہ شرم کو کام میں لاؤ۔

اور پھر بعد اس کے سورۃ **الاحزاب** میں فرمایا۔مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنۡ قَلۡبَيۡنِ فِىۡ جَوۡفِهٖ‌ ۚ وَمَا جَعَلَ اَزۡوَاجَكُمُ الّٰٓـئِْ تُظٰهِرُوۡنَ مِنۡهُنَّ اُمَّهٰتِكُمۡ‌ ۚ وَمَا جَعَلَ اَدۡعِيَآءَكُمۡ اَبۡنَآءَكُمۡ‌ ؕ ذٰ لِكُمۡ قَوۡلُكُمۡ بِاَفۡوَاهِكُمۡ‌ ؕ وَاللّٰهُ يَقُوۡلُ الۡحَـقَّ وَهُوَ يَهۡدِى السَّبِيۡلَ اُدۡعُوۡهُمۡ لِاٰبَآئِهِمۡ هُوَ اَقۡسَطُ عِنۡدَ اللّٰهِ (الاحزاب:۶،۵) یعنی خدا تعالیٰ نے کسی کے پیٹ میں دو دل نہیں بنائے پس اگر تم کسی کو کہو کہ تو میرا دل ہے تو اس کے پیٹ میں دو دل نہیں ہو جائیں گے۔

دل تو ایک ہی رہے گا اسی طرح جس کو تم ماں کہہ بیٹھے وہ تمہاری ماں نہیں بن سکتی اور اسی طرح خدا نے تمہارے منہ بولے بیٹوں کو حقیقت میں تمہارے بیٹے نہیں کر دیا۔یہ تو تمہارے منہ کی باتیں ہیں اور خدا سچ کہتا ہے اور سیدھی راہ دکھلاتا ہے تم اپنے منہ بولے بیٹوں کو ان کے باپوں کے نام سے پکارو یہ تو **قرآنی تعلیم** ہے مگر چونکہ خدا تعالیٰ کو منظور تھا کہ اپنے پاک نبی کا نمونہ اس میں قائم کر کے پورانی رسم کی کراہت کو دلوں سے دور کر دے سو یہ نمونہ خدا تعالیٰ نے قائم کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام آزاد کردہ کی بیوی کی اپنے خاوند سے سخت ناسازش ہو گئی آخر طلاق تک نوبت پہنچی۔پھر جب خاوند کی طرف سے طلاق مل گئی تو اللہ تعالیٰ نے آنحضرت

ﷺ کے ساتھ پیوند نکاح کر دیا۔ اور خدا تعالیٰ کے نکاح پڑھنے کے یہ معنی نہیں کہ زینب اور آنحضرت ﷺ کا ایجاب قبول نہ ہوا اور جبراً خلاف مرضی زینب کے اس کو گھر میں آباد کر لیا یہ تو ان لوگوں کی بد ذاتی اور ناحق کا افترا ہے جو خدا تعالیٰ سے نہیں ڈرتے بھلا اگر وہ سچے ہیں تو اس افترا کا حدیث صحیح یا قرآن سے ثبوت تو دیں۔ اتنا بھی نہیں جانتے کہ اسلام میں نکاح پڑھنے والے کو یہ منصب نہیں ہوتا کہ جبراً نکاح کر دے بلکہ نکاح پڑھنے سے پہلے فریقین کی رضامندی ضروری ہوتی ہے۔ اب خلاصہ یہ کہ صرف منہ کی بات سے نہ تو بیٹا بن سکتا ہے نہ ماں بن سکتی ہے۔ مثلاً ہم آریوں سے پوچھتے ہیں کہ اگر ان میں سے کوئی شخص غصہ میں آ کر یا کسی دھوکہ سے اپنی عورت کو ماں کہہ بیٹھے تو کیا اس کی عورت اس پر حرام ہو جائے گی اور طلاق پڑ جائے گی اور خود یہ خیال بالبداہت باطل ہے کیونکہ طلاق تو آریوں کے مذہب میں کسی طور سے پڑ ہی نہیں سکتی خواہ اپنی بیوی کو نہ ایک دفعہ بلکہ ہزار دفعہ ماں کہہ دیں یا دادی کہہ دیں۔ تو پھر جبکہ صرف منہ کے کہنے سے کوئی عورت ماں یا دادی نہیں بن سکتی تو پھر صرف منہ کی بات سے کوئی غیر کا نطفہ بیٹا کیونکر بن سکتا ہے اور کیونکر قبول کیا جاتا ہے کہ درحقیقت بیٹا ہو گیا اور اس کی عورت اپنے پر حرام ہوگئی خدا کے کلام میں اختلاف نہیں ہو سکتا پس بلاشبہ یہ بات صحیح ہے کہ اگر صرف منہ کی بات سے ایک آریہ کی عورت اس کی ماں نہیں بن سکتی تو اسی طرح صرف منہ کی بات سے غیر کا بیٹا بیٹا بھی نہیں بن سکتا۔

اور دوسری جز جس پر اعتراض کی بنیاد رکھی گئی ہے یہ ہے کہ زینب نے آنحضرت ﷺ کو قبول نہیں کیا تھا صرف زبردستی خدا تعالیٰ نے حکم دے دیا۔ اس کے جواب میں ابھی ہم لکھ چکے ہیں کہ یہ ایک نہایت بد ذاتی کا افتراء ہے جس کا ہماری کتابوں میں نام و نشان نہیں۔ اگر سچے ہیں تو قرآن یا حدیث میں سے دکھلاویں کیسی بے ایمان قوم ہے کہ جھوٹ بولنے سے شرم نہیں کرتی۔ اگر افتراء نہیں تو ہمیں بتلاویں **کہاں لکھا** ہے کیا قرآن شریف میں یا بخاری اور **مسلم** میں۔ قرآن شریف کے بعد بالاستقلال وثوق کے لائق ہماری دو ہی کتابیں ہیں ایک بخاری اور ایک مسلم۔ سو قرآن یا بخاری اور مسلم سے اس بات کا ثبوت دیں کہ وہ نکاح زینب کے خلاف

مرضی پڑھا گیا تھا۔ظاہر ہے کہ جس حالت میں زینب زید سے جو آنحضرتؐ کا غلام آزاد تھا راضی نہ تھی اوراسی بناء پر زید نے تنگ آکر طلاق دی تھی اور زینب نے خود آنحضرتؐ کے گھر میں ہی پرورش پائی تھی اور آنحضرتؐ کے اقارب میں سے اور ممنون منت تھی تو زینب کے لئے اس سے بہتر اور کونسی مراد اور کونسی فخر کی جگہ تھی کہ غلام کی قید سے نکل کر اس شاہ عالم کے نکاح میں آوے جو خدا کا پیغمبر اور خاتم الانبیاء اور ظاہری بادشاہت اور ملک داری میں بھی دنیا کے تمام بادشاہوں کا سرتاج تھا جس کے رعب سے قیصر اور کسریٰ کانپتے تھے۔دیکھو تمہارے ہندوستان کے راجوں نے محض فخر حاصل کرنے کے لئے مغلیہ خاندان کے بادشاہوں کو باوجود ہندو ہونے کے لڑکیاں دیں اور آپ درخواستیں دے کر اور تمنا کر کے اس سعادت کو حاصل کیا اور اپنے مذہبی قوانین کی بھی کچھ رعایت نہ رکھی بلکہ اپنے گھروں میں ان لڑکیوں کو قرآن شریف پڑھایا اور اسلام کا طریق سکھایا اور مسلمان بنا کر بھیجا حالانکہ یہ تمام بادشاہ اس عالیشان جناب کے آگے ہیچ تھے جس کے آگے دنیا کے بادشاہ جھکے ہوئے تھے کیا کوئی عقل قبول کرسکتی ہے کہ ایک ایسی عورت جو اس ذلت سے تنگ آگئی تھی جو اس کا خاوند ایک غلام آزاد کردہ ہے وہ اس غلام سے آزاد ہونے کے بعد اس شہنشاہ کو قبول نہ کرے جس کے پاؤں پر دنیا کے بادشاہ گرتے تھے بلکہ دیکھ کر رعب کو برداشت نہیں کرسکتے تھے چنانچہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ ایک ملک کا بادشاہ گرفتار ہو کر آنحضرت ﷺ کے روبرو پیش کیا گیا اور وہ ڈر کر بید کی طرح کانپتا تھا۔آپ نے فرمایا کہ اس قدر خوف مت کر۔میں کیا ہوں ایک بڑھیا کا بیٹا ہوں جو باسی گوشت کھایا کرتی تھی سو ایسا **خاوند جو دنیا کا بھی بادشاہ اور آخرت کا بھی بادشاہ ہو وہ اگر فخر کی جگہ نہیں تو اور کون ہوسکتا** ہے۔اور زینب وہ تھی جس کی آنحضرت ﷺ نے زید کے ساتھ آپ شادی کی تھی اور آپ کی دست پروردہ تھی اور ایک یتیم لڑکی آپ کے عزیزوں میں سے تھی جس کو آپ نے پالا تھا وہ دیکھتی تھی کہ آنحضرت ﷺ کی بیویاں عزت کے تخت پر بیٹھی ہیں اور میں ایک غلام کی جورو ہوں اسی وجہ سے دن رات تکرار رہتا تھا۔اور قرآن شریف بیان فرماتا ہے کہ آنحضرتؐ اس رشتہ سے طبعاً نفرت رکھتے تھے اور روز کی لڑائی دیکھ کر جانتے تھے کہ اس کا انجام ایک دن طلاق ہے چونکہ یہ

آیتیں پہلے سے وارد ہو چکی تھیں کہ منہ بولا بیٹا دراصل بیٹا نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لئے آنحضرتؐ کی فراست اس بات کو جانتی تھی کہ اگر زید نے طلاق دے دی تو غالباً خدا تعالیٰ مجھے اس رشتہ کے لئے حکم کرے گا تا لوگوں کے لئے نمونہ قائم کرے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اور یہ قصہ قرآن شریف میں بعینہٖ درج ہے۔

پھر پلید طبع لوگوں نے جن کی بد ذاتی ہمیشہ افترا کرنے کی خواہش رکھتی ہے خلاف واقعہ یہ باتیں بنائیں کہ آنحضرت خود زینب کے خواہشمند ہوئے حالانکہ زینب کچھ دور سے نہیں تھی کوئی ایسی عورت نہیں تھی جس کو آنحضرت نے کبھی نہ دیکھا ہو یہ زینب وہی تو تھی جو آنحضرتؐ کے گھر میں آپ کی آنکھوں کے آگے جوان ہوئی اور آپ نے خود نہ کسی اور نے اس کا نکاح اپنے غلام آزاد کردہ سے کر دیا اور یہ نکاح اس کو اور اس کے بھائی کو اوائل میں نامنظور تھا اور آپ نے بہت کوشش کی یہاں تک کہ وہ راضی ہو گئی۔ ناراضگی کی یہی وجہ تھی کہ زید غلام آزاد کردہ تھا۔ پھر یہ کس قدر بے ایمانی اور بد ذاتی ہے جو واقعات صحیحہ کو چھوڑ کر افترا کئے جائیں **قرآن موجود بخاری مسلم موجود ہے نکالو کہاں سے یہ بات نکلتی** ہے کہ آنحضرت زینب کے نکاح کو خود اپنے لئے چاہتے تھے۔ کیا آپ نے زید کو کہا تھا کہ تو طلاق دیدے تا میرے نکاح میں آوے بلکہ آپ تو بار بار طلاق دینے سے ہمدردی کے طور پر منع کرتے تھے۔ یہ تو وہ باتیں ہیں جو ہم نے قرآن اور حدیث میں سے لکھی ہیں۔ لیکن اگر کوئی اس کے برخلاف مدعی ہے تو ہماری کتب موصوفہ سے اپنے دعوے کو ثابت کرے۔ ورنہ **بے ایمان اور خیانت پیشہ** ہے۔ اور یہ بات جو خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں نے نکاح پڑھ دیا۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ یہ نکاح میری مرضی کے موافق ہے اور **میں نے ہی چاہا ہے کہ ایسا ہو تا مومنوں** پر حرج باقی نہ رہے۔

یہ معنی تو نہیں کہ اب زینب کے خلاف مرضی اس پر قبضہ کر لو ظاہر ہے کہ نکاح پڑھنے والے کا یہ منصب تو نہیں ہوتا کہ کسی عورت کو اس کے خلاف مرضی کے مرد کے حوالہ کر دیوے بلکہ وہ تو نکاح پڑھنے میں ان کی مرضی کا تابع ہوتا ہے سو خدا تعالیٰ کا نکاح یہی ہے کہ زینب کے دل کو اس طرف جھکا دیا اور آپ کو فرما دیا کہ ایسا کرنا ہو گا تا امت پر حرج نہ رہے۔ اب بھی اگر کوئی باز

نہ آوے تو ہمیں قرآن اور بخاری اور مسلم سے اپنے دعوے کا ثبوت دکھلاوے کیونکہ ہمارے دین کا تمام مدار قرآن شریف پر ہے اور رسول اللہ ﷺ کی حدیث قرآن کی مفسر ہے اور جو قول ان دونوں کے مخالف ہو وہ مردود اور شیطانی قول ہے یوں تو تہمت لگانا سہل ہے۔ مثلاً اگر کسی آریہ کو کوئی کہے کہ تیری والدہ کا تیرے والد سے اصل نکاح نہیں ہوا۔ جبراً اس کو پکڑ لائے تھے اور اس پر کوئی اطمینان بخش ثبوت نہ دے اور مخالفانہ ثبوت کو قبول نہ کرے۔ تو ایسے بدذات کا کیا علاج ہے ایسا ہی وہ شخص بھی اس سے کچھ کم بدذات نہیں جو مقدس اور راستبازوں پر بے ثبوت تہمت لگاتا ہے۔ ایماندار آدمی کا یہ شیوہ ہونا چاہئے کہ پہلے ان کتابوں کا صحیح صحیح حوالہ دے جو مقبول ہوں اور پھر اعتراض کرے ورنہ ناحق کسی مقدس کی بے عزتی کر کے اپنی ناپاکی فطرت کی ظاہر نہ کرے۔ جب ہم سوچتے ہیں کہ کیوں خدا تعالیٰ کے مقدس اور پیارے بندوں پر ایسے ایسے حرام زادے جو سفلہ طبع دشمن ہیں جھوٹے الزام لگاتے ہیں تو بجز اس کے اور کوئی سبب معلوم نہیں ہوتا کہ خدا تعالیٰ ارادہ فرماتا ہے کہ تا نور کے مقابل پر ظلمت کا خبیث مادہ بھی ظاہر ہو جاوے کیونکہ دنیا میں اضداد اضداد سے پہچانی جاتی ہیں۔ اگر رات کا اندھیرا نہ ہوتا تو دن کی روشنی کی خوبی ظاہر نہ ہو سکتی۔ پس خدا تعالیٰ اس طور سے پلید روحوں کو مقابل پر لا کر پاک روح کی پاکیزگی زیادہ صفائی سے کھول دیتا ہے۔ (آریہ دھرم، روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۶۵ تا ۶۴)

☆

پادری فتح مسیح نے آنحضرتؐ پر اپنے متبنّٰی کی مطلقہ زینب سے شادی پر اعتراض کرتے ہوئے اسے زنا کے الزام میں ناحق پیش کیا ہے اس کا جواب دیتے ہوئے حضرت مسیح موعود علیہ السلام تحریر فرماتے ہیں:

"زینبؓ کے نکاح کا قصہ جو آپ نے زنا کے الزام سے ناحق پیش کر دیا بجز اس کے کیا کہیں کہ ع بدگہر از خطا خطا نہ کند

اے نالائق متبنّٰی کی مطلّقہ سے نکاح کرنا زنا نہیں۔ صرف منہ کی بات سے نہ کوئی بیٹا بن سکتا ہے اور نہ کوئی باپ بن سکتا ہے اور نہ ماں بن سکتی ہے مثلاً اگر کوئی عیسائی غصہ میں آ کر

اپنی بیوی کو ماں کہہ دے تو کیا وہ اس پر حرام ہو جائے گی اور طلاق واقع ہو جائے گی۔ بلکہ وہ بدستور اُسی ماں سے مجامعت کرتا رہے گا پس جس شخص نے یہ کہا کہ طلاق بغیر زنا کے نہیں ہوسکتی اس نے خود قبول کر لیا کہ صرف اپنے منہ سے کسی کو ماں یا باپ یا بیٹا کہہ دینا کچھ چیز نہیں ورنہ وہ ضرور کہہ دیتا کہ ماں کہنے سے طلاق پڑ جاتی ہے مگر شاید کہ **مسیح** کو وہ عقل نہ تھی جو فتح مسیح کو ہے۔ اب تم پر فرض ہے کہ اس بات کا ثبوت انجیل میں سے دو کہ اپنی عورت کو ماں کہنے سے **طلاق** پڑ جاتی ہے یا یہ کہ اپنے مسیح کی تعلیم کو ناقص مان لو یا یہ ثبوت دو کہ بائبل کی رو سے متبنّٰی فی الحقیقت بیٹا ہو جاتا اور بیٹے کی طرح وارث ہو جاتا ہے اور اگر کچھ ثبوت نہ دے سکو تو بجز اس کے اور کیا کہیں کہ **لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكَاذِبِيْنَ مسیح بھی تم پر لعنت کرتا ہے**۔ کیونکہ مسیح نے انجیل میں کسی جگہ نہیں کہا کہ اپنی عورت کو ماں کہنے سے اس پر طلاق پڑ جاتی ہے اور آپ جانتے ہیں کہ یہ تینوں امر ہم شکل ہیں۔ اگر صرف منہ کے کہنے سے ماں نہیں بن سکتی تو پھر بیٹا بھی نہیں بن سکتا اور نہ باپ بن سکتا ہے اب اگر کچھ حیا ہو تو **مسیح کی گواہی قبول کر لو** یا اس کا **کچھ جواب دو** اور یاد رکھو کہ **ہرگز نہیں دے سکو گے** اگرچہ فکر کرتے کرتے مر ہی جاؤ کیونکہ **تم کاذب ہو اور مسیح تم سے بیزار ہے**"۔

(نور القرآن نمبر ۲، روحانی خزائن جلد نمبر ۹ صفحہ ۳۸۸ تا ۳۸۹)

☆

ایک عیسائی کا اعتراض "محمد صاحب نے اپنے لے پالک کی جورو سے عشق کیا پھر لوگوں سے ڈرے تو ایک آیت اتار لی" کے جواب میں حضرت خلیفۃ المسیح الاوّلؓ نے تحریر فرمایا:

معترض نے عشق کا ثبوت تو کوئی نہ دیا۔ لوگوں سے ڈرنا مقتضائے بشریّت ہے۔ حضرت مسیح بقول آپ کے باوجود الوہیت کے لوگوں (یہود) سے ڈرتے رہے۔ اور حاکم کے سامنے حضرت سے کچھ نہ بن پڑا صُمٌّ وَبُكْمٌ سے رہ گئے۔ بھلا صاحبان جس صبح کو پکڑے گئے اس رات مسیح کی کیا حالت تھی۔ (متی ۲۶ باب ۳۸ آیت)

اگر لے پالک کی بیوی سے شادی منع ہے تو اس کا ثبوت توریت یا انجیل یا شرع محمدیؐ (قرآن) سے یا دلائل عقلیہ سے دیا ہوتا۔ بلکہ میں کہتا ہوں سارے عیسائی لے پالک بیٹے ہیں۔

(نامہ رومیاں ۸ باب ۵) تو اب کیا وہ باہمی عقد میں بہنوں سے نکاح کرتے ہیں۔ توریت میں بھی بہن سے نکاح حرام ہے۔ اگر کہو۔ وہاں حقیقی بہن مراد ہے تو کیا دینی بہن سے نکاح جائز ہے۔ پولوس صاحب فرماتے ہیں ''کیا ہمیں اختیار ہے کہ دینی بہن سے نکاح کر لیں''۔

(قرنتی ۹ باب ۵)

ہم کہتے ہیں اسی طرح حقیقی بیٹے کی جورو سے نکاح منع ہے نہ لے پالک کی جورو سے۔ مجھے اس وقت مولوی لطف اللہ لکھنوی یاد آ گئے۔ ان سے بھی ایک پادری صاحب نے مجمع عام میں یہی سوال کیا تھا۔ آپ نے کیا خوب جواب دیا۔

''سارے راستباز خدا کے فرزند ہیں۔ تو یوسف نجار بھی فرزند تھا پھر اس کی جورو سے خدا نے فرزند لیا۔ پس اگر اس کے رسول نے لے پالک کی بی بی مطلّقہ سے نکاح کیا تو کیا عیب ہے۔ اگر جماع عیب ہے تو ایک عضو کی نسبت سارے سموچے خدا کی رحم میں ازراہ...... چلا جانا اور پھر مجسّم بن کر نکل کر کھڑا ہونا تو شاید اور بھی معیوب ہوگا۔ زید نے تو طلاق بھی دے ڈالی تھی۔ یوسف سے تو کسی نے براءت نامہ بھی نہ لیا ہاں شاید الوہیت اور رسالت میں یہی فرق ہوگا۔ کہ اس میں طلاق کی ضرورت نہیں رہتی''۔

کتبِ مقدسہ کے محاورات تمہیں تعجب انگیز معلوم نہیں ہوتے۔ اے میری زوجہ۔ اے میری بہن۔ تیرا عشق کیا خوب ہے۔ تیری محبت مَے سے کتنی زیادہ لذیذ ہے۔

(غزل الغزلات ۴ باب ۱۰، ۵ باب ۱)

حقیقی جواب: اصل قصہ یوں ہے کہ زینب ایک بڑے خاندان کی عورت تھی۔ آنحضرتؐ نے اپنے خادم زید کے لئے اس کے وارثوں کو ناطہ کا پیغام دیا۔ وہ اپنی عظمت و شرافت شان کے خیال سے اوّل تو ناراض ہوئے پھر آخر کار راضی ہو گئے۔ کچھ مدّت تو جوں توں کر کے بسر ہوئی۔ آخر زید نے اس کی تعلّی اور طنز و تعریض سے تنگ آ کر اس کے چھوڑ دینے کا ارادہ ظاہر کیا۔ چونکہ آپ بذاتِ مبارک اس شادی کے انصرام کے متکفّل ہوئے تھے۔ اس لئے اس طلاق کے انجام اور اس کے مفاسد پر قومی دستوروں اور حالات معاشرت ملکی کے لحاظ سے آپ کے دل میں کھٹکا پیدا

ہوا۔اس میں شک نہیں کہ رخنہ جُو کفار اور حیلہ طلب معاندین کو رسماً وعرفاً ایسے موقع پر بہت ملامت وطنز کا قابو مل سکتا تھا اور آپ گوارا نہیں کر سکتے تھے کہ اس مفارقت اور معاشرتی ناچاکی کا حال مخالفین منکرین پر کھلنے پائے جو اُن کی زبان درازی اور تعریض کا باعث ہو۔اور نیز زینب کے وارثوں کا خیال ایک رسمی اور قومی خیال تھا۔ جو آنحضرت ﷺ کے دل کو اور بھی مضطرب کرنے کا موجب ہوسکتا تھا۔بنابرآں آپؐ نے زید کو بہت روکا اور تلخی معاشرت پر صبر کرنے کی بہت نصیحت وہدایت کی اور سخت الحاح واصرار کیا کہ وہ اس ارادے سے باز آجاوے مگر خدا کو ایک عظیم الشان کام پورا کرنا اور ایک خلافِ قدرت مضر معاشرت رسم کا توڑنا منظور تھا۔اس موقع پر قرآن کے الفاظ جن میں آنحضرتؐ کی دلی حالت کی تصویر کھینچی گئی ہے ۔الہامی حقیقت پہچاننے والے منصف کے نزدیک قابلِ غور ہیں۔

خصوصاً اَمۡسِكۡ .الخ" اپنی بی بی کو نگاہ رکھ اور اللہ سے ڈر" بہت غور کے قابل ہے "خدا سے ڈر" ایسے الفاظ ہیں کہ بازداشت اور زجر کے لئے اس سے زیادہ اور نہیں کہا جاسکتا۔عیسائیوں کی شوخی اور جرأت سخت قابلِ افسوس ہے کہ" آنحضرت ﷺ نے اوپرے دل سے زید کو منع کیا" (لائف آف محمد از سر ولیم میور صفحہ ۲۲۸)معلوم نہیں صادق کے دل کے اظہار مافی الضمیر کا اور کیا طریق ہوسکتا ہے۔

کسی سوسائٹی کے رسوم وآئین کی اصلاح میں اگر کسی مصلح کو تکالیف وزحمات اٹھانی پڑتی ہیں تو آنحضرت ﷺ کو چند درچند صعوبات اٹھانی پڑتیں اور پڑنے والی تھیں جن کے درپیش عرب جیسی غیر مہذب اکھڑ سوسائٹی کے خلاف قدرت اور مضر معاشرت رسوم کا اصلاح کرنا تھا۔عرب میں(ہندوؤں کی طرح)مُتَبَنّٰی (منہ بولا بیٹا) صُلبی بیٹے کی مانند سمجھا جاتا تھا۔اس رسمِ قبیح سے جو نتائج فاسدہ دنیا میں ہوئے اور ہوتے ہیں عیاں ہیں اور حقیقتاً قدرت کہاں اجازت دیتی ہے کہ پسرِ حقیقی اور متبنّٰی دونوں مساوات کا درجہ رکھیں قرآن نے اس مضر اصل کی بیخ کنی کر دی کہ" منہ بولے تمہارے بیٹے نہیں ہیں۔تمہارے بیٹے وہی ہیں جو تمہارے نطفے سے ہیں" اب یہاں قوم وملک کے رسوم کے مخالف دو عظیم مشکلوں کا سامنا آپ کو کرنا پڑا۔

ایک تو خدا کے قول وفعل کے مطابق رسمِ تبنّیت کا (کہ وہ حقیقی بیٹے کی مانند ہیں) اور دوسرا ایک مطلّقہ عورت سے (جس سے شادی کرنا عرب جاہلیت میں سخت قابلِ ملامت ونفرت اور ذلّت تصور کرتے تھے) نکاح کرنا۔ مگر چونکہ عقلاً ورسماً وشرعاً یہ افعال معیوب نہ تھے۔ اور ضرور تھا کہ مصلح و ہادی خود نظیر بنے تاکہ تابعین کو تحریک وترغیب ہو۔ آپ پہلے بے شک بمقتضائے بشریت گھبرائے اور بالآخران مشکلات پر غالب آکر ایک عجیب نظیر قائم کر دکھلائی۔

پادری صاحب کی عقل پر افسوس آتا ہے جو کہتے ہیں ''محمدؐ نے لوگوں سے ڈر کر آیت اتارلی'' کون سی آیت اتارلی اور ڈرہی کیا تھا۔ آنحضرتؐ کو اس بات کا ڈر تھا اور لوگوں کی طرف سے خوف تھا کہ دشمن اس بات کا طعنہ دیں گے کہ ان کا اپنے ہاتھ سے کیا ہوا کام انجام کو نہ پہنچا۔ کیونکہ آنحضرتﷺ خود اس مزاوجت کے متکفل اور منصرم ہوئے تھے۔ اور بڑے اصرار سے زینب کے وارثوں سے اس کو زید کے لئے مانگا تھا اور اب اس مفارقت پر دشمن طعنہ دے سکتے تھے۔ بے شک اس بات کا آپؐ کو خوف تھا اور ان کی ناچاکی کو وہ اخفا کرنا چاہتے تھے جو بالآخر پھوٹ نکلی۔ اسی خوف واخفا کی نسبت قرآن کریم فرماتا ہے کہ تُو لوگوں سے ڈرتا تھا حالانکہ ڈرنا تو مجھ سے چاہئے۔ یہ ایک عجیب محاورہ قرآنی ہے مطلب ایسے جملہ کا یہ ہوتا ہے کہ جو امر حسبِ مقتضائے قانونِ الٰہی ہو اس کے اجرا وتعمیل میں انسان سے ڈرنا یعنی اس کا عمل میں نہ لانا عبث ہے۔

ناقص العقل پادری اتنا بھی خیال نہیں کرسکتے کہ اگر اس عقد میں کوئی امر معیوب اور قادح نبوت ہوتا تو یقیناً اوّل منکر زید ہوتا۔ حالانکہ بعد ازاں بہت دنوں تک اسلام اور سچے ہادی کی خاطر بڑے بڑے معرکوں اور مہلکوں میں جاں نثاری کرتا رہا۔ اور بڑے بڑے غیّور جرّی صحابہ (جو یقیناً مچھوؤں اور باج گیروں سے بڑھ کر وقعت وغیرت میں تھے) جو اسلام کے رکن رکین تھے۔ بہت جلد ہاں اسی دم آپ کے پاس سے ٹوٹ پھوٹ جاتے اور یہ تانا بانا برہم ہو جاتا میں سچے دل سے کہتا ہوں کہ اس قصّے کا ہونا قرآن کے کلام اللہ ہونے کا بڑا بھاری ثبوت ہے اور یہ نبی عرب کی ترکیب وآورد (جیسے منکرین سمجھتے ہیں) کلام نہیں۔ کیا امانت کا حق ادا کیا ہے۔ کیا

صادق امین ہے کہ تمام الٰہی واردات اور ربّانی الہامات وواقعات بلا کم وکاست دنیا کے آگے رکھ دیئے۔ بِاَبِیْ اَنْتَ وَاُمِّیْ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ۔ (فصل الخطاب حصہ اول طبع دوم صفحہ ۱۲۸ تا ۱۳۲)

اپنی کتاب نورالدین میں اس ضمن میں تحریر فرماتے ہیں:

لے پالک بنانا شرع اسلام میں جائز نہیں تو آپ کا اعتراض کیونکر چسپاں ہوگا۔ لے پالک بیٹا حقیقۃً بیٹا ہی نہیں اور اس کو بیٹا کہنا سچ نہیں اسی واسطے قرآن نے جو حقیقت کا کاشف ہے اس کو بیٹا کہنا جائز قرار نہیں دیا کیونکہ بیٹا باپ کی جزء ہوتا ہے اور لے پالک غیر اور غیر کی نسل سے ہے۔ مجھے ہمیشہ خیال آتا ہے کہ حقیقی علوم کا معلم نیوگ کو کیونکر جائز کرسکتا ہے کیونکہ نیوگی بیٹا نیوگ کنندہ کا نطفہ اور اس کا جزو ہوتا ہے۔ نیوگ کنندہ اولاد کا لالچ دے کر لذّت ومزہ بھی اُٹھالے اور پھر اپنے بیرج کی اولاد کو دوسرے کے مال و دولت کا مالک بھی بنالے اور آہستہ آہستہ جوڑتوڑ کرکے آخر عورت بھی اڑالے اور اپنا ہی بیٹا جائیداد کا مالک کردے اور پھر عذر کرو۔ کہ یہ وید کا ارشاد ہے۔ آہ کوئی سمجھنے والا ہو۔

پھر اسلام میں لے پالک کی بیوی کیونکر نا جائز ہوگی۔ جبکہ لے پالک بنانا ہی جائز نہیں پھر کسی دوسرے کی بی بی بدون طلاق کے اور اس کی عدّت گزرنے سے پہلے جائز نہیں پھر بدون نکاح اور گواہوں بلکہ بلا رضامندی ان والیوں کے جو عورت کے مہتمم ہوں۔ ہمارے مذہب میں کسی عورت کا بیاہنا جائز نہیں ہاں نیوگ میں یہ سب کچھ ہوسکتا ہے سو وہ ہمارے یہاں ممنوع اور آپ کے یہاں ضروری ہے۔ سوچو اور غور کرو کہ اس خبیث الزام کا نشانہ وید کا مذہب ہے یا کوئی اور۔ خدا تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اس کا کلام قرآن کریم ہر قسم کے ناپاک الزاموں سے پاک اور اس کے غیر ہر طرح کی نجاستوں میں آلودہ ہیں۔ کوئی رشید ہے جو غور کرے!

(نورالدّین صفحہ ۲۲۸، ۲۲۹)

بہت سی لونڈیاں اور عورتیں رکھنے کا اعتراض

پادری فتح مسیح کے اس اعتراض کے جواب میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

''اور پھر آپ کا اعتراض ہے کہ بہت سی عورتوں اور لونڈیوں کو رکھنا یہ فسق و فجور ہے **اے نادان** حضرت داؤد نبیؑ کی بیبیاں تجھ کو یاد نہیں جس کی تعریف کتاب مقدس میں ہے کیا وہ اخیر عمر تک حرام کاری کرتا رہا کیا اسی حرام کار کی یہ پاک ذریت ہے جس پر تمہیں بھروسہ ہے جس خدا نے **اوریا** کی بیوی کے بارے میں داؤد پر عتاب کیا۔ کیا وہ **داؤدؑ کے اس جرم سے غافل رہا** جو مرتے دم تک اس سے سرزد ہوتا رہا بلکہ خدا نے اس کی چھاتی گرم کرنے کو ایک اور لڑکی بھی اسے دی اور آپ کے خدا کی شہادت موجود ہے کہ داؤد اوریا کے قصہ کے سوا اپنے تمام کاموں میں راستباز ہے کیا کوئی عقلمند قبول کرسکتا ہے کہ اگر کثرت ازدواج خدا کی نظر میں بُری تھی تو خدا اسرائیلی نبیوں کو جو کثرت ازدواج میں سب سے بڑھ کر نمونہ ہیں ایک مرتبہ بھی اس فعل پر سرزنش نہ کرتا پس یہ سخت بے ایمانی ہے کہ جو بات خدا کے پہلے نبیوں میں موجود ہے اور خدا نے اسے قابل اعتراض نہیں ٹھہرایا اب شرارت اور خباثت سے جناب **مقدس نبوی** کی نسبت قابل اعتراض ٹھہرائی جاوے۔ افسوس یہ لوگ ایسے بے شرم ہیں کہ اتنا بھی نہیں سوچتے کہ اگر ایک سے اوپر بیوی کرنا زنا کاری ہے تو حضرت **مسیح** جو **داؤد** کی اولاد کہلاتے ہیں ان کی پاک ولادت کی نسبت سخت شبہ پیدا ہوگا اور کون ثابت کر سکے گا کہ ان کی بڑی نانی حضرت **داؤد** کی پہلی ہی بیوی تھی''۔ (نور القرآن نمبر۲، روحانی خزائن جلد نمبر ۹ صفحہ ۳۹۱ تا ۳۹۲)

☆

تعدد ازدواج کا اعتراض

حضرت مصلح موعودؓ اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

''رسول کریم ﷺ پر مخالفین اعتراض کرتے ہیں کہ آپؐ نے نعوذ باللہ شہوت رانی کے لئے ایک سے زیادہ نکاح کئے تھے۔ اب مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ دنیا کو دکھلا دیں کہ رسول

کریم ﷺ کی یہ شہوت رانی نہیں تھی بلکہ بہت بڑی قربانی تھی۔ جب کوئی ایک سے زیادہ بیویاں کرتا ہے تب اس کو پتہ لگتا ہے کہ یہ کتنی بڑی مشکل بات ہے۔ رسول کریم ﷺ پر تو یہ اعتراض کر دیا گیا ہے کہ آپؐ نے نعوذ باللہ شہوت رانی کے لئے زیادہ بیویاں کیں مگر میں تجربہ کے بعد جانتا ہوں کہ دو عورتوں کے ساتھ ہی مساوی معاملہ کرنے میں کس قدر نفس کی قربانی کرنی پڑتی ہے۔ اور یہ رسول کریم ﷺ ہی کی شان تھی کہ آپؐ نے نو (۹) کے ساتھ مساوی معاملہ کیا۔ شہوت رانی تو یہ ہے کہ ایک کو چھوڑ کر دوسری عورت کو اپنے پاس رکھا جائے نہ یہ ایک شخص جو سب کے مساوی حقوق دیتا ہے، مساوی سلوک کرتا ہے اسے شہوت ران کہا جائے۔ کیونکہ یہ کھلی بات ہے کہ جب ایک انسان کی کئی بیویاں ہوں تو ان میں سے کسی ایک کے ساتھ دوسری بیویوں کی نسبت زیادہ محبت ہوگی۔ اور بعض دفعہ ہوسکتا ہے کہ کسی ایک عورت سے کسی سبب سے نفرت بھی ہو۔ مگر باوجود اس کے جو شخص اپنی سب بیویوں سے یکساں سلوک کرتا ہے ایسے شخص کو کس طرح شہوت ران کہا جاسکتا ہے؟ کیا نفس کی قربانی کے معنی شہوت رانی ہوتے ہیں۔ اگر نہیں تو ایک سے زیادہ بیویوں سے مساوی سلوک کرنا بہت بڑی نفس کی قربانی ہے۔ اور جو شخص مذہبی، قومی یا ملی فوائد کو مدنظر رکھ کر یہ بوجھ اٹھاتا ہے وہ فدائے قوم سمجھا جائے گا نہ کہ شہوت ران۔ اور جو شخص اپنی ذاتی ضروریات کو مدنظر رکھ کر ایک سے زیادہ نکاح کرتا ہے لیکن سب بیویوں سے برابر کا سلوک کرتا ہے وہ بھی شہوت ران نہیں بلکہ اپنے نفس پر قابو رکھنے والا کہلائے گا۔ غرض میں نے جو ایک سے زیادہ بیویاں کرنے پر زور دیا ہے تو صرف اس غرض سے کہ اس سے اسلام کے اس حکم کو صاف کیا جائے اور رسول کریم ﷺ پر سے اعتراض مٹایا جاوے۔ وَاللّٰہُ عَلٰی مَا اَقُوْلُ شَہِیْدٌ۔

تعدد ازدواج کے متعلق مسلمانوں کا برا نمونہ

مگر میں دیکھتا ہوں کہ مسلمان ہی اس مسئلہ میں برا نمونہ دکھا کر دوسروں کے لئے ٹھوکر کا موجب بن رہے ہیں۔ عیسائیوں کی عورتیں آ کر مسلمان عورتوں کو کہتی ہیں کہ مسلمان دوسری شادی کر کے عورتوں پر بڑا ظلم کرتے ہیں۔ اور سو (۱۰۰) میں سے ننانوے مسلمان عورتیں ایسی ہیں جو کہتی ہیں کہ ہاں واقع میں ہم پر یہ بہت بڑا ظلم ہے اور یہ کہہ کر وہ کافر ہو جاتی ہیں۔ کیونکہ

شریعت اسلام پر ظلم کا الزام لگاتی ہیں۔ مگر میں پوچھتا ہوں اس کا ذمہ دار کون ہے؟ وہی جن کی وجہ سے عورتوں کو اس اعتراض کا موقع ملا۔ اور وہی جنہوں نے اپنی نفس پرستی کی وجہ سے دشمنوں کو محمد ﷺ پر اعتراض کا موقع دیا اور اسلام پر ہنسی اڑوائی۔ یہی وجہ ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا ہے جو شخص دو بیویاں کر کے ان سے مساوی سلوک نہیں کرتا قیامت کے دن وہ ایسے حال میں اٹھے گا کہ اس کا آدھا دھڑ ہوگا اور آدھا نہیں (ترمذی ابواب النکاح باب ما جاء في التسوية بين الضرائر) اور کون کہہ سکتا ہے کہ وہ آدھا دھڑ کون سا ہوگا؟ وہ جس میں دل ہے یا وہ جس میں دل نہیں۔ پس یہ وہ حکم ہے جس پر مخالفین کی طرف سے بڑے شور سے اعتراض کئے جاتے ہیں۔ اور جس کے متعلق مسلمان اپنے عمل سے مخالفین کو اعتراض کرنے کا موقع دے رہے ہیں۔

نفس پاک رکھنے والے اپنے عمل سے مخالفین کا اعتراض دور کریں:

میرا دل چاہتا ہے کہ ہماری جماعت کے جو لوگ نفس پاک رکھتے ہیں اور اسلام کو اپنی شہوت رانی پر قربان کرنے والے نہیں وہ اس حکم پر عمل کر کے اسلام پر سے اس اعتراض کو دور کریں اور عملاً اس کا جھوٹا ہونا ثابت کر دیں۔ ابتداءً بے شک ان کے اس فعل پر بھی اعتراض ہوں گے لیکن آہستہ آہستہ جب لوگ اپنی آنکھوں سے اس بات کو دیکھیں گے کہ یہ فعل شہوت رانی نہیں ہے بلکہ اس امر پر کوئی شخص قادر بھی نہیں ہو سکتا جب تک کہ شہوت کو دبانے پر قادر نہ ہو تو خود بخود ان کی آنکھیں کھل جاویں گی اور اپنی غلطی کا اقرار کرنے لگیں گے۔

بیویوں سے مساوی سلوک کرنے میں احتیاط:

میں آپ لوگوں کو اپنا حال سناتا ہوں کہ میں اس قدر احتیاط سے کام لیتا ہوں۔ پچھلے دنوں جب میں بیمار ہوا اور میں نے دیکھا اِدھر اُدھر آ جا نہیں سکتا تو میں نے کہا کہ میری چارپائی والدہ کے گھر پہنچا دی جائے تا کہ میں ایک مشترک گھر میں رہوں اور کسی بیوی کو شکایت نہ ہو کہ دوسری کے ہاں رہتا ہوں۔

رسول کریم ﷺ نے بیویوں کے حقوق کے متعلق خاص تاکید فرمائی ہے۔ اور اس معاملہ میں اس قدر تشدد کیا ہے کہ جب آپ مرض الموت میں تھے اور نماز کے لئے بھی باہر نہیں

آسکتے تھے تو اپنی سب بیویوں کو جمع کر کے کہا کہ اگر تمہاری اجازت ہو تو میں کسی ایک گھر میں رہوں۔ یہ تھی آپ کی احتیاط۔ اس کو نادان اور اندھی دنیا شہوت رانی کہتی ہے۔ چنانچہ سب نے اجازت دی۔

(بخاری کتاب المغازی باب مرض النبیؐ و وفاتہٗ و قول اللہ تعالیٰ انک میت و انھم میتون)

اور خدا نے چاہا کہ وہ آپس میں اسی کو چنیں جس کو خدا نے سب پر فضیلت دی تھی اور وہ عائشہؓ تھیں۔ حضرت عائشہ کے گھر جانے کے تین چار روز بعد آپ فوت ہو گئے۔ بیویوں کے متعلق یہ طرزِ عمل تھا اس انسان کا جس پر اعتراض کئے جاتے ہیں اور مسلمانوں کی طرف سے کرائے جاتے ہیں۔ کیونکہ مسلمانوں میں سے آدھا حصہ عورتیں ہیں جو کہتی ہیں کہ ایک سے زیادہ بیویوں میں عدل نہیں کیا جاسکتا۔ اور صرف عورتیں ہی نہیں کہتیں مرد بھی کہتے ہیں کہ ایسا نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ وہ دیکھتے ہیں کہ جو لوگ مسلمانوں میں سے ایک سے زیادہ عورتیں کرتے ہیں وہ ان میں عدل نہیں کرتے۔ پس سوچے اور غور کرے وہ مسلمان اور سوچے اور غور کرے وہ احمدی جو عیسائیوں کو کہتا ہے کہ تمہارے مذہب میں ایسی تعلیم پائی جاتی ہے جس پر عمل نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن وہ خود اپنے عمل سے بتاتا ہے کہ اسلام میں بھی ایسی تعلیم ہے جس پر عمل نہیں ہوسکتا۔

رسول کریمؐ پر ایک بیوی کے متعلق اعتراض اور اس کا جواب:

بعض نادان بعض حدیثوں کی بناء پر کہہ دیا کرتے ہیں کہ رسول کریمؐ نے بھی ایک بیوی کے گھر اس لئے جانا چھوڑ دیا تھا کہ وہ بوڑھی ہو گئی تھیں۔ حالانکہ حدیثوں سے یہی ثابت ہے کہ اس عورت نے خود رسول کریم ﷺ کو کہا تھا کہ میں اپنی باری عائشہؓ کو دیتی ہوں۔

(بخاری کتاب النکاح باب المرءۃ تھب یومھا من زوجھا لضرتھا و کیف یقسم ذالک)

بے شک روایت کیا جاتا ہے کہ اس بیوی کے دل میں ڈر پیدا ہو گیا تھا کہ ایسا نہ ہو کہ رسول کریم ﷺ مجھے بوجہ بڑھاپے کے طلاق دے دیں۔ اور ممکن ہے یہ بات درست ہو۔ عورتیں بعض دفعہ اپنی کمزوری کے باعث اس قسم کے وہموں میں مبتلا ہو جاتی ہیں مگر رسول کریمؐ کے دل میں یہ خیال کبھی پیدا نہیں ہوسکتا تھا اور نہ ہوا۔ آپ کی عمر کا ایک ایک لحظہ اور ایک ایک

دقیقہ اس افتراء کی تردید کرتا ہے، اس بہتان کو رد کرتا ہے اور اس خیال کو دھکے دیتا ہے۔ بدبخت ہے وہ انسان جو محمد رسول اللہ ﷺ کا متبع کہلا کر ایسا خیال دل میں لاتا ہے اور اندھا ہے وہ آدمی جو محمد رسول اللہ ﷺ کی زندگی کو دیکھتے ہوئے پھر اس پر یقین کرتا ہے۔ رسول کریم ﷺ کی شادی پچیس برس کی عمر میں حضرت خدیجہؓ سے ہوئی تھی اور اس وقت حضرت خدیجہؓ کی عمر ۴۰ سال کی تھی۔ حضرت خدیجہؓ چونسٹھ سال کی عمر میں فوت ہوئیں اور اس وقت آنحضرتؐ کی عمر انچاس سال کی تھی۔ مگر دوست اور دشمن شاہد ہیں کہ آپ نے حضرت خدیجہؓ سے ایسا برتاؤ کیا جس کی نظیر دنیا میں بہت کم ملتی ہے۔ حضرت سودہؓ سے آپ کی شادی حضرت خدیجہؓ کے بعد ہوئی اور ان کی وفات ۵۴ ہجری میں ہوئی ہے۔ چونکہ ان کی عمر کا صحیح اندازہ مجھے معلوم نہیں میں سنِ وفات سے اندازہ لگاتا ہوں کہ اگر وہ سو سال کی عمر میں فوت ہوئی ہوں تو چوالیس سال جو وہ رسول کریمؐ کے بعد زندہ رہیں نکال کر ان کی عمر آنحضرت ﷺ کی وفات کے وقت چھپن (۵۶) سال بنتی ہے۔ اب کیا کوئی شخص خیال کرسکتا ہے کہ وہ شخص جس نے پچاس سالہ عمر میں چونسٹھ سالہ بیوی سے نہایت وفادارانہ گزارہ کیا تھا وہ اپنی تریسٹھ سالہ عمر میں چھپن سالہ بیوی کو اس لئے طلاق دینے پر آمادہ ہوجاوے گا کہ وہ بوڑھی ہوگئی ہے۔ اِنْ ھٰذَا اِلَّا اِفْکٌ مُّبِیْنٌ۔

پس اگر اس روایت میں کوئی حقیقت ہے تو حضرت سودہؓ کے خیال سے زیادہ وقعت اسے حاصل نہیں اور عورتوں میں اس قسم کے خیال پیدا ہوجانا قابلِ تعجب نہیں۔ رسول کریم ﷺ کا یہ ہرگز خیال نہیں تھا۔ پس وہ مسلمان جو ایک سے زیادہ بیویاں کرتے ہیں ان کو اسلام کی تعلیم کے مطابق عمل کرکے دکھانے کی کوشش کرنی چاہئے۔ اور شہوت رانی اور نفس پرستی کے پیچھے نہیں پڑنا چاہئے۔ تا مخالفینِ اسلام کو حرف گیری کا موقع نہ ملے۔ (انوار العلوم جلد ۴ صفحہ ۵۱۲ تا ۵۱۵)

ولیم میور نے آنحضورؐ کی کثرتِ ازدواج پر اعتراض کیا ہے اس اعتراض کا تفصیلی جواب حضرت مصلح موعودؓ نے ارشاد فرمایا ہے۔ آپ بیان فرماتے ہیں:

''زیادہ بیویاں کرنا اپنی ذات میں تو قابلِ اعتراض فعل نہیں ہے۔ قابلِ اعتراض بات تو عیاشی ہے یعنی بعض عورتوں کی طرف ناجائز اور حد سے بڑھی ہوئی رغبت۔''

عیاشی کے لوازمات:

عیاشی کے لئے یہ چیزیں ضرورت ہوتی ہیں۔(۱) بڑا عیاش شراب کا دلدادہ ہوتا ہے۔ (۲) عمدہ کھانوں کا دلدادہ ہوتا ہے۔(۳) عمدہ سامانوں کا دلدادہ ہوتا ہے۔(۴) راگ ورنگ کا دلدادہ ہوتا ہے۔(۵) باکرہ عورتوں کا دلدادہ ہوتا ہے۔(۶) پہلے سے زیادہ حسین عورتوں کو تلاش کرتا ہے اور کم عمر عورتیں تلاش کرتا ہے۔(۷) عورتوں کی خواہشوں کا پابند ہوتا ہے۔(۸) عورتوں میں بے انصافی کرتا ہے۔(۹) ان کی صحبت میں زیادہ وقت صرف کرتا ہے۔

عیاشی کی علامتیں:

یہ عیاش کی علامتیں ہوتی ہیں۔کوئی عیاش ایسا نہ ہوگا جو شراب کو ناپسند کرتا ہو۔کیونکہ عیاشی کے لئے غم وفکر سے علیحدگی ضروری ہوتی ہے اور چونکہ ہر انسان کو کوئی نہ کوئی غم لگا ہوتا ہے اس لئے شراب پی کر خود فراموشی حاصل کی جاتی ہے۔پھر عیاش کو عمدہ کھانوں کی ضرورت ہوتی ہے تا کہ ان کے ذریعہ شہوت بڑھے۔پھر عیاش کو عمدہ سامانوں کی ضرورت ہوتی ہے تا کہ ان کے ذریعہ شہوت کے خیالات پیدا ہوں۔اس کے لئے یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ راگ ورنگ، گانا بجانا ہوتا کہ شہوانی خیالات کو طاقت حاصل ہو۔پھر عیاش باکرہ عورتوں کا متلاشی ہوتا ہے۔کبھی یہ نہ ہوگا کہ کوئی عیاش باکرہ عورتوں کو چھوڑ کر دوسری عورتیں پسند کرے اور باکرہ عورتوں سے بھی وہ کم عمر عورتوں کو تلاش کرتا ہے کیونکہ وہ کھیل تماشہ ہی چاہتا ہے اور یہ کم عمری میں زیادہ ہوتا ہے۔ اسی طرح طبعاً بھی جس قدر رغبت چھوٹی عمر کی عورتوں سے ہوسکتی ہے بڑی عمر کی عورت سے نہیں ہوسکتی۔دوسرے مطلقہ یا بیوہ عورت کے متعلق یہ بھی خطرہ ہوتا ہے کہ اس نے پہلے خاوند دیکھا ہوا ہے۔ممکن ہے میں اس سے کمزور ہوں اور اس کی نظر میں میری سبکی ہو۔پس وہ اس امتحان میں پڑنا نہیں چاہتا۔پھر عیاش آدمی کی خواہش ہوتی ہے کہ ایک سے ایک بڑھ کر حسین عورت اس کے قبضہ میں آئے۔

اسی طرح عیاش مرد عورت کو خوش کرنا اور اس کی خواہشات کو پورا کرنا ضروری سمجھتا ہے تا کہ وہ اس کی طرف زیادہ سے زیادہ رغبت کرے۔وہ عورتوں میں بے انصافی کرتا ہے۔

ایک کو چھوڑ کر دوسری کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے دوسری کو چھوڑ کر تیسری کی طرف۔ کیونکہ سب کی طرف توجہ کرنا اس کے مزے کو خراب کرتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ عیاش مرد عورتوں میں زیادہ وقت صرف کرتا ہے کیونکہ اس کے بغیر اس کی عیاشی کے میلان پورے ہی نہیں ہو سکتے۔ یہ نو باتیں ایسی ہیں کہ ان کے بغیر یا کم سے کم ان میں سے بعض کے بغیر دنیا میں کوئی عیاش ہو نہیں سکتا۔ اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ کیا یہ باتیں رسول کریم ﷺ میں پائی جاتی ہیں؟

شراب:

پہلی چیز شراب ہے۔ سو دیکھو کہ ایک محمد رسول اللہ ﷺ ہی کی ذات ہے۔ جنہوں نے دنیا میں شراب کو قطعاً حرام کیا ہے۔ پہلی اقوام میں شراب کو محدود کرنے کی کوشش تو کی گئی ہے لیکن اسے بالکل نہیں روکا گیا سوائے اسلام کے۔ اب سوچو کہ اگر آپ میں عیاشی کا کوئی شائبہ بھی ہوتا تو آپ کی قوم اگر پہلے پانچ دفعہ شراب پیتی تھی تو آپ انہیں حکم دیتے کہ آٹھ دفعہ پیو اور اگر آٹھ دفعہ پیتی ہوتی تو آپ انہیں کہتے کہ بارہ دفعہ پیا کرو۔ لیکن آپ نے شراب کو بالکل اور قطعاً حرام قرار دے دیا۔ کوئی نہیں کہہ سکتا۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ آپ نے شراب کو اس لئے حرام کیا کہ آپ کے تقدس پر لوگ حرف گیری نہ کریں۔ کیونکہ آپ کے ملک کے لوگ ہی نہیں بلکہ دنیا کے لوگ بھی اس زمانہ میں شراب کو تقدس کے خلاف نہیں سمجھتے تھے۔ عرب کے کاہن اور ایران کے موبد اور روم کے پادری اور ہندوستان کے پنڈت شراب میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کر رہے تھے اور شراب تقدس کے خلاف نہیں بلکہ شراب عبادات کا ایک جزو اور ریاضات کا ایک ذریعہ سمجھی جاتی تھی۔ پس ایسے وقت میں پبلک اوپنین (Opinion) کا خیال کر کے شراب کو حرام کرنے کا خیال بھی کسی شخص کے دل میں نہیں آ سکتا تھا۔ پس اگر عیاشی کا ایک خفیف سا میلان بھی آپ میں پایا جاتا جیسا کہ آپ کے دشمن خیال کرتے ہیں تو آپ شراب کو ہرگز منع نہ فرماتے۔ بلکہ اپنے ملک کے رواج کو جو ملک کے بڑے اور چھوٹے کی فطرت ثانیہ بن چکا تھا جاری رہنے دیتے۔

ہاں کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ آپ کو عیاشی کے لئے شراب کی ضرورت ہی نہ تھی کیونکہ

شراب کی ضرورت غموں کے غلط کرنے کے لئے ہوتی ہے اور آپ غموں سے آزاد تھے۔ مگر یہ دلیل پہلی دلیل سے بھی زیادہ بوُدی اور لچر ہوگی کیونکہ آپ کی زندگی غموں کا ایک مرقّع تھی۔ جان کاہیوں کی ایک نہ ٹوٹنے والی زنجیر تھی۔ نبوت کا دعویٰ پیش کرنے کے بعد سے آپ دنیا کی نگاہوں میں کانٹے کی طرح کھٹکنے لگے۔ اپنے اور پرایوں کے حملوں کے ہدف بن گئے۔ دنیا آپ کے دکھ دینے میں صرف لطف ہی محسوس نہیں کرتی تھی بلکہ وہ اسے ثواب دارین کا موجب خیال کرتی تھی۔ مکہ کے لوگ ہی نہیں بلکہ عرب کے لوگ مشرک ہی نہیں بلکہ یہود ونصاریٰ بھی آپ کو اپنے مذہب اور اپنی قومیت کے لئے ایک خطرناک وجود سمجھتے تھے۔ پس ہر ایک کی تلوار آپ کے خلاف اٹھ رہی تھی۔ ہر ایک کی زبان آپ کی ہتکِ عزت کے لئے دراز ہو رہی تھی۔ ہر ایک کی آنکھ غصہ سے سرخ ہو ہو کر آپ پر پڑتی تھی۔ جب عرب آپ کے ہاتھ پر فتح ہوگیا تو تب بھی آپ کو امن نہ ملا۔ روم کی حکومت نے آپ کے خلاف کارروائیاں شروع کر دی۔ ایران کے بادشاہ نے آپ کے قتل کے احکام دیئے۔ گھر کے دشمن منافقوں نے اندر ہی اندر ریشہ دوانیاں شروع کر دیں۔ غرض دنیوی لحاظ سے ایک شعلہ مارنے والی قبا تھی جو آپ کے لئے تیار کی گئی تھی۔ ایک گھڑی اور ایک ساعت راحت اور آرام کی آپ کے لئے میسر نہ تھی۔ حتیٰ کہ وفات کے وقت بھی آپ ایک بہت بڑے دشمن کے مقابلہ کے لئے ایک جرار لشکر کو بھیج رہے تھے۔ ان مصائب اور ان آلام کے ہوتے ہوئے اور شخص ہوتا تو پاگل ہو جاتا مگر آپ بہادری سے ان مشکلات کا مقابلہ کر رہے تھے۔ پس اگر عیاشی کے لئے نہیں تو غموں ہی کے کم کرنے کے لئے آپ شراب کی اجازت دے سکتے تھے۔ مگر آپ نے شراب کو حرام اور قطعاً حرام کر دیا۔ پس کون کہہ سکتا ہے کہ آپ کو غم نہ تھے اس لئے آپ نے شراب کو حرام کیا۔

عمدہ کھانے:

پھر عیاش عمدہ کھانوں کا دلدادہ ہوتا ہے۔ عیاش لذیذ سے لذیذ اور مقوّی سے مقوّی کھانے کھاتے ہیں تا کہ شہوت پیدا ہو۔ مگر محمد ﷺ کے گھر کا یہ حال تھا کہ جس دن آپ فوت ہوئے اس دن شام کو آپ کے گھر فاقہ تھا۔ بعض اوقات آپ کو بھوک کی وجہ سے پیٹ پر پتھر

باندھنا پڑا۔آپ کے پاس جو کچھ آتا اسلام کی ضرورتوں پر خرچ کر دیتے۔حضرت عائشہ فرماتی ہیں بیسیوں وقت ایسے آئے کہ ہمیں کھانے کو کچھ نہ ملا۔کئی وقت ایسے آئے کہ صرف کھجوریں کھا کر گزارہ کیا اور کئی وقت ایسے آئے کہ صرف پانی پی کر وقت گزارا۔جس شخص کے کھانے پینے کی یہ حالت ہو اسے کون عیاش کہہ سکتا ہے۔

عمدہ سامان:

پھر عیاشی کے لئے عمدہ سامان جمع کئے جاتے ہیں تا کہ عیاشی میں لذت پیدا ہو۔مگر رسول کریم ﷺ کے گھروں کا یہ حال تھا کہ بعض گھروں میں صرف بھیڑ بکری کی ایک کھال تھی۔جس پر میاں بیوی اکٹھے سو رہتے تھے۔چنانچہ حضرت عائشہ کہتی ہیں ہمارے گھر میں ایک ہی بستر تھا اور ہمیں اکٹھے سونا پڑتا۔جب رات کو رسول کریم ﷺ نماز کے لئے اٹھتے تو اسی بچھونے پر نماز پڑھتے اور مجھے اپنی ٹانگیں اکٹھی کر لینی پڑتیں۔

باکرہ عورتیں:

پھر عیاش باکرہ عورتوں کا دلدادہ ہوتا ہے۔مگر رسول کریم ﷺ نے با اختیار بادشاہ ہونے کی حالت میں کسی باکرہ سے شادی نہ کی۔ہاں مکہ میں ایک باکرہ حضرت عائشہ سے شادی کی مگر جب صاحب اختیار ہوئے تو ایک بھی نکاح کسی باکرہ سے نہ کیا۔اگر آپ عیش پسند ہوتے تو کیا آپ باکرہ عورتوں سے شادی نہ کر سکتے۔کئی باکرہ عورتوں نے اپنے آپ کو نکاح کے لئے پیش بھی کیا مگر آپ نے کسی سے نکاح نہ کیا بلکہ ان کا نکاح دوسروں سے کرا دیا۔

حسین عورت کی تلاش:

پھر عیاش انسان پہلی عورت سے زیادہ حسین تلاش کرتا ہے۔جو پہلی عورتوں سے زیادہ اس کی شہوات کو پورا کر سکے۔مگر سب اس بات پر متفق ہیں کہ حضرت عائشہ کے درجہ کی آپ کی کوئی بھی بیوی نہ تھی۔اگر آپ نعوذ باللہ عیاش ہوتے تو جو نکاح آپ نے بعد میں کئے وہ زیادہ حسین عورتوں سے کرتے۔مگر اروِنگ جیسا دشمن بھی آپ کے متعلق لکھتا ہے:

Upon this wife thus chosen in the very Blossom of years, the Prophet dotted more than any of those whom he subsequently married.

یعنی اس طرح چنی ہوئی یہ بیوی (عائشہ رضی اللہ عنہا) جسے آپ نے اس کے عنفوانِ شباب میں بیاہ کیا ہے ایسی تھی کہ جس پر نبی اپنی تمام دوسری بیبیوں سے جو بعد میں بیاہی گئیں فریفتہ تھا۔ یہ ایک دشمن اور سخت دشمن کی شہادت ہے۔ اگر نعوذ باللہ آپ عیاش ہوتے تو آپ عائشہ کے بعد ان سے زیادہ خوبصورت نہایت نوجوانی کی عمر کی بیویوں کو تلاش کرتے۔ مگر آپ نے ایسا نہیں کیا اور ایسی عورتوں سے شادی کی جو عائشہ کا مقابلہ اپنی عمر اور اپنی ظاہری خوبی کے لحاظ سے نہیں کر سکیں اور ایسی حالت میں شادی کی جب کہ آپ عائشہؓ کے والد کے اخلاص اور خود ان کے زہد اور تقویٰ کی وجہ سے عائشہؓ سے کمال محبت رکھتے تھے۔ کیا یہ عیاشی کہلا سکتی ہے؟

مزامیر:

پھر عیاشی کے لئے مزامیر ضروری ہوتے ہیں۔ مگر رسول کریم ﷺ نے ان کے متعلق فرما دیا ہے کہ یہ شیطانی آلے ہیں۔ یاد رکھو کہ ایسے لوگ تو ہو سکتے ہیں جو عیاش نہ ہوں اور باجے سنیں مگر کوئی ایسا عیاش نہیں ہو سکتا جو مزامیر نہ سنتا ہو۔ مگر محمد ﷺ وہ انسان تھے جو مزامیر کو مٹانے والے تھے۔ اگر آپ نعوذ باللہ عیاش ہوتے تو پھر کس طرح ممکن تھا کہ ایسا کرتے۔

عورتوں کی خواہشوں کی پابندی:

پھر عیاش انسان عورتوں کی خواہشوں کا پابند ہوتا ہے مگر رسول کریم ﷺ کا یہ حال تھا کہ جب خیبر کا علاقہ فتح ہوا اور وہاں کے ٹیکس کی ایک معقول رقم آنے لگی اور مسلمانوں کے گھروں میں دولت اور فراوانی آ گئی تو آپ کی بیویوں نے بھی جن میں سے اکثر آسودہ حال گھرانوں کی لڑکیاں تھیں خواہش کی کہ ہم بہت تنگی میں گزارہ کرتی ہیں اس وقت تو ہم نے اس وجہ سے کچھ نہیں کہا کہ روپیہ تھا ہی نہیں لیکن اب جب کہ روپیہ آ گیا ہے اور سب لوگوں کو حصہ ملا ہے ہماری آسودگی کا بھی انتظام ہونا چاہئے اور اس تنگ زندگی سے ہمیں بچانا چاہئے۔ تو اس خواہش کے جواب میں وہ انسان جسے کہا جاتا ہے کہ نعوذ باللہ عیاش تھا اور عورتوں کی صحبت میں اس نے عمر گزاری جو جواب دیتا ہے اس کا ذکر قرآن کریم میں ان الفاظ میں آیا ہے:

يَاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَاُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا ۝ وَاِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالدَّارَ الْاٰخِرَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝ (الاحزاب:۲۹۔۳۰)

خدا تعالیٰ فرماتا ہے اے نبی ان بیویوں سے کہہ دو کہ اگر تم دنیا کے مال اور زینت کے سامان کی خواہش رکھتی ہو تو آؤ تم کو مال دے دیتا ہوں۔ مگر اس حالت میں تم میری بیویاں نہیں رہ سکتیں۔ مال لے کر تم مجھ سے جدا ہو جاؤ۔ لیکن اگر تم اللہ اور اس کے رسول کی محبت رکھتی ہو اور آخرت کی بھلائی چاہتی ہو تو پھر ان اموال کا مطالبہ نہ کرو۔ اور یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ نے تم میں سے ان کے لئے جو پوری طرح خدا کے احکام کی پابندی کرنے والیاں ہوں گی بہت بڑے اجر مقرر کر چھوڑے ہیں۔

اس جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ میری زوجیت یا میری موجودگی میں تم کو مال نہیں مل سکتا۔ اگر میری زندگی میں مال لینا چاہتی ہو تو طلاق لے لو اور الگ ہو جاؤ کہ میری دینی ذمہ داریاں مالداروں کی زندگی کی برداشت نہیں کر سکتیں۔ لیکن اگر تم اس وقت صبر سے کام لو اور میرے ساتھ مل کر خدمتِ دین کو ترجیح دو تو پھر بھی تم کو مال مل جائے گا مگر میری وفات کے بعد ملے گا۔ میری موجودگی میں نہیں۔ چنانچہ آپ کی بیویوں کو مال ملے اور بہت ملے مگر آپ کی وفات کے بعد۔ اب دیکھو کہ اس طرح عورتوں کی خواہشات کو ٹھکرا دینے والا کیا عیاش کہلا سکتا ہے؟ اور کیا کوئی عیاش اپنی بیویوں کی مال و زینت کی خواہش سن کر انہیں کہہ سکتا ہے کہ زینت کے سامان چاہئیں تو طلاق لے لو۔

عورتوں میں بے انصافی:

پھر عیاش انسان عورتوں میں بے انصافی کرتا ہے۔ جسے خوبصورت سمجھے اس کی طرف زیادہ رغبت رکھتا ہے اور باقیوں کو چھوڑ دیتا ہے۔ مگر رسول کریم ﷺ کا یہ حال تھا کہ جب آپ بیمار ہوئے تو اس حالت میں بھی دوسروں کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر اس بیوی کے ہاں چلے جاتے جس کی باری ہوتی۔ وفات سے تین دن قبل تک ایسا ہی کرتے رہے حتیٰ کہ آپ کی یہ حالت دیکھ

کر حضرت فاطمہؓ رو پڑیں اور آپ کی بیویوں نے بھی کہا کہ آپ ایک جگہ ٹھہر جایئے ہم بخوشی اس کی اجازت دیتی ہیں ۔ تب آپ ایک جگہ ٹھہر گئے ۔ جو انسان بیویوں میں انصاف کرنے کا اس قدر پابند ہو کہ مرض الموت میں بھی دوسرے کے کندھوں کا سہارا لے کر ان کے ہاں باری باری جاتا ہو اسے کون عیاش کہہ سکتا ہے۔

عورتوں میں زیادہ وقت صرف کرنا:

پھر عیاش اپنا زیادہ وقت عورتوں کی صحبت میں گزارتا ہے ۔ مگر آپ کی یہ حالت تھی کہ صبح سے شام تک باہر رہتے اور رات کو جب گھر جاتے تو کھانا کھا کر لیٹ جاتے اور پھر رات کو اٹھ کر عبادت کرتے ۔ اس طرح بندھے ہوئے اوقات میں آپ کو عیاشی کے لئے کون سا وقت ملتا تھا۔

رسول کریمؐ کی شادیوں کی غرض:

پس آپ کی کئی بیویوں کو دیکھ کر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ نعوذ باللہ آپ عیاش تھے ۔ دیکھنا یہ چاہئے کہ کس غرض کو مد نظر رکھ کر آپ نے شادیاں کیں ۔ خدا کے لئے یا اپنے نفس کے لئے ۔ اگر خدا کے لئے کیں تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ آپ کا زیادہ بیویاں کرنا عیاشی کی دلیل ہے ۔ میں ثابت کر چکا ہوں کہ آپ کا ایک سے زیادہ بیویاں کرنا نفس کی خواہشات کے لئے نہ تھا کیونکہ انہیں تو آپ نے پورا نہیں کیا ۔ اس کی وجہ کوئی اور تھی اور وہ یہ تھی کہ آپ ایک ایسی قوم میں مبعوث ہوئے تھے جس کے مرد اور عورتیں سب شریعت سے بے خبر تھے اس قوم میں آپ نے شریعت کو رائج کرنا تھا ۔ پس آپ نے مختلف خاندانوں کی بیویوں سے شادیاں کیں تا کہ وہ دین کے اس حصہ کو جو عورتوں سے تعلق رکھتا ہے سیکھ کر اپنی ہم جنسوں کو تعلیم دیں ۔ اور یہ ایک محض للّٰہی غرض تھی ۔ اور آپ کا زیادہ شادیاں کرنا اور ان میں انصاف قائم رکھنا ایک بہت بڑی قربانی تھا نہ کہ عیاشی۔

اور اب جب کہ میں یہ ثابت کر چکا ہوں کہ جس رنگ میں آپ نے عورتوں سے معاملہ کیا ہے وہ عیاشی نہیں بلکہ قربانی ہے ۔ تو یہ بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ جب کہ آپ نے اپنی امت کے انہی لوگوں کو ایک سے زیادہ بیویوں کی اجازت دی ہے جو آپ کی طرح عورتوں سے معاملہ کر سکیں تو اس حکم سے کسی ظلم کی بنیاد نہیں پڑی ۔ بلکہ دینوی ترقی کے لئے ایک بہت بڑی قربانی اور

ملک کی اخلاقی درستی کے لئے ایک بہت بڑی تدبیر کے لئے دروازہ کھلا رکھا گیا ہے۔"

(انوارالعلوم جلد ۱۰ صفحہ ۲۶۶ تا صفحہ ۲۷۲)

تعدد ازدواج اور شہوت پرستی کا الزام: حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز اس اعتراض کے ردّ میں فرماتے ہیں:۔

"شادیوں پر اعتراض کیا تو پھر اللہ تعالیٰ نے اس کا ردّ بھی فرمایا۔ اسے پتہ تھا کہ ایسے واقعات ہونے ہیں، ایسے سوال اٹھنے ہیں تو وہ ایسے حالات پیدا کر دیتا تھا کہ ان باتوں کا ردّ بھی سامنے آ گیا۔

اسماء بنت نعمان بن ابی جون کے بارے میں آتا ہے کہ عرب کی خوبصورت عورتوں میں سے تھیں۔ وہ جب مدینہ آئی ہیں تو عورتوں نے انہیں وہاں جا کر دیکھا تو سب نے تعریف کی کہ ایسی خوبصورت عورت ہم نے زندگی میں نہیں دیکھی۔ اس کے باپ کی خواہش پر آپ نے اس سے پانچ صد درہم حق مہر پر نکاح کر لیا جب آپ اس کے پاس گئے تو اس نے کہا میں آپ سے اللہ کی پناہ مانگتی ہوں۔ آپ ﷺ نے یہ سن کر فرمایا کہ تم نے ایک بہت عظیم پناہ گاہ کی پناہ طلب کی ہے اور باہر آ گئے اور اپنے ایک صحابی ابو اسید کو فرمایا کہ اس کو اس کے گھر والوں کے پاس چھوڑ آؤ۔ اور پھر یہ بھی تاریخ میں ہے کہ اس شادی پر اس کے گھر والے بڑے خوش تھے کہ ہماری بیٹی آنحضرت ﷺ کے عقد میں آئی لیکن واپس آنے پر وہ سخت ناراض ہوئے اور اسے بہت برا بھلا کہا۔

(ماخوذ از الطبقات الکبریٰ لابن سعد الجزء الثامن صفحہ 318-319 ذکر من تزوج رسول اللہ ﷺ اسماء بنت النعمان۔ دار احیاء التراث العربی بیروت 1996)

تو یہ وہ عظیم ہستی ہے جس پر گھناؤنے الزام عورت کے حوالے سے لگائے جاتے ہیں۔ جس کا بیویاں کرنا بھی اس لئے تھا کہ خدا تعالیٰ کا حکم تھا۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے تو لکھا ہے اگر بیویاں نہ ہوتیں، اولاد نہ ہوتی اور جو اولاد کی وجہ سے ابتلاء آئے اور جن کا جس طرح اظہار کیا اور پھر جس طرح بیویوں سے حسنِ سلوک ہے، خُلق ہے، یہ کس طرح قائم ہو، اس کے نمونے کس طرح قائم ہو کے ہمیں پتہ چلتے۔ ہر عمل آپ کا خدا کی رضا کے لئے ہوتا تھا۔

(ماخوذ از چشمہ معرفت روحانی خزائن جلد ۲۳ صفحہ نمبر ۳۰۰)

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بارے میں الزام ہے کہ وہ بہت لاڈلی تھیں اور پھر عمر کے حساب سے بھی بڑی غلط باتیں کی جاتی ہیں لیکن عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو آپ یہ فرماتے ہیں کہ بعض راتوں میں مَیں ساری رات اپنے خدا کی عبادت کرنا چاہتا ہوں جو مجھے سب سے زیادہ پیارا ہے۔

(الدرالمنثور فی التفسیر بالماثور لامام السیوطی سورۃ الدخان زیر آیت نمبر ۴ جلد ۷ صفحہ ۳۵۰ دار احیاء التراث العربی بیروت ۲۰۰۱)

پس جن کے دماغوں میں غلاظتیں بھری ہوئی ہوں انہوں نے یہ الزام لگانے ہیں اور لگاتے رہے ہیں، آئندہ بھی شاید وہ ایسی حرکتیں کرتے رہیں جیسے کہ میں پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں سے جہنم کو بھرتا رہے گا۔ پس ان لوگوں کو اور ان کی حمایت کرنے والوں کو خدا تعالیٰ کے عذاب سے ڈرنا چاہئے۔ جیسا کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے کہ وہ اپنے پیاروں کے لئے بڑی غیرت رکھتا ہے۔

(ماخوذ از تریاق القلوب روحانی خزائن جلد ۱۵ صفحہ نمبر ۲۷۸)

(خطبات مسرور جلد ۱۰، صفحہ ۴۵۷، ۴۵۷)

حضرت عائشہؓ سے بدن لگانا وغیرہ کے اعتراضات

پادری فتح مسیح نے تعصب کے ساتھ آپ پر یہ اعتراض کئے کہ حضرت عائشہؓ سے بدن لگانا وغیرہ خلاف شرع تھا اس کے ردّ میں حضور علیہ السلام تحریر فرماتے ہیں کہ:

''پھر آپ حضرت **عائشہ صدیقہؓ** کا نام لے کر اعتراض کرتے ہیں کہ جناب **مقدس نبویؐ** کا بدن سے بدن لگانا اور زبان چوسنا خلاف شرع تھا اب اس ناپاک تعصب پر کہاں تک رو ویں۔ اے **نادان** جو **حلال** اور جائز نکاح ہیں۔ ان میں یہ سب باتیں جائز ہوتی ہیں یہ اعتراض کیسا ہے کیا تمہیں خبر نہیں کہ **مردی** اور **رجولیت** انسان کی صفات محمودہ میں سے ہے **ہیجڑا** ہونا کوئی **اچھی صفت نہیں** جیسے بہرہ اور گونگا ہونا کسی خوبی میں داخل نہیں۔ ہاں یہ اعتراض بہت بڑا ہے کہ **حضرت مسیح علیہ السلام** مردانہ صفات کی اعلیٰ ترین صفت سے بے نصیب محض

ہونے کے باعث ازواج سے سچی اور کامل حسن معاشرت کا کوئی عملی نمونہ نہ دے سکے۔اس لئے یورپ کی عورتیں نہایت قابل شرم آزادی سے فائدہ اٹھا کر اعتدال کے دائرہ سے **اِدھراُدھر نکل گئیں اور آخر ناگفتنی فسق وفجور تک نوبت پہنچی۔**

اے نادان! فطرت انسانی اور اس کے سچے پاک جذبات سے اپنی بیویوں سے پیار کرنا اور حسن معاشرت کے ہر قسم جائز اسباب کو برتنا انسان کا طبعی اور اضطراری خاصہ ہے **اسلام کے بانی علیہ الصلوٰۃ والسّلام** نے بھی اسے برتا اور اپنی جماعت کو ایک نمونہ دیا **مسیح** نے اپنے نقص تعلیم کی وجہ سے اپنے **ملفوظات** اور اعمال میں یہ کمی رکھ دی مگر چونکہ طبعی تقاضا تھا اس لئے یورپ اور عیسویت نے خود اس کے لئے ضوابط نکالے۔اب تم خود انصاف سے دیکھ لو کہ گندی سیاہ بدکاری اور ملک کا ملک رنڈیوں کا ناپاک چکلہ بن جانا **ہائیڈ پارکوں** میں **ہزاروں ہزار کا** روز روشن میں **کتوں اور کتیوں** کی طرح اوپر **تلے** ہونا اور آخر اس ناجائز آزادی سے **تنگ** آ کر آہ و فغان کرنا اور برسوں دیوثیوں اور سیاہ روئیوں کے مصائب جھیل کر اخیر میں **مسودہ طلاق** پاس کرانا یہ کس بات کا نتیجہ ہے۔کیا اس قدوس **مطہر۔مزکّی نبی اُمّیؐ** کی معاشرت کے اس نمونہ کا جس پر خباثت باطنی کی تحریک سے آپ معترض ہیں یہ نتیجہ ہے۔اور ممالک **اسلامیہ** میں یہ تعفّن اور زہریلی ہوا پھیلی ہوئی ہے یا ایک سخت ناقص نالائق کتاب **پولوی انجیل** کی مخالف فطرت اور ادھوری تعلیم کا یہ اثر ہے اب دوزانو ہو کر بیٹھو اور **یوم الجزا** کی تصویر کھینچ کر غور کرو۔

ہاں **مسیح** کی **دادیوں** اور **نانیوں** کی نسبت جو اعتراض ہے اس کا جواب بھی کبھی آپ نے سوچا ہوگا ہم تو سوچ کر تھک گئے اب تک کوئی عمدہ جواب خیال میں نہیں آیا کیا ہی خوب خدا ہے جس کی دادیاں اور نانیاں اس کمال کی ہیں آپ یاد رکھیں کہ ہم بقول آپ کے مرد میدان بن کر ہی رسالہ لکھیں گے اور آپ کو دکھائیں گے کہ وساوس کی بیخ کنی اسے کہتے ہیں اس جاہل گمراہ کا شکست دینا کون سے بڑی بات ہے جو انسان کو خدا بناتا ہے مگر آپ ازراہ مہربانی ان چند باتوں کا جو میں نے دریافت کی ہیں ضرور جواب لکھیں۔اوران الفاظ سے ناراض نہ ہوں جو لکھے گئے ہیں کیونکہ الفاظ محل پر چسپاں ہیں۔اور آپ کی شان کے شایان ہیں۔جس حالت میں آپ نے

باوجود بے علمی اور جہالت کے آنحضرت ﷺ پر جو **سید المطھرین** ہیں زنا کی تہمت لگائی۔ تو اس پلید جھوٹ اور افترا کا یہی جواب تھا۔ جو آپ کو دیا گیا۔ ہم نے بہتیرا چاہا کہ آپ لوگ بھلے مانس بن جاویں۔ اور گالیاں نہ دیا کریں۔ مگر آپ لوگ نہیں مانتے۔ آپ ناحق اہل اسلام کا دل دکھاتے ہیں آپ نہیں جانتے کہ ہمارے نزدیک وہ نادان ہر ایک زنا کار سے بدتر ہے جو انسان کے پیٹ سے نکل کر خدا ہونے کا دعویٰ کرے۔ اگر آپ لوگ **مسیح** کے خیر خواہ ہوتے تو ہم سے **جناب مقدس نبوی** کے ذکر میں بے ادب پیش آتے **ایک صحیح حدیث میں** ہے کہ تم اپنے باپ کو گالی مت دو لوگوں نے عرض کی کوئی باپ کو بھی گالی دیتا ہے آپ نے فرمایا ہاں جب تو کسی کے باپ کو گالی دے گا تو وہ ضرور تیرے باپ کو بھی گالی دے گا تب وہ گالی اس نے نہیں دی بلکہ تو نے دی ہے اسی طرح آپ لوگ چاہتے ہیں کہ آپ کے بودے جھوٹے خدا کی بھی اچھی طرح بھگت سنواری جائے۔ اب ہم یہ خط بطور نوٹس کے آپ کو بھیجتے ہیں کہ اگر پھر ایسے ناپاک لفظ آپ نے استعمال کئے۔ اور آنحضرت ﷺ کی جناب میں ناپاک تہمت لگائی تو ہم بھی آپ کے فرضی اور جعلی خدا کی وہ خبر لیں گے جس سے اس کی تمام خدائی ذلت کی نجاست میں گرے گی۔

اے نالائق کیا تو اپنے خط میں سرور انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو زنا کی تہمت لگاتا ہے اور فاسق فاجر قرار دیتا ہے اور ہمارا دل دکھاتا ہے۔ ہم کسی عدالت کی طرف رجوع نہیں کرتے اور نہ کریں گے مگر آئندہ کے لئے سمجھاتے ہیں کہ ایسی ناپاک باتوں سے باز آجاؤ اور خدا سے ڈرو جس کی طرف پھرنا ہے اور حضرت مسیح کو بھی گالیاں مت دو۔ یقیناً جو کچھ تم **جناب مقدس نبوی** کی نسبت بُرا کہو گے۔ وہی تمہارے فرضی **مسیح** کو کہا جائے گا مگر ہم اس سچے **مسیح** کو **مقدس** اور بزرگ اور پاک جانتے اور مانتے ہیں جس نے **نہ خدائی کا دعویٰ کیا نہ بیٹا ہونے کا اور جناب محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم** کے آنے کی خبر دی اور ان پر ایمان لایا۔ فقط"

(نور القرآن نمبر۲، روحانی خزائن جلد نمبر ۹ صفحہ ۳۹۴ تا ۳۹۵)

☆

حضرت زینبؓ سے آسمان پر نکاح ہونے پر اعتراض

حضرت زینبؓ سے آسمان پر نکاح پر آریوں نے اعتراض کیا اس کے ردّ میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام نسیم دعوت میں تحریر فرماتے ہیں:

''اور یہ اعتراض کہ ہمارے نبی ﷺ کی بیوی زینب کا آسمان پر نکاح ہوا تھا۔اس سے بھی معترض کی صرف نادانی ثابت ہوتی ہے۔خدا کے نبیوں اور رسولوں کے آسمان پر ہی نکاح ہوتے ہیں کیونکہ خدا ان کو قبل از وقت نکاح کا حکم دیتا ہے۔اور اپنی رضامندی ظاہر کرتا ہے جبکہ آپ لوگوں کا ایک برہمن درمیان میں آ کر نکاح کراجاتا ہے تو کیا خدا کو اختیار نہیں۔اعتراض تو اس صورت میں تھا کہ خدا کسی غیر کی عورت سے جو اس کے نکاح میں ہے اور اس نے طلاق نہیں دی جبراً کسی پیغمبر کو دیدے مگر طلاق کے بعد اگر خدا کے حکم سے طرفین کی رضامندی سے نکاح ہو تو اس پر کیا اعتراض ہے''۔

(نسیم دعوت، روحانی خزائن جلد ۱۹ صفحہ ۴۴۳۔۴۴۴)

رنگیلا رسول ہونے کا الزام

بدنام زمانہ کتاب ''رنگیلا رسول'' کے مصنف نے آنحضورؐ پر رنگیلا یعنی عیاش ہونے کا الزام لگایا ہے۔اس کے ردّ میں حضرت مصلح موعود فرماتے ہیں:

''اس کتاب کا لکھنے والا رسول کریم ﷺ کا نام رنگیلا رکھتا ہے اور رنگیلا ایسے شخص کو کہا جاتا ہے جو عواقبِ زمانہ کا خیال نہ رکھتا ہو۔اپنی زندگی عیش وعشرت میں گزارتا ہو۔انجام اور عاقبت کو کچھ وقعت نہ دیتا ہو۔چنانچہ ہندوستان کے ایک بادشاہ محمد شاہ کا نام رنگیلا رکھا گیا تھا۔جس کی وجہ یہ ہے کہ جب اس پر غنیم چڑھ کر آیا اور اس کی خبر اس تک بذریعہ تحریر پہنچائی گئی تو اس نے اس کاغذ کو شراب کے پیالہ میں ڈال دیا۔آخر اسے اس کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔اس وجہ سے اس کا نام رنگیلا ہو گیا کیونکہ اس نے عواقب پر نظر نہ کی بلکہ شراب و کباب اور عورتوں کی صحبتوں میں مصروف رہا۔

رسول کریم ﷺ کونعوذ باللہ رنگیلا کہہ کر یہی الزام اس کتاب والا آپ پر لگا تا ہے۔اب ہم دیکھتے ہیں کہ کیا رسول کریم ﷺ پر کوئی عقلمند ایسے الزام لگا سکتا ہے۔ہر شخص جو آپ کی زندگی کے حالات سے واقف ہو جاتا ہے کہ سوائے اس شخص کو جو شراب کی ترنگ میں ایسی کتاب لکھے۔اور کوئی یہ الزام آپؐ پر نہیں لگا سکتا۔اور یہ دیکھا گیا ہے کہ شرابی جب شراب پی کر مخمور ہو جاتے ہیں تو دوسروں کو کہتے ہیں کہ ہم تو ہوش میں ہیں تم نشہ میں ہو۔یہی اس شخص کا حال ہے جس نے یہ کتاب لکھی۔واقعی اس نے شراب کے نشہ میں یا فطرت کی گندگی کی وجہ سے اپنے نفس کے عیب اس مصفٰی آئینے میں دیکھے جس سے بڑھ کر نہ کوئی مصفٰی آئینہ پیدا ہوا اور نہ ہوگا۔جس طرح ایک بدشکل اور سیاہ رو جب شیشہ میں اپنی شکل دیکھے تو سمجھے کہ یہ شیشہ کا قصور ہے اسی طرح اس کی حالت ہے۔اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس کتاب کا مصنف خود رنگیلا ہے جسے نہ خدا کا خوف ہے نہ دنیا کا ڈر۔ورنہ رسول کریم ﷺ کی زندگی کو جب دیکھا جائے تو اس کا کوئی حصہ ایسا نہیں نظر آتا جس میں رنگیلا پن کا شائبہ بھی پایا جائے اور اس بات کو دشمن بھی مانتے ہیں۔

میں نے بتایا ہے رنگیلا اسے کہا جاتا ہے جو شراب میں بدمست رہے اور اس طرح زندگی بسر کرے کہ بدمستی یا لا ابالی میں کسی وجہ سے دنیا کے غموں کو پاس نہ آنے دے۔پس پہلی چیز رنگیلے شخص کے لئے بدمستی ہے۔لیکن ہر شخص جسے عقل سے ذرا بھی مس ہو وہ جانتا ہے کہ دنیا سے شراب کا مٹانے والا ایک ہی شخص ہے یعنی محمدؐ اگر نعوذ باللہ آپ میں رنگیلا پن ہوتا تو اس وقت جب کہ اس کتاب کے لکھنے والے کے باپ دادا مٹکوں کے مٹکے شراب کے اڑاتے تھے۔بلکہ دیوی دیوتاؤں کو بھی پلاتے تھے۔اس وقت محمد ﷺ شراب کی ممانعت کا حکم نہ دیتے۔مگر اس زمانہ میں کہ آپ کی قوم دن رات شراب میں مست رہتی تھی آپ نے شراب کی ممانعت کا حکم دیا۔آپ کے اس حکم کا اثر اور تصرف دیکھو۔کچھ لوگ ایک جگہ بیٹھے شراب پی رہے تھے اور نشہ کی حالت میں تھے کہ باہر سے آواز آئی شراب حرام کر دی گئی۔اس وقت ایک شخص نے جو اس مجلس میں شامل تھا کہا اٹھ کر پوچھو تو سہی کہ اس بات کی تفصیل کیا ہے۔مگر اس نشہ کی حالت میں ایک دوسرا شخص سونٹا اٹھا کر شراب کے مٹکے پر مارتا ہے اور کہتا ہے کہ جب ایک شخص کہہ رہا ہے کہ

شراب حرام ہوگئی ہے تو اب میں پہلے مٹکا توڑدوں گا اور پھر پوچھوں گا کہ کیا کہتا ہے۔ آواز یہ آئی ہے کہ محمد ﷺ نے شراب حرام کر دی۔ اگر یہ بات غلط بھی ہے تو بھی میں پہلے مٹکا توڑوں گا پھر اس کی تصدیق کروں گا۔ چنانچہ وہ مٹکا توڑ دیتا ہے اور پھر پوچھتا ہے کہ کیا رسول کریم ﷺ نے شراب حرام کر دی؟ جب بتایا جاتا ہے کہ ہاں آپ نے شراب حرام کر دی تو سب پکار اٹھتے ہیں اچھا ہم نے شراب چھوڑ دی۔

میں پوچھتا ہوں کہ کیا وہ انسان جس نے شراب کو ایک ملک کے ملک سے ایک حکم کے ساتھ ایسے طور پر مٹا دیا کہ پھر کسی نے اس کا نام نہ لیا۔ اور اس قوم سے شراب چھڑائی کہ جو کم سے کم دن رات آٹھ دفعہ شراب پیتے تھے اور اس پر فخر کرتے تھے۔ اس کی طرف رنگیلا پن منسوب کیا جا سکتا ہے؟ اگر وہ رنگیلا کہلا سکتا ہے تو ہندوؤں کے بزرگ جو شراب سے منع نہیں کرتے تھے بلکہ خود شرابیں پیتے تھے کیا کہلائیں گے؟

رنگیلا پن کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ ایسا انسان انجام کی کوئی فکر نہ رکھے۔ لیکن محمد ﷺ کی تعلیم کو پڑھو اور پھر بتاؤ کیا اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے۔ اس کتاب میں جو آپ کو خدا تعالیٰ کی طرف سے ملی دیکھو کس طرح انسان کو بار بار موت یاد دلائی گئی ہے اور کس طرح آپ اپنے ماننے والوں کو تلقین فرماتے ہیں کہ اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، چلتے پھرتے موت کو یاد کرو۔ کیا دنیا کی کوئی کتاب ایسی ہے جو عاقبت کے متعلق اتنا ڈراتی ہو جتنا قرآن کریم ڈراتا ہے۔ قرآن کریم کا حجم ویدوں سے، بائبل سے اور ژنداوستا سے بہت کم ہے۔ اور میرے نزدیک تمام ان کتابوں سے کم ہے جنہیں خدا کی سمجھا جاتا ہے۔ مگر میں چیلنج دیتا ہوں کہ جس قدر قرآن میں انجام اور عاقبت کے متعلق ڈرایا گیا ہے اس کا چوتھا حصہ ہی کسی اور کتاب سے نکال کر دکھا دیا جائے۔ تو میں اپنی شکست تسلیم کرلوں گا۔ اگر کوئی نہیں دکھا سکتا تو میں پوچھتا ہوں کیا جس انسان میں رنگیلا پن پایا جائے اور جو انجام سے لاپرواہ ہو اس کے حرکات وسکنات میں، اس کی گفتگو میں، اس کی تعلیم میں کیا اس قدر انجام کا خیال رکھنے کی تعلیم ہو سکتی ہے؟ پھر رنگیلا پن میں عورتوں سے تعلق بھی شامل ہے۔ لیکن ذرا بتایا تو جائے کہ دنیا میں کونسی کتاب اور کونسا مذہب اور کونسا انسان ایسا

ہے جس نے پردہ کا حکم دیا ہو۔ اور اس وقت دیا ہو جب کہ عورت و مرد آپس میں خلا ملا رکھتے ہوں۔ عورتوں کی صحبت سے لذت اٹھاتے ہوں۔ بغیر کسی جھجک اور حجاب کے ایک دوسرے سے ملتے ہوں۔ کیا ان سب باتوں سے روک کر پردہ کا حکم جاری کرنا اور یہ کہنا کہ مرد و عورت اس طرح ایک دوسرے سے نہ ملا کریں کسی رنگیلے کی تعلیم ہو سکتی ہے۔ اگر نعوذ باللہ رسول کریم ﷺ میں رنگیلا پن ہوتا تو چاہئے تھا کہ آپ کہتے کہ عورتوں اور مردوں کو خوب محفلیں گرم کرنی چاہئیں اور ایک دوسرے کے ساتھ ملنے سے کوئی پرہیز نہیں کرنا چاہئے۔ آپس میں خوب ہنسی تمسخر کرنا چاہئے۔ مگر آپ نے یہ فرمایا کہ مرد و عورت علیحدہ علیحدہ رہیں اور نامحرم کی شکل تک نہ دیکھیں۔ کیا اس کو رنگیلا پن کہا جا سکتا ہے۔

پھر رنگیلا پن کی خاصیت یہ ہے کہ جس میں پایا جائے وہ کسی قسم کی ہیبت اور خوف کو اپنے اوپر مستولی نہیں ہونے دیتا۔ مگر رسول کریم ﷺ کی ذات دیکھو صبح شام، رات دن خدا تعالیٰ کا ذکر کرتے ہیں اور اس کثرت سے کرتے ہیں کہ فرانس کا ایک مشہور مصنف لکھتا ہے۔ محمد ﷺ کے متعلق خواہ کچھ کہو مگر اس کی ایک بات کا مجھ پر اتنا اثر ہے کہ میں اسے جھوٹا نہیں کہہ سکتا۔ اور وہ یہ کہ رات دن اٹھتے بیٹھتے سوائے خدا کے نام کے اس کی زبان سے کچھ نہیں نکلتا۔ اور ہر لحہ اور ہر گھڑی وہ خدا کی عظمت اور اس کی محبت کو پیش کرتا ہے۔

وہ لکھتا ہے میں کس طرح مان لوں کہ یہ شخص جو سب سے زیادہ خدا تعالیٰ کو پیش کرنے والا ہے خدا پر افترا ءباندھتا ہے۔ اب یہ ایک دشمن کی گواہی ہے جس نے رسول کریم ﷺ کی زندگی کو تنقید کے طور پر مطالعہ کیا۔ پس جب کہ رسول کریم ﷺ ہر وقت اس طرف توجہ دلاتے رہے کہ ایک بالا ہستی ہے، اس کی شان اور عظمت بیان کرتے رہے۔ اس کے جلال اور جبروت سے ڈراتے رہے تو کیونکر تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ آپ میں (نعوذ باللہ) رنگیلا پن پایا جاتا تھا۔

پھر میں کہتا ہوں کہ رنگیلا پن کا موقع کھانے پینے یا مرد عورت کے تعلقات کا ہے۔ مگر اس وقت بھی رسول کریم ﷺ یہ تعلیم دیتے ہیں کہ جب کھانے بیٹھو تو خدا کا نام لو۔ جب کوئی چیز پینے لگو تو خدا کا نام لو کہ یہ سب چیزیں اسی نے تم کو عطا کی ہیں۔ اسی طرح جب مرد و عورت کے

تعلقات ہوتے ہیں اور جب عیش وعشرت کرنے والے چاہتے ہیں کہ کسی قسم کا فکران کے پاس نہ آئے اور اسی غرض کے لئے شراب پیتے ہیں اس وقت کے متعلق بھی آپ فرماتے ہیں ۔یہ وقت بھی خدا تعالیٰ کو بھولنے کا نہیں ۔اس وقت تم دعا کرو کہ تمہارے ملنے کا نتیجہ برا نہ پیدا ہو بلکہ اچھا پیدا ہو ۔پس جو انسان میاں بیوی کے جائز تعلقات کے وقت بھی کہتا ہے رنگیلا پن مت اختیار کرو بلکہ اس موقع پر بھی خدا کو یاد رکھو ۔جو پردہ کا حکم دے کر عورتوں کو بالکل مردوں سے علیحدہ رہنے کا حکم دیتا ہے ۔جو شراب کا پینا قطعاً چھڑا دیتا ہے کیا اسے ان مذہب کے پیروؤں کا جن میں شراب جائز ہے، جن میں مرد اور عورتیں آزادی سے خلا ملا رکھتے ہیں، جن میں رنگیلا پن کی ساری باتیں پائی جاتی ہیں حق ہے کہ ایسے انسان پر اعتراض کریں ۔کیا ان اقوام کا فرد رسول کریم ﷺ کو رنگیلا کہہ کر اپنے سیاہ چہرہ کو اپنے مصفّٰی آئینہ میں نہیں دیکھتا ؟ یقیناً وہ اپنا ہی گند دیکھتا ہے یا پھر وہ پاگل خانہ میں بھیجے جانے کے قابل ہے ۔وہ شخص اس بات کو دیکھتے ہوئے کہ رسول کریم ﷺ نے شراب پینے سے بالکل روک دیا ۔پردہ کا حکم جاری کر دیا ۔کھانے پینے اور مرد وعورت کے جائز تعلق کے وقت خدا کو یاد رکھنے کی تلقین کی ۔موت کو ہر وقت سامنے رکھنے کی ہدایت کی ۔ہر وقت خدا کے جلال سے ڈرنے اور اس کی رحمت کی امید رکھنے کا سبق پڑھایا ۔اور باوجود بادشاہ ہونے کے بغیر چھنے اور پتھروں سے کوٹ کر بنے ہوئے آٹے پر گزارہ کیا ۔آپ کی طرف رنگیلا پن منسوب کرتا ہے ۔وہ اگر اول درجہ کا خبیث اور جھوٹا نہیں تو اول درجہ کا پاگل ضرور ہے اور پاگل خانہ میں بھیجنے کے قابل ہے ۔ان حالات کے ماتحت جو قوم رسول کریم ﷺ اعتراض کرتی اور الزام لگاتی ہے ۔اس کے دماغ میں نقص اور عقل میں فتور ہے ۔یا وہ ملک میں فتنہ پیدا کرنا چاہتی ہے ۔میں دعا کرتا ہوں کہ اگر ایسی قوم پاگل ہو گئی ہے تو خدا تعالیٰ اس کے جنون کو دور کرے اور اگر شرارت کر رہی ہے تو اس کے فتنے کو مٹائے ۔ورنہ اگر یہی حالت رہی تو اتنے فتنے رونما ہوں گے جن کا مٹانا نہ گورنمنٹ کی طاقت میں ہو گا اور نہ پبلک کی طاقت میں ۔“

(خطبات محمود جلد ۱۱ صفحہ ۱۷۵ تا ۱۷۸)

باب ہشتم

ابتر ہونے کا الزام

ابتر ہونے کا الزام اور اس کا جواب

حضرت مسیح موعود علیہ السلام ابتر کے الزام کی حقیقت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

یہ جو اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو فرمایا اِنَّآ اَعۡطَيۡنٰكَ الۡكَوۡثَرَ یہ اس وقت کی بات ہے کہ ایک کافر نے کہا کہ آپ کی اولاد نہیں ہے۔ معلوم نہیں اس نے ابتر کا لفظ بولا تھا جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الۡاَبۡتَرُ۝ تیرا دشمن ہی بے اولاد رہے گا۔

روحانی طور پر جو لوگ آئیں گے وہ آپؐ ہی کی اولاد سمجھے جائیں گے اور وہ آپؐ کے علوم و برکات کے وارث ہوں گے اور اس سے حصہ پائیں گے۔ اس آیت کو مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنۡ رِّجَالِكُمۡ وَلٰكِنۡ رَّسُوۡلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ (الاحزاب:۴۱) کے ساتھ ملا کر پڑھو تو حقیقت معلوم ہو جاتی ہے۔ اگر آنحضرت ﷺ کی روحانی اولاد بھی نہیں تھی تو پھر معاذ اللہ آپ ابتر ٹھہرے ہیں جو آپ کے اعداء کیلئے ہے اور اِنَّآ اَعۡطَيۡنٰكَ الۡكَوۡثَرَ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کو روحانی اولاد کثیر دی گئی ہے پس اگر ہم یہ اعتقاد نہ رکھیں کہ کثرت کے ساتھ آپ کی روحانی اولاد ہوئی ہے تو اس پیشگوئی کے بھی منکر ٹھہریں گے۔

اس لئے ہر حالت میں ایک سچے مسلمان کو یہ ماننا پڑے گا اور ماننا چاہئے کہ آنحضرت ﷺ کی تاثیرات قدسی ابدالآباد کے لئے ویسی ہی ہیں جیسی تیرہ سو برس پہلے تھیں چنانچہ ان تاثیرات کے ثبوت کے لئے ہی خدا تعالیٰ نے یہ سلسلہ قائم کیا ہے اور اب وہی آیات و برکات ظاہر ہو رہے ہیں جو اس وقت ہو رہے تھے۔ (الحکم ۲۴ رمئی ۱۹۰۲ء)

اگر یہ مانا جائے جیسا کہ ہمارے مخالف کہتے ہیں کہ آپؐ کا نہ کوئی جسمانی بیٹا تھا نہ روحانی تو پھر اسی طرح پر معاذ اللہ یہ لوگ آپؐ کو ابتر ٹھہراتے ہیں مگر ایسا نہیں۔ آپ کی شان تو یہ ہے کہ

اِنَّآ اَعۡطَيۡنٰكَ الۡكَوۡثَرَؕ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانۡحَرۡؕ اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الۡاَبۡتَرُ

(الحکم ۱۷ ر اکتوبر ۱۹۰۲ء)

اگر آپؐ کا سلسلہ آپؐ سے ہی شروع ہو کر آپؐ ہی پر ختم ہو گیا تو آپ ابتر ٹھہریں

گے (معاذ اللہ) حالانکہ اللہ تعالیٰ آنحضرت ﷺ کو مخاطب کر کے فرماتا ہے اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ یعنی تجھے تو ہم نے کثرت کے ساتھ روحانی اولاد عطاء کی ہے جو تجھے بے اولاد کہتا ہے وہی ابتر ہے۔ آنحضرت ﷺ کا جسمانی فرزند تو کوئی تھا نہیں اگر روحانی طور پر بھی آپؐ کی اولاد کوئی نہیں تو ایسا شخص خود بتاؤ کیا کہلاوے گا؟ میں تو اس کو سب سے بڑھ کر بے ایمانی اور کفر سمجھتا ہوں کہ آنحضرت ﷺ کی نسبت اس قسم کا خیال بھی کیا جاوے۔ اِنَّاۤ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ کسی دوسرے نبی کو نہیں کہا گیا یہ تو آنحضرتؐ ہی کا خاصہ ہے۔ آپؐ کو اس قدر روحانی اولاد عطاء کی گئی جس کا شمار بھی نہیں ہوسکتا۔ اس لئے قیامت تک یہ سلسلہ بدستور جاری ہے۔ روحانی اولاد ہی کے ذریعہ آنحضرت ﷺ زندہ نبی ہیں کیونکہ آپؐ کے انوار و برکات کا سلسلہ برابر جاری ہے اور جیسے اولاد میں والدین کے نقوش ہوتے ہیں اسی طرح روحانی اولاد میں آنحضرت ﷺ کے کمالات اور فیوض کے آثار اور نشانات موجود ہیں۔ اَلْوَلَدُ سِرٌّ لِاَبِيْهِ۔ (الحکم ۱۰ر نومبر ۱۹۰۵ء)

حضرت مسیح موعود علیہ السلام حقیقۃ الوحی میں ابتر کی حقیقت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

واضح ہو کہ عرب کی زبان میں ابتر کا لفظ ایک وسیع لفظ ہے **لسان العرب** میں لکھا ہے: **البتر استیصال الشیء قطعًا. البتر قطع الذنب و نحوهٗ. الابتر المقطوع الذنب. والابتر من الحيات الذی يقال له الشيطان. لا تبصره حامل الّا اسقطت. وفی الحديث كل امرٍ ذی بال لا يبدء فيه بحمد اللّٰه فهو ابتر. و الابتر الذی لا عقب له وبه فسّر قوله تعالٰى** اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ (الکوثر:۴) **نزلت فی العاص ابن وائل و كان دخل على النبی صلى اللّٰه عليه وسلّم وهو جالس فقال هٰذا الابتر ای هٰذا الذی لا عقب له فقال اللّٰه جلّ ثنائهٗ ان شانئک یا محمد هو الابتر ای المنقطع العقب و جائز ان يكون هو المنقطع عنه كل خيرٍ.**

وفی حديث ابن عباس قال لمّا قدم ابن اشرف مكة. قالت له قريش انت خير اهل المدينة وسيّدهم قال نعم قالوا الا ترىٰ هٰذا الصُّنَير الابيتر عن قومه يزعم انه خير منّا ونحن اهل الحجيج و اهل السدانة واهل السقاية قال

انتم خیر منہ۔ فانزلت اِنَّ شَانِئَکَ ھُوَ الۡاَبۡتَرُ ۔والا بتر المُعدِم. والابتر الخاسِرُ و الا بتر ھوالذی لا عروۃ لہ من المراد والدَّلاءِ۔

ترجمہ: بتر کہتے ہیں ایک چیز کا جڑھ سے کاٹ دینا۔ دوسرے معنی بتر کے یہ ہیں کہ دُم وغیرہ کو کاٹ دینا۔(۱) ابتر اُس کو کہتے ہیں جس کی دُم کاٹی گئی ہو۔(۲) سانپوں کی اقسام میں سے ایک قسم کے سانپوں کا نام ابتر ہے اِس قسم کے سانپ کو شیطان کہتے ہیں اگر حاملہ عورت اُس کو دیکھے تو اُس کا حمل ساقط ہو جاتا ہے(۳) اور حدیث میں ہے کہ ہر ایک امر شاندار جس کو حمد الٰہی سے شروع نہ کیا جاوے وہ ابتر ہے۔(۴) اور ابتر اُس کو بھی کہتے ہیں کہ جو عقب نہ رکھتا ہو یعنی اُس کا کوئی بیٹا نہ ہو یا بیٹے کا بیٹا نہ ہو۔ **لسان العرب** میں لکھا گیا ہے کہ عقب ولد کو بھی کہتے ہیں اور ولد الولد کو بھی کہتے ہیں۔ پس ان معنوں کی رو سے جس کا بیٹا نہیں وہ بھی ابتر ہے اور جس کے بیٹے کے آگے بیٹا نہیں وہ بھی ابتر ہے مگر جس کے کئی بیٹوں میں سے کسی بیٹے کی نسل چل جائے اُس کو ابتر نہیں کہہ سکتے۔ پس جو شخص مر جائے اور ایسا کوئی بچہ نہ چھوڑے اُس کا نام بھی ابتر ہے اور اس کے موافق خدا تعالیٰ کے اس قول کی تفسیر کی گئی ہے کہ اِنَّ شَانِئَکَ ھُوَ الۡاَبۡتَرُ یہ آیت عاص بن وائل کے حق میں نازل ہوئی تھی۔ وہ ایک دن آنحضرت ﷺ کے پاس آیا اور آپ بیٹھے ہوئے تھے۔ پس عاص بن وائل نے آنحضرت ﷺ کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ ابتر ہے یعنی اس کا کوئی لڑکا نہیں ہے اور نہ لڑکے کا لڑکا۔ تب خدا تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ اے محمد جو تیرا بدگو ہے وہی ابتر ہے یعنی مقدّر یوں ہے کہ جس اولاد پر وہ ناز کرتا ہے آخر اُس کی اولاد فنا ہو جائے گی۔ گو اُس کی زندگی میں یا بعد اُس کے۔ اور سلسلہ نسل ختم ہو جائے گا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ عاص بن وائل اولاد رکھتا تھا کیونکہ اگر وہ ابتر یعنی بے اولاد ہوتا تو یہ غیر معقول بات تھی کہ باوجود آپ ابتر ہونے کے آنحضرت ﷺ کا نام ابتر رکھتا۔ پس خدائے تعالیٰ کی طرف سے یہ پیشگوئی تھی کہ انجام کار اس کی نسل قطع ہو جائے گی۔ گو اُس کی زندگی میں ہو یا بعد اُس کے چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ وہ اولاد چھوڑ کر مر گیا تھا لیکن بعد اُس کے اُس کی اولاد کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ کیونکہ اگر اولاد اُس کے روبرو مرتی تو ضرور اُس کا ذکر کیا جاتا۔

اور باقی ترجمہ یہ ہے کہ اس جگہ ابتر کے یہ معنی بھی جائز ہیں کہ ابتر اُس کو کہتے ہیں کہ ہر ایک خیر سے محروم اور بے نصیب ہو اور ابن عباس کی حدیث میں ہے کہ جب ابن اشرف مکہ میں آیا تو اُس کو قریش نے کہا کہ تو سب مدینہ والوں سے بہتر اور اُن کا سردار ہے۔ اُس نے کہا کہ ہاں میں ایسا ہی ہوں تب قریش نے کہا کہ کیا تو اس شخص کی طرف نہیں دیکھتا (یعنی آنحضرت ﷺ کی طرف) یہ ایک کمزور اور ضعیف اور گمنام شخص ہے نہ اس کا کوئی بیٹا اور نہ کوئی بھائی اور نہ کوئی دوستوں کی جماعت اس کے ساتھ ہے بلکہ ایک فرد واحد اکیلی جان ہے اور قوم میں سے کاٹا ہوا ہے یعنی قوم نے بباعث مخالفت مذہب اپنی جماعت میں سے اس کو خارج کر دیا ہے اور فتویٰ دے دیا ہے کہ کوئی اس کے ساتھ میل ملاپ نہ کرے اور نہ کوئی اس کی ہمدردی کرے اور باوجود اس بات کے کہ یہ شخص کچھ بھی عزت نہیں رکھتا اور اس کو کوئی جانتا نہیں کہ کون ہے پھر یہ گمان کرتا ہے کہ ہم سے بہتر ہے۔ لیکن ہم ایک معزز جماعت ہیں تمام حج کرنیوالے ہم میں سے ہیں اور ہم اُن کے سردار ہیں اور خانہ کعبہ کے متولّی اور خادم بھی ہم ہی ہیں اور حاجیوں کو پانی پلانے کا شرف بھی ہمیں ہی حاصل ہے مگر یہ شخص تو کسی شمار میں نہیں۔ جب یہ تمام باتیں ابن الاشرف نے سنیں تو اُس بدبخت نے جواب دیا کہ درحقیقت تم اس شخص سے جو پیغمبری کا دعویٰ کرتا ہے بہتر ہو۔ تب خدا تعالیٰ نے اُس کے حق میں اور قریش کی اُس تمام جماعت کے حق میں جو ابتر کہتی تھی فرمایا کہ اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ یعنی ابن الاشرف نے جو آنحضرت ﷺ کو ابتر کہا اور قریش کے کفار نے بھی ابتر کہا یہ خود ابتر ہیں یعنی ان کی اولاد کا سلسلہ منقطع ہو جائے گا اور ہر ایک خیر و برکت سے محروم مریں گے۔ اس بات کو تو آج تک کوئی ثابت نہیں کر سکا کہ وہ تمام قریش کے لوگ جو آنحضرت ﷺ کو ابتر کہتے تھے اُن کی زندگی میں ہی اُن کے تمام لڑکے مر گئے تھے یا اُن کی اولاد نہیں تھی کیونکہ اگر اُن کی اولاد نہ ہوتی تو آنحضرت ﷺ کو ہرگز وہ لوگ ابتر نہ کہتے۔ یہ بات کوئی عقلمند قبول نہیں کر سکتا کہ ایک شخص خود ابتر ہو کر دوسرے کو ابتر کہے پس ماننا پڑتا ہے کہ اُن کی اولاد موجود تھی اور یہ دوسرا امر کہ پیشگوئی کے مطابق اُن لوگوں کی اولاد اُن کی زندگی میں ہی مر گئی تھی یہ امر بھی قرین قیاس نہیں اور عقل اس کو ہرگز باور نہیں کر سکتی۔ کیونکہ ایسا کہنے والے نہ

ایک نہ دو بلکہ صدہا شریر النفس اور خبیث الطبع آدمی تھے جن کی اولاد کی ہزار ہا تک نوبت پہنچی تھی۔ پس اگر اُن کی زندگی میں ہی اُن کی تمام اولاد مر جاتی تو ملک میں ایک کہرام مچ جاتا۔ کیونکہ معجزہ کے طور پر ہزارہا بچوں کا مر جانا اور پھر لاولد ہونے کی حالت میں ان کے باپوں کا مرنا یہ ایسا معجزہ نہیں تھا جو مخفی رہ سکتا اور ضرور تھا کہ احادیث اور تاریخوں کی کتابوں میں اس کا ذکر ہوتا۔ پس اس سے یقینی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ اکثر اُن کے اولاد چھوڑ کر مر گئے تھے اور بعد میں پیشگوئی کے مطابق آہستہ آہستہ اُن کی نسل منقطع ہو گئی پس قرآن شریف کی یہ پیشگوئی جو قریش کے کافروں کے حق میں تھی یعنی اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ یہ بعینہٖ اسی رنگ کی پیشگوئی ہے جو میں نے خدا تعالیٰ سے الہام پا کر سعد اللہ لودھیانوی کے حق میں کی تھی۔ پس اسی طرح اُس کا ظہور ہوگا جس کے کان سُننے کے ہوں سُنے۔ بقیہ ترجمہ **لسان العرب** کا یہ ہے کہ ابتر مفلس کو بھی کہتے ہیں اور اس شخص کو بھی جو خسارہ میں ہو۔ اور اُن چیزوں کو ابتر کہتے ہیں جو مشکیزہ اور ہوکا وغیرہ میں سے قبضہ نہ رکھتے ہوں۔

(حقیقۃ الوحی، روحانی خزائن جلد ۲۲ صفحہ ۴۳۹۔۴۴۲)

☆

آنحضرتؐ پر کفار نے ابتر ہونے کا الزام لگایا جس کا ردّ سورۃ الکوثر میں اللہ نے فرمایا ہے۔اس کی تفسیر میں حضرت مصلح موعودؓ نے اس اعتراض کے پس منظر اور پھر اس کے جواب کو بیان فرمایا ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

"کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو لوگوں سے کہا کرتے تھے کہ اگر محمد (ﷺ) کی تم مخالفت کرو گے اور اسے مارو پیٹو گے تو خواہ مخواہ لوگوں کی توجہ اُس کی طرف منعطف ہوگی۔ کیونکہ باہر کے لوگ مکہ آتے ہیں جب وہ دیکھتے ہیں کہ تم محمد (ﷺ) کو ایذائیں دیتے ہو، مارتے ہو، پیٹتے ہو تو وہ اس کے متعلق پوچھنے لگ جاتے ہیں اور اس کے معاملہ میں دلچسپی لینے لگ جاتے ہیں۔ اس طرح اُسے اہمیت اور عظمت حاصل ہوتی جا رہی ہے۔ گو اس کی باتیں ہمیں پسند نہیں ہیں۔ گو

اس کی تعلیم سارے عرب کے قومی مذہب کے خلاف ہے مگر مصلحتاً ہمیں اسے کچھ نہیں کہنا چاہئے تا اُسے اہمیت وعظمت حاصل نہ ہو جائے۔ اِن لوگوں میں سے عاص بن وائل بھی تھا جو مکّہ کا ایک بڑا سردار تھا۔ اُس کا بھی یہی خیال تھا کہ مخالفت کی وجہ سے چونکہ محمد رسول اللہ ﷺ کو اہمیت حاصل ہو رہی ہے اور لوگوں کی توجہ ان کی طرف مبذول ہو رہی ہے اس لئے ہمیں مخالفت سے رُک جانا چاہئے اور انہیں کچھ نہیں کہنا چاہئے۔ اگر چہ ہمیں ان کی حرکات پسند نہیں اور اگر چہ ان کی تعلیم ہمارے مذہب کے خلاف ہے۔ مگر پھر بھی مصلحت اِسی میں ہے کہ اُنہیں کچھ نہ کہیں۔ چنانچہ عاص بن وائل کہا کرتا تھا کہ **دَعُوْهُ اِنَّمَا هُوَ رَجُلٌ اَبْتَرُ لَا عَقِبَ لَهٗ لَوْ هَلَكَ انْقَطَعَ ذِكْرُهٗ وَاسْتَرَحْتُمْ مِنْهُ** (البحر المحیط) یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ دو یہ تو ایک ایسا شخص ہے جس کی کوئی نرینہ اولاد نہیں اور نہ ہی اس کا کوئی پیچھے رہنے والا ہے جو اس کی تعلیم کو اس کی وفات کے بعد قائم رکھ سکے۔ اگر یہ وفات پا گیا تو اس کا ذکر خود بخود منقطع ہو جائے گا اور تم اس کے وعظوں اور نصیحتوں سے محفوظ ہو جاؤ گے۔ گویا عاص بن وائل کے نزدیک آپ کی تعلیم ایک جتھہ بندی والی بات تھی اور نرینہ اولاد ہی اس کو قائم رکھنے میں مد ہو سکتی تھی۔ چونکہ رسول کریم ﷺ کی نرینہ اولاد نہیں تھی صرف لڑکیاں ہی لڑکیاں تھیں اور لڑکیوں کی عرب میں کوئی وقعت نہیں سمجھی جاتی تھی۔ عرب لوگ سمجھتے تھے کہ لڑکیاں تو دوسرے خاندانوں میں چلی جائیں گی جہاں وہ اُنہی کی مرضی کے مطابق چلیں گی۔ باپ کی یاد کو قائم رکھنے والے تو اُس کے لڑکے ہی ہوتے ہیں اور محمد رسول اللہ ﷺ کی چونکہ نرینہ اولاد نہیں صرف لڑکیاں ہی لڑکیاں ہیں اِس لئے جب آپ وفات پا جائیں گے تو آپ کی تعلیم بھی ختم ہو جائے گی۔ خواہ مخواہ آپ کی مخالفت کرنے میں آپ کو اہمیت حاصل ہوتی جا رہی ہے۔ انہیں چھوڑ دو۔ وفات کے بعد آپ کا قائم کردہ سلسلہ خود بخود منقطع ہو جائے گا۔ پس مخالفت کر کے آپ کی تعلیم پھیلانے کی کیا ضرورت ہے کیونکہ مخالفت کو دیکھ کر لوگوں کی توجہ خواہ مخواہ اُن کی طرف پھر جاتی ہے۔ اسی وجہ سے عاص بن وائل یہ کہا کرتا تھا کہ آپ ابتر ہیں۔ آپ کی نرینہ اولاد نہیں جو آپ کی وفات کے بعد آپ کے سلسلے کو قائم رکھ سکے۔ مفسّرین کے نزدیک اللہ تعالیٰ نے اُس کے اور اُس کے ہم خیال

لوگوں کی تردید میں ہی یہ سورۃ اُتاری۔

تاریخوں سے یہ بھی ثابت ہے کہ آپ کو ابتر کہنے والا صرف عاص بن وائل ہی نہیں تھا بلکہ اور لوگ بھی تھے جو آپ کو ابتر کہا کرتے تھے۔ابو جہل کے متعلق بھی آتا ہے کہ وہ بھی آپ کو ابتر کہا کرتا تھا۔اس کی وجہ یہ تھی کہ اُن سب کی نرینہ اولاد تھی لڑکے تھے۔لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی لڑکا نہیں تھا۔اور جتھہ بندی کے لحاظ سے عرب میں لڑکے کی قدر ہوتی تھی۔اِن لوگوں کا خیال تھا کہ جب آپ وفات پا جائیں گے تو ساتھ ہی آپ کا قائم کردہ سلسلہ بھی ختم ہو جائے گا۔وہ آپ کے سلسلہ کو عارضی شورش سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ آپ کی مخالفت کی کوئی ضرورت نہیں۔مخالفت سے خواہ مخواہ اس سلسلہ کو ترقی مل رہی ہے۔'' (تفسیر کبیر جلد ۱۰ صفحہ ۲۲۵،۲۲۶)

سورۃ الکوثر کی تفسیر میں فرمایا:

''احادیث میں آتا ہے کہ بعض کفار رسول کریم ﷺ کے متعلق کہا کرتے تھے کہ یہ تو نعوذ باللہ ابتر ہے۔اس کا سلسلہ بہت جلد ختم ہو جائے گا۔اِس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ لیکن چونکہ آپ کی بیٹیاں تھیں بیٹے نہیں تھے۔اس لئے مفسرین کہتے ہیں کہ ابتر اُسے کہتے ہیں جس کا کوئی بیٹا نہ ہو۔لیکن اس کے عام معنے یہی ہیں کہ خواہ بالکل بے اولاد ہو یا نرینہ اولاد سے محروم ہو اُسے ابتر کہتے ہیں تاج العروس جو عربی لغت کی دو بڑی کتابوں میں سے ایک ہے۔اس میں لکھا ہے اَلْاَبْتَرُ الْمُنْبَتِرُ الَّذِیْ لَا وَلَدَ لَهٗ۔ابتر اسے کہتے ہیں جو لا ولد ہونے کی صورت میں وفات پا جائے وَقَدْ یُقَالُ لَمْ یَكُنْ یَوْمًا وُلِدَ لَهٗ۔اور اس شخص کو بھی ابتر سمجھا جاتا ہے جس کی کبھی بھی کوئی اولاد نہ ہوئی ہو۔وَفِیْهِ نَظَرٌ لیکن یہ درست نہیں۔لِاَنَّهٗ وُلِدَ لَهٗ قَبْلَ الْبَعْثِ وَالْوَحْیِ کیونکہ رسول کریم ﷺ کو دشمن ابتر کہتے تھے حالانکہ بعثت اور وحی سے قبل دونوں وقتوں میں آپ کے اولاد پیدا ہوئی تھی۔اِلَّا اَنْ یَّكُوْنَ اَرَادَ لَمْ یَعِشْ لَهٗ وَلَدٌ ذَكَرٌ۔ہاں آپ کی نرینہ اولاد زندہ نہیں رہی تھی۔گویا اگر کسی کی پہلے نرینہ اولاد موجود ہو لیکن بعد میں مر جائے تب بھی وہ ابتر کہلائے گا اور اگر پیدا ہی نہ ہو تب بھی وہ ابتر کہلائے گا۔

ابتر کے معنے اُوپر بتائے جا چکے ہیں کہ جس کی اولاد نہ ہو یا جس کے ہاں کوئی لڑکا نہ ہو۔ چونکہ روایت میں آتا ہے کہ دشمن کے اعتراض کے جواب میں یہ آیت ہے اور دشمن کا اعتراض یہ نہ تھا کہ آپ کی اولاد نہیں بلکہ یہ تھا کہ آپ کے ہاں لڑکا نہیں اس لئے اس آیت میں لڑکے کے معنے ہی کئے جائیں گے اور اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْأَبْتَرُ کے یہ معنے ہوں گے کہ دشمن کہتا ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کے ہاں لڑکا نہیں اور اُس کے ہاں ہے۔ یہ دشمن جھوٹا ثابت ہوگا اور دنیا دیکھ لے گی کہ دشمن تو بغیر بیٹے کے رہے گا اور رسول کریم ﷺ کے ہاں لڑکا ہوگا کیونکہ ''تیرا دشمن ہی بغیر لڑکے کے ہوگا'' کے الفاظ صاف بتاتے ہیں کہ دشمن کے ہاں لڑکا نہ ہوگا اور آپ کے ہاں ہوگا مگر جب ہم واقعات کو دیکھتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم ﷺ کے جتنے دشمن تھے وہ سب صاحبِ اولاد تھے بلکہ اُن کی اولاد کی بھی آئندہ نسلیں چلیں اور اُن میں سے کوئی بھی ابتر نہ رہا۔ ابوجہل کو ہی لو۔ وہ رسول کریم ﷺ کا کتنا شدید دشمن تھا۔ مگر اُس کا لڑکا عکرمہؓ موجود تھا جو جوان ہوا اور اس کی اولاد اب تک موجود ہے۔ مگر وہ ابوجہل کی طرف اپنے آپ کو منسوب نہیں کرتی۔ درمیان میں کسی اولاد کی طرف اپنے آپ کو منسوب کرتی ہے۔ اُس کی اولاد عرب میں بھی پائی جاتی ہے، ہندوستان میں بھی پائی جاتی ہے اور پنجاب کے ضلع سرگودھا میں بھی پائی جاتی ہے۔

پھر آپ کے بڑے دشمن عتبہ اور ولید تھے۔ عتبہ کی اولاد کا مجھے علم نہیں لیکن ولید کے بیٹے حضرت خالدؓ تھے۔ جن پر مسلمان آج تک فخر کرتے ہیں۔ پھر اُن کی بھی آگے اولاد چلی۔ وہ عبدالرحمٰن خالدؓ کا ہی بیٹا تھا جس کو انگریزی کُتب میں سگیشس قاضی لکھا جاتا ہے یعنی عقلمند جج۔ حضرت عبدالرحمٰن بڑے ذہین اور سمجھدار تھے، بڑے دبدبہ والے تھے اور انہوں نے اسلام کی بڑی خدمات سرانجام دی ہیں۔

پھر آپ کا بڑا دشمن عاصی تھا۔ حضرت عمروؓ بن عاص عاصی کے ہی بیٹے تھے جو اسلام کے ایک بڑے جرنیل گزرے ہیں۔ انہوں نے مصر فتح کیا، شام کی لڑائیاں لڑیں اور اپنے پیچھے اولاد چھوڑی۔ آپ کے بیٹے عبداللہؓ رسول کریم ﷺ کے مقرب صحابی تھے اور وہ اپنے باپ سے

بھی پہلے چودہ سال کی عمر میں ایمان لے آئے تھے۔ باپ کفار کی طرف سے لڑائی میں شامل ہوتا تھا تو بیٹا رسول کریم ﷺ کی طرف سے لڑائی میں شامل ہوتا تھا پھر حضرت عبداللہؓ کی بھی آگے اولاد چلی۔ پھر اسلام کے دشمن ابوسفیان کی بھی اولاد تھی۔ آپ کا بیٹا معاویہؓ تھا جس سے بنوامیہ ہوئے جنہوں نے اسپین میں حکومت کی اور اب تک بھی ابوسفیان کی نسل پائی جاتی ہے۔ غرض آپ کے شدید سے شدید دشمن کی بھی اولاد چلی۔ بلکہ جن لوگوں کے متعلق روایت میں یہ آتا ہے کہ انہوں نے آپ کو ابتر کہا وہ بھی صاحب اولاد ہوئے اور اُن کی نسل چلی مگر اُن کے مقابلے میں رسول کریم ﷺ کی کوئی نرینہ اولاد زندہ نہیں رہی بیٹے ہوئے مگر فوت ہو گئے۔ آخری عمر میں ماریہ قبطیہؓ سے حضرت ابراہیم پیدا ہوئے۔ مگر وہ بھی دو سال زندہ رہ کر فوت ہو گئے۔ اب یہ ایک عجیب بات ہے کہ قرآن کریم تو کہتا ہے کہ ہم نے تجھے کوثر عطا فرمایا ہے جس کے نتیجہ میں تیرا دشمن ہی ابتر ہوگا اور اس کی نرینہ اولاد نہیں چلے گی۔ مگر واقعات اس کے خلاف ہیں۔ آپ کے ہر دشمن کے ہاں قریباً لڑکے ہی تھے اور ان کی نسلیں قائم رہیں۔ مگر محمد رسول اللہ ﷺ کا کوئی لڑکا زندہ نہیں رہا اور اس طرح آپ کی جسمانی نسل ختم ہوگئی۔ پس اس آیت پر یہ ایک بڑا بھاری اعتراض پیدا ہوتا ہے اور ایک مسلمان حیران ہوتا ہے کہ اس کا جواب کیا دے۔

اِس اعتراض کے جواب میں یہ امر یاد رکھنا چاہئے کہ اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ دراصل اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ کے مقابلہ میں ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے محمد رسول اللہ ﷺ ہم نے تجھے کوثر عطا کیا ہے۔ پس تُو دعائیں مانگ اور قربانیاں پیش کر۔ اس کے نتیجہ میں تیرا دشمن ہی بے اولاد رہے گا۔ میں بتا چکا ہوں کہ لُغت میں کوثر کے معنے اَلرَّجُلُ الْمِعْطَاءُ کے بھی آتے ہیں جس کے معنے ہیں بڑا سخی آدمی یا صاحب الخیر الکثیر۔ وہ آدمی جس کے اندر بڑی خیر اور برکت پائی جائے۔ پس آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ ہم تجھے ایک بہت بڑی خیر و برکت رکھنے والے اور سخی انسان دینے کی خبر دیتے ہیں۔ اُس انسان کے ملنے کے شکریہ میں تو دعائیں مانگ اور قربانیاں پیش کر اس کے نتیجہ میں تیرا دشمن تو نرینہ اولاد سے محروم رہے گا اور تُو نرینہ اولاد والا ہو جائے گا۔ میں یہ بھی بتا چکا ہوں کہ یہ علامتیں جو یہاں بیان کی گئی ہیں کہ رجل

معطاء ہوگا اور صاحب الخیر الکثیر ہوگا یہ مسیح اور مہدی کی علامات ہیں اور اُسی کے لئے فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ کا حکم ہے۔پس جس طرح میں جسمانی اولاد مراد نہیں بلکہ روحانی اولاد مراد ہے اسی طرح اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ میں بھی جسمانی اولاد مراد نہیں بلکہ روحانی اولاد مراد ہے اور اللہ تعالیٰ اس امر کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ تیرا دشمن اپنے عقائد کو چلانے والی نسل سے ہمیشہ کے لئے محروم رہے گا لیکن تو صاحبِ اولاد ہوگا۔چنانچہ دیکھ لو عکرمہؓ جسمانی طور پر ابو جہل کا بیٹا تھا لیکن وہ مسلمان ہو کر محمد رسول اللہ ﷺ کا بیٹا بن گیا۔گویا بیٹا ہوتے ہوئے بھی ابو جہل یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ میری اولاد موجود ہے۔آخر یہ سوچنے والی بات ہے کہ رسول کریم ﷺ کو ابتر کہنے سے دشمن کی مراد کیا تھی۔اُس کی مراد یہی تھی کہ ہمارے عقائد کو ہمارے بعد قائم رکھنے والی اولاد موجود ہے لیکن محمد رسول ﷺ کی تعلیم کو قائم رکھنے والی اولاد موجود نہیں۔اس لئے اُن کا قائم کردہ سلسلہ جلد ہی تباہ ہو جائے گا۔لیکن جب ابو جہل کا بیٹا عکرمہؓ مسلمان ہو گیا اور اسلام کے لئے اُس نے قربانیاں کیں تو جو دعویٰ ابو جہل نے کیا تھا وہ جھوٹا ہو گیا کیونکہ اس کا اپنا بیٹا محمد رسول اللہ ﷺ کے عقائد کو پھیلانے لگ گیا۔ابو جہل سمجھتا تھا کہ میں مر جاؤں گا تو میرے خیالات اور عقائد کو رکھنے کے لئے اولاد موجود ہے مگر محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم قائم نہیں رہے گی اس لئے آپ کی اولاد موجود نہیں۔مگر جب اُس کا اپنا بیٹا مسلمان ہو گیا تو اس کا یہ دعویٰ غلط ہو گیا۔پھر ولید اسلام کا بڑا دشمن تھا اور وہ سمجھتا تھا کہ میری اولاد میرے عقائد کو قائم رکھے گی لیکن اُس کا بیٹا خالدؓ مسلمان ہو گیا اور اُس نے اسلام کے لئے ایسی شاندار قربانیاں کیں کہ آج بھی ہم بہادری کی مثال دیتے وقت کہتے ہیں کہ تم خالدؓ بنو۔خالدؓ وہی ہے جو ولید کا بیٹا تھا۔وہ ولید جو محمد رسول اللہ ﷺ کی شدید ترین مخالفت کیا کرتا تھا جو آپ پر گند پھینکا کرتا تھا اور جو نماز پڑھتے وقت آپ پر جانوروں کی اوجھریاں ڈال دیتا تھا۔اُس کا اپنا بیٹا رسول کریم ﷺ کا فدائی اور جاں نثار ثابت ہوا۔اور اُس نے ساری عمر اسلام کی خدمت میں بسر کر دی۔جب خالدؓ آپؐ کے متبع ہوئے اور آپ پر قربان اور فدا ہوئے تو گویا خالدؓ آپ کا بیٹا بن گیا اور ولید اولاد سے محروم ہو گیا پھر عاص ہے یہ بڑ ھا رات دن لوگوں کو مسلمانوں کے خلاف اُکساتا رہتا تھا اور اسلام کا

شدید ترین دشمن تھا مگر اُس کے بیٹے حضرت عمروؓ آپؐ پر ایمان لائے اور بڑے پایہ کے صحابیؓ ثابت ہوئے۔ مصر آپ نے ہی فتح کیا تھا اور شام کی لڑائیاں بھی آپ نے ہی لڑیں۔ گویا عاص بے اولاد رہا کیونکہ اُس کی اپنی اولاد محمد رسول اللہ ﷺ کی اولاد بن گئی۔ پھر ابوسفیان تو خود ہی مسلمان ہوگیا تھا اس لئے اُس کی دشمنی کا کوئی سوال ہی نہ رہا۔ اُس کے بیٹے حضرت معاویہؓ تھے وہ بھی اسلام کے بڑے خدمت گزار ثابت ہوئے۔ غرض کو جسمانی اولاد کے لحاظ سے اس آیت کے کوئی معنے نہیں بنتے۔ لیکن اگر روحانی معنے مراد لئے جائیں تو یہ آیت ایک زندہ حقیقت ثابت ہوتی ہے اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ ابوجہل لا ولد تھا۔ کیونکہ اس کے خیالات اور عقائد کو چلانے والی اولاد موجود نہیں تھی۔ ولید لا ولد تھا کیونکہ اس کی اولاد بھی رسول کریم ﷺ کی متبع ہوگئی عاص لا ولد تھا کیونکہ اُس کی اولاد چلی مگر اُس کے عقائد اور خیالات کو اُس نے نہیں پھیلایا بلکہ وہ رسول کریم ﷺ کی تعلیم پھیلانے میں لگ گئی۔ پس یہاں اولاد سے جسمانی اولاد مراد نہیں بلکہ روحانی اولاد ہے۔ اگر جسمانی اولاد مراد لی جائے تو آیت کی دونوں دلالتیں غلط ہو جاتی ہیں۔ کیونکہ اس میں کہا گیا ہے کہ آپ کے دشمن کی نرینہ اولاد نہیں ہوگی حالانکہ اُس کی اولاد تھی اور پھر کہا گیا ہے کہ آپ کی نرینہ اولاد ہوگی حالانکہ آپ کی نرینہ اولاد نہیں تھی۔ لیکن اگر روحانی معنے مراد لئے جائیں تو دونوں باتیں صحیح ہو جاتی ہیں۔ یہ بات بھی صحیح ہو جاتی ہے کہ ابو جہل کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ ولید کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ عاص کی کوئی اولاد نہیں تھی اور یہ بات بھی صحیح ہو جاتی ہے کہ آپ کی روحانی اولاد کا سلسلہ اللہ تعالیٰ نے قائم رکھا۔ عُتبہ کی نسل کے متعلق مجھے اس وقت یاد نہیں کہ اُس کی ظاہری نسل چلی تھی یا نہیں۔ لیکن اگر اُس کی نسل ہوگی بھی تو وہ مسلمانوں میں ہی چھپی ہوگی بہر حال اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں یہ مضمون بیان فرماتا ہے کہ ہم تجھے ایک خیر کثیر رکھنے والا روحانی بیٹا عطا فرمائیں گے جس سے دنیا پر یہ ظاہر ہو جائے گا کہ تُو نہیں بلکہ تیرا دشمن ہی نرینہ اولاد سے محروم ہے۔

یہاں ایک اور بات بھی مدنظر رکھنے والی ہے اور وہ یہ کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ رسول کریم ﷺ کی ازواج مطہرات کو مسلمانوں کی مائیں قرار دیتا ہے۔ جب وہ مومنوں کی

مائیں ہوئیں تو لازماً محمد رسول اللہ ﷺ مومنوں کے باپ ہوئے اور تمام مومن آپ کی اولاد میں شامل ہو گئے۔ اب اولاد میں لڑکیاں بھی شامل ہوتی ہیں اور لڑکے بھی شامل ہوتے ہیں۔ مگر اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ اور اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ میں یہ خبر دی گئی ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کو ہم ایک خیر کثیر رکھنے والا روحانی بیٹا عطا فرمائیں گے اور اس کا دشمن نرینہ اولاد سے محروم ہوگا۔ اب لازماً کوئی ایسا رتبہ اور عہدہ بھی ہونا چاہئے جو اس اولاد کو نرینہ اولاد ثابت کردے اور جس کے وجود سے یہ ثابت ہو جائے کہ رسول کریم ﷺ نرینہ اولاد سے محروم نہ تھے۔ اس نقطہ نگاہ سے جب ہم غور کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ مومن کا عہدہ تو لڑکیوں کے لئے بھی ہے اور لڑکوں کے لئے بھی شہادت اور صدیقیت کے مقامات بھی مرد کی طرح عورتیں بھی حاصل کرسکتی ہیں لیکن نبوت ایک ایسا عہدہ ہے جو کبھی کسی عورت کو نہیں ملا اور یہ مرد کے ساتھ مخصوص ہوتا ہے۔ یہاں چونکہ رسول کریم ﷺ کو ایک بہت بڑے روحانی بیٹے کی خوشخبری دی گئی ہے اس لئے آیت کا یہ مفہوم ہوگا کہ تیرے دشمن کی اولاد کٹ جائے گی لیکن تیری نسل میں سے اللہ تعالیٰ ایک ایسا انسان پیدا کرے گا جو نبوت کے مقام پر فائز ہوگا۔"

(تفسیر کبیر جلد ۱۰ صفحہ ۳۶۷ تا ۳۷۰)

باب نہم

کفار کے بتوں کو تسلیم کرنے

اور

شرکیہ کلمات کہلوانے کا الزام

کفار کے بتوں کو تسلیم کرنے اور شرکیہ کلمات کہلوانے کا الزام

مندرجہ بالا الزام کا رد حضرت مصلح موعودؓ نے سورۃ الحج کی آیت ۵۳ تا ۵۶ کی تشریح میں بیان فرمایا ہے۔ آیت ۵۳ کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

یہ آیت قرآن کریم کی نہایت آسان آیت بھی ہے اور اس کو مفسرین نے خطرناک آیت بھی بنا دیا ہے اور وہ اس طرح کہ وہ اس آیت کو سورۂ نجم کی بعض آیات سے ملا دیتے ہیں اور پھر بعض خیالی دِقتوں کے ذریعہ سے اس کو ایک نہایت ہی خطرناک حربہ اسلام کے خلاف بنا دیتے ہیں۔ حالانکہ سورۂ حج اور سورۂ نجم کا کوئی بھی جوڑ نہیں۔ سورۂ نجم کی جن آیتوں کو ان کے ساتھ ملا کر ایک ہوّا بنا دیا گیا ہے وہ یہ ہیں:

اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى (النجم:۲۰،۲۱)

مفسرین کہتے ہیں کہ رسول کریمؐ ایک دفعہ خانہ کعبہ کے صحن میں آئے اور سب کفار بھی وہاں جمع ہو گئے اور آپ نے یہ آیتیں پڑھنی شروع کیں کہ اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى اور اس کے بعد آپ نے فرمایا وَ تِلْكَ الْغَرَانِيقُ الْعُلٰى وَاِنَّ شَفَاعَتَهُنَّ لَتُرْتَجٰى ۔یعنی یہ تینوں اونچی گردنوں والے دیوتا ہیں اور ان کی شفاعت کی امید کی جاتی ہے۔(نَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنْ تِلْکَ الْخُرَافَاتِ) اس کے بعد جب سورۃ کے آخر تک پہنچے تو آخری آیت یہ تھی فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ وَاعْبُدُوْا (النجم:۶۳) اور تم اللہ کے حضور ہی سجدہ کرو اور اس کی فرمانبرداری کرو۔ چونکہ اس جگہ قرآن کریم میں سجدہ کرنے کا حکم ہے۔ آپ نے اس جگہ سجدہ کیا اور آپ کے ساتھ صحابہؓ نے بھی اور کفار نے بھی سجدہ کیا بلکہ ولید بن مغیرہ جو ایک خطرناک دشمن اسلام تھا اس نے بھی زمین پر سے کنکر اٹھا کر اپنے ماتھے کو لگا لئے گویا سجدہ کر لیا۔ یہ واقعہ جب مکہ میں مشہور ہوا تو ایک شور مچ گیا۔ لوگوں نے کہنا شروع کر دیا کہ سارا مکہ مسلمان ہو گیا ہے کیونکہ

سب کفار نے مسلمانوں کے ساتھ مل کر سجدہ کر لیا ہے۔

مسلمان مفسر کہتے ہیں کہ یہ آیتیں جو آپؐ نے پڑھیں کہ وَ تِلْکَ الْغَرَانِیْقُ الْعُلٰی وَاِنَّ شَفَاعَتَھُنَّ لَتُرْتَجٰی۔ یہ قرآن کا حصہ نہیں تھیں اس لئے اللہ تعالیٰ نے بعد میں ان کو منسوخ کر دیا۔ چنانچہ موجودہ قرآن میں یہ آیتیں نہیں ہیں۔ وہ اس کہانی کی حقیقت یہ بیان کرتے ہیں کہ سورۂ حج میں یہ آیت آتی ہے کہ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ ۚ (الحج:۵۳) یعنی ہم نے تجھ سے پہلے کوئی رسول اور نبی نہیں بھیجا مگر اس کی یہ حالت تھی کہ جب کبھی وہ وحی پڑھتا تھا شیطان اس کی وحی میں اپنی طرف سے کچھ ملا دیتا تھا۔ پھر بعد میں خدا تعالیٰ شیطانی وحی کو منسوخ کر دیتا تھا۔ اسی طرح جب رسول کریم ﷺ نے سورۃ نجم کی آیتیں خانہ کعبہ میں پڑھیں تو شیطان نے (نعوذ باللہ من ذالک) آپؐ کی وحی میں یہ بات ملا دی کہ وَ تِلْکَ الْغَرَانِیْقُ الْعُلٰی وَاِنَّ شَفَاعَتَھُنَّ لَتُرْتَجٰی جب رسول کریم ﷺ کی زبان سے یہ الفاظ نکلے تو مکہ کے کفار نے سمجھا کہ آپؐ نے اپنے دین میں کچھ تبدیلی کر دی ہے اور آپؐ کے ساتھ سجدہ میں شامل ہو گئے۔ جب مکہ میں شور پڑ گیا کہ کفار مسلمان ہو گئے ہیں تو کفار نے کہا کہ ہم نے تو صرف اس لئے سجدہ کیا تھا کہ محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنی تلاوت میں یہ فرمایا تھا کہ وَ تِلْکَ الْغَرَانِیْقُ الْعُلٰی وَاِنَّ شَفَاعَتَھُنَّ لَتُرْتَجٰی جس میں صاف طور پر ہمارے بتوں کو تسلیم کر لیا گیا تھا۔ پس جب محمد رسول اللہ ﷺ نے ہمارے بتوں کو تسلیم کر لیا تو ہم نے بھی جواب میں ان کے خدا کے آگے سجدہ کر دیا۔ جب کفار کا یہ قول مشہور ہوا تو مفسرین کہتے ہیں کہ چونکہ حدیثوں سے ثابت ہے کہ اس وقت کوئی آواز آئی تھی جس میں یہ الفاظ سنے گئے تھے کہ وَ تِلْکَ الْغَرَانِیْقُ الْعُلٰی وَاِنَّ شَفَاعَتَھُنَّ لَتُرْتَجٰی اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت کے یہ معنے ہیں کہ ہر نبی کی زبان پر شیطان کبھی کبھی خدائی منشاء کے خلاف الفاظ جاری کر دیتا تھا۔ لیکن اس آیت میں الفاظ جاری کرنے کا کوئی ذکر نہیں بلکہ آیت کے صرف اتنے معنے ہیں کہ جب کوئی نبی دنیا میں کوئی خواہش

کرتا ہے اور نبی کی خواہش یہی ہوتی ہے کہ دنیا کی اصلاح ہو جائے۔اس وقت شیطان جو اس کی کامیابی کو ناپسند کرتا ہے اس کے راستہ میں روکیں ڈال دیتا ہے۔ اَلْقٰی کے معنے ڈال دینے کے ہوتے ہیں۔پس اَلْقَی الشَّیْطٰنُ فِیْٓ اُمْنِیَّتِہٖ کے یہی معنے ہیں کہ اس کی خواہشوں کے راستہ میں کوئی چیز ڈال دیتا ہے۔اور ظاہر ہے کہ شیطان روک ہی ڈالے گا نبی کی مدد تو نہیں کرے گا۔پس ان الفاظ سے یہ معنے لینا کہ شیطان اس کی زبان پر شرکیہ الفاظ بھی جاری کر دیتا ہے صریح ظلم ہے۔مگر مشکل یہ ہے کہ اوپر کے بیان کردہ واقعہ کی روایت کو بڑے پایہ کے محدّثین نے صحیح تسلیم کیا ہے۔چنانچہ ابن حجرؒ جیسا محدث لکھتا ہے۔ **انّ ثلاثۃ اسانید منھا علی شرط الصحیح** (فتح البیان) یعنی مختلف راویوں سے جو بڑے ثقہ تھے یہ روایت آتی ہے جن میں سے تین روایتیں اتنی معتبر ہیں جتنی بخاریؒ کی۔اسی طرح بزارؒ اور طبرانیؒ نے بھی اسے درست تسلیم کیا ہے۔(ھمیان الزاد) جس کی وجہ سے ہم اس روایت کو کلّی طور پر ردّ نہیں کر سکتے۔

لیکن خدا تعالیٰ نے اپنے فضل سے مجھے اس کا حل سمجھا دیا ہے جو یہ ہے کہ جب مسلمان ہجرت کر کے حبشہ چلے گئے تو مکہ والوں کو ان کا حبشہ جانا بڑا بُرا لگا اور انہوں نے اپنے بعض آدمی نجاشی شاہِ حبشہ کے پاس بھیجے کہ کسی طرح ان کو سمجھا کر واپس مکہ لے آئیں۔(سیرۃ الحلبیہ) اور تاریخوں میں یہ بھی لکھا ہے کہ جس وقت یہ سجدہ والا واقعہ ہوا اس وقت کچھ مہاجرین حبشہ سے لوٹ کر مکہ آگئے۔اور جب ان سے لوگوں نے پوچھا کہ تم لوگ واپس کیوں آگئے ہو تو انہوں نے کہا ہمیں تو یہ اطلاع پہنچی تھی کہ مکہ کے لوگ مسلمان ہو گئے ہیں۔(ابن خلدون)

مکہ کے جو لوگ ان سے ملے تھے انہوں نے کہا کہ مکہ والے تو کوئی مسلمان نہیں ہوئے۔ بات یہ ہے کہ تمہارے رسول نے قرآن کی کچھ آیتیں ایسی پڑھی تھیں جن سے شرک کی تائید ہوتی تھی اس لئے تمہارے رسول کے ساتھ مل کر مکہ والوں نے بھی سجدہ کر دیا مگر جبکہ بعد میں تمہارے رسول نے ان آیتوں کو منسوخ قرار دے دیا تو مکہ والے پھر اپنے دین کی طرف لوٹ آئے۔یہ باتیں سن کر وہ مہاجر پھر واپس حبشہ چلے گئے۔ (سیرۃ الحلبیہ)

سورۂ نجم کی تلاوت کا واقعہ اور مسلمانوں کے حبشہ سے آنے کا واقعہ اتنا قریب ہے کہ خود جغرافیہ اس کو رد کرتا ہے۔مکہ سے اس زمانہ کی بندرگاہ شعیبہ کا فاصلہ کیلئے سوار کے لئے کم از کم چار پانچ دن کا بنتا ہے۔چنانچہ زرقانی میں لکھا ہے **مسافتها طويلة جدًا** کہ مکہ سے شعیبہ کا فاصلہ بہت زیادہ ہے اور وہاں سے حبشہ کی بندرگاہ کا فاصلہ بھی کوئی چار پانچ دن کا بنتا ہے۔کیونکہ اس زمانہ میں لوگ صرف بادبانی کشتیوں میں سفر کرتے تھے اور وہ بھی ہر وقت نہیں چلتی تھیں کیونکہ کوئی جہاز رانی کی کمپنیاں نہیں ہوتی تھیں۔جب کسی ملاح کو فرصت ہوتی تھی وہ اپنی کشتی اُدھر لے آتا تھا جس میں بعض دفعہ مہینوں کا فاصلہ ہو جاتا تھا۔اور حبشہ کی بندرگاہ سے لے کر اس زمانہ کے حبشہ کے دارالحکومت کا فاصلہ کوئی دو مہینہ کا سفر ہے۔گویا اگر یہ خبر سورۂ نجم کی تلاوت کے بعد مکہ سے جاتی اور پھر مسلمان وہاں سے روانہ ہوتے تو مختلف فاصلوں اور دربارِ حبشہ کی اجازت وغیرہ کے زمانہ کو ملا کر کوئی اڑھائی تین ماہ میں لوگ واپس آ سکتے تھے۔مگر وہ سجدہ والے واقعہ کے بعد پندرہ بیس دن کے اندر اندر واپس آ گئے۔کیونکہ مسلمان حبشہ جانے کے لئے رجب میں روانہ ہوئے تھے اور شعبان و رمضان حبشہ میں ٹھہرے اور شوال میں واپس پہنچ گئے (زرقانی) اور حبشہ ٹھہرنے اور واپس مکہ پہنچنے کا کل عرصہ تین ماہ سے بھی کم بنتا ہے۔(سیرۃ الحلبیہ) اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ سورۂ نجم کی تلاوت والا واقعہ بنایا گیا ہے۔یعنی بعض مکہ کے سرداروں نے پہلے سے یہ تدبیر سوچی اور کوئی سوار حبشہ دوڑا دیا کہ مسلمانوں میں جا کر مشہور کر دو کہ مکہ کے لوگ مسلمان ہو گئے ہیں اور انہوں نے محمد رسول اللہ کے ساتھ مل کر سجدہ کیا ہے۔لیکن جب انہوں نے اندازہ کیا کہ اب حبشہ والے آنے ہی والے ہوں گے تو سوچا کہ ہم ان کے آنے پر کیا جواب دیں گے کیونکہ آ کر وہ دیکھیں گے کہ مکہ والے تو ابھی تک کافر ہیں اس لئے یہ مشہور کر دیا کہ سجدہ کرنا (نعوذ باللہ) شرکیہ آیتوں کی وجہ سے تھا۔اور محمد رسول اللہ ﷺ کا ان آیتوں کو منسوخ کرنا جو درحقیقت منسوخ کرنا نہ تھا بلکہ یہ اعلان کرنا تھا کہ ایسی کوئی آیتیں میں نے نہیں پڑھیں، کفارِ مکہ کے واپس کفر پر آ جانے کی وجہ تھا۔

اب یہ تدبیر تبھی کامیاب ہو سکتی تھی جبکہ کوئی شرکیہ آیتیں اس مجلس میں کہلائی جاتیں جس میں آپ نے تلاوت کی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم ﷺ نے نہیں بلکہ کسی خبیث کافر نے اپنے سرداروں کے مشورہ سے پیچھے سے یہ فقرے پڑھ دیئے اور بوجہ اس کے کہ سینکڑوں آدمی موجود تھے اور مکہ کے سارے رؤساء جمع تھے شور میں پہچانا نہیں گیا کہ یہ آواز کس کی ہے اور کفار نے مشہور کر دیا کہ چونکہ محمد رسول اللہ ﷺ نے یہ فقرے کہے ہیں اس لئے ہم نے سجدہ کر دیا تھا۔ جو لوگ مجلس کے کناروں پر بیٹھے تھے انہوں نے بھی چونکہ یہ فقرے اسی مخفی شیطان کے منہ سے سنے تھے جس نے یہ فقرے آپؐ کی تلاوت کے وقت بآواز بلند کہہ دیئے تھے اس لئے ان لوگوں نے بھی یہ خیال کیا کہ شاید محمد رسول اللہ ﷺ نے ہی یہ فقرے کہے ہوں۔ پس اس کہانی کا حل تو یہ ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی تلاوت کے وقت کفار نے پہلے سے سوچ سمجھے ہوئے منصوبہ کے مطابق کسی خبیث سے یہ فقرے بلند آواز سے کہلا دیئے اور ان کی سکیم کا ثبوت یہ ہے کہ مہاجرین حبشہ اس وقت سے پہلے مکہ پہنچ گئے۔ جبکہ سورۂ نجم والے واقعہ کو سن کر وہ مکہ آ سکتے تھے۔ بلکہ اگر اس وقت ہوائی جہاز بھی ہوتے تو جتنے وقت میں وہ آ سکتے تھے اس سے بھی پہلے پہنچ گئے۔ پس ان کا وقت سے پہلے مکہ آ جانا بتاتا ہے کہ وقت سے پہلے ان کو کہلا بھیجا گیا تھا کہ مکہ والے مسلمان ہو گئے ہیں اور عین ان دنوں میں جبکہ وہ سکیم کے ماتحت آ سکتے تھے مکہ والوں نے یہ اوپر کے الفاظ کسی خبیث کے منہ سے بلند آواز سے کہلوا دیئے۔

پھر اگر ان تفسیروں کو نظر انداز کر دیا جائے جو صراحتاً قرآن کریم کے خلاف ہیں تو یہ سورۃ ہی اس واقعہ کی تردید کرتی ہے کیونکہ ان آیتوں سے پہلے جن میں کہا گیا ہے کہ شیطان نے شرکیہ مضمون ملا دیا تھا یہ ذکر ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ نے خدا کو دیکھا ہے بلکہ یہ بھی کہ دو دفعہ دیکھا ہے۔ چنانچہ پہلے فرمایا وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى (النجم:۱۴) یعنی اس نے یقیناً اپنے خدا کو ایک دفعہ اور دیکھا ہے اور پھر فرمایا لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى (النجم:۱۹) محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنے رب کے بڑے بڑے نشانات دیکھے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں کافروں کو کہا

گیا ہے کہ اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى یعنی بتاؤ تو سہی کہ کیا تم نے بھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح اپنے بتوں کا کوئی نشان دیکھا ہے؟ یعنی تم نے نہیں دیکھا مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خدا کے بڑے بڑے نشانات دیکھے ہیں۔ یہ تو شرکیہ آیات سے پہلے کی آیتیں ہیں۔ اور ان شرکیہ آیات کے بعد کی یہ آیت ہے کہ اِنْ هِيَ اِلَّآ اَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ (النجم:۲۴) یعنی یہ بتوں کے نام تو تم نے خود رکھ لئے ہیں خدا تعالیٰ نے اس کے لئے کوئی دلیل نہیں اتاری۔

اب بتاؤ کہ کیا یہ ممکن ہے کہ شرک کے اقرار سے پہلے بھی شرک کی تردید کی آیتیں ہوں اور ان کے بعد بھی شرک کی تردید کی آیتیں ہوں۔ باوجود اس کے کہ کوئی شخص کہہ دے کہ ان دو تردیدوں کے درمیان محمدؐ رسول اللہ کی زبان پر شیطان نے شرک کے کلمات جاری کر دئے تھے۔ شیطان کو تو ہمارے مفسّر عقلمند کہتے ہیں۔ یہاں تک کہ سورۂ بقرہ کی آیات میں شیطان کو فرشتوں کا استاد قرار دیتے ہیں اور شیطان اور خدا تعالیٰ کے مباحثہ میں خدا کو ہرایا گیا ہے۔ مگر اس کہانی والا شیطان تو کوئی گدھا معلوم ہوتا ہے کہ اس کو شرکیہ کلمات کے لئے دو زبردست توحیدی آیات کے درمیان ہی مقام ملا۔ اس شیطان کو تو پاگل خانہ میں داخل کرنا چاہئے۔ ایسا اُلّو خدا کے بندوں کو بہکاتا کس طرح ہے؟

پھر یہ لطیفہ دیکھو کہ یہ سورۃ اس آیت پر ختم ہوئی ہے فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ وَاعْبُدُوْا کہ اے لوگو اللہ کے سامنے سجدہ کرو اور صرف اسی کی عبادت کرو۔ اس آیت کو سن کر کون گدھا تھا جو یہ سمجھتا تھا کہ محمد رسول اللہؐ نے کوئی شرکیہ کلمات کہہ دئے ہیں۔ غرض اس سورۃ کی آیت آیت ہی اس کہانی کو رڈ کر رہی ہے۔ یہ اندرونی شہادت ہے اور بیرونی شہادت یہ ہے کہ مہاجرین حبشہ اس کہانی کو سن کر اس وقت مکّہ میں واپس نہیں آسکتے تھے جس وقت وہ آئے جیسا کہ میں پہلے ثابت کر چکا ہوں۔

اب میں سورۂ حج کی زیرِ تفسیر آیت کو لیتا ہوں جس کی بناء پر اس واقعہ کو جائز قرار دیا گیا ہے

اور بتاتا ہوں کہ اس آیت کا وہ مفہوم نہیں جو مفسّرین نے لیا ہے۔اس آیت کے مفسرین تو یہ معنے کرتے ہیں کہ تجھ سے پہلے جتنے نبی اور رسول گزرے ہیں جب کبھی وہ اپنی وحی کی تلاوت کیا کرتے تھے شیطان ان کی وحی میں کچھ ملا دیا کرتا تھا۔پھر اللہ تعالیٰ شیطان کے ملائے ہوئے کو منسوخ کر دیتا تھا اور اپنی آیات مضبوط کر دیتا تھا۔لیکن یہ معنے بالکل غلط ہیں۔اوّل تو اس لئے کہ تَمَنّٰی کے معنے صرف پڑھنے کے نہیں ہوتے بلکہ ارادہ کرنے کے بھی ہوتے ہیں اور اُمْنِیَۃٌ کے معنے صرف تلاوت کے ہی نہیں ہوتے بلکہ مطلوب ومقصود کے بھی ہوتے ہیں (اقرب)ان دونوں لفظوں کے مذکورہ بالا معنے مدنظر رکھتے ہوئے آیت کے معنے یوں ہوں گے کہ ''ہم نے تجھ سے پہلے کوئی رسول اور نبی نہیں بھیجا مگر جب بھی وہ کوئی ارادہ کرتا تھا شیطان اس کے ارادہ میں کچھ ڈال دیتا تھا۔پھر اللہ تعالیٰ شیطان کے ڈالے ہوئے کو راستے سے ہٹا دیتا ہے اور اپنے نشانوں کو قائم کر دیتا ہے''ان معنوں کو دیکھو تو پتہ لگ جائے گا کہ مفسرین کے معنے یہاں چسپاں ہی نہیں ہو سکتے۔ان معنوں کی روسے اس آیت کے معنے صرف یہ بنتے ہیں کہ کوئی رسول اور نبی نہیں گزرا جس کے ارادوں یعنی شرک کے تباہ کرنے کے ارادوں کو ناکام رکھنے کے لئے شیطان کوئی روکیں نہ ڈالتا ہو۔لیکن نبیوں کے مطلوب ومقصود کو ناکام کرنے کیلئے شیطان خواہ کتنی کوششیں کرے اور ان کے راستہ میں کتنی مشکلات بھی ڈالے اللہ تعالیٰ شیطان کی ڈالی ہوئی مشکلات کو ان کے راستہ سے ہٹا دیتا ہے اور نبیوں کو کامیاب بنانے کے لئے جن نشانوں کی خبر دیتا ہے ان کے پورا ہونے کے سامان پیدا کر دیتا ہے۔سو اس طرح نبی جیت جاتے ہیں اور شیطان ہار جاتا ہے۔اب جو تاریخی واقعات ہیں ان سے بھی لوگ سمجھ سکتے ہیں کہ آیا جو مفسّرین نے معنے کئے ہیں وہ واقعات کے مطابق ہیں یا جو ہم نے معنے کئے ہیں وہ واقعات کے مطابق ہیں۔تفسیری معنوں کے مطابق محمد رسول اللہ ﷺ کو ہارنا چاہئے تھا اور شرک کو غالب آجانا چاہئے تھا۔لیکن ہوا یہ کہ محمد رسول اللہ ﷺ نے خانہ کعبہ میں رکھے ہوئے بتوں کو اپنے ہاتھ سے توڑا اور شرک ہمیشہ کے لئے مٹ گیا۔

پس آج تک کوئی بھی نبی اور رسول ایسا نہیں آیا جس کے ہر مقصد اور ہر مدعا اور ہر خواہش اور ہر تڑپ کے آگے شیطان نے روکیں نہ ڈالی ہوں کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اگر نبی کامیاب ہو گیا تو پھر میرا ٹھکانا کہیں نہیں۔ جس طرح مرتا ہوا آدمی پورا زور لگاتا ہے کہ وہ کسی طرح موت کے پنجے سے نکل جائے اسی طرح شیطان اور اس کی ذریت انبیاء اور ان کی جماعتوں کے خلاف پورا زور لگاتی ہے۔ جنہوں نے مرنے والوں کو دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ اس بے ہوشی میں بھی جس میں دنیا و مافیھا کی اسے کوئی خبر نہیں ہوتی جبکہ ساری طاقت زائل ہو چکی ہوتی ہے اور تمام قوت خرچ ہو چکی ہوتی ہے۔ مرنے سے چند منٹ پہلے مرنے والا اس طرح زور لگاتا ہے کہ گویا وہ پھر اس دنیا میں واپس آنا چاہتا ہے۔ اس کا سارا جسم ہل جاتا ہے، گردن اُٹھ جاتی ہے اور وہ اپنی طاقت کا آخری ذرّہ تک اس کے لئے خرچ کر دیتا ہے کہ بچ جاؤں۔ یہ اس انسان کی حالت ہوتی ہے جو بے ہوشی میں ہوتا ہے۔ جس کی طاقت خرچ ہو چکی ہوتی ہے۔ جو سُوکھ کر کانٹا ہو چکا ہوتا ہے۔ پھر اس کی کیا حالت ہوگی جو بے ہوش نہ ہو اور جس کی طاقت خرچ نہ ہوئی ہو۔ ایک چھوٹے بچے کو ہی کنوئیں میں ڈراوے کے طور پر دھکیل کر دیکھ لو کس طرح وہ چمٹ جاتا ہے اور عام طاقت سے آٹھ دس گُنے زیادہ طاقت اس میں پیدا ہو جائے گی۔ ایک ایسا آدمی جسے کشتی میں پہلوان ایک منٹ میں گرا سکتا ہے اس کے متعلق پہلوان سے کہو کہ اسے کنوئیں میں گرا کر دیکھے تو ایک منٹ چھوڑ ایک گھنٹے میں بھی نہیں گرا سکے گا۔ اس لئے کہ کشتی میں تو وہ سمجھتا ہے مقابلہ ہے اگر گر بھی گیا تو کیا ہوا۔ مگر جب وہ یہ سمجھے کہ موت آنے لگی ہے تو اپنی ساری طاقت خرچ کرے گا اور اتنا زور لگائے گا کہ اوّل تو زبردست کے برابر ہو جائے گا ورنہ اس کے قریب قریب رہے گا۔

جب خدا تعالیٰ کی طرف سے دنیا میں کوئی سلسلہ قائم کیا جاتا ہے تو اس وقت ایسی ارواح خبیثہ جو شیطان سے تعلق رکھتی ہیں یا بعض گناہوں کی وجہ سے شیطان نے ان پر تصرف پایا ہوا ہوتا ہے جوش میں آجاتی ہیں اور سارا زور اس بات کے لئے صرف کرتی ہیں کہ کسی طرح سچائی دنیا میں نہ پھیلے۔ یہ لوگ جو الٰہی سلسلوں کے مقابلہ میں کھڑے ہوتے ہیں کبھی تو ایسے ہوتے ہیں

جو ان سلسلوں میں نام کے لحاظ سے شامل ہوتے ہیں جیسے عبداللہ بن ابی ابن سلول اور اس کے ساتھ تعلق رکھنے والے۔ اور کبھی ایسے ہوتے ہیں جو نام کی طرف تو منسوب ہوتے ہیں لیکن نظام کی طرف منسوب نہیں ہوتے ہیں جیسے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں خوارج تھے اور کبھی ایسے لوگ ہوتے ہیں جو نہ نام کی طرف منسوب ہوتے ہیں اور نہ نظام کے لحاظ سے کوئی تعلق رکھتے ہیں۔ جیسے مکّہ کے کفار اور یہود اور نصاریٰ۔ یہ سب لوگ مل کر ان مقاصد میں روک بننا چاہتے ہیں جن کو پورا کرنے کے لئے خدا تعالیٰ کے انبیاء دنیا میں مبعوث ہوتے ہیں اور ہر قسم کی مشکلات ان کے راستے میں کھڑی کر دیتے ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ اپنے نشانات کے ساتھ نبیوں کی تائید کرتا اور شیطان کو اس کے تمام منصوبوں میں ناکام کر دیتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ جس طرح شکاری کتّے کو اگر کسی چور کے کپڑے کی خوشبو سونگھا کر چھوڑ دیا جائے تو وہ دس بیس بلکہ سو میل تک بھی پیچھے جا کر اسے پکڑ لیتا ہے۔ اسی طرح شیطان کو بھی تقدس کی خوشبو سے دشمنی ہے اور جس میں سے اسے یہ خوشبو آئے اس پر وہ دیوانہ وار حملہ کرتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ جس سے تقدّس کی خوشبو آتی ہے اسے چیر ڈالے۔ جب آدمؑ نے خدا تعالیٰ سے تقدّس کی خوشبو پائی تو وہ حضرت آدم علیہ السلام کے پیچھے دوڑا۔ پھر حضرت نوح علیہ السلام آئے اور انہوں نے خوشبو پائی تو وہ ان کے پیچھے دوڑا۔ پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام آئے اور ان کے ذریعہ سے خوشبو پھیلی تو وہ ان کے پیچھے دوڑ پڑا۔ پھر حضرت رام، حضرت کرشن، حضرت زرتشت، حضرت عیسیٰؑ اور حضرت محمد مصطفی ﷺ آئے تو ان کے پیچھے دوڑ پڑا۔ اگر ان سب میں ایک ہی قسم کی خوشبو نہ ہوتی تو ان پر شیطان کا حملہ بھی ایک رنگ میں نہ ہوتا۔ چونکہ ان کی خوشبو ایک ہی طرح کی تھی اور وہ توحید کی خوشبو تھی اس لئے شیطان نے ان کے زمانوں میں حملہ بھی ایک ہی رنگ میں کیا۔ مگر فرماتا ہے:۔

فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ

(الحج:۵۳)

اللہ تعالیٰ شیطان کی تمام روکوں کو مٹا دیتا ہے اور اس تعلیم کو قائم کر دیتا ہے جو اس کی طرف

سے آتی ہے۔اور اللہ تعالیٰ بڑا جاننے والا اور حکمت والا ہے۔

سورۃ الحج کی آیات ۵۴ تا ۵۶ کی تشریح میں حضرت مصلح موعودؓ نے فرمایا:

اب سوال پیدا ہوتا تھا کہ اللہ تعالیٰ شیطان کو نبیوں کے راستہ میں کیوں روکیں ڈالنے دیتا ہے۔اس کا جواب دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم ایسا اس لئے کرتے ہیں تا کہ ان شیطانی فتنوں کے ذریعہ نبیوں کی جماعتیں ہر قسم کی منافقت اور بے ایمانی رکھنے والوں سے پاک ہو جائیں اور دشمنوں کی عداوت لوگوں پر ظاہر ہو جائے۔جب شیطان روکیں پیدا کرتا ہے تو جن لوگوں کے دلوں میں بدی ہوتی ہے اور جن کے قلوب سخت ہوتے ہیں وہ اس کی بات مان لیتے ہیں اور بلا وجہ مومنوں پر ظلم کرنے لگ جاتے ہیں۔پس کمزور ایمان والوں کی کمزوری اور دشمنوں کی دشمنی دونوں ظاہر ہو جاتی ہیں اور پتہ لگ جاتا ہے کہ اسلام کے دشمن ضد اور مخالفت میں کس قدر بڑھے ہوئے ہیں۔اور یہ بھی پتہ لگ جاتا ہے کہ اسلام پر سچا ایمان لانے والے لوگ شریروں کی شرارتوں سے ڈرتے نہیں بلکہ ایمان میں اور بھی بڑھتے ہیں۔اور اس طرح مومنوں کو اللہ تعالیٰ ہدایت میں بڑھاتا چلا جاتا ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ قانون بیان فرمایا ہے کہ جب بھی کوئی نبی آتا ہے اور وہ لوگوں کی اصلاح کی تجاویز کرتا ہے تو شیطان اس کے راستہ میں روکیں ڈالنی شروع کر دیتا ہے مگر اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ منافق اور کمزور ایمان لوگ الگ ہو جاتے ہیں۔اور خدا تعالیٰ اپنے سلسلہ کی مضبوطی اور اس کی عظمت کو اور بھی بڑھا دیتا ہے۔اب ان معنوں پر غور کرو اور دیکھو کہ یہ معنے تمام نبیوں کو عموماً اور محمد رسول اللہ ﷺ کو خصوصاً کس طرح شیطان کے تصرّف سے محفوظ رکھتے ہیں بلکہ الٹا یہ بتاتے ہیں کہ نبیوں پر شیطان کا تصرّف تو الگ رہا شیطان ان سے ماریں کھاتا ہے۔اور جب ہم قرآن کریم کی یہ آیت مدّنظر رکھیں کہ اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ (بنی اسرائیل:٦٦) کہ میرے بندوں پر تجھے کبھی غلبہ نصیب نہ ہوگا تو میرے کئے ہوئے معنے ہی ٹھیک ثابت ہوتے ہیں اور مفسّرین کے کئے ہوئے معنے غلط ثابت ہوتے ہیں۔کیونکہ کسی نبی کی

زبان پر شیطان کا قبضہ خصوصاً وحی کی تلاوت کے وقت تو اتنا بڑا ''سُلْطٰنٌ'' ہے کہ جس کی مثال دنیا میں نہیں پائی جاتی ۔ہم تو معمولی انسانوں کو دیکھتے ہیں کہ حکومتیں ان پر کتنا ہی جبر کریں وہ ان کے خلاف نعرے لگاتے جاتے ہیں ۔پھر یہ کہنا کہ محمد رسول اللہ ﷺ جو سب نبیوں کے بھی سردار تھے شیطان نے ان کی زبان پر تصرّف کر لیا اور نعوذ باللہ ان کے منہ سے شرکیہ کلمات نکلوا دیئے ۔یہ تو سورۂ بنی اسرائیل والی آیت کی صریح تردید ہے اور قرآن کریم کی کوئی آیت دوسری آیت کی تردید نہیں کر سکتی ۔چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ۔اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ وَلَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰہِ لَوَجَدُوْا فِیْہِ اخْتِلَافًا کَثِیْرًا

(النساء:۸۳)

یعنی کیا وہ قرآن پر غور نہیں کرتے اگر یہ خدا تعالیٰ کے سوا کسی اور کا کلام ہوتا تو اس میں عظیم الشان اختلاف پائے جاتے ۔بعض لوگ غلطی سے سمجھتے ہیں کہ اس آیت میں چونکہ کَثِیْراً کا لفظ ہے اس لئے اس کے معنے یہ ہیں کہ خدا تعالیٰ کے سوا دوسروں کے کلام میں بہت سے اختلاف پائے جاتے ہیں لیکن خدا کے کلام میں بہت سے اختلاف نہیں پائے جاتے ۔چونکہ یہاں کَثِیْراً کا لفظ ہے اس لئے یہ آیت اختلاف کو ردّ نہیں کرتی ۔مگر کثیر کے معنے عربی زبان میں عظیم الشان کے بھی ہوتے ہیں ۔چنانچہ مفردات میں لکھا ہے:وَلَیْسَتِ الْکَثْرَۃُ اِشَارَۃٌ اِلَی الْعَدَدِ فَقَطْ بَلْ اِلَی الْفَضْلِ. (مفردات)یعنی قرآن شریف میں بعض جگہ جو کثیر کا لفظ استعمال ہوا ہے اس کے صرف یہ معنے نہیں کہ تعداد میں زیادہ بلکہ مطلب یہ ہے کہ شان میں بڑا اور قرآن کریم میں یہ اختلاف ماننا کہ ایک طرف تو وہ یہ کہتا ہے کہ میرے نیک بندوں پر شیطان کو کبھی تصرّف نہیں ہوگا اور دوسری طرف وہ یہ بھی کہتا ہے کہ ہر نبی اور رسول پر شیطان کو تصرّف دیا گیا تھا ۔وہ اس کی وحی میں اپنی طرف سے کچھ ملا دیتا تھا ۔یہ اتنا بڑا اختلاف ہے کہ جس سے بڑا اختلاف قیاس کرنا بھی مشکل ہے ۔پس سورۂ نساء کی آیت کے مطابق اس کے ایسے معنے کرنے بالکل باطل اور غلط ہیں اور قرآن کریم کی تعلیم کے صریح خلاف ہیں ۔''

(تفسیر کبیر جلد۶ صفحہ ۶۷ تا ۷۵)

☆

سورۃ الشعراء آیت ۲۱۱ تا ۲۱۴ کی تفسیر میں حضرت مصلح موعودؓ آنحضرتؐ پر شیطانی وحی کے اعتراض کی تردید کرتے ہوئے بیان فرماتے ہیں:

''ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے کفار کے ایک اعتراض کی تردید فرمائی ہے ان کا اعتراض یہ تھا کہ اس شخص کے ساتھ شیطان کا تعلق ہے اور اس کی طرف سے اس پر کلام نازل ہوتا ہے۔ چنانچہ کو قرآن کریم نے ان کے اس اعتراض کی طرف قرآن کریم کے مختلف مقامات میں اشارات ضرور پائے جاتے ہیں۔ مثلاً اللہ تعالیٰ سورۂ تکویر میں فرماتا ہے۔ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ۔ (التکویر:۲۶) یعنی اس رسول ﷺ پر نازل ہونے والا کلام کسی دھتکارے ہوئے شیطان کا قول نہیں۔ اسی طرح زیر تفسیر آیات میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَمَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيٰطِيْنُ شیطانوں نے اس کلام کو نہیں اُتارا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار کا ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ اس پر شیطان نازل ہوتا ہے افسوس ہے کہ بعض مسلمان مفسرین نے اس قول کو اور بھی پکا کر دیا اور کفار کے ہاتھوں میں انہوں نے ایک خطرناک ہتھیار دے دیا اور وہ اس طرح کہ وہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ کفار مکہ کے سردار رسول کریم ﷺ کے پاس آئے اور انہوں نے کہا کہ آپؐ کے ماننے والے تو ادنیٰ لوگ ہیں۔ اگر آپؐ دین میں کچھ نرمی کر دیں تو ہم لوگ بھی آپؐ کے پاس آ کر بیٹھا کریں۔ اسی طرح دوسرے لوگ بھی آپؐ کے پاس آنے لگیں گے۔ اتنے میں آپ نماز پڑھنے لگے۔ جب آپؐ نے یہ آیت پڑھی کہ اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى کہ تم بھی ذرا لات اور عزّیٰ کا حال سناؤ اور تیسرے مناۃ کا بھی جو ان کے علاوہ ہے۔ تو شیطان نے آپ کی زبان پر یہ کلمات جاری کر دیئے کہ تِلْكَ الْغَرَانِيْقُ الْعُلٰى وَاِنَّ شَفَاعَتَهُنَّ لَتُرْتَجٰى۔ یعنی یہ لمبی گردنیں رکھنے والے بت بڑی اعلیٰ شان کے مالک ہیں اور ان کی شفاعت کی یقینی طور پر امید کی جا سکتی ہے۔ کفار نے یہ بات سنی تو وہ بڑے خوش ہوئے۔ چنانچہ جب آپؐ نے سورۃ ختم کی اور سجدہ کیا تو سب کفار نے بھی آپؐ

کے ساتھ سجدہ کر دیا۔ کیونکہ انہوں نے سمجھا کہ آپؐ نے دین میں نرمی کر دی ہے۔ اس روایت کو اتنے طریقوں سے بیان کی گیا ہے کہ ابن حجرؒ جیسے آدمی بھی کہتے ہیں کہ اس کی تاویل کی ضرورت ہے۔ میں اس وقت اس کی تاویل میں نہیں پڑتا کیونکہ اس پر تفصیلی بحث سورۃ حج میں گزر چکی ہے۔ میں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ کیا واقعہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسا ہوا۔ مجھے قاضی عیاض کا یہ قول بے انتہا پسند ہے کہ بعض محدثین کی قلم سے شیطان نے یہ حدیث لکھوا دی ہے گویا اگر شیطان کا تسلط تسلیم ہی کرنا ہے تو کیوں نہ اس کا تسلط محدثین پر تسلیم کرلیا جائے۔ یہ تو قاضی عیاض کا جواب ہے۔ قرآنی جواب یہ ہے کہ تِلْكَ الْغَرَانِيقُ الْعُلىٰ وَاِنَّ شَفَاعَتَهُنَّ لَتُرْتَجىٰ کا فقرہ جہاں جہاں بیان کیا جاتا ہے۔ اس کے معاً بعد یہ آیت آتی ہے کہ اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى۝ تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى۝ اِنْ هِيَ اِلَّآ اَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ

(النجم: ۲۲-۲۴) یعنی کیا تمہیں تو اپنے لئے بیٹے پسند اور خدا تعالیٰ کے لئے تم لڑکیاں تجویز کر رہے ہو۔ یہ تقسیم تو نہایت ہی ناقص اور ظالمانہ تقسیم ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ صرف چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے رکھ لئے ہیں ورنہ اللہ تعالیٰ نے ان بتوں کی تائید کے لئے کوئی دلیل نازل نہیں کی۔ اب بتاؤ کہ کیا اس فرضی کلام کے بعد جو محمد رسول اللہ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے کوئی شخص ان آیتوں کا منکر یہ خیال بھی کر سکتا تھا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عقائد میں نرمی اختیار کر لی ہے اور اس پر کوئی بے وقوف سے بے وقوف مشرک بھی سجدہ کر سکتا تھا۔ پس یہ آیات ہی بتا رہی ہیں کہ ان میں وہ فقرے داخل ہی نہیں ہو سکتے تھے جو بتوں کی تعریف میں بیان کئے جاتے ہیں۔ آخر کفار عربی تو جانتے تھے کیا وہ اتنا بھی نہیں سمجھ سکتے تھے کہ اس سورۃ کے تو لفظ لفظ میں شرک کی مذمت کی گئی ہے پھر یہ کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ آپؐ نے اپنے دینی عقائد میں نرمی اختیار کر لی ہے۔ یہی مضمون زیر تفسیر آیات میں بیان کیا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ کفار کا یہ الزام کہ اس شخص پر شیطان کلام نازل کرتا ہے درست نہیں کیونکہ

(الف)اس شخص کا اپنا چال چلن ایسا اعلیٰ اور پاکیزہ ہے کہ ایسے آدمیوں کا شیطان سے کوئی تعلق ہو ہی نہیں سکتا۔(ب) پھر جو تعلیم اس پر نازل ہوئی ہے وہ ایسی مطہر اور پاک ہے کہ ناپاک شیطان اس تعلیم کو اتار ہی نہیں سکتا۔آخر یہ کس طرح ممکن ہے کہ شیطان کے خلاف تعلیم ہے تو یہ کلام اس کی طرف سے کیسے نازل ہو سکتا ہے۔(ج) اس کتاب میں آسمانی علوم ہیں اور اس میں شیطانی کلام کا اس قدر ردّ ہے کہ اگر شیطان یا اس کے ساتھی اس میں کچھ ملانا بھی چاہیں تو نہیں ملا سکتے کیونکہ کہیں کوئی عبارت چھپ ہی نہیں سکتی اور پھر وہ آسمانی علوم کے بیان کرنے کی طاقت بھی نہیں رکھتے کیونکہ اِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ خدا تعالیٰ نے انہیں آسمان کی باتیں سننے سے محروم کیا ہوا ہے گویا آسمان پر جا کر باتیں سننا تو الگ رہا وہاں تک کسی کے جانے کی طاقت بھی قرآن کریم نے تسلیم نہیں کی مگر عجیب بات یہ ہے کہ بعض مسلمان یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ شیطان آسمان پر جاتا ہے اور وہ ملاءِ اعلیٰ اور جبریلؑ اور عرش کی باتوں کو سن کر زمین پر آجاتا ہے اور پھر وہ اپنے چیلے چانٹوں کو وہ خبریں بتاتا پھرتا ہے۔ حالانکہ خدا تعالیٰ یہ فرماتا ہے کہ شیطان آسمانی کلام سننے کی طاقت ہی نہیں رکھتا۔خدا تو خدا ہے۔اس دنیا کی معمولی معمولی بادشاہوں کے پاس بھٹکنے کی بھی لوگوں میں طاقت نہیں ہوتی اور وہ ان کے قریب جانے سے لرزتے اور گھبراتے ہیں۔پھر یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ زمین و آسمان کے خدا کے راز شیطان اچک کر لے آئے۔ اور وہ انہیں بگاڑ کر دنیا میں پھیلانا شروع کر دے۔غرض قرآن کریم کفار کے اس الزام کی تردید کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ شیاطین نے اس کلام کو نازل نہیں کیا اور یہ کام نہ ان کے مناسب حال تھا اور نہ وہ اس کی طاقت رکھتے تھے۔یعنی قرآن کریم میں تو وہ وہ نصیحتیں ہیں جو شیطانی تعلیموں کے بالکل خلاف ہیں۔پھر یہ کس طرح تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ شیطان نے خود اپنے خلاف محمد رسول اللہؐ پر تعلیم نازل کر دی۔یہ دلیل حضرت مسیحؑ نے بھی انجیل میں استعمال کی ہے۔چنانچہ لکھا ہے کہ:

”پھر وہ ایک گونگی بدروح کو نکال رہا تھا۔ اور جب وہ بدروح نکل گئی تو ایسا ہوا کہ گونگا بولا

اور لوگوں نے تعجب کیا لیکن ان میں سے بعض نے کہا۔ یہ تو بدروحوں کے سردار بعلزبول کی مدد سے بدروحوں کو نکالتا ہے۔ بعض اور لوگ آزمائش کے لئے اس سے آسمانی نشان طلب کرنے لگے۔ مگر اس نے ان کے خیالات کو جان کر ان سے کہا جس سلطنت میں پھوٹ پڑے وہ ویران ہو جاتی ہے اور جس گھر میں پھوٹ پڑے وہ برباد ہو جاتا ہے اور اگر شیطان بھی اپنا مخالف ہو جائے تو اس کی سلطنت کس طرح قائم رہے گی کیونکہ تم میری بابت کہتے ہو کہ یہ بدروحوں کو بلعزبول کی مدد سے نکالتا ہے۔"

(لوقا باب ۱۱ آیت ۱۴ تا ۱۸)

اسی طرح متی میں لکھا ہے کہ حضرت مسیحؑ نے ان سے کہا۔ "اگر شیطان ہی نے شیطان کو نکالا تو وہ آپ اپنا مخالف ہو گیا۔ پھر ان کی بادشاہی کس طرح قائم رہے گی۔"

(متی باب ۱۲ تا ۲۶)

قرآن کریم بھی یہی دلیل مخالفوں کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اور انہیں توجہ دلاتا ہے کہ اگر تمہارا یہ اعتراض صحیح ہو کہ شیطان نے یہ کلام نازل کیا ہے تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ شیطان نے اپنا بیڑا آپ غرق کر لیا۔ کیونکہ اس کتاب کے لفظ لفظ میں شیطان کو دھتکارا گیا ہے اور اس کی ایک ایک تعلیم میں اس پر پھٹکار ڈالی گئی ہے۔ اب یہ کس طرح تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ شیطان نے خود اپنے خلاف اتنا بڑا مواد فراہم کر دیا۔ یہ تو عقل کے بالکل خلاف ہے۔

اسی طرح وَمَا يَسْتَطِيْعُوْنَ میں جو دلیل استعمال کی گئی ہے کہ اس قرآن میں تو غیب کی خبریں ہیں اور غیب کی خبریں بیان کرنا شیطان کے اقتدار سے باہر ہے۔ اسے بھی انجیل میں استعمال کیا گیا ہے اور حضرت مسیحؑ نے واضح کیا ہے کہ علم غیب صرف خدا تعالیٰ کو حاصل ہے اور شیاطین تو الگ رہے فرشتے بھی اس کے رازوں سے آگاہ نہیں چنانچہ ایک دفعہ حضرت مسیحؑ نے جب اپنی آمد ثانی کی علامات بتائیں تو اس کے ساتھ ہی آپ نے اس امر کی بھی وضاحت فرما دی کہ گو میری یہ باتیں کبھی نہیں ٹلیں گی۔ "لیکن اس دن اور اس گھڑی کی بابت کوئی نہیں جانتا۔ نہ

آسمان کے فرشتے نہ بیٹا، مگر صرف باپ ۔جیسا نوح کے دنوں میں ہوا ویسا ہی ابن آدم کے آنے کے وقت ہوگا۔کیونکہ جس طرح طوفان کے پہلے سے دنوں میں لوگ کھاتے پیتے اور بیاہ شادی کرتے تھے اس دن تک کہ نوح کشتی میں داخل ہوا۔اور جب تک طوفان آکر ان سب کو بہانہ لے گیا ان کو خبر نہ ہوئی اسی طرح ابن آدم کا آنا ہوگا۔" (لوقا باب ۲۴ آیت ۳۶ تا ۴۰)

غرض محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک اور بے عیب زندگی اور آپؐ کی تعلیم کا پاک اور مطہر ہونا اور پھر قرآن کریم میں آسمانی علوم اور غیب کی خبروں کا بکثرت اظہار اور شیاطین کا آسمانی علوم کے بیان کرنے کی طاقت ہی نہ رکھنا بتا رہا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جو یہ الزام لگایا جا رہا ہے کہ آپؐ کے ساتھ شیطان کا تعلق ہے اور اس نے آپؐ پر یہ کلام نازل کر دیا ہے سراسر غلط اعتراض ہے ۔محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا شیطان سے نہیں خدا سے تعلق ہے اور اسی نے آپؐ پر یہ کلام نازل فرمایا ہے۔" (تفسیر کبیر جلد ۷ ص ۲۷۴ تا ۲۷۷)

☆

پروفیسر رام دیو نے اپنے ایک لیکچر میں سید امیر علی صاحب کی کتاب "سپرٹ آف اسلام" کے حوالہ سے یہ اعتراض کیا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار مکہ کے تین بتوں کو مان لیا تھا۔اس اعتراض کے رد میں حضرت مصلح موعودؓ بیان فرماتے ہیں:

"ایک حوالہ جو "سپرٹ آف اسلام" سے پروفیسر رام دیو صاحب نے دیا ہے یہ کہ سید امیر علی صاحب نے لکھا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کفار مکہ نے کہا کہ وہ ان کے تین بتوں کو مان لیں تو وہ بھی ان کے خدا کو مان لیں گے۔تو آپ نے کچھ دن کے لئے بتوں کو مان لیا۔مجھے نہایت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ سید امیر علی صاحب پر یہ اتہام ہے کہ ان پر اور ہزار الزام لگ سکتے ہوں مگر یہ الزام ان پر نہیں لگ سکتا۔انہوں نے ہرگز اپنی کتاب میں یہ نہیں لکھا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار کے کہنے پر بتوں کو مان لیا تھا۔بلکہ اس مضمون پر انہوں نے اپنی طرف سے کچھ لکھا ہی نہیں۔یہ واقعہ جس کی طرف پروفیسر رام دیو صاحب نے اشارہ کیا ہے

''سپرٹ آف اسلام'' کے پہلے باب میں مندرج ہے۔سید امیر علی صاحب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے حالات بیان کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ:

''اس دوران میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جسے پیغمبر صاحب کے مسیح سوانح نویس اور مسلمان مؤرخ مختلف پیرایوں میں بیان کرتے ہیں۔''

اس کے آگے انہوں نے پہلے تو اسلامی مؤرخین کی روایت نقل کی ہے اور بعد میں مسیحی مؤرخوں کا وہ بیان نقل کیا ہے جس کی طرف پروفیسر رام دیو صاحب نے اشارہ کیا ہے اور جسے انہوں نے سید امیر علی صاحب کی طرف منسوب کیا ہے۔اپنی طرف سے سید صاحب نے کوئی رائے ظاہر نہیں کی۔چنانچہ سید صاحب لکھتے ہیں کہ ''دو مسیحی مؤرخین کے نزدیک اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریمؐ کے دل میں ایک قلیل عرصہ کے لئے یہ خواہش پیدا ہوگئی تھی کہ وہ قریش کے ساتھ جو جنگ ہو رہی تھی کسی سمجھوتہ کے ذریعہ خاتمہ کردیں۔''اور آگے انہوں نے مسیحی مؤرخین کے دونوں گروہوں کے خیالات نقل کئے ہیں۔ان کے بھی جو متعصب ہیں اور ان کے بھی جو غیر متعصب ہیں۔جیسے لین پول وغیرہ۔پس مسیحی مؤرخین کے خیالات کو سید امیر علی صاحب کی طرف منسوب کرنا ایک ظلم عظیم ہے۔اور مجھے افسوس ہے کہ ایک قابل آدمی کی زبان سے اس قسم کی غلطی کی اشاعت ہو۔اور ایک ایسے مضمون کے بیان کرتے وقت جس میں وہ ایک اہم اور وسیع الاثر مسئلہ کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کر رہا ہو۔''

(انوار العلوم جلد ۵ صفحہ ۵۸۵ تا ۵۸۶)

☆

شیطانی تعلق اور شیطانی کلام ہونے کا اعتراض

آپؐ پر ایک یہ اعتراض بھی کیا گیا کہ نعوذ باللہ آپؐ کا شیطان سے تعلق ہے اور شیطان نے آپؐ پر کلام اتارا۔اس اعتراض کے ردّ میں حضرت مصلح موعودؓ فرماتے ہیں:

''اعتراض یہ تھا کہ اس کے ساتھ شیطان کا تعلق ہے اور اس کی طرف سے اسے کلام حاصل ہوتا

ہے اور گو کفار کا کوئی قول اس اعتراض کے متعلق نقل نہیں کیا گیا مگر اس اعتراض کے اشارے ضرور پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَمَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيٰطِيْنُ (الشعراء:۲۱۱) شیطان اس کلام کو لے کر نہیں اترے۔ اسی طرح فرماتا ہے۔ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ (التکویر:۲۶) یہ شیطان رجیم کا قول نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار کا یہ بھی اعتراض تھا کہ اس پر شیطان اترتا ہے۔ افسوس ہے کہ مسلمانوں نے اس اعتراض کو اور پکا کر دیا ہے اور کفار کے ہاتھ میں ایک ہتھیار دے دیا ہے۔ وہ اس طرح کہ وہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ کفارِ مکہ کے سردار جمع ہو کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہا کہ آپ کے پاس ادنیٰ درجہ کے لوگ آتے ہیں اور بڑے لوگ آپ کی باتیں نہیں سنتے۔ اگر آپ دین میں کچھ نرمی کر دیں تو ہم لوگ آپ کے پاس آ کر بیٹھا کریں۔ اس طرح دوسرے لوگ بھی آپ کے پاس آنے لگیں گے۔ اس پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خیال آیا کہ اگر ایسا کر دیا جائے تو پھر بڑے بڑے لوگ مان لیں گے۔ (مجھے کیا ہی لطف آیا اس شخص کے اس فقرہ سے جس کا نام نولڈ کے ہے۔ وہ لکھتا ہے ”معلوم ہوتا ہے یہ روایت بنانے والے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اپنے جیسا ہی بیوقوف سمجھتے تھے۔“) غرض رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نعوذ باللہ دین میں نرمی کرنے کا خیال آیا۔ اتنے میں آپ نماز پڑھنے لگے اور سورۃ نجم پڑھنی شروع کی۔ اس وقت شیطان نے اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى (النجم:۲۰،۲۱) کے بعد یہ کلمات آپ کی زبان پر جاری کر دئے کہ وَتِلْكَ الْغَرَانِيْقُ الْعُلٰى وَ اِنَّ شَفَاعَتَهُنَّ لَتُرْتَجٰى کیا تم نے لات اور عزیٰ اور منات کی حقیقت نہیں دیکھی۔ یہ بہت خوبصورت دیویاں ہیں اور ان کی شفاعت کی بڑی امید ہے۔ چونکہ سورۃ نجم کے آخر میں سجدہ آتا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سجدہ کیا تو سب کفار نے بھی آپ کے ساتھ سجدہ کر دیا کیونکہ انہوں نے سمجھ لیا کہ آپ نے دین میں نرمی کر دی ہے اور بتوں کو مان لیا ہے۔ اس روایت کو اتنے طریقوں سے

بیان کیا گیا ہے کہ ابن حجر جیسے آدمی کہتے ہیں کہ اس کی تاویل کی ضرورت ہے ۔ گو تاریخی طور پر یہ روایت بالکل غلط ہے اور میں ثابت کر سکتا ہوں کہ یہ محض جھوٹ ہے ۔ مگر اس وقت میں کسی تاویل میں نہیں پڑتا میں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ قرآن اس کے متعلق کیا کہتا ہے اور کیا واقعہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسا ہوا؟ اس موقع پر میں ایک مسلمان بزرگ کا قول بھی بیان کرتا ہوں جو مجھے بے انتہا پسند ہے ۔ میں تو جب بھی یہ قول پڑھتا ہوں ان کے لئے دعا کرتا ہوں ۔ یہ بزرگ قاضی عیاض ہیں ۔ وہ فرماتے ہیں شیطان نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر تو کوئی تصرف نہیں کیا البتہ بعض محدثین کے قلم سے شیطان نے یہ روایت لکھوا دی ہے ۔ گویا اگر شیطان کا تسلط کسی پر کرانا ہی ہے تو کیوں نہ محدثین پر کرایا جائے ۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو درمیان میں کیوں لایا جائے ۔ بعض نادان کہتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۃ نجم پڑھتے ہوئے یہ آیتیں بھی پڑھ دیں ۔ اس پر جبریل نازل ہوا اور اس نے کہا آپؐ نے یہ کیا کیا ۔ میں تو یہ آیتیں نہیں لایا تھا ۔ یہ تو شیطان نے جاری کی ہیں ۔ یہ معلوم کر کے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت فکر ہوا ۔ خدا تعالیٰ نے اس فکر کو یہ کہہ کر دور کر دیا کہ:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ ۚ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِى الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (الحج:۵۳)

فرمایا تم سے پہلے بھی کوئی نبی اور رسول ایسا نہیں بھیجا گیا کہ جب اس کے دل میں کوئی خواہش پیدا ہوئی ہو تو شیطان نے اس میں دخل نہ دے دیا ہو ۔ پھر اللہ تعالیٰ شیطان کی بات کو مٹا دیتا ہے اور جو اس کی اپنی طرف سے ہوتی ہے اسے قائم رکھتا ہے ۔ کہتے ہیں جب یہ آیت اللہ تعالیٰ نے نازل کی تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی ہو گئی ۔ تسلی کس طرح ہوئی اسی طرح جس طرح اس بڑھیا عورت کی ہو گئی تھی جس سے کسی نے پوچھا کہ کیا تم یہ چاہتی ہو کہ تمہارا کبڑا پن

دور ہو جائے یا یہ کہ دوسری عورتیں بھی تمہاری طرح گبڑی ہو جائیں۔ اس نے کہا مجھ پر تو دوسری عورتوں نے جس قدر ہنسی کرنی تھی کر لی ہے اب باقی عورتیں بھی کُبڑی ہو جائیں تا کہ میں بھی ان پر ہنسوں۔ اس روایت کو درست قرار دینے والوں کے نزدیک رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کس طرح تسلی ہوئی۔ اس طرح کہ خدا تعالیٰ نے آپ کو کہہ دیا کہ تم پر ہی شیطان کا قبضہ نہیں ہوا سب نبیوں پر ہوتا چلا آیا ہے۔ یہ سن کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فکر دور ہو گیا۔ کتنی نامعقول بات ہے ان لوگوں نے کبھی اتنا بھی نہ سوچا کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ اللہ تعالیٰ جاننے والا اور حکمت والا ہے۔ کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ شیطان کا ہر نبی اور رسول پر قبضہ پالینا بڑی حکمت کی بات ہے اور پھر علیم کا اس کے ساتھ کیا تعلق ہے۔ میں بیان کر رہا تھا کہ ایک بزرگ کے قول سے مجھے بڑا مزا آتا ہے۔ ان کا نام قاضی عیاض ہے۔ وہ اس قسم کی روایتیں نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ان سے یہ تو پتہ لگ گیا کہ شیطان کا تصرّف ہوا مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نہیں بلکہ ان روایتوں کو نقل کرنے والوں کی قلموں پر ہوا ہے۔ یہ بہت ہی لطیف بات ہے۔

قرآن کریم نے اس کا جو جواب دیا ہے وہ اسی جگہ موجود ہے جہاں کہتے ہیں کہ شیطان نے آیتیں نازل کیں یعنی تِلْكَ الْغَرَانِيْقُ الْعُلٰى. وَ اِنَّ شَفَاعَتَهُنَّ لَتُرْتَجٰى کے بعد کہتے ہیں کہ یہ آیات اُتریں:

اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى اِنْ هِيَ اِلَّآ اَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ

(النجم:۲۲تا۲۴)

فرمایا کیا تم اپنے لئے تو بیٹے قرار دیتے ہو اور خدا کے لئے لات، منات اور عزّیٰ بیٹیاں۔ یہ کس قدر بھونڈی تقسیم ہے جو تم نے کی۔ یہ نام تم نے اپنے طور پر رکھ لئے ہیں۔ خدا کی طرف سے نازل نہیں ہوئے۔ خدا نے تو ان بتوں کے لئے اتارا ہی کچھ نہیں۔ کیا ان آیات کے بعد کوئی

شخص ان فقروں کو درمیان میں شامل سمجھ سکتا ہے۔پس یہ آیات ہی بتا رہی ہیں کہ ان میں وہ فقرے داخل نہیں ہو سکتے۔آخر کار عربی تو جانتے تھے۔اس کے علاوہ مندرجہ ذیل آیتیں بھی اس حصہ کو رڈ کر رہی ہیں۔فرمایا:

وَمَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيٰطِيْنُ۝ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهُمْ وَمَا يَسْتَطِيْعُوْنَ۝

(الشعراء:۲۱۱تا۲۱۲)

یعنی اس میں شیطانی کلام کا اس قدر رد ہے کہ اسے شیطان اتار ہی کس طرح سکتا ہے۔پھر اگر شیطان یا اس کے ساتھی اس میں کچھ ملانا چاہیں تو ملا ہی نہیں سکتے۔کہیں کوئی عبارت کھپ ہی نہیں سکتی۔جو کچھ ملائیں گے بے جوڑ ہو گا۔جیسا کہ یہاں ہوا ہے۔پھر آگے چل کر فرماتا ہے:

هَلْ اُنَبِّئُكُمْ عَلٰى مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيٰطِيْنُ تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ يُّلْقُوْنَ السَّمْعَ وَاَكْثَرُهُمْ كٰذِبُوْنَ (الشعراء:۲۲۲تا۲۲۴)

کیا میں تمہیں بتاؤں کہ شیطان کس طرح اترتے ہیں۔شیطان کا تعلق ہر آفاق اور اثیم کے ساتھ ہوتا ہے۔یعنی جو بڑا جھوٹ بولنے والا اور گنہگار ہو اس سے شیطان کا تعلق ہوتا ہے۔مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق تو تم خود کہتے ہو کہ اس سے بڑھ کر سچا اور کوئی نہیں۔اس کے امین ہونے کے بھی تم قائل ہو پھر اس پر شیطان کا تصرّف کس طرح ہو سکتا ہے۔پھر فرماتا ہے:

اِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰۤى اَوْلِيٰٓـِٕهِمْ لِيُجَادِلُوْكُمْ (الانعام:۱۲۲)

کہ شیطان تو اپنی وحی شیطانوں کی طرف کرتا ہے تا کہ وہ تم سے جھگڑیں۔مومنوں کی طرف نہیں کرتا۔اب دیکھو وہ روایتیں جو بیان کی جاتی ہیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر کیسا خطرناک الزام لگاتی ہیں۔شیطان تو اپنے دوست کو ہی کہے گا کہ یہ ہتھیار لے جا اور لڑ۔کسی مسلمان کو وہ اپنے خلاف کس طرح بتائے گا۔اسی طرح سورہ نحل رکوع ۱۳ میں آتا ہے:

إِنَّهُ لَيْسَ لَهُ سُلْطَانٌ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَلَى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ۝
إِنَّمَا سُلْطَانُهُ عَلَى الَّذِينَ يَتَوَلَّوْنَهُ وَالَّذِينَ هُمْ بِهِ مُشْرِكُونَ ۝

(النحل: ۱۰۰۔۱۰۱)

یعنی شیطان کا مومنوں پر کوئی تسلط نہیں ہو سکتا جو خدا پر توکل رکھتے ہیں۔ شیطان کی حکومت تو انہی پر ہوتی ہے جو اس کے دوست ہوتے ہیں اور اس کے ساتھ شرک کرتے ہیں۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو ساری عمر شرک کا رڈ کرتے رہے۔ ان سے شیطان کا کیا تعلق ہو سکتا ہے۔''

(انوار العلوم جلد ۱۲ صفحہ ۴۴۹ تا ۴۵۴)

باب دھم

متفرق اعتراضات

اس عقیدہ کا ردّ کہ نجات کے لئے توحید کافی ہے آپؐ پر ایمان لانے کی ضرورت نہیں

بعض نادان یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ نجات کے لئے توحید ہی کافی ہے آپؐ پر ایمان لانے کی ضرورت نہیں، اس کے ردّ میں حضرت مسیح موعودؑ حقیقۃ الوحی میں تحریر فرماتے ہیں:

''پہلے وہ امر لکھنے کے لائق ہے جس کی وجہ سے عبدالحکیم خان ہماری جماعت سے علیحدہ ہوا ہے اور وہ یہ ہے کہ اس کا یہ عقیدہ ہے کہ نجات اُخروی حاصل کرنے کیلئے آنحضرت ﷺ پر ایمان لانے کی ضرورت نہیں بلکہ ہر ایک جو خدا کو واحد لاشریک جانتا ہے (گو آنحضرت ﷺ کا مکذب ہے) وہ نجات پائے گا۔ اس سے ظاہر ہے کہ اُس کے نزدیک ایک شخص اسلام سے مرتد ہو کر بھی نجات پا سکتا ہے اور ارتداد کی سزا دینا اُس کو ظلم ہے۔ مثلاً حال میں ہی جو ایک شخص عبدالغفور نام مرتد ہو کر آریہ سماج میں داخل ہوا اور دھرم پال نام رکھایا اور آنحضرت ﷺ کی توہین اور تکذیب میں دن رات کمر بستہ ہے وہ بھی عبدالحکیم خان کے نزدیک سیدھا بہشت میں جائے گا۔ کیونکہ آریہ لوگ بُت پرستی سے دستکش ہیں۔ مگر ہر ایک عقلمند سمجھ سکتا ہے کہ ایسے عقیدہ کی رو سے انبیاء علیہم السلام کا مبعوث ہونا محض بیہودہ اور لغو کام ٹھہرے گا۔ کیونکہ جب ایک شخص انبیاء علیہم السلام کا مکذّب اور دشمن ہو کر بھی خدا کو ایک جاننے سے نجات پا سکتا ہے تو پھر اس صورت میں گویا انبیاء صرف عبث طور پر دنیا میں بھیجے گئے۔☆

ورنہ اُن کے بغیر بھی کام چل سکتا تھا۔ اور اُن کے وجود کی کوئی بڑی بھاری ضرورت نہ تھی۔

☆ حاشیہ اگر یہ بات سچ ہے کہ وہ لوگ جو انبیاء علیہم السلام کی تکذیب کرنے والے اور اُن کے دشمن ہیں محض اپنی خیالی توحید سے نجات پا جائیں گے تو بجائے اس کے کہ ان کفار کو قیامت میں کوئی عذاب ہو انبیاء خود ایک قسم کے عذاب میں مبتلا ہو جائیں گے۔ جبکہ وہ اپنے سخت دشمنوں اور مکذبوں اور اہانت کرنیوالوں کو بہشت کے تختوں پر بیٹھے دیکھیں گے اور اپنی طرح ہر ایک قسم کی نازونعمت میں اُنکو پائیں گے اور ممکن ہے کہ اسوقت بھی وہ لوگ ٹھٹھا کر کے نبیوں کو کہیں کہ تمہاری تکذیب اور توہین نے ہمارا کیا بگاڑا۔ تب بہشت میں رہنا نبیوں پر تلخ ہو جائے گا۔ منہ

اور اگر یہ سچ تھا کہ صرف خدا کو واحد لاشریک کہنا ہی کافی ہے تو گویا یہ بھی ایک شرک کی قسم ہے کہ لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ کے ساتھ مُحَمَّد رسُول اللّٰه لازمی طور پر ملایا گیا اور در حقیقت اس خیال کے لوگ محمد رسول الله کہنا شرک ہی سمجھتے ہیں اور خدا تعالیٰ کی کامل توحید اسی میں تصور کرتے ہیں کہ اس کے ساتھ کسی کا نام نہ ملایا جائے اور ان کے نزدیک دین اسلام سے خارج ہونا نجات سے مانع نہیں۔ اور اگر مثلاً ایک ہی دن میں سب کے سب مسلمان آنحضرت ﷺ کی نبوت سے انکار کر کے گمراہ فلسفیوں کی طرح مجرّد توحید کو کافی سمجھیں اور اپنے تئیں قرآن اور رسول ﷺ کی پیروی سے مستغنی خیال کرلیں اور مکذّب ہو جائیں تو اُن کے نزدیک یہ سب لوگ باوجود مرتد ہونے کے نجات پاجائیں گے اور بلاشبہ بہشت میں داخل ہوں گے۔ مگر یہ بات کسی ادنیٰ عقل والے پر بھی پوشیدہ نہیں کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے زمانہ سے ہمارے اِس زمانہ تک تمام اسلامی فرقوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اسلام کی حقیقت یہی ہے کہ جیسا کہ ایک شخص خدا تعالیٰ کو واحد لاشریک سمجھتا ہے اور اس کی ہستی اور وجود اور وحدانیت پر ایمان لاتا ہے ایسا ہی اُس کے لئے ضروری ہے کہ آنحضرت ﷺ کی نبوت پر ایمان لاوے۔ اور جو کچھ قرآن شریف میں مذکور و مسطور ہے سب پر ایمان رکھے۔ یہی وہ امر ہے جو ابتدا سے مسلمانوں کے ذہن نشین کر دیا گیا ہے اور اسی پر محکم عقیدہ رکھنے کی وجہ سے صحابہ رضی اللہ عنہم نے اپنی جانیں دیں۔ اور کئی صادق مسلمان جو کفار کے ہاتھ میں عہد نبوی میں گرفتار ہو گئے تھے اُنکو بار بار یہ فہمائش کی گئی تھی کہ آنحضرت ﷺ سے منکر ہو جاؤ تو تم ہمارے ہاتھ سے رہائی پاؤ گے۔ لیکن انہوں نے انکار نہ کیا اور اسی راہ میں جان دی۔ یہ باتیں اِسلام کے واقعات میں ایسی مشہور ہیں کہ جو شخص ایک ادنیٰ واقفیت بھی اسلامی تاریخ سے رکھتا ہوگا اس کو ہمارے اِس بیان سے انکار نہیں ہوگا۔

اور پھر یہ بھی یاد رہے کہ اگرچہ اسلامی لڑائیاں مدافعت کے طور پر تھیں یعنی ابتدا انکی کفار کی طرف سے تھی اور کفارِ عرب اپنے حملوں سے باز نہیں آتے تھے اِس خوف سے کہ مبادا دینِ اسلام جزیرہ عرب میں پھیل جائے اور اسی بنا پر آنحضرت ﷺ کو اُن کے ساتھ لڑنے کا حکم ہوا

تھا۔تا مظلوموں کواُن فرعونوں کے ہاتھ سے رہائی بخشیں مگر اس میں بھی کچھ شبہ نہیں کہ پھر بھی اگر کفار کو یہ پیغام دیا جاتا کہ آنحضرت ﷺ کی نبوت کا ماننا کچھ ضروری نہیں اور آنجناب پر ایمان لانا کچھ شرط نجات نہیں صرف اپنے طور پر خدا کو واحد لاشریک سمجھو تو آنحضرت ﷺ کے مکذّب اور مخالف اور دشمن رہو اور اس بات کی ضرورت نہیں کہ انکو اپنا سردار اور پیشوا سمجھ لو تو اِس سے اس قدر خونریزی کی نوبت نہ آتی بالخصوص یہودی جو خدا کو واحد لاشریک سمجھتے تھے کیا وجہ کہ اُن سے لڑائیاں کی گئیں یہاں تک کہ بعض موقعوں میں کئی ہزار یہودی گرفتار کرکے ایک ہی دن میں قتل کئے گئے۔اِس سے صاف ظاہر ہے کہ اگر صرف توحید نجات کے لئے کافی تھی تو یہودیوں سے خواہ نخواہ لڑائیاں کرنا اور اُن میں سے ہزاروں کو قتل کرنا یہ فعل سراسر ناجائز اور حرام تھا۔پھر خود آنحضرت ﷺ اِس فعل کے کیوں مرتکب ہوئے۔کیا آنحضرت ﷺ کو قرآن کا علم نہ تھا؟

اور اگر خدا تعالیٰ کی تمام کتابوں کو غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ **تمام نبی** یہی سکھلاتے آئے ہیں کہ خدا تعالیٰ کو واحد لاشریک مانو اور ساتھ اس کے ہماری رسالت پر بھی ایمان لاؤ۔اِسی وجہ سے اسلامی تعلیم کا اِن دو فقروں میں **خلاصہ** تمام اُمّت کو سکھلایا گیا کہ لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ۔

یہ بھی یاد رہے کہ خدا کے وجود کا پتہ دینے والے اور اُس کے واحد لاشریک ہونے کا علم لوگوں کو سکھلانے والے صرف انبیاء علیہم السلام ہیں۔اور اگر یہ مقدس لوگ دنیا میں نہ آتے تو صراط مستقیم کا یقینی طور پر پانا ایک ممتنع اور **محال امر تھا** اگرچہ زمین و آسمان پر غور کرکے اور اُن کی ترتیب ابلغ اور محکم پر نظر ڈال کر ایک صحیح الفطرت اور سلیم العقل انسان دریافت کرسکتا ہے کہ اِس کارخانہ پُرحکمت کا بنانے والا کوئی ضرور ہونا چاہئے لیکن اِس فقرہ میں کہ ضرور ہونا چاہئے۔اور اِس فقرہ میں کہ واقعی وہ موجود ہے **بہت فرق** ہے۔واقعی وجود پر اطلاع دینے والے صرف **انبیاء** علیہم السلام ہیں جنہوں نے ہزارہا نشانوں اور معجزات سے دنیا پر ثابت کردکھایا کہ وہ ذات جو مخفی در مخفی اور تمام طاقتوں کی جامع ہے درحقیقت موجود ہے۔اور سچ تو یہ ہے کہ اس قدر عقل بھی کہ نظام عالم کو دیکھ کر صانع حقیقی کی ضرورت محسوس ہو۔یہ مرتبہ عقل بھی نبوت کی

شعاعوں سے ہی مستفیض ہے۔ اگر انبیاء علیہم السلام کا وجود نہ ہوتا تو اِس قدر عقل بھی کسی کو حاصل نہ ہوتی۔ اِس کی مثال یہ ہے کہ اگرچہ زمین کے نیچے پانی بھی ہے مگر اس پانی کا بقاء اور وجود آسمانی پانی سے وابستہ ہے۔ جب کبھی ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ آسمان سے پانی نہیں برستا تو زمینی پانی بھی خشک ہو جاتے ہیں۔ اور جب آسمان سے پانی برستا ہے تو زمین میں بھی پانی جوش مارتا ہے۔ اِسی طرح انبیاء علیہم السلام کے آنے سے عقلیں تیز ہو جاتی ہیں اور عقل جو زمینی پانی ہے اپنی حالت میں ترقی کرتی ہے۔ اور پھر جب ایک مُدّت دراز اِس بات پر گذرتی ہے کہ کوئی نبی مبعوث نہیں ہوتا تو عقلوں کا زمینی پانی گندہ اور کم ہونا شروع ہو جاتا ہے اور دنیا میں بُت پرستی اور شرک اور ہر ایک قسم کی بدی پھیل جاتی ہے۔ پس جس طرح آنکھ میں ایک روشنی ہے اور وہ باوجود اس روشنی کے پھر بھی آفتاب کی محتاج ہے اِسی طرح دنیا کی عقلیں جو آنکھ سے مشابہ ہیں ہمیشہ آفتابِ نبوت کی محتاج رہتی ہیں اور جبھی کہ وہ آفتاب پوشیدہ ہو جائے اُن میں فی الفور کدورت اور تاریکی پیدا ہو جاتی ہے۔ کیا تم صرف آنکھ سے کچھ دیکھ سکتے ہو؟ ہرگز نہیں۔ اِسی طرح تم بغیر نبوت کی روشنی کے بھی کچھ نہیں دیکھ سکتے۔

پس چونکہ قدیم سے اور جب سے کہ دنیا پیدا ہوئی ہے **خدا کا شناخت** کرنا نبی کے شناخت کرنے سے وابستہ ہے اِس لئے یہ خود غیر ممکن اور محال ہے کہ بجز ذریعہ نبی کے توحید مل سکے۔ نبی خدا کی صورت دیکھنے کا آئینہ ہوتا ہے اسی آئینہ کے ذریعہ سے خدا کا چہرہ نظر آتا ہے۔ جب خدا تعالیٰ اپنے تئیں دنیا پر ظاہر کرنا چاہتا ہے تو نبی کو جو اس کی قدرتوں کا مظہر ہے دنیا میں بھیجتا ہے اور اپنی وحی اس پر نازل کرتا ہے اور اپنی ربوبیت کی طاقتیں اس کے ذریعہ سے دکھلاتا ہے۔ تب دنیا کو پتہ لگتا ہے کہ خدا موجود ہے۔ پس جن لوگوں کا وجود ضروری طور پر خدا کے قدیم قانونِ ازلی کے رُو سے خداشناسی کے لئے ذریعہ مقرر ہو چکا ہے اُن پر ایمان لانا توحید کی ایک جزو ہے اور بجز اس ایمان کے توحید کامل نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ ممکن نہیں کہ بغیر اُن آسمانی نشانوں اور قدرت نما عجائبات کے جو نبی دکھلاتے ہیں اور معرفت تک پہنچاتے ہیں وہ خالص توحید جو چشمہء یقین کامل سے پیدا ہوتی ہے میسر آ سکے۔ وہی ایک قوم ہے جو خدا نما ہے جن کے ذریعہ سے وہ

خدا جس کا وجود دقیق در دقیق اور مخفی در مخفی اور غیب الغیب ہے ظاہر ہوتا ہے اور ہمیشہ سے وہ کنزِ مخفی جس کا نام خدا ہے نبیوں کے ذریعہ سے ہی شناخت کیا گیا ہے۔ ورنہ وہ توحید جو خدا کے نزدیک توحید کہلاتی ہے جس پر عملی رنگ کامل طور پر چڑھا ہوا ہوتا ہے اُس کا حاصل ہونا بغیر ذریعہ نبی کے جیسا کہ خلاف عقل ہے ویسا ہی خلاف تجارب سالکین ہے۔

بعض نادانوں کو جو یہ وہم گذرتا ہے کہ گویا نجات کے لئے صرف توحید کافی ہے نبی پر ایمان لانے کی ضرورت نہیں۔ گویا وہ رُوح کو جسم سے علیحدہ کرنا چاہتے ہیں یہ وہم سراسر دلی کوری پر مبنی ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ جبکہ توحید حقیقی کا وجود ہی نبی کے ذریعہ سے ہوتا ہے اور بغیر اس کے ممتنع اور محال ہے تو وہ بغیر نبی پر ایمان لانے کے میسر کیونکر آسکتی ہے۔ اور اگر نبی کو جو جڑھ توحید کی ہے ایمان لانے میں علیحدہ کر دیا جائے تو توحید کیونکر قائم رہے گی۔ توحید کا موجب اور توحید کا پیدا کرنے والا اور توحید کا باپ اور توحید کا سرچشمہ اور توحید کا مظہر اتم صرف نبی ہی ہوتا ہے اُسی کے ذریعہ سے خدا کا مخفی چہرہ نظر آتا ہے اور پتہ لگتا ہے کہ **خدا** ہے۔ بات یہ ہے کہ ایک طرف تو حضرت احدیّت جلّ شانہٗ کی ذات نہایت درجہ استغنا اور بے نیازی میں پڑی ہے اُس کو کسی کی ہدایت اور ضلالت کی پروا نہیں۔ اور دوسری طرف وہ بالطبع یہ بھی تقاضا فرماتا ہے کہ وہ شناخت کیا جائے اور اُسکی رحمتِ ازلی سے لوگ فائدہ اُٹھاویں۔ پس وہ ایسے دل پر جو اہل زمین کے تمام دلوں میں سے محبت اور قرب او سبحانہٗ کا حاصل کرنے کیلئے کمال درجہ پر فطرتی طاقت اپنے اندر رکھتا ہے۔ اور نیز کمال درجہ کی ہمدردی بنی نوع کی اس کی فطرت میں ہے تجلّی فرماتا ہے اور اُس پر اپنی ہستی اور صفاتِ ازلیہ ابدیہ کے انوار ظاہر کرتا ہے اور اس طرح وہ خاص اور اعلیٰ فطرت کا آدمی جس کو دوسرے لفظوں میں **نبی** کہتے ہیں اس کی طرف کھینچا جاتا ہے۔ پھر وہ نبی بوجہ اسکے کہ ہمدردی بنی نوع کا اس کے دل میں کمال درجہ پر جوش ہوتا ہے اپنی روحانی توجہات اور تضرع اور انکسار سے یہ چاہتا ہے کہ وہ خدا جو اُس پر ظاہر ہوا ہے۔ دُوسرے لوگ بھی اُسکو شناخت کریں اور نجات پاویں اور وہ دلی خواہش سے اپنے وجود کی قربانی خدا تعالیٰ کے سامنے پیش کرتا ہے اور اس تمنا سے کہ لوگ زندہ ہو جائیں کئی موتیں اپنے لئے قبول کر لیتا ہے اور

بڑے مجاہدات میں اپنے تئیں ڈالتا ہے جیسا کہ اس آیت میں اشارہ ہے:

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (الشعراء:۴)(ترجمہ:یعنی کیا تو اس غم میں اپنے تئیں ہلاک کر دے گا کہ یہ کافر لوگ کیوں ایمان نہیں لاتے۔منہ) تب اگرچہ خدا مخلوق سے بے نیاز اور مستغنی ہے مگر اُس کے دائمی غم اور حزن اور کرب وقلق اور تذلل اور نیستی اور نہایت درجہ کے صدق اور صفا پر نظر کر کے مخلوق کے مستعد دلوں پر اپنے نشانوں کے ساتھ اپنا چہرہ ظاہر کر دیتا ہے اور اُس کی پُر جوش دعاؤں کی تحریک سے جو آسمان پر ایک صعبناک شور ڈالتی ہیں خدا تعالیٰ کے نشان زمین پر بارش کی طرح برستے ہیں۔اور عظیم الشان خوارق دنیا کے لوگوں کو دکھلائے جاتے ہیں جن سے دنیا دیکھ لیتی ہے کہ خدا ہے اور خدا کا چہرہ نظر آ جاتا ہے لیکن اگر وہ پاک نبی اِس قدر دعا اور تضرّع اور ابتہال سے خدا تعالیٰ کی طرف توجہ نہ کرتا اور خدا کے چہرہ کی چمک دنیا پر ظاہر کرنے کیلئے اپنی قربانی نہ دیتا اور ہر ایک قدم میں صدہا موتیں قبول نہ کرتا تو خُدا کا چہرہ دنیا پر ہرگز ظاہر نہ ہوتا۔کیونکہ خدا تعالیٰ بوجہ استغناء ذاتی کے بے نیاز ہے جیسا کہ وہ فرماتا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ (آل عمران:۹۸) اور وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (العنکبوت:۷۰) خدا تو تمام دنیا سے بے نیاز ہے اور جو لوگ ہماری راہ میں مجاہدہ کرتے ہیں اور ہماری طلب میں کوشش کو انتہا تک پہنچا دیتے ہیں اُنہیں کیلئے ہمارا یہ قانون قدرت ہے کہ ہم اُنکو اپنی راہ دکھلا دیا کرتے ہیں۔سو خدا کی راہ میں سب سے اول قربانی دینے والے نبی ہیں۔ہر ایک اپنے لئے کوشش کرتا ہے مگر انبیاء علیہم السلام دوسروں کیلئے کوشش کرتے ہیں۔لوگ سوتے ہیں اور وہ ان کیلئے جاگتے ہیں۔اور لوگ ہنستے ہیں اور وہ اُن کیلئے روتے ہیں اور دنیا کی رہائی کیلئے ہر ایک مصیبت کو بخوشی اپنے پر وارد کر لیتے ہیں۔یہ سب اس لئے کرتے ہیں کہ تا خدا تعالیٰ کچھ ایسی تجلی فرماوے کہ لوگوں پر ثابت ہو جاوے کہ خدا موجود ہے اور مستعد دلوں پر اُس کی ہستی اور اُس کی توحید منکشف ہو جاوے تا کہ وہ نجات پائیں۔پس وہ جانی دشمنوں کی ہمدردی میں مر رہتے ہیں۔اور جب انتہا درجہ پر اُن کا درد پہنچتا ہے اور ان کی دردناک آہوں سے (جو مخلوق کی رہائی کیلئے

ہوتی ہیں) آسمان پُر ہو جاتا ہے۔تب خدا تعالیٰ اپنے چہرہ کی چمک دکھلاتا ہے اور زبردست نشانوں کے ساتھ اپنی ہستی اور اپنی توحید لوگوں پر ظاہر کرتا ہے۔پس اس میں شک نہیں کہ توحید اور خدا دانی کی متاع رسول کے دامن سے ہی دنیا کو ملتی ہے بغیر اس کے ہرگز نہیں مل سکتی اور اس امر میں سب سے اعلیٰ نمونہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دکھایا کہ ایک قوم جو نجاست پر بیٹھی ہوئی تھی اُن کو نجاست سے اُٹھا کر گلزار میں پہنچا دیا۔اور وہ جو روحانی بھوک اور پیاس سے مرنے لگے تھے اُن کے آگے روحانی اعلیٰ درجہ کی غذائیں اور شیریں شربت رکھ دیئے۔اُن کو وحشیانہ حالت سے انسان بنایا۔پھر معمولی انسان سے مہذب انسان بنایا پھر مہذب انسان سے کامل انسان بنایا اور اس قدر اُن کے لئے نشان ظاہر کئے کہ اُنکو خدا دکھلا دیا اور اُن میں ایسی تبدیلی پیدا کر دی کہ اُنہوں نے فرشتوں سے ہاتھ جا ملائے۔یہ تاثیر کسی اور نبی سے اپنی اُمت کی نسبت ظہور میں نہ آئی کیونکہ اُن کے صحبت یاب ناقص رہے پس مَیں ہمیشہ تعجب کی نگہ سے دیکھتا ہوں کہ یہ عربی نبی جس کا نام **محمد** ہے (ہزار ہزار درود اور سلام اُس پر) یہ کس **عالی مرتبہ کا نبی** ہے۔اس کے عالی مقام کا انتہا معلوم نہیں ہو سکتا اور اس کی تاثیر قدسی کا اندازہ کرنا انسان کا کام نہیں۔☆ افسوس کہ جیسا حق شناخت کا ہے اُس کے مرتبہ کو شناخت نہیں کیا گیا۔**وہ توحید** جو دنیا سے گم ہو چکی تھی وہی ایک پہلوان ہے جو دوبارہ اس کو دنیا میں لایا۔اُس نے خدا سے انتہائی درجہ پر محبت کی اور انتہائی درجہ پر بنی نوع کی ہمدردی میں اس کی جان گداز ہوئی اس لئے خدا نے جو اُس کے دل کے راز کا واقف تھا اُس کو **تمام انبیاء** اور تمام **اوّلین وآخرین** پر فضیلت بخشی اور اُس کی مرادیں اُس کی زندگی

☆ حاشیہ یہ عجیب بات ہے کہ دنیا ختم ہونے کو ہے مگر اس کامل نبیؐ کے فیضان کی شعاعیں اب تک ختم نہیں ہوئیں اگر خدا کا کلام قرآن شریف مانع نہ ہوتا تو فقط یہی نبی تھا جس کی نسبت ہم کہہ سکتے تھے کہ وہ اب تک مع جسم عنصری زندہ آسمان پر موجود ہے کیونکہ ہم اُس کی زندگی کے صریح آثار پاتے ہیں۔اس کا دین زندہ ہے اس کی پیروی کرنے والا زندہ ہو جاتا ہے اور اس کے ذریعہ سے زندہ خدا مل جاتا ہے۔ہم نے دیکھ لیا ہے کہ خدا اس سے اور اس کے دین سے اور اس کے مُحِب سے محبت کرتا ہے۔اور یاد رہے کہ درحقیقت وہ زندہ ہے اور آسمان پر سب سے اس کا مقام برتر ہے لیکن یہ جسم عنصری جو فانی ہے یہ نہیں ہے بلکہ ایک اور نورانی جسم کے ساتھ جو لازوال ہے اپنے خدائے مقتدر کے پاس آسمان پر ہے۔منہ

میں اُس کو دیں۔ وہی ہے جو سر چشمہ ہر ایک فیض کا ہے اور وہ شخص جو بغیر اقرار افاضہ اُس کے کسی فضیلت کا دعویٰ کرتا ہے۔ وہ انسان نہیں ہے بلکہ **ذُرّیّتِ شیطان** ہے کیونکہ ہر ایک فضیلت کی کُنجی اُس کو دی گئی ہے اور ہر ایک معرفت کا خزانہ اُس کو عطا کیا گیا ہے۔ جو اُس کے ذریعہ سے نہیں پاتا وہ محروم ازلی ہے۔ ہم کیا چیز ہیں اور ہماری حقیقت کیا ہے۔ ہم کافر نعمت ہوں گے اگر اس بات کا اقرار نہ کریں کہ توحید حقیقی ہم نے اِسی نبی کے ذریعہ سے پائی اور زندہ خدا کی شناخت ہمیں اِسی کامل نبی کے ذریعہ سے اور اسکے نُور سے ملی ہے اور خدا کے مکالمات اور مخاطبات کا شرف بھی جس سے ہم اُس کا چہرہ دیکھتے ہیں **اِسی بزرگ نبی** کے ذریعہ سے ہمیں میسر آیا ہے اس آفتاب ہدایت کی شعاع دھوپ کی طرح ہم پر پڑتی ہے اور اُسی وقت تک ہم منور رہ سکتے ہیں جب تک کہ ہم اُس کے مقابل پر کھڑے ہیں۔ وہ لوگ جو اس غلط خیال پر جمے ہوئے ہیں کہ جو شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لاوے یا مرتد ہو جائے اور توحید پر قائم ہو اور خدا کو واحد لاشریک جانتا ہو وہ بھی نجات پا جائے گا اور ایمان نہ لانے یا مرتد ہونے سے اس کا کچھ بھی حرج نہ ہوگا جیسا کہ عبدالحکیم خان کا مذہب ہے ایسے لوگ درحقیقت توحید کی حقیقت سے ہی بے خبر ہیں“ (حقیقۃ الوحی، روحانی خزائن جلد ۲۲ صفحہ ۱۱۸ تا ۱۱۹)

☆

آپ کو علم روح نہ دیئے جانے کا اعتراض

آریہ سماج ہوشیارپور کے لیڈر لالہ مرلیدھر ڈرائنگ ماسٹر نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے ساتھ مباحثہ کے دوران آنحضور ﷺ کے بارہ میں یہ اعتراض پیش کیا: ”مرزا صاحب اور سب اہل اسلام کا یہی اعتقاد ہے اور قرآن میں آیا ہے کہ جب آنحضرت (محمدؐ صاحب) سے لوگوں نے پوچھا کہ روح کیا چیز ہے تو آپ کچھ نہ بتلا سکے اور اس وقت آیت نازل ہوئی کہ اے محمدؐ کہہ دے کہ روح ایک امر ربی ہے سو مسلمانوں نے تو روح کو کیا سمجھا ہوگا خدا نے انکے ہادی پر بھی روح کی کیفیت ظاہر نہیں کی اور خدا کا بھی کیا جواب عمدہ ہے کہ روح امر ربی ہے کیا اور چیزیں امر ربی نہیں“۔ اس اعتراض کے جواب میں حضرت مسیح موعودؑ نے تحریر فرمایا کہ:

''اس وقت ماسٹر صاحب کی خوبیٔ فہم اور جلد بازی کا تصور کر کے مجھے ایک حکایت یاد آ گئی ہے کہ ایک ایسا شخص کسی شہر میں تھا جو ہمیشہ چپ رہا کرتا تھا آخر اس کی خاموشی سے لوگ اس وہم میں پڑ گئے کہ یہ کوئی بڑا فاضل اور دانشمند ہوگا۔ اسی خیال سے ایک جماعت کثیر اس کی خدمت میں حاضر رہنے لگی۔ ایک دن اس شخص نے اپنے دل میں سوچا کہ مجھے اپنی عقلمندی ظاہر کرنے کے لئے کچھ بولنا چاہئے سو جب اس نے دو چار باتیں ہی مونہہ سے نکالیں تو تمام لوگ سمجھ گئے کہ اگر اس شہر میں کوئی اور نادان بھی ہے تو اس سے بڑھ کر کبھی نہ ہوگا۔ تب اس کے اردگرد سے سب بھاگ گئے اور ساری جماعت متفرق ہوگئی اور وہ اکیلا رہ کر بہت دردمند ہوا۔ بڑی مصیبت سے ایک رات کاٹی صبح ہوتے ہی اس شہر سے کہیں کو چلا گیا اور جاتے وقت ایک دیوار پر لکھ گیا کہ اگر میں پہلے اپنی شکل کو آئینہ میں دیکھ لیتا تو نادانی سے اپنا پردہ فاش نہ کرتا۔

اسی طرح ماسٹر صاحب نے بھی اچھا نہیں کیا کہ لاعلمی اور ناواقفیت اور ناسمجھی کی حالت میں اعتراض کرنے کے لئے زبان کھولی۔ لالہ صاحب میں آپ کی غلطیوں کی کہاں تک اصلاح کرتا جاؤں آپ نے یہ کس سے سن لیا کہ مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کو خدائے تعالیٰ کی طرف سے علم روح نہیں دیا گیا تھا اور آپ نے قرآن شریف میں کس جگہ اور کہاں دیکھ لیا کہ حضرت ممدوح روح کے علم سے بے خبر تھے۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کو اپنی عقل ناتمام کی شامت سے اس آیت کے سمجھنے میں دھوکا لگا ہے جو قرآن شریف میں وارد ہے اور وہ یہ ہے

وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ۖ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا الجزو ۱۵ سورہ بنی اسرائیل۔(بنی اسرائیل:۸۶) اور کفار تجھ سے (اے محمدؐ) پوچھتے ہیں کہ روح کیا ہے اور کس چیز سے اور کیونکر پیدا ہوئی ہے۔ ان کو کہہ دے کہ روح میرے ربّ کے امر میں سے ہے اور تم کو اے کافرو علم روح اور علم اسرار الٰہی نہیں دیا گیا مگر کچھ تھوڑا سا۔ سو اس جگہ اے ماسٹر صاحب آپ کو اپنے نقصان فہم سے یہ غلطی لگی کہ آپ نے اس عبارت کا مخاطب (کہ تم کو علم روح نہیں دیا گیا) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سمجھ لیا حالانکہ لفظ مَآ اُوْتِيْتُمْ جس کا ترجمہ یہ ہے کہ تم کو نہیں دیا گیا جمع کا صیغہ ہے جو صاف دلالت کر رہا ہے جو اس آیت کے

مخاطب کفار ہیں کیونکہ ان آیات میں جمع کے صیغہ سے کسی جگہ آنحضرت ﷺ کو خطاب نہیں کیا گیا بلکہ جابجا واحد کے صیغہ سے خطاب کیا گیا ہے اور جمع کے صیغہ سے کفار کی جماعت کو بیان کیا گیا ہے کہ وہ ایسا سوال کرتے ہیں سو اگر کوئی نرا اندھا نہ ہو تو سمجھ سکتا ہے کہ ان دونوں آیتوں میں دو جمع کے صیغے وارد ہیں۔ اول یَسْئَلُوْنَ یعنی سوال کرتے ہیں۔ دوم مَآ اُوْتِیْتُمْ یعنے تم نہیں دیئے گئے اور جیسا کہ ظاہر ہے کہ یَسْئَلُوْنَ کے صیغہ جمع سے مراد کافر ہیں جنہوں نے روح کی کیفیت کے بارے میں سوال کیا تھا۔ ایسا ہی ظاہر ہے کہ مَآ اُوْتِیْتُمْ کے صیغہ جمع سے بھی مراد کافر ہی ہیں مگر آنحضرت ﷺ کو تو کسی جگہ جمع کے صیغہ سے خطاب نہیں کیا گیا بلکہ اول مجرد کاف سے جو واحد پر دلالت کرتا ہے خطاب کیا گیا یعنے یہ کہا گیا کہ تجھ سے کفار پوچھتے ہیں یہ نہیں کہا گیا کہ تم سے کفار پوچھتے ہیں۔ پھر بعد اس کے ایسا ہی لفظ واحد سے فرمایا کہ ان کو کہہ دے یہ نہیں فرمایا کہ ان کو کہہ دو برخلاف بیان حال کفار کے کہ ان کو دونوں موقعوں پر جمع کے صیغے سے بیان کیا ہے سو آیت کے سیدھے سیدھے معنے جو سیاق سباق کلام سے سمجھے جاتے ہیں اور صاف صاف عبارت سے نکلتے ہیں یہی ہیں کہ اے محمدؐ کفار تجھ سے روح کی کیفیت پوچھتے ہیں کہ روح کیا چیز ہے اور کس چیز سے پیدا ہوئی ہے سو ان کو کہہ دے کہ روح امر ربی ہے یعنے عالم امر میں سے ہے اور تم اے کافرو کیا جانو کہ روح کیا چیز ہے کیونکہ علم روح حاصل کرنے کے لئے ایماندار اور عارف باللہ ہونا ضروری ہے مگر ان باتوں میں سے تم میں کوئی بھی بات نہیں۔

اب ہر یک منصف سمجھ سکتا ہے کہ نادانی اور شتاب کاری کی آمیزش سے کیا کیا ندامتیں اٹھانی پڑتی ہیں۔ غور کرنا چاہئے کہ ان آیات شریفہ متذکرہ بالا کا کیسا مطلب صاف صاف تھا کہ کفار کی ایک جماعت نے آنحضرت ﷺ سے روح کے بارے میں سوال کیا کہ روح کیا چیز ہے تب ایسی جماعت کو جیسا کہ صورت موجودہ تھی بصیغہ جمع مخاطب کر کے جواب دیا گیا کہ روح عالم امر میں سے ہے یعنی کلمۃ اللہ یا ظل کلمہ ہے جو حکمت وقدرت الٰہی روح کی شکل پر وجود پذیر ہو گیا ہے اور اس کو خدائی سے کچھ حصہ نہیں بلکہ وہ درحقیقت حادث اور بندہ خدا ہے اور یہ قدرت

ربانی کا ایک بھید دقیق ہے۔ جس کو تم اے کافرو سمجھ نہیں سکتے ☆ (دیکھئے حاشیہ)

مگر کچھ تھوڑا سا جس کی وجہ سے تم مکلّف بایمان ہو۔ تمہاری عقلیں بھی دریافت کرسکتی ہیں۔ اس کھلے کھلے مطلب کے سمجھنے میں ماسٹر صاحب نے کتنی بڑی غلطی کھائی ہے اور یہ سمجھ بیٹھے کہ گویا یہ خطاب لاعلمی کیفیت روح کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف

☆**حاشیہ** یہ ایک سرِ ربوبیت ہے جو کلمات اللہ سے مخلوقات الٰہی پیدا ہو جاتی ہے اس کو اپنی اپنی سمجھ کے موافق ہر یک شخص ذہن نشین کرسکتا ہے چاہے اس طرح سمجھ لے کہ مخلوقات کلمات الٰہی کے اظلال وآثار ہیں یا ایسا سمجھ سکتا ہے کہ خود کلمات الٰہی ہی ہیں جو بقدرت الٰہی مخلوقیت کے رنگ میں آجاتے ہیں کلام الٰہی کی عبارت ان دونوں معنے کے سمجھنے کے لئے وسیع ہے اور بعض مواضع قرآن کی ظاہر عبارت میں مخلوقات کا نام کلمات اللہ رکھا گیا ہے جو تجلیات ربوبیت ہے بقدرت الٰہی لوازم وخواص جدیدہ حاصل کر کے حدوث کے کامل رنگ سے رنگین ہو گئے ہیں اور درحقیقت یہ ایک سر ان اسرار خالقیت میں سے ہے جو عقل کے چرخ پر چڑھا کر اچھی طرح سمجھ میں نہیں آسکتے اور عوام کے لئے سیدھا راہ سمجھنے کا یہی ہے کہ خدائے تعالیٰ نے جو کچھ پیدا کرنا چاہا وہ ہو گیا اور سب کچھ اسی کا پیدا کردہ اور اسی کی مخلوق اور اسی کے دست قدرت سے نکلا ہوا ہے۔ لیکن عارفوں پر کشفی طور سے بعد مجاہدات یہ کیفیت حدوث کھل جاتی ہے اور نظر کشفی میں کچھ ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام ارواح واجسام کلمات اللہ ہی ہیں۔ جو حکمت کاملہ الٰہی پیرایہ حدوث ومخلوقیت سے متلبس ہو گئے ہیں مگر اصل محکم جس پر قدم مارنا اور قائم رہنا ضروری ہے یہ ہے کہ ان کشفیات ومعقولات سے قدر مشترک لیا جائے یعنے یہ کہ خدائے تعالیٰ ہر یک چیز کا خالق اور محدث ہے اور کوئی چیز کیا ارواح اور کیا اجسام بغیر اس کے ظہور پذیر نہیں ہوئی اور نہ ہو سکتی ہے۔ کیونکہ کلام الٰہی کی عبارت اس جگہ درحقیقت ذوالوجوہ ہے۔ اور جس قدر قطع اور یقین کے طور پر قرآن شریف ہدایت کرتا ہے وہ یہی ہے کہ ہر یک چیز خدائے تعالیٰ سے ظہور پذیر و وجود پذیر ہوئی ہے اور کوئی چیز بغیر اس کے پیدا نہیں ہوئی اور نہ خود بخود ہے سو اس قدر اعتقاد ابتدائی حالت کے لئے کافی ہے پھر آگے معرفت کے میدانوں میں سیر کرنا جس کو نصیب ہوگا اس پر بعد مجاہدات خود وہ کیفیت کھل جائے گی جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (العنکبوت:۷۰) یعنی جو لوگ ہماری راہ میں مجاہدہ کریں گے ہم ان کو وہ اپنی خاص راہیں آپ دکھلا دیں گے جو مجرد عقل اور قیاس سے سمجھ میں نہیں آسکتیں اور درحقیقت خدائے تعالیٰ نے اپنے عجیب عالم کو تین حصہ پر منقسم کر رکھا ہے۔

ہے لاحول ولا قوۃ پتھر پڑیں ایسی سمجھ پر کاش ماسٹر صاحب نے کچھ تھوڑی سی عربی پڑھی ہوتی یا کچھ تھوڑا سا قاعدہ نحو صرف کا ہی دیکھا ہوتا اے صاحب ذرا آنکھ کھول کر دیکھو کہ روح کی کیفیت پوچھنے والے کون لوگ تھے۔

وہ تو آپ کے ہی بھائی بند یعنے منکرین دین اسلام تھے انہیں کو تو یہ جواب دیا گیا

(ا) عالم ظاہر جو آنکھوں اور کانوں اور دیگر حواس ظاہری کے ذریعہ اور آلات خارجی کے توسل سے محسوس ہو سکتا ہے۔

(۲) عالم باطن جو عقل اور قیاس کے ذریعہ سے سمجھ میں آ سکتا ہے۔

(۳) عالم باطن در باطن جو ایسا نازک اور لایدرک وفوق الخیالات عالم ہے جو تھوڑے ہیں جو اس سے خبر رکھتے ہیں وہ عالم غیب محض ہے جس تک پہنچنے کے لئے عقلوں کو طاقت نہیں دی گئی مگر ظن محض۔ اور اس عالم پر کشف اور وحی اور الہام کے ذریعہ سے اطلاع ملتی ہے نہ اور کسی ذریعہ سے اور جیسی عادت اللہ بدیہی طور پر ثابت اور محقق ہے کہ اس نے ان دو پہلے عالموں کے دریافت کرنے کے لئے جن کا اوپر ذکر ہو چکا ہے انسان کو طرح طرح کے حواس و قوتیں عنایت کی ہیں۔ اسی طرح اس تیسرے عالم کے دریافت کرنے کے لئے بھی اس فیاضِ مطلق نے انسان کے لئے ایک ذریعہ رکھا ہے اور وہ ذریعہ وحی اور الہام اور کشف ہے جو کسی زمانہ میں بکلی بند اور موقوف نہیں رہ سکتا بلکہ اس کے شرائط بجالانے والے ہمیشہ اس کو پاتے رہے ہیں اور ہمیشہ پاتے رہیں گے۔ چونکہ انسان ترقیات غیر محدودہ کے لئے پیدا کیا گیا ہے اور خدائے تعالیٰ بھی عیب بخل و امساک سے بکلی پاک ہے۔ پس اس قوی دلیل سے ایسا خیال بڑا ناپاک خیال ہے جو یہ سمجھا جائے جو خدائے تعالیٰ نے انسان کے دل میں تینوں عالموں کے اسرار معلوم کرنے کا شوق ڈال کر پھر تیسرے عالم کے وسائل وصول سے بکلی اس کو محروم رکھا ہے۔ پس یہ وہ دلیل ہے جس سے دانشمند لوگ دائمی طور پر الہام اور کشف کی ضرورت کو یقین کر لیتے ہیں اور آریوں کی طرح چار رشیوں پر الہام کو ختم نہیں کرتے جن کی مانند کوئی پانچواں اس کمال تک پہنچنا ان کی نظر عجیب میں ممکن ہی نہیں بلکہ عقلمند لوگ خدائے تعالیٰ کے فیاض مطلق ہونے پر ایمان لا کر الہامی دروازوں کو ہمیشہ کھلا سمجھتے ہیں اور کسی ولایت اور ملک سے اس کو مخصوص نہیں رکھتے ہاں اس صراط مستقیم سے مخصوص رکھتے ہیں جس پر ٹھیک ٹھیک چلنے سے یہ برکات حاصل ہوتے ہیں۔ کیونکہ ہر یک چیز کے حصول کے لئے یہ لازم پڑا ہوا ہے کہ انہیں قواعد اور طریقوں پر عمل کیا جائے جن کی پابندی سے وہ چیز مل سکتی ہے۔ غرض عقلمند لوگ عالم کشف کے عجائبات سے انکار نہیں کرتے بلکہ انہیں ماننا پڑتا ہے کہ جس

تھا کہ روح عالم امر میں سے ہے اور تم ان الٰہی بھیدوں کواے کافر و کیا جانو ایمان لاؤ تا تمہیں روح کی کیفیت اور اس کے علوم معلوم ہوں اور یہ جو خدائے تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ روح عالم امر میں سے ہے جس پر ماسٹر صاحب نے اپنی خوش فہمی سے جھٹ پٹ اعتراض بھی کر دیا یہ ایک بڑی بھاری صداقت کا بیان ہے اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ ربوبیتِ الٰہی دو طور سے ناپیدا چیزوں

جوادِ مطلق نے عالم اول کے ادنیٰ ادنیٰ امور کے دریافت کرنے کے لئے انسان کو حواس و طاقتیں عنایت کی ہیں وہ تیسرے عالم کے معظم اور عالی شان امور کے دریافت سے جس سے حقیقی اور کامل تعلق خدائے تعالیٰ سے پیدا ہوتا ہے اور سچی اور یقینی معرفت حاصل ہو کر اسی دنیا میں انوار نجات نمایاں ہو جاتے ہیں کیوں انسان کو محروم رکھتا بے شک یہ طریق بھی دوسرے دونوں طریقوں کی طرح کھلا ہوا ہے اور صادق لوگ بڑے زور سے اس پر قدم مارتے ہیں اور اس کو پاتے ہیں اور اس کے ثمرات حاصل کرتے ہیں عجائبات اس عالم ثالث کے بے انتہا ہیں اور اس کے مقابل پر دوسرے عالم ایسے ہیں جیسے آفتاب کے مقابل پر ایک دانہ خشخاش۔ اس بات پر زور لگانا کہ اس عالم کے اسرار عقلی طاقت سے بکلی منکشف ہو جائیں یہ ایسا ہی ہے جیسے ایک انسان آنکھوں کو بند کر کے مثلاً اس بات پر زور لگائے کہ وہ قابل رویت چیزوں کو قوت شامہ کے ذریعہ سے دیکھ لے بلکہ عجائبات عالم باطن در باطن سے عقل ایسی حیران ہے کہ کچھ دم نہیں مار سکتی کہ یہ کیا بھید ہے۔ روحوں کی پیدائش پر انسان کیوں تعجب کرے اسی دنیا میں صاحب کشف پر ایسے ایسے اسرار ظاہر ہوتے ہیں کہ ان کی کُنہ کو سمجھنے میں بکلی عقل عاجز رہ جاتی ہے۔ بعض اوقات صاحب کشف صدہا کوسوں کے فاصلہ سے باوجود حائل ہونے بے شمار حجابوں کے ایک چیز کو صاف صاف دیکھ لیتا ہے بلکہ بعض اوقات عین بیداری میں باذنہٖ تعالیٰ اس کی آواز بھی سن لیتا ہے اور اس سے زیادہ تر تعجب کی یہ بات ہے کہ بعض اوقات وہ شخص بھی اس کی آواز سن لیتا ہے جس کی صورت اس پر منکشف ہوئی ہے۔ بعض اوقات صاحب کشف اپنے عالم کشف میں جو بیداری سے نہایت مشابہ ہے ارواح گزشتہ سے ملاقات کرتا ہے اور عام طور پر ملاقات ہر یک نیک بخت روح یا بد بخت روح کے کشف قبور کے طور پر ہو سکتی ہے چنانچہ خود اس میں مؤلف رسالہ ہذا صاحب تجربہ ہے اور یہ امر ہندوؤں کے مسئلہ تناسخ کی بیخ کنی کرنے والا ہے اور سب سے تعجب کا یہ مقام ہے کہ بعض اوقات صاحب کشف اپنی توجہ اور قوت تاثیر سے ایک دوسرے شخص پر باوجود صدہا کوسوں کے فاصلہ کے باذنہٖ تعالیٰ عالم بیداری میں ظاہر ہو جاتا ہے حالانکہ اس کا وجود عنصری اپنے مقام سے جنبش نہیں کرتا اور عقل کے زور سے ایک چیز کا دو جگہ ہونا محال ہے سو وہ محال اس عالم ثالث میں ممکن الوقوع ہو جاتا ہے اسی طرح

کو پیدا کرتی ہے اور دونوں طور کے پیدا کرنے میں پیدا شدہ چیزوں کے الگ الگ نام رکھے جاتے ہیں۔ جب خدائے تعالیٰ کسی چیز کو اس طور سے پیدا کرے کہ پہلے اس چیز کا کچھ بھی وجود نہ ہو تو ایسے پیدا کرنے کا نام اصطلاح قرآنی میں امر ہے اور اگر ایسے طور سے کسی چیز کو پیدا کرے کہ پہلے وہ چیز کسی اور صورت میں اپنا وجود رکھتی ہو تو اس طرز پیدائش کا نام خلق ہے خلاصہ

صدہا عجائبات کو عارف بچشم خود دیکھتا ہے اور ان کور باطنوں کے انکار سے تعجب پر تعجب کرتا ہے۔ جو اس عالم ثالث کے عجائبات سے قطعاً منکر ہیں۔ راقم رسالہ ہذا نے اس عالم ثالث کے عجائبات اور نادر مکاشفات کو قریب پانچ ہزار کے بچشم خود دیکھا اور اپنے ذاتی تجربہ سے مشاہدہ کیا اور اپنے نفس پر انہیں وارد ہوتے پایا ہے۔ اگر ان سب کی تفصیل لکھی جائے تو ایک بڑی بھاری کتاب تالیف ہو سکتی ہے۔ ان سب عجائبات میں سے ایک بڑی عجیب بات یہ ثابت ہوئی ہے کہ بعض کشفی امور جن کا خارج میں نام و نشان نہیں محض قدرت غیبی سے وجود خارجی پکڑ لیتے ہیں اگرچہ صاحب فتوحات وفصوص و دیگر اکثر اکابر متصوفین نے اس بارے میں بہت سے اپنے خود گذشت قصے اپنی تالیفات میں لکھے ہیں لیکن چونکہ دید و شنید میں فرق ہے اس لئے مجرد ان قصوں کی سماعت سے ہم کو وہ کیفیت یقینی حاصل نہیں ہو سکتی تھی۔ جو اپنے ذاتی مشاہدہ سے حاصل ہوئی۔ ایک مرتبہ مجھے یاد ہے کہ میں نے عالم کشف میں دیکھا کہ بعض احکام قضاء و قدر میں نے اپنے ہاتھ سے لکھے ہیں کہ آئندہ زمانہ میں ایسا ہوگا اور پھر اس کو دستخط کرانے کے لئے خداوند قادر مطلق جل شانہٗ کے سامنے پیش کیا ہے (اور یاد رکھنا چاہئے کہ مکاشفات اور رویا صالحہ میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بعض صفات جمالیہ یا جلالیہ الٰہیہ انسان کی شکل پر متمثل ہو کر صاحب کشف کو نظر آ جاتے ہیں اور مجازی طور پر وہ یہی خیال کرتا ہے کہ وہی خداوند قادر مطلق ہے اور یہ امر ارباب کشوف میں شائع و متعارف ومعلوم الحقیقت ہے جس سے کوئی صاحب کشف انکار نہیں کر سکتا) غرض وہی صفت جمالی جو بعالم کشف قوت متخیلہ کے آگے ایسی دکھلائی دی تھی جو خداوند قادر مطلق ہے اس ذات بے چون و بے چگون کے آگے وہ کتاب قضاء وقدر پیش کی گئی اور اس نے جو ایک حاکم کی شکل پر متمثل تھا اپنے قلم کو سرخی کی دوات میں ڈبو کر اول اس سرخی کو اس عاجز کی طرف چھڑ کا اور بقیہ سرخی کا قلم کے مونہہ میں رہ گیا اس سے اس کتاب پر دستخط کر دیئے اور ساتھ ہی وہ حالت کشفیہ دور ہو گئی اور آنکھ کھول جب خارج میں دیکھا تو کئی قطرات سرخی کے تازہ بہ تازہ کپڑوں پر پڑے چنانچہ ایک صاحب عبداللہ نام جو سنور ریاست پٹیالہ کے رہنے والے تھے اور اس وقت اس عاجز کے پاس نزدیک ہو کر بیٹھے ہوئے تھے دو یا تین قطرہ سرخی کے ان

کلام یہ کہ بسیط چیز کا عدم محض سے پیدا کرنا عالم امر میں سے ہے اور مرکب چیز کو کسی شکل یا ہیئت خاص سے متشکل کرنا عالم خلق سے ہے جیسے اللہ تعالیٰ دوسرے مقام میں قرآن شریف میں فرماتا ہے...... اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ (الاعراف:۵۵) یعنے بسائط کا عدم محض سے پیدا کرنا اور مرکبات کو ظہور خاص میں لانا دونوں خدا کا فعل ہیں اور بسیط اور مرکب دونوں خدائے

کی ٹوپی پر پڑے۔ پس وہ سرخی جو ایک امر کشفی تھا وجود خارجی پکڑ کر نظر آ گئی۔ اسی طرح اور کئی مکاشفات میں جن کا لکھنا موجب تطویل ہے مشاہدہ کیا گیا ہے اور اپنے ذاتی تجارب سے ثابت ہو گیا جو بلاشبہ امور کشفیہ کبھی کبھی باذنہٖ تعالیٰ وجود خارجی پکڑتے ہیں یہ امور عقل کے ذریعہ سے ہرگز ذہن نشین نہیں ہو سکتے بلکہ جو شخص عقل کے گھمنڈ اور غرور میں پھنسا ہوا ہے وہ ایسی باتوں کو سنتا ہے نہایت تکبر سے کہے گا کہ یہ سراسر محال اور خیال باطل ہے اور ایسا کہنے والا یا تو دروغگو ہے یا دیوانہ یا اس کو سادہ لوحی کی وجہ سے دھوکا لگا ہے اور یہ باعث نقصان تحقیق بات کی تہ تک پہنچنے سے محروم رہ گیا ہے لیکن افسوس تو یہ ہے کہ ان عقلمندوں کو کبھی یہ خیال نہیں آتا کہ وہ امور جن کی صداقت پر ہزارہا عارف وراستباز اپنے ذاتی تجارب سے شہادتیں دے گئے ہیں۔ اور اب بھی دیتے ہیں اور صحبت گزین پر ثابت کر دینے کے لئے بفضلہٖ تعالیٰ اپنی ذمہ داری لیتے ہیں کیا وہ ایسے خفیف امور ہیں جو صرف منکرانہ زبان ہلانے سے باطل ہو سکتے ہیں اور حق بات تو یہ ہے کہ عالم کشف کے عجائبات تو ایک طرف رہے جو عالم عقل ہے یعنے جس عالم تک عقل کی رسائی ہونا ممکن ہے اس عالم کا بھی ابھی تک عقل نے تصفیہ نہیں کیا اور لاکھوں اسرار الٰہی پردہ غیب میں دبے پڑے ہیں۔ جن کی عقلمندوں کو ہوا تک نہیں پہنچی۔ ایک فصلی مکھی جو پلید اور ناپاک زخموں پر بیٹھتی ہے اور اکثر گدھے یا بیل وغیرہ جو زخمی اور مجروح ہوں ان کو ستاتی ہے اس کے اس عجیب خاصہ پر کوئی فلسفی دلیل عقلی نہیں بتلا سکتا کہ وہ اکثر برسات میں تکون کے طور پر پیدا ہو جاتی ہے اور اس کی اولاد صرف کیڑے ہوتے ہیں کہ جو ایک ایک سیکنڈ میں دس دس بیس بیس تیس تیس اس کے اندر سے نکلتے جاتے ہیں کیا یہ عقل کے برخلاف ہے یا نہیں کہ مادہ اور نر دونوں نوع واحد میں داخل ہوں اور ان کے بچے ایسے ہوں کہ اس نوع سے بکلی خارج ہوں۔ ایسا ہی اگر چھپکلی کو (جس کو پنجاب میں کرلی کہتے ہیں) درمیان سے کاٹا جائے تو اس کا نیچے اور اوپر کا دھڑ دونوں الگ الگ تڑپتے ہیں اور مضطربانہ حرکت کرتے ہیں اگر بقول پنڈت دیانند صاحب روح بھی جسم کی قسم ہے تو اس سے ضرور لازم آتا ہے کہ روح دو ٹکڑے ہو گیا ہو اور اگر روح کو جسم اور جسمانی ہونے سے منزہ خیال کریں اور اس کا تعلق جسم سے ایسا ہی مجہول الکیفیت وبرتر از عقل وفہم خیال کریں جیسے روح کا حدوث برتر از عقل و فہم ہے تو پھر البتہ کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا۔ ہاں پنڈت دیانند کا مذہب جڑھ سے اکھڑتا ہے۔ اسی طرح

تعالیٰ کی پیدائش ہے اب ماسٹر صاحب! دیکھا کہ یہ کیسی اعلیٰ اور عمدہ صداقت ہے جس کو ایک مختصر آیت اور چند معدود لفظوں میں خدائے تعالیٰ نے ادا کر دیا۔ اس کے مقابلہ پر اگر آپ وید کے عقیدہ کو سوچیں تو جتنا شرمندہ ہوں اتنا ہی تھوڑا ہے اسی وجہ سے تو ہم نے آپ کو ایک خاموش درویش کا قصہ سنایا اگر آپ ایسے ایسے فضول اور خام شبہات کے پیش کرنے سے زبان بند رکھتے تو ہمیں آپ کی حیثیت علمی پر وہ شک نہ پڑتا جواب پڑ گیا ہے۔ بالآخر ہم یہ بھی لکھنا چاہتے ہیں کہ اگر ماسٹر صاحب کے دل میں یہ خیال ہے کہ قرآن شریف میں علم روح بیان نہیں کیا گیا اور وید میں بیان کیا گیا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کیفیت روح سے کچھ خبر نہ تھی مگر وید کے چاروں رشیوں کو خبر تھی تو اس بات کا تصفیہ نہایت سہل اور آسان ہے اور وہ یہ ہے کہ ماسٹر صاحب مقابلہ کرنے کے عہد پر ہم کو اجازت دیں تا ہم علم روح کو جو قرآن شریف میں لکھا ہے جس سے معرفت کاملہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم وکمالیت قرآن شریف ثابت ہوتی ہے ایک مستقل رسالہ میں مرتب کر کے بحوالہ آیات قرآنی شائع کر دیں اور جب یہ رسالہ ہماری طرف سے چھپ کر شائع ہو جائے تو اس وقت ماسٹر صاحب پر واجب ولازم ہوگا کہ اس کے مقابل پر وید کی شرتیوں کے ساتھ ایک رسالہ مرتب کریں، جس میں روح کے بارے میں وید کی فلاسفی بیان کی گئی ہے کہ وہ کیونکر غیر مخلوق اور خدا کی طرح قدیم اور خدا سے الگ چلی آتی ہے اور اس کے خواص کیا کیا ہیں مگر ہم دونوں فریقوں پر لازم ہوگا کہ اپنی اپنی کتاب سے باہر نہ جائیں اور کوئی خود تراشیدہ خیال پیش نہ کریں۔ بلکہ وہی بات پیش کریں جو اپنی کتاب الہامی نے پیش کی ہے اور اس آیت یا

عقلمندوں کی عقل ناقص کی تراش وخراش پر بہت اعتراض اٹھتے ہیں اور ان کو آخر کار نہایت شرمساری سے موتہہ کے بل گرنا پڑتا ہے اور پھر انجام کار بہت خوار اور ذلیل ہو کر اسی بات کا اقرار کرتے ہیں کہ خدائے تعالیٰ کی بے انتہا عجیب وغریب قدرتوں کا احاطہ کرنا انسان کا کام نہیں۔

ہر چہ دانا کند کند نادان   لیک بعد از کمال رسوائی

منہ

شرتی کو بہ پتہ خاص معہ ترجمہ لکھ بھی دیں تا کہ ناظرین رائے لگا سکیں کہ آیا وہ بات اس سے نکلتی ہے یا نہیں۔ سو اگر اس شرط سے ماسٹر صاحب مقابلہ کر دکھائیں یا کوئی اور شخص جو آریوں کے ممتاز علماء میں سے ہو تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ ایسے شخص کو خواہ ماسٹر صاحب ہوں یا منشی اندرمن صاحب مراد آبادی یا منشی جیونداس صاحب سیکرٹری آریہ سماج لاہور یا کوئی اور صاحب جو اس گروہ میں مسلم العلم ہوں سو روپیہ نقد انعام دوں گا اور یہ روپیہ فریق مخالف کی تسلی خاطر کے لئے پہلے ہی کسی فاضل برہمو صاحب کے پاس جیسے بابو نوبین چندر رائے صاحب و پنڈت شیو نارائن صاحب اگنی ہوتری ہیں بطور امانت جمع کرایا جائے گا اور انہیں اختیار ہوگا کہ اگر وہ اپنی رائے میں دیکھیں کہ حقیقت میں آریہ صاحب نے وید کا مقابلہ کر دکھایا تو خود بخود بغیر اجازت ایں جانب وہ روپیہ اس آریہ صاحب کے حوالہ کر دیں۔ لیکن اگر اس مضمون کو پڑھ کر پھر بھی ماسٹر صاحب یا ان کے کوئی دوسرے باعلم بھائی خاموش رہے اور مجھ کو بوعدہ مقابلہ ایسے رسالہ کی تالیف کے لئے تحریک نہ کی تو پھر تمام ناظرین کو سمجھنا چاہئے کہ ان کی سب آوازیں طبل تہی ہیں اور صادقوں کے طریق پر وہ چلنا چاہتے ہی نہیں۔ بھلا یہ کیا اوباشانہ طریق ہے اوّل خدائے تعالیٰ کی پاک کلام اور اس کے کامل نبی کی نسبت ہتک اور توہین کے کلمات مونہہ پر لائیں اور جب مقابلہ وید و قرآن کے لئے کہا جائے تو پھر ایسے چپ ہوں کہ گویا دنیا سے کوچ کر گئے۔ ناظرین سوچ لیں کہ اس سے بڑھ کر اور کیا صفائی کی بات ہوگی کہ ہم مغلوب ہونے کی حالت میں سو روپیہ نقد دینا وعدہ کرتے ہیں اور غالب ہونے کی حالت میں ہم کچھ بھی نہیں مانگتے صرف یہ امید رکھتے ہیں کہ کوئی روح بے راہی کے طریق سے نادم ہو کر سچائی کا طریق اختیار کرے۔ سو اب ہم منتظر رہیں گے کہ کب لالہ مرلیدھر صاحب یا ان کے کوئی اور آریہ بھائی جو اپنی قوم میں امتیاز علمی رکھتے ہوں ایسی درخواست کریں گے۔ تا سیہ روئے شود ہر کہ درو غش باشد۔

(سرمہ چشم آریہ، روحانی خزائن جلد نمبر ۲ صفحہ ۱۸۱ تا ۱۸۲)

کفار کی طرف سے دشنام طرازی کا الزام

کفار نے آنحضرتؐ پر دشنام طرازی کرنے کا الزام بھی لگایا۔اس کا جواب حضرت مسیح موعود علیہ السلام ان الفاظ میں تحریر فرماتے ہیں:

اِس سوال کا جواب ہمارے سیّد و مولیٰ مادر و پدرم براوفدا باد حضرت ختم المرسلین سیّد الاولین والآخرین پہلے سے دے چکے ہیں اور وہ یہ ہے کہ جب یہ آیتیں اتریں کہ مشرکین رجس ہیں پلید ہیں شرّ البریّہ ہیں سفہاء ہیں اور ذرّیت شیطان ہیں اور ان کے معبود **وقود النّار** اور **حصب جھنم** ہیں تو ابو طالب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بلا کر کہا کہ اے میرے بھتیجے اب تیری دشنام دہی سے قوم سخت مشتعل ہوگئی ہے اور قریب ہے کہ تجھ کو ہلاک کریں اور ساتھ ہی مجھ کو بھی۔تو نے ان کے عقلمندوں کو سفیہ قرار دیا اور ان کے بزرگوں کو شرّ البریّہ کہا اور ان کے قابل تعظیم معبودوں کا نام ہیزم جہنّم اور وقود النّار رکھا اور عام طور پر ان سب کو رجس اور ذرّیت شیطان اور پلید ٹھہرایا میں تجھے خیر خواہی کی راہ سے کہتا ہوں کہ اپنی زبان کو تھام اور دشنام دہی سے باز آجا ورنہ میں قوم کے مقابلہ کی طاقت نہیں رکھتا۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں کہا کہ اے چچا یہ دشنام دہی نہیں ہے بلکہ اظہار واقعہ اور نفس الامر کا عین محل پر بیان ہے اور یہی تو کام ہے جس کے لئے میں بھیجا گیا ہوں اگر اس سے مجھے مرنا درپیش ہے تو میں بخوشی اپنے لئے اس موت کو قبول کرتا ہوں میری زندگی اسی راہ میں وقف ہے مَیں موت کے ڈر سے اظہار حق سے رک نہیں سکتا اور اے چچا اگر تجھے اپنی کمزوری اور اپنی تکلیف کا خیال ہے تو تُو مجھے پناہ میں رکھنے سے دست بردار ہو جا بخدا مجھے تیری کچھ بھی حاجت نہیں میں احکام الٰہی کے پہنچانے سے کبھی نہیں رکوں گا مجھے اپنے مولیٰ کے احکام جان سے زیادہ عزیز ہیں بخدا اگر میں اس راہ میں مارا جاؤں تو چاہتا ہوں کہ پھر بار بار زندہ ہو کر ہمیشہ اسی راہ میں مرتا رہوں۔یہ خوف کی جگہ نہیں بلکہ مجھے اس میں بے انتہا لذت ہے کہ اس کی راہ میں دکھ اٹھاؤں۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ تقریر کر رہے تھے اور چہرہ پر سچائی اور نورانیّت سے بھری ہوئی رقت نمایاں ہو رہی تھی

اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ تقریر ختم کر چکے تو حق کی روشنی دیکھ کر بے اختیار ابو طالب کے آنسو جاری ہو گئے اور کہا کہ میں تیری اِس اعلیٰ حالت سے بے خبر تھا تُو اور ہی رنگ میں اور اَور ہی شان میں ہے جا اپنے کام میں لگا رہ جب تک میں زندہ ہوں جہاں تک میری طاقت ہے میں تیرا ساتھ دوں گا۔ اب حاصل کلام یہ ہے کہ جو کچھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو طالب کے اعتراض کا خود اپنی زبان مبارک سے جواب دیا درحقیقت وہی جواب ہر یک معترض کے ساکت کرنے کے لئے کافی ووافی ہے کیونکہ دشنام دہی اور چیز ہے اور بیان واقعہ کا گو وہ کیسا ہی تلخ اور سخت ہو دوسری شے ہے ہر یک محقق اور حق گو کا یہ فرض ہوتا ہے کہ سچی بات کو پورے پورے طور پر مخالف گم گشتہ کے کانوں تک پہنچا دیوے پھر اگر وہ سچ کو سن کر افروختہ ہو تو ہوا کرے ہمارے علماء جو اس جگہ لَا تَسُبُّوْا کی آیت پیش کرتے ہیں میں حیران ہوں کہ اس آیت کو ہمارے مقصد اور مدعا سے کیا تعلق ہے۔ اس آیت کریمہ میں تو صرف دُشنام دہی سے منع فرمایا گیا ہے نہ یہ کہ اظہار حق سے روکا گیا ہو اگر نادان مخالف حق کی مرارت اور تلخی کو دیکھ کر دشنام دہی کی صورت میں اس کو سمجھ لیوے اور پھر مشتعل ہو کر گالیاں دینی شروع کرے تو کیا اس سے امر معروف کا دروازہ بند کر دینا چاہئے؟ کیا اس قسم کی گالیاں پہلے کفار نے کبھی نہیں دیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حق کی تائید کے لئے صرف الفاظ سخت ہی استعمال نہیں فرمائے بلکہ بُت پرستوں کے ان بتوں کو جو اُن کی نظر میں خدائی کا منصب رکھتے تھے اپنے ہاتھ سے توڑا بھی ہے۔ اسلام نے مداہنہ کو کب جائز رکھا اور ایسا حکم قرآن شریف کے کس مقام میں موجود ہے بلکہ اللہ جلّشانہٗ مداہنہ کی ممانعت میں صاف فرماتا ہے کہ جو لوگ اپنے باپوں یا اپنی ماؤں کے ساتھ بھی ان کی کفر کی حالت میں مداہنہ کا برتاؤ کریں وہ بھی ان جیسے ہی بے ایمان ہیں اور کفار مکہ کی طرف سے حکایت کر کے فرماتا ہے: وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ (القلم:۱۰) یعنی اس بات کو کفار مکہ دوست رکھتے ہیں کہ اگر تُو حق پوشی کی راہ سے نرمی اختیار کرے تو وہ بھی تیرے دین میں ہاں میں ہاں ملا دیا کریں مگر ایسا ہاں میں ہاں ملانا خدائے تعالیٰ کو منظور نہیں"۔

(ازالہ اوہام، روحانی خزائن جلد نمبر ۳ صفحہ ۱۱۰ تا ۱۱۳)

یہ اعتراض کہ رسول ہوتے تو سوالوں سے لاچار اور غلط جواب نہ دیتے

ایک عیسائی عبداللہ جیمز نے یہ اعتراض کیا کہ اگر آپ پیغمبر اور رسول اللہ ہوتے تو لوگوں کے سوالوں سے لاچار اور انہیں غلط جواب نہ دیتے۔ اس اعتراض کا تفصیلی جواب دیتے ہوئے حضرت مسیح موعود علیہ السلام تحریر فرماتے ہیں کہ:

جن خیالات کو عیسائی صاحب نے اپنی عبارت میں بصورت اعتراض پیش کیا ہے وہ درحقیقت اعتراض نہیں ہیں بلکہ وہ تین غلط فہمیاں ہیں جو بوجہ قلّتِ تدبّر اُن کے دل میں پیدا ہوگئی ہیں۔ ذیل میں ہم ان غلط فہمیوں کو دُور کرتے ہیں۔

پہلی غلط فہمی کی نسبت جواب یہ ہے کہ نبی برحق کی یہ نشانی ہرگز نہیں ہے کہ خدائے تعالیٰ کی طرح ہر ایک مخفی بات کا بالاستقلال اس کو علم بھی ہو بلکہ اپنے ذاتی اقتدار اور اپنی ذاتی خاصیت سے عالم الغیب ہونا خدائے تعالیٰ کی ذات کا ہی خاصہ ہے۔ قدیم سے اہل حق حضرت واجب الوجود کے علم غیب کی نسبت وجوبِ ذاتی کا عقیدہ رکھتے ہیں اور دوسرے تمام ممکنات کی نسبت امتناعِ ذاتی اور امکان بالواجب **عزّاسمہٗ** کا عقیدہ ہے۔ یعنی یہ عقیدہ کہ خدائے تعالیٰ کی ذات کے لئے عالم الغیب ہونا واجب ہے اور اس کی ہُویّتِ حقّہ کی یہ ذاتی خاصیت ہے کہ عالم الغیب ہو مگر ممکنات کے جو **ھالکۃ الذات** اور **باطلۃ الحقیقت** ہیں اس صفت میں اور ایسا ہی دوسری صفات میں شراکت بحضرت باری **عزّاسمہٗ** جائز نہیں اور جیسا ذات کی رو سے شریک الباری ممتنع ہے ایسا ہی صفات کی رو سے بھی ممتنع ہے۔ پس ممکنات کیلئے **نظراً علی ذاتھم** عالم الغیب ہونا **ممتنعات** میں سے ہے۔ خواہ نبی ہوں یا محدّث ہوں یا ولی ہوں، ہاں الہام الٰہی سے اسرارِ غیبیہ کو معلوم کرنا یہ ہمیشہ خاص اور برگزیدہ کو حصہ ملتا رہا ہے اور اب بھی ملتا ہے جس کو ہم صرف تابعین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں پاتے ہیں نہ کسی اور میں۔ عادت اللہ اسی طرح پر جاری ہے کہ وہ کبھی کبھی اپنے مخصوص بندوں کو اپنے بعض اَسرارِ خاصہ پر مطلع کر دیتا ہے اور اوقاتِ مقررہ اور مقدرہ میں رشحِ فیضِ غیب ان پر ہوتا ہے بلکہ کامل مقرب اللہ اسی سے آزمائے

جاتے ہیں اور شناخت کیئے جاتے ہیں کہ بعض اوقات آئندہ کی پوشیدہ باتیں یا کچھ چھپے اسرار اُنہیں بتلائے جاتے ہیں مگر یہ نہیں کہ ان کے اختیار اور ارادہ اور اقتدار سے بلکہ خدائے تعالیٰ کے ارادہ اور اختیار اور اقتدار سے یہ سب نعمتیں انہیں ملتی ہیں۔

وہ جو اس کی مرضی پر چلتے ہیں اور اُسی کے ہو رہتے اور اسی میں کھوئے جاتے ہیں اس خیر محض کی ان سے کچھ ایسی ہی عادت ہے کہ اکثر ان کی سنتا اور اپنا گزشتہ فعل یا آئندہ کا منشاء بسا اوقات ان پر ظاہر کر دیتا ہے۔ مگر بغیر اعلامِ الٰہی انہیں کچھ بھی معلوم نہیں ہوتا وہ اگر چہ خدائے تعالیٰ کے مقرب تو ہوتے ہیں مگر خدا تو نہیں ہوتے سمجھائے سمجھتے ہیں، بتلائے جانتے ہیں، دکھلائے دیکھتے ہیں بلائے بولتے ہیں اور اپنی ذات میں کچھ بھی نہیں ہوتے۔ جب طاقت عظمٰی انہیں اپنے الہام کی تحریک سے بلاتی ہے تو وہ بولتے ہیں اور جب دکھلاتی ہے تو دیکھتے ہیں اور جب سناتی ہے تو سنتے ہیں اور جب تک خدائے تعالیٰ ان پر کوئی پوشیدہ بات ظاہر نہیں کرتا تب تک انہیں اس بات کی کچھ بھی خبر نہیں ہوتی۔ تمام نبیوں کے حالات زندگی (لائف) میں اس کی شہادت پائی جاتی ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام کی طرف ہی دیکھو کہ وہ کیونکر اپنی لاعلمی کا آپ اقرار کر کے کہتے ہیں کہ اُس دن اور اس گھڑی کی بابت سوا باپ کے نہ تو فرشتے جو آسمان پر ہیں، نہ بیٹا، کوئی نہیں جانتا۔ باب ۱۳۔ آیت ۳۲ مرقس۔ اور پھر وہ فرماتے ہیں کہ میں آپ سے کچھ نہیں کرتا (یعنی کچھ نہیں کر سکتا) مگر جو میرے باپ نے سکھلایا وہ باتیں کہتا ہوں۔ کسی کو راستبازوں کے مرتبہ تک پہنچانا میرے اختیار میں نہیں۔ مجھے کیوں نیک کہتا ہے نیک کوئی نہیں مگر ایک یعنی خدا۔ مرقس۔ (مرقس باب ۱۰ آیت ۱۸)

غرض کسی نبی نے بااقتدار یا عالم الغیب ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ دیکھو اس عاجز بندہ کی طرف جس کو مسیح کر کے پکارا جاتا ہے اور جسے نادان مخلوق پرستوں نے خدا سمجھ رکھا ہے کہ کیسے اس نے ہر مقام میں اپنے قول اور فعل سے ظاہر کر دیا کہ میں ایک ضعیف اور کمزور اور ناتواں بندہ ہوں اور مجھ میں ذاتی طور پر کوئی بھی خوبی نہیں اور آخری اقرار جس پر ان کا خاتمہ ہوا کیسا پیارے لفظوں میں ہے۔ چنانچہ انجیل میں یوں لکھا ہے کہ وہ یعنی مسیح (اپنی گرفتاری کی خبر پا کر) گھبرانے

اور بہت دلگیر ہونے لگا اور ان سے (یعنی اپنے حواریوں سے) کہا کہ میری جان کا غم موت کا سا ہے اور وہ تھوڑا آگے جا کر زمین پر گر پڑا (یعنی سجدہ کیا) اور دعا مانگی کہ اگر ہو سکے تو یہ گھڑی مجھ سے ٹل جائے اور کہا کہ اے ابا! اے باپ! سب کچھ تجھ سے ہو سکتا ہے۔ اس پیالہ کو مجھ سے ٹال دے۔ یعنی تو قادرِ مطلق ہے اور میں ضعیف اور عاجز بندہ ہوں۔ تیرے ٹالنے سے یہ بلا ٹل سکتی ہے اور آخر ایلی ایلی لما سبقتنی کہہ کر جان دی۔ جس کا ترجمہ یہ ہے کہ "اے میرے خدا اے میرے خدا!!! تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا۔"

اب دیکھئے کہ اگرچہ دعا تو قبول نہ ہوئی کیونکہ تقدیر مبرم تھی۔ ایک مسکین مخلوق کی خالق کے قطعی ارادہ کے آگے کیا پیش جاتی تھی۔ مگر حضرت مسیح نے اپنی عاجزی اور بندگی کے اقرار کو نہایت تک پہنچا دیا۔ اس امید سے کہ شاید قبول ہو جائے۔ اگر انہیں پہلے سے علم ہوتا کہ دعا رڈ کی جائے گی ہرگز قبول نہیں ہوگی تو وہ ساری رات برابر فجر تک اپنے بچاؤ کے لئے کیوں دعا کرتے رہتے اور کیوں اپنے تئیں اور اپنے حواریوں کو بھی تقید سے اس لا حاصل مشقت میں ڈالتے۔

سو بقول معترض صاحب ان کے دل میں یہی تھا کہ انجام خدا کو معلوم ہے مجھے معلوم نہیں۔ پھر ایسا ہی حضرت مسیح کی بعض پیشگوئیوں کا صحیح نہ نکلنا دراصل اسی وجہ سے تھا کہ بباعث عدم علم بر اسرارِ مخفیہ اجتہادی طور پر تشریح کرنے میں اُن سے غلطی ہو جاتی تھی جیسا کہ آپ نے فرمایا تھا کہ جب نئی خلقت میں ابن آدم اپنے جلال کے تخت پر بیٹھے گا تم بھی (اے میرے بارہ حواریو) بارہ تختوں پر بیٹھو گے۔ دیکھو باب ۲۰۔ آیت ۲۸۔ متی۔

لیکن اسی انجیل سے ظاہر ہے کہ یہودا اسکریوطی اس تخت سے بے نصیب رہ گیا۔ اس کے کانوں نے تخت نشینی کی خبر سن لی مگر تخت پر بیٹھنا اُسے نصیب نہ ہوا اب راستی اور سچائی سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر حضرت مسیح کو اس شخص کے مرتد اور بد عاقبت ہونے کا پہلے سے علم ہوتا تو کیوں اس کو تخت نشینی کی جھوٹی خوش خبری سناتے۔ ایسا ہی ایک مرتبہ آپ ایک انجیر کا درخت دور سے دیکھ کر انجیر کھانے کی نیت سے اس کی طرف گئے مگر جا کر جو دیکھا تو معلوم ہوا کہ اس پر ایک بھی انجیر نہیں تو آپ بہت ناراض ہوئے اور غصہ کی حالت میں اس انجیر کو بد دعا دی جس کا کوئی

بداثر انجیر پر ظاہر نہ ہوا۔اگر آپ کو کچھ غیب کا علم ہوتا تو بے ثمر درخت کی طرف اس کا پھل کھانے کے ارادہ سے کیوں جاتے۔

ایسا ہی ایک مرتبہ آپ کے دامن کو ایک عورت نے چھوا تھا تو آپ چاروں طرف پوچھنے لگے کہ کس نے میرا دامن چھوا ہے؟ اگر کچھ علم غیب سے حصہ ہوتا تو دامن چھونے والے کا پتہ معلوم کرنا تو کچھ بڑی بات نہ تھی ایک اور مرتبہ آپ نے یہ پیشگوئی بھی کی تھی کہ اس زمانہ کے لوگ گزر نہ جائیں گے جب تک یہ سب کچھ (یعنی مسیح کا دوبارہ دنیا میں آنا اور ستاروں کا گرنا وغیرہ) واقع نہ ہووے لیکن ظاہر ہے کہ نہ اس زمانہ میں کوئی ستارہ آسمان کا زمین پر گرا اور نہ حضرت مسیح عدالت کیلئے دنیا میں آئے اور وہ صدی تو کیا اس پر اٹھارہ صدیاں اور بھی گزر گئیں اور انیسویں گزرنے کو عنقریب ہے۔سو حضرت مسیح کے علم غیب سے بے بہرہ ہونے کے لئے یہی چند شہادتیں کافی ہیں جو کسی اور کتاب سے نہیں بلکہ چاروں انجیلوں سے دیکھ کر ہم نے لکھی ہیں دوسرے اسرائیلی نبیوں کا بھی یہی حال ہے۔حضرت یعقوب نبی ہی تھے مگر انہیں کچھ خبر نہ ہوئی کہ اُسی گاؤں کے بیابان میں میرے بیٹے پر کیا گزر رہا ہے۔حضرت دانیال اس مدت تک کہ خدائے تعالیٰ نے بخت نصر کے رؤیا کی ان پر تعبیر کھول دی کچھ بھی علم نہیں رکھتے تھے کہ خواب کیا ہے اور اس کی تعبیر کیا ہے؟

پس اس تمام تحقیق سے ظاہر ہے کہ نبی کا یہ کہنا کہ یہ بات خدا کو معلوم ہے مجھے معلوم نہیں، بالکل سچ اور اپنے محل پر چسپاں اور سراسر اس نبی کا شرف اور اس کی عبودیت کا فخر ہے بلکہ ان باتوں سے اپنے آقائے کریم کے آگے اس کی شان بڑھتی ہے نہ یہ کہ اس کے منصب نبوت میں کچھ فتور لازم آتا ہے۔ہاں اگر یہ تحقیق منظور ہو کہ خدائے تعالیٰ کے اعلام سے جو اسرار غیب حاصل ہوتے ہیں وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کس قدر رہوئے تو میں ایک بڑا ثبوت اس بات کا پیش کرنے کیلئے تیار ہوں کہ جس قدر توریت وانجیل اور تمام بائبل میں نبیوں کی پیشگوئیاں لکھی ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش گوئیاں کَمًّا وَ کَیْفًا ہزار حصہ سے بھی ان سے زیادہ ہیں جن کی تفصیل احادیث نبویہ کی رو سے جو بڑی تحقیق سے قلم بند کی گئی ہیں، معلوم ہوتی

ہے اور اجمالی طور پر مگر کافی اور اطمینان بخش اور نہایت مؤثر بیان قرآن شریف میں موجود ہے۔ پھر دیگر اہل مذاہب کی طرح مسلمانوں کے ہاتھ میں صرف قصہ ہی نہیں بلکہ وہ تو ہر صدی میں غیر قوموں کو کہتے رہے ہیں اور اب بھی کہتے ہیں کہ یہ سب برکات اسلام ہیں ہمیشہ کے لئے موجود ہیں۔ بھائیو! آؤ اوّل آزماؤ پھر قبول کرو۔ مگر اُن آوازوں کو کوئی نہیں سنتا۔ حجت الٰہی ان پر پوری ہے کہ ہم بلاتے ہیں وہ نہیں آتے اور ہم دکھاتے ہیں وہ نہیں دیکھتے۔ انہوں نے آنکھوں اور کانوں کو بکلّی ہم سے پھیر لیا تا نہ ہو کہ وہ سنیں اور دیکھیں اور ہدایت پاویں۔

دوسری غلط فہمی جو معترض نے پیش کی ہے یعنی یہ کہ اصحاب کہف کی تعداد کی بابت قرآن شریف میں غلط بیان ہے یہ نرا دعویٰ ہے۔ معترض نے اس بارے میں کچھ نہیں لکھا کہ وہ بیان کیوں غلط ہے اور اس کے مقابل پر صحیح کونسا بیان ہے اور اس کی صحت پر کون سے دلائل ہیں تا اس کے دلائل پر غور کی جائے اور جواب شافی دیا جائے۔ اگر معترض کو فرقانی بیان پر کچھ کلام تھا تو اس کے وجوہات پیش کرنی چاہئیں تھیں۔ بغیر پیش کرنے وجوہات کے یونہی غلط ٹھہرانا متلاشی حق کا کام نہیں ہے۔

تیسری غلط فہمی معترض کے دل میں یہ پیدا ہوئی ہے کہ قرآن شریف میں لکھا ہے کہ ایک بادشاہ (جس کی سیر و سیاحت کا ذکر قرآن شریف میں ہے) سیر کرتا کرتا کسی ایسے مقام تک پہنچا جہاں اُسے سورج دلدل میں چھپتا نظر آیا۔ اب عیسائی صاحب مجاز سے حقیقت کی طرف رُخ کر کے یہ اعتراض کرتے ہیں کہ سورج اتنا بڑا ہو کر ایک چھوٹے سے دلدل میں کیونکر چھپ گیا۔ یہ ایسی بات ہے جیسے کوئی کہے کہ انجیل میں مسیح کو خدا کا برّہ لکھا ہے یہ کیونکر ہو سکتا ہے۔ برّہ تو وہ ہوتا ہے جس کے سر پر سینگ اور بدن پر پشم وغیرہ بھی ہو اور چارپایوں کی طرح سرنگون چلتا اور وہ چیزیں کھاتا ہو جو برّے کھایا کرتے ہیں؟ اے صاحب! آپ نے کہاں سے اور کس سے سن لیا کہ قرآن شریف نے واقعی طور پر سورج کے دلدل میں چھپنے کا دعویٰ کیا ہے۔ قرآن شریف تو فقط بمنصب نقل خیال اس قدر فرماتا ہے کہ اس شخص کو اس کی نگاہ میں دلدل میں سورج چھپتا ہوا معلوم ہوا۔ سو یہ تو ایک شخص کی رویت کا حال بیان کیا گیا ہے کہ وہ ایسی جگہ پہنچا جس جگہ سورج

کسی پہاڑ یا آبادی یا درختوں کی اوٹ میں چھپتا ہوا نظر نہیں آتا تھا جیسا کہ عام دستور ہے بلکہ دلدل میں چھپتا ہوا معلوم دیتا تھا۔ مطلب یہ کہ اُس جگہ کوئی آبادی یا درخت یا پہاڑ نزدیک نہ تھے بلکہ جہاں تک نظر وفا کرے ان چیزوں میں سے کسی چیز کا نشان نظر نہیں آتا تھا فقط ایک دلدل تھا جس میں سورج چھپتا دکھائی دیتا تھا۔

ان آیات کا سیاق سباق دیکھو کہ اس جگہ حکیمانہ تحقیق کا کچھ ذکر بھی ہے فقط ایک شخص کی دُور دراز سیاحت کا ذکر ہے اوران باتوں کے بیان کرنے سے اسی مطلب کا اثبات منظور ہے کہ وہ ایسے غیر آباد مقام پر پہنچا۔ سو اس جگہ ہیئت کے مسائل لے بیٹھنا بالکل بے محل نہیں تو اور کیا ہے؟ مثلاً اگر کوئی کہے کہ آج رات بادل وغیرہ سے آسمان خوب صاف ہو گیا تھا اور ستارے آسمان کے نقطوں کی طرح چمکتے ہوئے نظر آتے تھے تو اس سے یہ جھگڑا لے بیٹھیں کہ کیا ستارے نقطوں کی مقدار پر ہیں اور ہیئت کی کتابیں کھول کھول کر پیش کریں تو بلاشبہ یہ حرکت بے خبروں کی سی حرکت ہو گی کیونکہ اس وقت **متکلّم** کی نیت میں واقعی امر کا بیان کرنا مقصود نہیں وہ تو صرف مجازی طور پر جس طرح ساری دنیا جہان بولتا ہے بات کر رہا ہے۔ اے وہ لوگو! جو عشائے ربّانی میں مسیح کا لہو پیتے اور گوشت کھاتے ہو کیا ابھی تک تمہیں مجازات اور استعارات کی خبر نہیں؟ سب جانتے ہیں کہ ہر ایک ملک کی عام بول چال میں مجازات اور استعارات کے استعمال کا نہایت وسیع دروازہ کھلا ہے اور وحی الٰہی انہیں محاورات و استعارات کو اختیار کرتی ہے جو سادگی سے عوامُ النّاس نے اپنی روزمرہ کی بات چیت اور بول چال میں اختیار کر رکھی ہیں۔ فلسفہ کی دقیق اصطلاحات کی ہر جگہ اور ہر محل میں پیروی کرنا وحی کی طرز نہیں کیونکہ روئے سخن عوامُ النّاس کی طرف ہے۔ پس ضرور ہے کہ ان کی سمجھ کے موافق اور ان کے محاورات کے لحاظ سے بات کی جائے۔ حقائق ودقائق کا بیان کرنا بجائے خود ہے مگر محاورات کا چھوڑنا اور مجازات اور استعارات عادیہ سے یک لخت کنارہ کش ہونا ایسے شخص کے لئے ہرگز روا نہیں جو عوامُ النّاس سے مذاق پر بات کرنا اس کا فرضِ منصب ہے تا وہ اس کی بات کو سمجھیں اور ان کے دلوں پر اس کا اثر ہو۔ لہٰذا یہ مسلّم ہے کہ کوئی ایسی الہامی کتاب نہیں جس میں مجازات اور استعارات سے کنارہ

کیا گیا ہو یا کنارہ کرنا جائز ہو۔کیا کوئی کلامِ الٰہی دنیا میں ایسا بھی آیا ہے؟ اگر ہم غور کریں تو ہم خود اپنی ہر روزہ بول چال میں صدہا مجازات و استعارات بول جاتے ہیں اور کوئی بھی ان پر اعتراض نہیں کرتا۔مثلاً کہا جاتا ہے کہ ہلال بال سا باریک ہے اور ستارے نقطے سے ہیں یا چاند بادل کے اندر چھپ گیا اور سورج ابھی تک جو پہردن چڑھا ہے نیزہ بھر اوپر آیا ہے یا ہم نے ایک رکابی پلاؤ کی کھائی یا ایک پیالہ شربت کا پی لیا۔تو ان سب باتوں سے کسی کے دل میں یہ دھڑکا شروع نہیں ہوتا کہ ہلال کیونکر بال سا باریک ہوسکتا ہے اور ستارے کس وجہ سے بقدر نقطوں کے ہوسکتے ہیں یا چاند بادل کے اندر کیونکر سما سکتا ہے اور کیا سورج نے باوجود اپنی اس تیز حرکت کے جس سے وہ ہزارہا کوس ایک دن میں طے کر لیتا ہے ایک پہر میں فقط بقدر نیزہ کے اتنی مسافت طے کرے ہے اور نہ رکابی پلاؤ کی کھانے یا پیالہ شربت کا پینے سے یہ کوئی خیال کرسکتا ہے کہ رکابی اور پیالہ کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے کھا لیا ہوگا۔ بلکہ یہ سمجھیں گے کہ جو ان کے اندر چاول اور پانی ہے وہی کھایا پیا ہوگا۔ نہایت صاف بات پر اعتراض کرنا کوئی دانا مخالف بھی پسند نہیں کرتا۔ انصاف پسند عیسائیوں سے ہم نے خود سنا ہے کہ ایسے ایسے اعتراض ہم میں سے وہ لوگ کرتے ہیں جو بے خبر یا سخت درجہ کے متعصب ہیں۔

بھلا یہ کیا حق روی ہے؟ کہ اگر کلامِ الٰہی میں مجاز یا استعارہ کی صورت پر کچھ وارد ہو تو اس بیان کو حقیقت پر حمل کر کے موردِ اعتراض بنایا جائے۔اس صورت میں کوئی الہامی کتاب بھی اعتراض سے نہیں بچ سکتی۔جہاز میں بیٹھنے والے اور اگنبوٹ پر سوار ہونے والے ہر روز یہ تماشا دیکھتے ہیں کہ سورج پانی میں سے ہی نکلتا ہے اور پانی میں ہی غروب ہوتا ہے اور صدہا مرتبہ آپس میں جیسا دیکھتے ہیں، بولتے بھی ہیں کہ وہ نکلا اور وہ غروب ہوا۔اب ظاہر ہے کہ اس بول چال کے وقت میں علم ہیئت کے دفتر اُن کے آگے کھولنا اور نظامِ شمسی کا مسئلہ لے بیٹھنا گویا یہ جواب سننا ہے کہ اے پاگل! کیا یہ علم تجھے ہی معلوم ہے۔ہمیں معلوم نہیں۔

عیسائی صاحب نے قرآن شریف پر تو اعتراض کیا مگر انجیل کے وہ مقامات جن پر حقاً و حقیقتاً اعتراض ہوتا ہے بھولے رہے۔مثلاً بطور نمونہ دیکھو کہ انجیل متی و مرقس میں لکھا ہے کہ مسیح کو

اس وقت آسمان سے خلق اللہ کی عدالت کے لئے اُترتا دیکھو گے جب سورج اندھیرا ہو جائے گا اور چاند اپنی روشنی نہیں دے گا اور ستارے آسمان سے گر جائیں گے۔ اب ہیئت کا علم ہی یہ اشکال پیش کرتا ہے کہ کیونکر ممکن ہے کہ تمام ستارے زمین پر گریں اور سب ٹکڑے ٹکڑے ہو کر زمین کے کسی گوشہ میں جا پڑیں اور بنی آدم کو ان کے گرنے سے کچھ بھی حرج اور تکلیف نہ پہنچے اور سب زندہ اور سلامت رہ جائیں حالانکہ ایک ستارہ کا گرنا بھی سُکَّانُ الْاَرْضِ کی تباہی کیلئے کافی ہے پھر یہ امر بھی قابل غور ہے کہ جب ستارے زمین پر گر کر زمین والوں کو صفحۂ ہستی سے بے نشان و نابود کریں گے تو مسیح کا یہ قول کہ تم مجھے بادلوں میں آسمان سے اُترتا دیکھو گے کیونکر درست ہوگا؟ جب لوگ ہزاروں ستاروں کے نیچے دبے ہوئے مرے پڑے ہوں گے تو مسیح کا اُترنا کون دیکھے گا؟ اور زمین جو ستاروں کی کشش سے ثابت و برقرار ہے کیونکر اپنی حالت صحیحہ پر قائم اور ثابت رہے گی اور مسیح کن برگزیدوں کو (جیسا کہ انجیل میں ہے) دُور دُور سے بلائے گا اور کن کو سرزنش اور تنبیہ کرے گا کیونکہ ستاروں کا گرنا تو بہ بداہت مستلزم عام فنا اور عام موت بلکہ تختۂ زمین کے انقلاب کا موجب ہوگا۔ اب دیکھئے کہ یہ سب بیانات علم ہیئت کے برخلاف ہیں یا نہیں؟ ایسا ہی ایک اور اعتراض علم ہیئت کی رو سے انجیل پر ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ انجیل متی میں دیکھو وہ ستارہ جو انہوں نے (یعنی مجوسیوں نے) پورب میں دیکھا تھا ان کے آگے آگے چل رہا اور اس جگہ کے اوپر جہاں وہ لڑکا تھا جا کر ٹھہرا۔ (باب ۲۔ آیت ۹ متی)

اب عیسائی صاحبان براہ مہربانی بتلاویں کہ علم ہیئت کی رو سے اس عجیب ستارہ کا کیا نام ہے جو مجوسیوں کے ہم قدم اور ان کے ساتھ ساتھ چلا تھا اور یہ کس قسم کی حرکت اور کن قواعد کی رو سے مسلّم الثبوت ہے؟ مجھے معلوم نہیں کہ انجیل متی ایسے ستارہ کے بارے میں ہیئت والوں سے کیونکر پیچھا چھڑا سکتی ہے۔ بعض صاحب تنگ آ کر یہ جواب دیتے ہیں کہ یہ مسیح کا قول نہیں متی کا قول ہے۔ متی کے قول کو ہم الہامی نہیں جانتے۔ یہ خوب جواب ہے جس سے انجیل کے الہامی ہونے کی بخوبی قلعی کھل گئی اور میں بطور تنزل کہتا ہوں کہ گو یہ مسیح کا قول نہیں متی یا کسی اور کا قول ہے مگر مسیح کا قول بھی تو (جس کو الہامی مانا گیا ہے اور جس پر ابھی ہماری طرف سے اعتراض

ہو چکا ہے) اسی کا ہم رنگ اور ہم شکل ہے ذرا اُسی کو اصولِ ہیئت سے مطابق کر کے دکھلایئے اور نیز یہ بھی یاد رہے کہ یہ قول الہامی نہیں بلکہ انسان کی طرف سے انجیل میں ملایا گیا ہے تو پھر آپ لوگ ان انجیلوں کو جو آپ کے ہاتھ میں ہیں تمام بیانات کے اعتبار سے الہامی کیوں کہتے ہو؟ صاف طور پر کیوں مشتہر نہیں کر دیتے کہ بجز چند ان باتوں کے جو حضرت مسیح کے منہ سے نکلی ہیں باقی جو کچھ اناجیل میں لکھا ہے وہ مؤلفین نے صرف اپنے خیال اور اپنی عقل اور فہم کے مطابق لکھا ہے، جو غلطیوں سے مبرا متصور نہیں ہو سکتا۔ جیسا کہ پادری صاحبوں کی عام تحریروں سے مجھے معلوم ہوا ہے کہ یہ رائے عام طور پر مشتہر بھی کی گئی ہے یعنی بالاتفاق انجیلوں کے بارے میں یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ جو کچھ تاریخی طور پر معجزات وغیرہ کا ذکر ان میں پایا جاتا ہے وہ کوئی الہامی امر نہیں بلکہ انجیل نویسوں نے اپنے قیاس یا سماعت وغیرہ وسائل خارجیہ سے لکھ دیا ہے۔ غرض پادری صاحبوں نے اس اقرار سے ان بہت سے حملوں سے جو انجیلوں پر ہوتے ہیں اپنا پیچھا چھڑانا چاہا ہے اور ہر ایک انجیل میں تقریباً دس*۱ حصے انسان کا کلام اور ایک حصہ خدائے تعالیٰ کا کلام مان لیا ہے اور ان اقرارات کی وجہ سے جو جو نقصان انہیں اُٹھانے پڑے۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ عیسوی معجزات ان کے ہاتھ سے گئے اور ان کا کوئی شافی کافی ثبوت ان کے پاس نہ رہا کیونکہ ہر چند انجیل نویسوں نے تاریخی طور پر فقط اپنی طرف سے مسیح کے معجزات انجیلوں میں لکھے ہیں مگر مسیح کا اپنا خالص بیان جو الہامی کہلاتا ہے حواریوں کے بیان سے صریح مبائن و مخالف معلوم ہوتا ہے بلکہ اُسی کی ضد اور نقیض ہے۔ وجہ یہ کہ مسیح نے اپنے بیان میں جس کو الہامی کہا جاتا ہے جا بجا معجزات کے کھلانے سے انکار ہی کیا ہے اور معجزات کے مانگنے والوں کو صاف جواب دے دیا ہے کہ تمہیں کوئی معجزہ دکھلایا نہیں جائے گا۔ چنانچہ ہیرودیس نے بھی مسیح سے معجزہ مانگا تو اُس نے نہ دکھلایا اور بہت سے لوگوں نے اس کے نشان دیکھنے چاہے اور نشانوں کے بارے میں اس سے سوال بھی کیا مگر وہ صاف منکر ہو گیا اور کوئی نشان دکھلا نہ سکا بلکہ اس نے تمام رات جاگ کر خدا تعالیٰ سے یہ نشان مانگا کہ وہ یہودیوں کے ہاتھ سے محفوظ رہے تو یہ نشان بھی اس کو نہ ملا اور دعا رد کی گئی۔ پھر مصلوب ہونے کے بعد یہودیوں نے سچے دل سے کہا کہ

اگر وہ اب صلیب پر سے زندہ ہو کر اُتر آوے تو ہم سب کے سب اس پر ایمان لائیں گے مگر وہ اُتر بھی نہ سکا۔ پس ان تمام واقعات سے صاف ظاہر ہے کہ جہاں تک انجیلوں میں الہامی فقرات ہیں وہ مسیح کو صاحب معجزات ہونے سے صاف جواب دے رہے ہیں اور اگر کوئی ایسا فقرہ ہے بھی کہ جس میں مسیح کے صاحب معجزات ہونے کے بارے میں کچھ خیال کر سکیں تو حقیقت میں وہ فقرہ ذوالوجوہ ہے جس کے اور اور معنی بھی ہو سکتے ہیں۔ کچھ ضروری نہیں معلوم ہوتا کہ اس کو ظاہر پر ہی محمول کیا جائے یا خواہ نخواہ کھینچ تان کر ان معجزات کا ہی مصداق ٹھہرایا جائے جن کا انجیل نویسوں نے اپنی طرف سے ذکر کیا ہے اور کوئی فقرہ خاص حضرت مسیح کی زبان سے نکلا ہوا ایسا نہیں کہ جو وقوع اور ثبوت معجزات پر صاف طور پر دلالت کرتا ہو بلکہ مسیح کے خاص اور پُر زور کلمات کی اسی امر پر دلالت پائی جاتی ہے کہ اُن سے ایک بھی معجزہ ظہور میں نہیں آیا۔☆ تعجب کہ عیسائی لوگ کیوں ان باتوں پر اعتماد و اعتبار نہیں کرتے جو مسیح کا خاص بیان اور الہامی کہلاتی ہیں اور خاص مسیح کے منہ سے نکلی ہیں؟ اور باتوں پر کیوں اعتماد کیا جاتا ہے اور کیوں ان کے قدر سے زیادہ ان پر زور دیا جاتا ہے جو عیسائیوں کے اپنے اقرار کے موافق الہامی نہیں ہیں بلکہ تاریخی طور پر انجیلوں میں داخل ہیں اور الہام کے سلسلہ سے بکلّی خارج ہیں اور الہامی عبارات سے بکلّی ان کا تناقض پایا جاتا ہے۔ پس جب الہامی اور غیر الہامی عبارات میں تناقض ہو تو اس کے دور کرنے کیلئے بجز اس کے اور کیا تدبیر ہے کہ جو عبارتیں الہامی نہیں ہیں وہ نا قابل اعتبار سمجھی جائیں اور صرف انجیل نویسوں کے مبالغات یقین نہ کئے جائیں؟ چنانچہ جا بجا ان کا مبالغہ کرنا ظاہر بھی ہے جیسا کہ یوحنا کی انجیل کی آخری آیت جس پر وہ مقدس انجیل ختم کی گئی ہے یہ ہے۔ ''پر اور بھی بہت سے کام ہیں جو یسوع نے کئے اور اگر وہ جُدا جُدا لکھے جاتے تو میں گمان کرتا ہوں کہ کتابیں جو لکھی جاتیں دنیا میں سما نہ سکتیں''۔ دیکھو کس قدر مبالغہ ہے زمین و آسمان

☆ قرآن شریف میں فقط اس مسیح کے معجزات کی تصدیق ہے جس نے کبھی خدائی کا دعویٰ نہیں کیا کیونکہ مسیح کئی ہوئے ہیں اور ہوں گے اور پھر قرآنی تصدیق ذوالوجوہ ہے جو انجیل نویسوں کے بیان کی ہرگز مصداق نہیں۔منہ

کے عجائبات تو دنیا میں سما گئے مگر مسیح کی تین یا اڑھائی برس کی سوانح دنیا میں سما نہیں سکتی ایسے مبالغہ کرنے والے لوگوں کی روایت پر کیونکر اعتبار کر لیا جاوے۔

ہندوؤں نے بھی اپنے اوتاروں کی نسبت ایسی ہی کتابیں تالیف کی تھیں اور اسی طرح خوب جوڑ جوڑ سے ملا کر جھوٹ کا پل باندھا تھا سو اس قوم پر بھی اس افترا کا نہایت قوی اثر پڑا اور اِس سرے سے ملک کے اُس سرے تک رام رام اور کرشن کرشن دلوں میں رَچ گیا۔ بات یہ ہے کہ مرتب کردہ کتابیں جن میں بہت سا افتراء بھرا ہوا ہو اُن قبروں کی طرح ہوتے ہیں جو باہر سے خوب سفید کی جائیں اور چمکائی جائیں پر اندر کچھ نہ ہو۔ اندر کا حال ان بے خبر لوگوں کو کیا معلوم ہو سکتا ہے جو صدہا برسوں کے بعد پیدا ہوئے اور بنی بنائی کتابیں ایسی متبرک اور بے لوث ظاہر کر کے ان کو دی گئیں کہ گویا وہ اسی صورت اور وضع کے ساتھ آسمان سے اُتری ہیں سو وہ کیا جانتے ہیں کہ دراصل یہ مجموعہ کس طرح طیار کیا گیا ہے؟ دنیا میں ایسی تیز نگاہیں جو پردوں کو چیرتی ہوئی اندر گھس جائیں اور اصل حقیقت پر اطلاع پالیں اور چور کو پکڑ لیں بہت کم ہیں اور افتراء کے جادو سے متاثر ہونے والی روحیں اس قدر ہیں جن کا اندازہ کرنا مشکل ہے اسی وجہ سے ایک عالم تباہ ہو گیا اور ہوتا جاتا ہے۔ نادانوں نے ثبوت یا عدم ثبوت کے ضروری مسئلہ پر کچھ بھی غور نہیں کی اور انسانی منصوبوں اور بندشوں کا جو ایک مستمرہ طریقہ اور نیچرلی امر ہے جو نوع انسان میں قدیم سے چلا آتا ہے اس سے چوکس رہنا نہیں چاہا اور یونہی شیطانی دام کو اپنے پر لے لیا۔ مکّاروں نے اس شریر کیمیا گر کی طرح جو ایک سادہ لوح سے ہزار روپیہ نقد لے کر دس بیس لاکھ کا سونا بنا دینے کا وعدہ کرتا ہے سچا اور پاک ایمان نادانوں کا کھویا اور ایک جھوٹی راستبازی اور جھوٹی برکتوں کا وعدہ دیا جن کا خارج میں کچھ بھی وجود نہیں اور نہ کچھ ثبوت۔ آخر شرارتوں میں، مکروں میں، دنیا پرستیوں میں، نفس امّارہ کی پیروی میں اپنے سے بدتر ان کو کر دیا۔ بالآخر یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اعجازات اور پیشگوئیوں کے بارے میں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے وقوع میں آئیں قرآن شریف کی ایک ذرہ شہادت، انجیلوں کے ایک تو دۂ عظیم سے جو مسیح کے اعجاز وغیرہ کے بارے میں ہو، ہزارہا درجہ بڑھ کر ہے کیوں بڑھ کر ہے؟ اسی وجہ سے کہ خود باقرار تمام

محقق پادریوں کے انجیلوں کا بیان خود حواریوں کا اپنا ہی کلام ہے اور پھر اپنا چشم دید بھی نہیں اور نہ کوئی سلسلہ راویوں کا پیش کیا ہے اور نہ کہیں ذاتی مشاہدہ کا دعویٰ کیا لیکن قرآن شریف میں اعجازات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ خاص خدائے صادق و قدوس کی پاک شہادت ہے۔ اگر وہ صرف ایک ہی آیت ہوتی تب بھی کافی ہوتی۔ مگر الحمدللہ کہ ان شہادتوں سے سارا قرآن شریف بھرا ہوا ہے۔ اب موازنہ کرنا چاہئے کہ کجا خدائے تعالیٰ کی پاک شہادت جس میں کذب ممکن نہیں اور کجا نادیدہ جھوٹ اور مبالغہ آمیز شہادتیں۔ ؎

بہ نزدیک دانائے بیدار دل — جوئے سیم بہتر ز صد تودۂ گِل

افترائی باتوں پر کیوں تعجب کرنا چاہئے۔ ایسا بہت کچھ ہوا ہے اور ہوتا ہے۔ عیسائیوں کو آپ اقرار ہے کہ ہم میں سے بہت لوگ ابتدائی زمانوں میں اپنی طرف سے کتابیں بنا کر اور بہت کچھ کمالات اپنے بزرگوں کے ان میں لکھ کر پھر خدائے تعالیٰ کی طرف اُن کو منسوب کرتے رہے ہیں اور دعویٰ کر دیا جاتا تھا کہ وہ خدائے تعالیٰ کی طرف سے کتابیں ہیں۔ ☆ پس جب کہ قدیم عادت عیسائیوں اور یہودیوں کی یہی جعلسازی چلی آئی ہے تو پھر کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ متی وغیرہ انجیلوں کو اس عادت سے کیوں باہر رکھا جائے؟ حالانکہ اس ساہوکار کی طرح جس کا روزنامچہ اور بہی کھاتہ بوجہ صریح تناقض اور مشکوکیت کے پوشیدہ حال کو

☆ جو کچھ انجیلوں میں ناجائز اور بے ثبوت مبالغہ معجزات حضرت مسیح کی نسبت یا ان کی ناواجب تعریفوں کے بارے میں پایا جاتا ہے۔ اس کی تحقیق کرنا مشکل ہے کہ کب اور کس وقت یہ باتیں انجیلوں میں ملائی گئی ہیں۔ اگرچہ عیسائیوں کو اقرار ہے کہ خود انجیل نویسوں نے یہ باتیں اپنی طرف سے ملا دی ہیں مگر اس عاجز کی دانست میں یہ حاشئے آہستہ آہستہ چڑھے ہیں۔ اور جعلساز مکار پیچھے سے بہت کچھ موقع پاتے رہے ہیں ہاں مستقل طور پر کئی جعلی کتابیں جو الہامی ہونے کے نام سے مشہور ہو گئیں حضرات مسیحوں اور یہودیوں نے اوائل دنوں میں ہی تالیف کر کے شائع کر دی تھیں۔ چنانچہ اسی جعلسازی کی برکت سے بجائے ایک انجیل کے بہت سی انجیلیں شائع ہو گئیں عیسائیوں کا خود یہ بیان ہے کہ مسیح کے بعد جعلی انجیلیں کئی تالیف ہوئیں۔ جیسا کہ منجملہ اُن کے ایک انجیل برنباس بھی ہے۔

ظاہر کر رہا ہو۔ ہر چہار انجیلوں سے وہ کارستانی ظاہر ہو رہی ہے جس کو انہوں نے چھپانا چاہا تھا۔ اسی وجہ سے یورپ اور امریکہ میں غور کرنے والوں کی طبیعتوں میں ایک طوفانِ شکوک پیدا ہو گیا ہے اور جس ناقص اور متغیر اور مجسم خدا کی طرف انجیل رہنمائی کر رہی ہے اس کے قبول کرنے سے وہ دہریہ رہنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ چنانچہ میرے ایک دوست فاضل انگریز نے امریکہ سے بذریعہ اپنی کئی چٹھیوں کے مجھے خبر دی ہے کہ ان ملکوں میں دانشمندوں میں سے کوئی بھی ایسا نہیں کہ عیسائی مذہب کو نقص سے خالی سمجھتا ہو اور اسلام کے قبول کرنے کے لئے مستعد نہ ہو۔ اور گو عیسائیوں نے قرآن شریف کے ترجمے محرف اور بدنما کر کے یورپ اور امریکہ کے

بقیہ حاشیہ: یہ تو عیسائیوں کا بیان ہے۔ مگر میں کہتا ہوں کہ چونکہ اُن انجیلوں اور اناجیل اربعہ مروجہ میں بہت کچھ تناقض ہے یہاں تک کہ برنباس کی انجیل مسیح کے مصلوب ہونے سے بھی منکر اور مسئلہ تثلیث کے بھی مخالف اور مسیح کی الوہیت اور ابنیت کو بھی نہیں مانتی اور نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کے آنے کی صریح لفظوں میں بشارت دیتی ہے۔ تو اب عیسائیوں کے اس دعوی بے دلیل کو کیونکر مان لیا جائے کہ جن انجیلوں کو اُنہوں نے رواج دیا ہے۔ وہ تو سچی ہیں اور جو اُن کے مخالف ہیں وہ سب جھوٹی ہیں۔ ماسوا اس کے جب کہ عیسائیوں میں جعل کی اس قدر گرم بازاری رہی ہے کہ بعض کامل اُستادوں نے پوری پوری انجیلیں بھی اپنی طرف سے بنا کر عام طور پر قوم میں اُنہیں شائع کر دیا اور ایک ذرہ پروں پر پانی پڑنے نہ دیا۔ تو کسی کتاب کا محرف مبدل کرنا اُن کے آگے کیا حقیقت تھا۔ پھر جب کہ یہ بھی تسلیم کر لیا گیا ہے کہ مسیح کے زمانہ میں یہ انجیلیں قلمبند نہیں ہوئیں بلکہ ساٹھ یا ستر برس مسیح کے فوت ہونے کے بعد یا کچھ کم وبیش یا اختلاف روایت اناجیل اربعہ کا مجموعہ دنیا میں پیدا ہوا تو اُس سے ان انجیلوں کی نسبت اور بھی شک پیدا ہوتا ہے۔ کیونکہ اس بات کا ثبوت دینا مشکل ہے کہ اس عرصہ تک حواری زندہ رہے ہوں یا اُن کی قوتیں قائم رہی ہوں۔ اب ہم سب قصوں کو مختصر کر کے ناظرین کو یہ یاد دلاتے ہیں کہ اس بات کا عیسائیوں نے ہرگز صفائی سے ثبوت نہیں دیا کہ بارہ انجیلیں جعلی اور چار جن کو رواج دے رہے ہیں جعل اور تحریف سے مبرا ہیں بلکہ وہ ان چاروں کی نسبت بھی خود اقرار کرتے ہیں کہ وہ خالص خدائے تعالیٰ کا کلام نہیں اور اگر وہ ایسا اقرار بھی نہ کرتے تب بھی انجیلوں کے مغشوش ہونے میں کچھ شک نہیں تھا کیونکہ اس بات کا بارِ ثبوت اُن کے ذمہ ہے۔ جس سے آج تک وہ سبکدوش نہیں ہو سکے کہ کیوں دوسری انجیلیں جعلی اور یہ جعلی نہیں۔

ملکوں میں شائع کیے ہیں مگر ان کے اندر جو نور چھپا ہوا ہے وہ پاکیزہ دلوں پر اپنا کام کر رہا ہے۔
غرض امریکہ اور یورپ آج کل ایک جوش کی حالت میں ہے اور انجیل کے عقیدوں نے جو
برخلاف حقیقت ہیں بڑی گھبراہٹ میں انہیں ڈال دیا ہے یہاں تک کہ بعضوں نے یہ رائے
ظاہر کی کہ مسیح یا عیسیٰ نام (کا) خارج میں کوئی شخص کبھی پیدا نہیں ہوا بلکہ اس سے آفتاب مراد ہے
اور بارہ حواریوں سے بارہ برج مراد ہیں۔ اور پھر اس مذہب عیسائی کی حقیقت زیادہ تر اس بات
سے کھلتی ہے کہ جن نشانیوں کو حضرت مسیح ایمان داروں کے لئے قرار دیئے گئے تھے اُن میں سے
ایک بھی ان لوگوں میں نہیں پائی جاتی حضرت مسیح نے فرمایا تھا کہ اگر تم میری پیروی کرو گے تو ہر
ایک طرح کی برکت اور قبولیت میں میرا ہی روپ بن جاؤ گے اور معجزات اور قبولیت کے نشان تم
کو دیئے جائیں گے اور تمہارے مومن ہونے کی یہی علامت ہوگی کہ تم طرح طرح کے نشان
دکھلا سکو گے اور جو چاہو گے تمہارے لئے وہی ہوگا۔ اور کوئی بات تمہارے لئے ناممکن نہیں
ہوگی۔ لیکن عیسائیوں کے ہاتھ میں ان برکتوں میں سے کچھ بھی نہیں۔ وہ اس خدا سے ناآشنا محض
ہیں جو اپنے مخصوص بندوں کی دعائیں سنتا ہے اور انہیں آمنے سامنے شفقت اور رحمت کا جواب
دیتا ہے۔ اور عجیب عجیب کام ان کے لئے کر دکھاتا ہے لیکن سچے مسلمان جو اُن راستبازوں کے
قائم مقام اور وارث ہیں جو ان سے پہلے گذر چکے ہیں وہ اُس خدا کو پہچانتے اور اس کی رحمت
کے نشانوں کو دیکھتے ہیں۔ اور اپنے مخالفوں کے سامنے آفتاب کی طرح جو ظلمت کے مقابل ہو
مابہ الامتیاز رکھتے ہیں۔ ہم بار بار لکھ چکے ہیں کہ اس دعویٰ کو بلا دلیل نہیں سمجھنا چاہئے سچے اور
جھوٹے مذہب میں ایک آسمان پر فرق ہے اور ایک زمین پر۔ زمین کے فرق سے مراد وہ فرق
ہے جو انسان کی عقل اور انسان کا کانشنس اور قانون قدرت اس عالم کا اس کی تشریح کرتا ہے۔ سو
عیسائی مذہب اور اسلام کو جب اس محک کی رو سے جانچا جائے تو صاف ثابت ہوتا ہے کہ اسلام
وہ فطرتی مذہب ہے جس کے اصولوں میں کوئی تصنع اور تکلّف نہیں اور جس کے احکام کوئی
مستحدث اور بناوٹی امر نہیں اور کوئی ایسی بات نہیں جو زبردستی منوانی پڑے اور جیسا کہ خدائے
تعالیٰ نے جا بجا آپ فرمایا ہے۔ قرآن شریف صحیفۂ فطرت کے تمام علوم اور اس کی صداقتوں کو

یاد دلاتا ہے اور اس کے اسرارِ غامضہ کو کھولتا ہے اور کوئی نئے امور برخلاف اس کے پیش نہیں کرتا بلکہ درحقیقت اُسی کے معارف دقیقہ ظاہر کرتا ہے۔ برخلاف اس کے عیسائیوں کی تعلیم جس کا انجیل پر حوالہ دیا جاتا ہے ایک نیا خدا پیش کر رہی ہے جس کی خودکشی پر دنیا کے گناہ اور عذاب سے نجات موقوف اور اس کے دُکھ اُٹھانے پر خلقت کا آرام موقوف اور اس کے بے عزت اور ذلیل ہونے پر خلقت کی عزت موقوف خیال کی گئی ہے۔ پھر بیان کیا گیا ہے کہ وہ ایک ایسا عجیب خدا ہے کہ ایک حصہ اس کی عمر کا تو منزّہ عن الجسم و عن عیوب الجسم میں گزرا ہے اور دوسرا حصہ عمر کا (کسی نامعلوم بدبختی کی وجہ سے) ہمیشہ کے تجسم اور تحیّز کی قید میں اسیر ہو گیا اور گوشت پوست استخوان وغیرہ سب کے سب اس کی روح کے لئے لازمی ہو گئے اور اس تجسم کی وجہ سے، کہ اب ہمیشہ اس کے ساتھ رہے گا، انواع اقسام کے اس کو دکھ اُٹھانے پڑے آخر دکھوں کے غلبہ سے مر گیا اور پھر زندہ ہوا اور اُسی جسم نے پھر آ کر اس کو پکڑ لیا اور ابدی طور پر اُسے پکڑے رہے گا۔ کبھی مخلصی نہیں ہوگی۔ اب دیکھو کہ کیا کوئی فطرت صحیحہ اس اعتقاد کو قبول کر سکتی ہے؟ کیا کوئی پاک کانشنس اس کی شہادت دے سکتا ہے؟ کیا قانون قدرت کا ایک جزو بھی خدائے بے عیب و بے نقص وغیر متغیر کیلئے یہ حوادث و آفات روا رکھ سکتا ہے کہ اس کو ہمیشہ ہر ایک عالم کے پیدا کرنے اور پھر اس کو نجات دینے کیلئے ایک مرتبہ مرنا درکار ہے اور بجز خودکشی اپنے کسی افاضۂ خیر کی صفت کو ظاہر نہیں کر سکتا اور نہ کسی قسم کا اپنی مخلوقات کو دنیا یا آخرت میں آرام پہنچا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر خدائے تعالیٰ کو اپنی رحمت بندوں پر نازل کرنے کیلئے خودکشی کی ضرورت ہے تو اُس سے لازم آتا ہے کہ ہمیشہ اس کو حادثۂ موت کا پیش آتا رہے اور پہلے بھی بے شمار موتوں کا مزہ چکھ چکا ہو اور نیز لازم آتا ہے کہ ہندوؤں کے پرمیشر کی طرح معطل الصفات ہو۔ اب خود ہی سوچو کہ کیا ایسا عاجز اور درماندہ خدا ہو سکتا ہے کہ جو بغیر خودکشی کے اپنی مخلوقات کو کبھی اور کسی زمانہ میں کوئی بھلائی پہنچا نہیں سکتا۔ کیا یہ حالت ضعف اور ناتوانی کی خدائے قادر مطلق کے لائق ہے؟ پھر عیسائیوں کے خدا کی موت کا نتیجہ دیکھئے تو کچھ بھی نہیں۔ ان کے خدا کی جان گئی مگر شیطان کے وجود اور اس کے کارخانہ کا ایک بال بھی بیکا نہ ہوا۔ وہی شیطان اور وہی

اس کے چیلے جو پہلے تھے اب بھی ہیں۔ چوری، ڈکیتی، زنا، قتل، دروغ گوئی، شراب خواری،☆ قمار بازی، دنیا پرستی، بے ایمانی، کفر، شرک، دہریہ پن اور دوسرے صدہا طرح کے جرائم جو قبل از مصلوبیت مسیح تھے اب بھی اُسی زور و شور میں ہیں بلکہ کچھ چڑھ، بڑھ کر۔ مثلاً دیکھئے کہ اس زمانہ میں کہ جب ابھی مسیحیوں کا خدا زندہ تھا عیسائیوں کی حالت اچھی تھی جبھی کہ اس خدا پر موت آئی جس کو کفارہ کہا جاتا ہے۔ تبھی سے عجیب طور پر شیطان اس قوم پر سوار ہو گیا اور گناہ اور نافرمانی

☆ تازہ اخبارات سے معلوم ہوا ہے کہ تیرہ کروڑ ساٹھ ہزار پاؤنڈ ہر سال سلطنت برطانیہ میں شراب کشی اور شراب نوشی میں خرچ ہوتا ہے (اور ایک نامہ نگار ایم اے کی تحریر ہے) کہ شراب کی بدولت لندن میں صدہا خودکشی کی وارداتیں ہو جاتی ہیں اور خاص لندن میں شاید مجملہ تیس لاکھ آبادی کے دس ہزار آدمی مے نوش نہ ہوں گے، ورنہ سب مرد اور عورت خوشی اور آزادی سے شراب پیتے اور پلاتے ہیں۔ اہل لندن کا کوئی ایسا جلسہ اور سوسائٹی اور محفل نہیں ہے کہ جس میں سب سے پہلے برانڈی اور شری اور لال شراب کا انتظام نہ کیا جاتا ہو۔ ہر ایک جلسہ کا جزو اعظم شراب کو قرار دیا جاتا ہے اور طرفہ برآں یہ کہ لندن کے بڑے بڑے قسیس اور پادری صاحبان بھی باوجود دیندار کہلانے کے مے نوشی میں اوّل درجہ ہوتے ہیں۔ جتنے جلسوں میں مجھ کو بطفیل مسٹر نکلیٹ صاحب شامل ہونے کا اتفاق ہوا ہے ان سب میں ضرور دو چار نوجوان پادری اور ریورنڈ بھی شامل ہوتے دیکھے۔ لندن میں شراب نوشی کو کسی بُری مد میں شامل نہیں سمجھا گیا اور یہاں تک شراب نوشی کی علانیہ گرم بازاری ہے کہ میں نے بچشم خود ہنگام سیر لندن اکثر انگریزوں کو بازار میں پھرتے دیکھا کہ متوالے ہو رہے ہیں اور ہاتھ میں شراب کی بوتل ہے۔ علی ھذا القیاس۔ لندن میں عورتیں دیکھی جاتی تھیں کہ ہاتھ میں بوتل بیئر پکڑے لڑکھڑاتی چلی جاتی ہیں۔ بیسیوں لوگ شراب سے مدہوش اور متوالے، اچھے بھلے، بھلے مانس مہذب بازاروں کی نالیوں میں گرے ہوئے دیکھے۔ شراب نوشی کے طفیل اور برکت سے لندن میں اس قدر خودکشی کی وارداتیں واقع ہوتی رہتی ہیں کہ ہر ایک سال اُن کا ایک مہلک وبا پڑتا ہے (یکم فروری ۱۸۸۳ء۔ رہبر ہند لاہور) اسی طرح ایک صاحب نے لندن کی عام زنا کاری اور قریب ستر ستر ہزار کے ہر سال ولد الزنا پیدا ہونا ذکر کر کے وہ باتیں ان لوگوں کی بے حیائی کی لکھی ہیں کہ جن کی تفصیل سے قلم رُکتی ہے۔ بعض نے یہ بھی لکھا ہے کہ یورپ کے اوّل درجہ کے مہذب اور تعلیم یافتہ لوگوں کے اگر دس حصے کئے جائیں تو بلاشبہ نو حصے ان میں سے دہریہ ہوں گے جو مذہب کی پابندی اور خدائے تعالیٰ کے اقرار اور جزا سزا کے اعتقاد سے فارغ ہو بیٹھے ہیں اور یہ مرض دہریّت کا دن بدن یورپ میں بڑھتا جاتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ دولت برطانیہ کی کشادہ دلی

اور نفس پرستی کے ہزارہا دروازے کھل گئے۔ چنانچہ عیسائی لوگ خود اس بات کے قائل ہیں اور پادری فنڈر صاحب مصنف میزان الحق فرماتے ہیں کہ عیسائیوں کی کثرت گناہ اور اُن کی اندرونی بدچلنی اور فسق و فجور کے پھیلنے کی وجہ سے ہی محمد صلی اللہ علیہ وسلم بغرض سزادہی اور تنبیہ عیسائیوں کے بھیجے گئے تھے۔ پس ان تقریروں سے ظاہر ہے کہ زیادہ تر گناہ اور معصیت کا طوفان مسیح کے مصلوب ہونے کے بعد ہی عیسائیوں میں اُٹھا ہے۔ اس سے ثابت ہے کہ مسیح کا مرنا اس غرض سے نہیں تھا کہ گناہ کی تیزی اس کی موت سے کچھ رو بہ کمی ہو جائے گی مثلاً اس کے

بقیہ حاشیہ: نے اس کی ترقی سے کچھ بھی کراہت نہیں کی۔ یہاں تک کہ بعض پکے دہریہ پارلیمنٹ کی کرسی پر بھی بیٹھ گئے اور کچھ پرواہ نہیں کی گئی۔ نامحرم لوگوں کو نوجوان عورتوں کا بوسہ لینا صرف جائز ہی نہیں بلکہ یورپ کی نئی تہذیب میں ایک مستحسن امر قرار دیا گیا ہے۔ کوئی دعویٰ سے نہیں کہہ سکتا کہ انگلستان میں کوئی ایسی عورت بھی ہے کہ جس کا عین جوانی کے دنوں میں کسی نامحرم جوان نے بوسہ نہ لیا ہو۔ دنیا پرستی اس قدر ہے کہ آروپ الیگزانڈر صاحب اپنی ایک چٹھی میں (جو میرے نام بھیجی ہے) لکھتے ہیں کہ تمام مہذب اور تعلیم یافتہ جو اس ملک میں پائے جاتے ہیں۔

ان میں سے ایک بھی میری نظر میں ایسا نہیں جس کی نگاہ آخرت کی طرف لگی ہوئی ہو بلکہ تمام لوگ سر سے پیر تک دنیا پرستی میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ اب ان تمام بیانات سے ظاہر ہے کہ مسیح کے قربان ہونے کی وہ تاثیریں جو پادری لوگ ہندوستان میں آکر سادہ لوحوں کو سناتے ہیں، سراسر پادری صاحبوں کا افترا ہے۔ اور اصل حقیقت یہی ہے کہ کفارہ کے مسئلہ کو قبول کر کے جس طرف عیسائیوں کی طبیعتوں نے پلٹا کھایا ہے وہ یہی ہے کہ شراب خواری بکثرت پھیل گئی۔ زنا کاری اور بدنظری شیر مادر سمجھی گئی۔ قمار بازی کی از حد ترقی ہو گئی۔ خدائے تعالیٰ کی عبادت سچے دل سے کرنا اور بکلی رو بحق ہو جانا یہ سب باتیں موقوف ہو گئیں۔ ہاں انتظامی تہذیب یورپ میں بے شک پائی جاتی ہے۔ یعنی باہم رضامندی کے برخلاف جو گناہ ہیں جیسے سرقہ اور قتل اور زنا بالجبر وغیرہ جن کے ارتکاب سے شاہی قوانین نے بوجہ مصالح ملکی روک دیا ہے ان کا انسداد بے شک ہے مگر ایسے گناہوں کے انسداد کی یہ وجہ نہیں کہ مسیح کے کفارہ کا اثر ہوا ہے بلکہ رعب قوانین اور سوسائٹی کے دباؤ نے یہ اثر ڈالا ہوا ہے اگر یہ موانع درمیان نہ ہوں تو حضرات مسیحیان سب کچھ کر گزریں اور پھر یہ جرائم بھی تو اور ملکوں کی طرح یورپ میں بھی ہوتے ہی رہتے ہیں انسداد کلی تو نہیں۔ منہ

مرنے سے پہلے اگر لوگ بہت شراب پیتے تھے یا اگر بکثرت زنا کرتے تھے یا اگر پکے دُنیا دار تھے تو مسیح کے مرنے کے بعد یہ ہر ایک قسم کے گناہ دور ہو جائیں گے کیونکہ یہ بات مستغنی عن الثبوت ہے کہ جس قدر اب شراب خوری و دنیا پرستی و زنا کاری خاص کر یورپ کے ملکوں میں ترقی پر ہے کوئی دانا ہرگز خیال نہیں کرسکتا کہ مسیح کی موت سے پہلے یہی طوفان فسق و فجور کا برپا ہو رہا تھا بلکہ اس کا ہزارم حصہ بھی ثابت نہیں ہوسکتا اور انجیلوں پر غور کرکے بکمال صفائی کھل جاتا ہے کہ مسیح کو ہرگز منظور نہ تھا کہ یہودیوں کے ہاتھ میں پکڑا جائے اور مارا جائے اور صلیب پر کھینچا جائے کیونکہ اگر یہی منظور ہوتا تو ساری رات اس بلا کے دفعہ کرنے کیلئے کیوں روتا رہتا اور رو رو کر کیوں یہ دعا کرتا کہ اے ابا! اے باپ!! تجھ سے سب کچھ ہوسکتا ہے یہ پیالہ مجھ سے ٹال دے۔ بلکہ سچ یہی ہے کہ مسیح بغیر اپنی مرضی کے ناگہانی طور پر پکڑا گیا اور اس نے مرتے وقت تک رو رو کر یہی دعا کی ہے کہ اے میرے خدا! اے میرے خدا! تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا۔ اس سے بوضاحت ثابت ہوتا ہے کہ مسیح زندہ رہنا اور کچھ اور دن دنیا میں قیام کرنا چاہتا تھا اور اس کی روح نہایت بے قراری سے تڑپ رہی تھی کہ کسی طرح اس کی جان بچ جائے لیکن بلا مرضی اس کے یہ سفر اس کو پیش آ گیا تھا اور نیز یہ بھی غور کرنے کی جگہ ہے کہ قوم کے لئے اس طریق پر مرنے سے جیسا کہ عیسائیوں نے تجویز کیا ہے۔ مسیح کو کیا حاصل تھا اور قوم کو اُس سے کیا فائدہ؟ اگر وہ زندہ رہتا تو اپنی قوم میں بڑی بڑی اصلاحیں کرتا بڑے بڑے عیب اُن سے دور کرکے دکھاتا مگر اس کی موت نے کیا کرکے دکھایا بجز اس کے کہ اس کے بے وقت مرنے سے صدہا فتنے پیدا ہوئے اور ایسی خرابیاں ظہور میں آئیں جن کی وجہ سے ایک عالم ہلاک ہوگیا۔ یہ سچ ہے کہ جوانمرد لوگ قوم کی بھلائی کیلئے اپنی جان بھی فدا کردیتے ہیں یا قوم کے بچاؤ کے لئے جان کو معرض ہلاکت میں ڈالتے ہیں مگر نہ ایسے لغو اور بیہودہ طور پر جو مسیح کی نسبت بیان کیا جاتا ہے بلکہ جو شخص دانشمندانہ طور سے قوم کے لئے جان دیتا ہے یا جان کو معرض ہلاکت میں ڈالتا ہے وہ تو معقول اور پسندیدہ اور کارآمد اور صریح مفید طریقوں میں سے کوئی سے ایسا اعلیٰ اور بدیہی انفع طریقہ فدا ہونے کا اختیار کرتا ہے جس طریقے کے استعمال سے گو اس کو تکلیف پہنچ جائے یا جان ہی جائے مگر اُس کی

قوم بعض بلاؤں سے واقعی طور پر بچ جائے یہ تو نہیں کہ پھانسی لے کر یا زہر کھا کر یا کسی کوئیں میں گرنے سے خودکشی کا مرتکب ہو اور پھر یہ خیال کرے کہ میری خودکشی قوم کے لئے بہبودی کا موجب ہوگی۔ ایسی حرکت تو دیوانوں کا کام ہے نہ عقلمندوں دینداروں کا بلکہ یہ موت موتِ حرام ہے اور بجز سخت جاہل اور سادہ لوح کے کوئی اس کا ارادہ نہیں کرتا۔ میں سچ کہتا ہوں کہ کامل اور اولوالعزم آدمی کا مرنا بجز اُس حالت خاص کے کہ بہتوں کے بچاؤ کے لئے کسی معقول اور معروف طریق پر مرنا ہی پڑے قوم کے لئے اچھا نہیں بلکہ بڑی مصیبت اور ماتم کی جگہ ہے اور ایسا شخص جس کی ذات سے خلق اللہ کو طرح طرح کا فائدہ پہنچ رہا ہے اگر خودکشی کا ارادہ کرے تو وہ خدائے تعالیٰ کا سخت گنہگار ہے اور اس کا گناہ دوسرے ایسے مجرموں کی نسبت زیادہ ہے پس ہر ایک کامل کے لئے لازم ہے کہ اپنے لئے جناب باری تعالیٰ سے درازی عمر مانگے تا وہ خلق اللہ کے لئے ان سارے کاموں کو بخوبی انجام دے سکے جن کے لئے اُس کے دل میں جوش ڈالا گیا ہے۔ ہاں! شریر آدمی کا مرنا اس کے لئے اور نیز خلق اللہ کے لئے بہتر ہے تا شرارتوں کا ذخیرہ زیادہ نہ ہوتا جائے اور خلق اللہ اس کے ہر روز کے فتنہ سے تباہ نہ ہو جائے۔ اور اگر یہ سوال کیا جائے کہ تمام پیغمبروں میں سے قوم کے بچاؤ کے لئے اور الٰہی جلال کے اظہار کی غرض سے معقول طریقوں کے ساتھ اور ضروری حالتوں کے وقت میں کس پیغمبر نے زیادہ تر اپنے تئیں معرضِ ہلاکت میں ڈالا اور قوم پر اپنے تئیں فدا کرنا چاہا آیا مسیح یا کسی اور نبی یا ہمارے سیّد و مولیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے۔ تو اس کا جواب جس جوش اور روشن دلائل اور آیات بینات اور تاریخی ثبوت سے میرے سینہ میں بھرا ہوا ہے، میں افسوس کے ساتھ اس جگہ اس کا لکھنا چھوڑ دیتا ہوں کہ وہ بہت طویل ہے یہ تھوڑا سا مضمون اس کی برداشت نہیں کر سکتا۔ انشاء اللہ القدیر، اگر عمر نے وفا کی تو آئندہ ایک رسالہ مستقلہ اس بارے میں لکھوں گا لیکن بطور مختصر اس جگہ بشارت دیتا ہوں کہ وہ فردِ کامل جو قوم پر اور تمام بنی نوع پر اپنے نفس کو فدا کرنے والا ہے وہ ہمارے نبی کریم ہیں یعنی سیّدنا و مولانا و وحیدنا و فریدنا احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ الرسول النبی الاُمّی العربی القرشی صلی اللہ علیہ وسلم۔

اس جگہ میں نے سچے اور جھوٹے مذہب کی تفریق کیلئے وہ فرق جو زمین پر موجود ہے یعنی جو باتیں عقل اور کانشنس کے ذریعہ سے فیصلہ ہو سکتی ہیں، کسی قدر لکھ دیا ہے لیکن جو فرق آسمان کے ذریعہ سے کھلتا ہے وہ بھی ایسا ضروری ہے کہ بجز اس کے حق اور باطل میں امتیاز بیّن نہیں ہو سکتا اور وہ یہ ہے کہ سچے مذہب کے پیرو کے ساتھ خدائے تعالیٰ کے ایک خاص تعلقات ہو جاتے ہیں اور وہ کامل پیرو اپنے نبی متبوع کا مظہر اور اس کے حالات روحانیہ اور برکات باطنیہ کا ایک نمونہ ہو جاتا ہے اور جس طرح بیٹے کے وجود درمیانی کی وجہ سے پوتا بھی بیٹا ہی کہلاتا ہے اسی طرح جو شخص زیر سایہ متابعت نبی پرورش یافتہ ہے اس کے ساتھ بھی وہی لطف اور احسان ہوتا ہے جو نبی کے ساتھ ہوتا ہے اور جیسے نبی کو نشان دکھائے جاتے ہیں ایسا ہی اس کی خاص طور پر معرفت بڑھانے کیلئے اس کو بھی نشان ملتے ہیں۔ سو ایسے لوگ اس دین کی سچائی کے لئے جس کی تائید کے لئے وہ ظہور فرماتے ہیں، زندہ نشان ہوتے ہیں۔ خدائے تعالیٰ آسمان سے ان کی تائید کرتا ہے اور بکثرت ان کی دعائیں قبول فرماتا ہے اور قبولیت کی اطلاع بخشتا ہے۔ ان پر مصیبتیں بھی نازل ہوتی ہیں مگر اس لئے نازل نہیں ہوتیں کہ انہیں ہلاک کریں بلکہ اس لئے کہ تا آخر ان کی خاص تائید سے قدرت کے نشان ظاہر کئے جائیں۔ وہ بےعزتی کے بعد پھر عزت پا لیتے ہیں اور مرنے کے بعد پھر زندہ ہو جایا کرتے ہیں تا خدائے تعالیٰ کے خاص کام ان میں ظاہر ہوں۔

اس جگہ یہ نکتہ یاد رکھنے کے لائق ہے کہ دعا کا قبول ہونا دو طور سے ہوتا ہے۔ ایک بطور ابتلاء اور ایک بطور اصطفاء۔ بطور ابتلاء تو کبھی کبھی گنہگاروں اور نافرمانوں بلکہ کافروں کی دعا بھی قبول ہو جاتی ہے مگر ایسا قبول ہونا حقیقی قبولیت پر دلالت نہیں کرتا بلکہ از قبیل استدراج و امتحان ہوتا ہے لیکن جو بطور اصطفاء دعا قبول ہوتی ہے اس میں یہ شرط ہے کہ دعا کرنے والا خدائے تعالیٰ کے برگزیدہ بندوں میں سے ہو اور چاروں طرف سے برگزیدگی کے انوار و آثار اس میں ظاہر ہوں کیونکہ خدائے تعالیٰ حقیقی قبولیت کے طور پر نافرمانوں کی دعا ہرگز نہیں سنتا بلکہ انہیں کی سنتا ہے کہ جو اس کی نظر میں راستباز اور اس کے حکم پر چلنے والے ہوں۔ سو ابتلاء اور اصطفاء کی قبولیت

ادعیہ میں مابہ الامتیاز یہ ہے کہ جو ابتلاء کے طور پر دعا قبول ہوتی ہے اس میں متقی اور خدا دوست ہونا شرط نہیں اور نہ اس میں یہ ضرورت ہے کہ خدائے تعالیٰ دعا کو قبول کر کے بذریعہ اپنے مکالمہ خاص کے اس کی قبولیت سے اطلاع بھی دیوے اور نہ وہ دعائیں ایسی اعلیٰ پایہ کی ہوتی ہیں جن کا قبول ہونا ایک امر عجیب اور خارقِ عادت متصور ہو سکے لیکن جو دعائیں اصطفاء کی وجہ سے قبول ہوتی ہیں ان میں یہ نشان نمایاں ہوتے ہیں۔

(۱) اوّل یہ کہ دعا کرنے والا ایک متقی اور راست باز اور کامل فرد ہوتا ہے۔

(۲) دوسرے یہ کہ بذریعہ مکالماتِ الٰہیہ اُس دعا کی قبولیت سے اس کو اطلاع دی جاتی ہے۔

(۳) تیسری یہ کہ اکثر وہ دعائیں جو قبول کی جاتی ہیں نہایت اعلیٰ درجہ کی اور پیچیدہ کاموں کے متعلق ہوتی ہیں، جن کی قبولیت سے کھل جاتا ہے کہ یہ انسان کا کام اور تدبیر نہیں بلکہ خدائے تعالیٰ کا ایک خاص نمونہ قدرت ہے جو خاص بندوں پر ظاہر ہوتا ہے۔

(۴) چوتھی یہ کہ ابتلائی دعائیں تو کبھی کبھی شاذو نادر کے طور پر قبول ہوتی ہیں لیکن اصطفائی دعائیں کثرت سے قبول ہوتی ہیں۔ بسا اوقات صاحب اصطفائی دعا کا ایسی بڑی بڑی مشکلات میں پھنس جاتا ہے کہ اگر اور شخص ان میں مبتلا ہو جاتا تو بجز خودکشی کے اور کوئی حیلہ اپنی جان بچانے کیلئے ہرگز اُسے نظر نہ آتا۔ چنانچہ ایسا ہوتا بھی ہے کہ جب کبھی دنیا پرست لوگ جو خدائے تعالیٰ سے مہجور و دور ہیں بعض بڑی بڑی ہموم و غموم و اَمراض و اَسقام و بلیّاتِ لاینحل میں مبتلا ہو جاتے ہیں تو آخر وہ بباعث ضعف ایمان خدائے تعالیٰ سے نا امید ہو کر کسی قسم کی زہر کھا لیتے ہیں یا کوئیں میں گرتے ہیں یا بندوق وغیرہ سے خودکشی کر لیتے ہیں لیکن ایسے نازک وقتوں میں صاحب اصطفاء کا بوجہ اپنی قوت ایمانی اور تعلق خاص کے خدائے تعالیٰ کی طرف سے نہایت عجیب در عجیب مدد دیا جاتا ہے اور عنایت الٰہی ایک عجیب طور سے اس کا ہاتھ پکڑ لیتی ہے یہاں تک کہ ایک محرم راز کا دل بے اختیار بول اُٹھتا ہے کہ یہ شخص مؤیّد الٰہی ہے۔

(۵) پانچویں یہ کہ صاحب اصطفائی دعا کا مَورَدِ عنایاتِ الٰہیہ کا ہوتا ہے اور خدائے تعالیٰ اس کے تمام کاموں میں اس کا متولی ہو جاتا ہے اور عشق الٰہی کا نور اور مقبولانہ

کبریائی کی مستی اور روحانی لذت یابی اور تنعم کے آثار اس کے چہرہ میں نمایاں ہوتے ہیں جیسا کہ اللہ جلشانہٗ فرماتا ہے۔ تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيْمِ (المطففین:۲۵)

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝ نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ ۝ (حٰم السجدۃ:۳۱تا۳۲)

وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ۭ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ ۝ (البقرۃ:۱۸۷)☆

اب جاننا چاہئے کہ محبوبیت اور قبولیت اور ولایت حقہ کا درجہ جس کے کسی قدر مختصر طور پر نشان بیان کر چکا ہوں۔ یہ بجز اتباع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہرگز حاصل نہیں ہوسکتا۔ اور سچے متبع

☆ **حاشیہ:** خبردار ہو یعنی یقیناً سمجھ کہ جو لوگ اللہ (جلشانہٗ) کے دوست ہیں یعنی جو لوگ خدائے تعالیٰ سے سچی محبت رکھتے ہیں اور خدائے تعالیٰ ان سے محبت رکھتا ہے تو ان کی یہ نشانیاں ہیں کہ نہ ان پر خوف مستولی ہوتا ہے کہ کیا کھائیں گے یا کیا پئیں گے یا فلاں بلا سے کیونکر نجات ہوگی کیونکہ وہ تسلی دیئے جاتے ہیں اور نہ گزشتہ کے متعلق کوئی حزن واندوہ انہیں ہوتا ہے کیونکہ وہ صبر دیئے جاتے ہیں۔ دوسری یہ نشانی ہے کہ وہ ایمان رکھتے ہیں یعنی ایمان میں کامل ہوتے ہیں اور تقویٰ اختیار کرتے ہیں یعنی خلاف ایمان وخلاف فرمانبرداری جو باتیں ہیں اُن سے بہت دُور رہتے ہیں۔ تیسری اُن کی یہ نشانی ہے کہ انہیں (بذریعہ مکالمہ الٰہیہ ورؤیائے صالحہ بشارتیں ملتی رہتی ہیں) اس جہان میں بھی اور دوسرے جہان میں بھی خدائے تعالیٰ کا ان کی نسبت یہ عہد ہے جو ٹل نہیں سکتا اور یہی پیارا درجہ ہے جو انہیں ملا ہوا ہے۔ یعنی مکالمہ الٰہیہ اور رؤیائے صالحہ سے خدائے تعالیٰ کے مخصوص بندوں کو جو اس کے ولی ہیں ضرور حصہ ملتا ہے اور ان کی ولایت کا بھاری نشان یہی ہے کہ مکالمات و مخاطبات الٰہیہ سے مشرف ہوں (یہی قانونِ قدرت اللہ جلشانہٗ کا ہے) کہ جو لوگ ارباب متفرقہ سے منہ پھیر کر اللہ جلشانہٗ کو اپنا رب سمجھ لیں اور کہیں کہ ہمارا تو ایک اللہ ہی رب ہے (یعنی اور کسی کی ربوبیت پر ہماری نظر نہیں) اور پھر آزمائشوں کے وقت میں مستقیم رہیں (کیسے ہی زلزلے آویں، آندھیاں چلیں، تاریکیاں پھیلیں ان میں ذرا تزلزل اور تغیر اور اضطراب پیدا نہ ہو پوری پوری استقامت پر رہیں) تو ان پر فرشتے

کے مقابل پر اگر کوئی عیسائی یا آریہ یا یہودی قبولیت کے آثار و انوار دکھلانا چاہے تو یہ اس کے لئے ہرگز ممکن نہ ہوگا اور نہایت صاف طریق امتحان کا یہ ہے کہ اگر ایک مسلمان صالح کے مقابل پر جو سچا مسلمان اور سچائی سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا متبع ہو کوئی دوسرا شخص عیسائی وغیرہ معارضہ کے طور پر کھڑا ہو اور یہ کہے کہ جس قدر تجھ پر آسمان سے کوئی نشان ظاہر ہوگا، یا جس قدر اسرارِ غیبیہ تجھ پر کھلیں گے، یا جو کچھ قبولیت دعاؤں سے تجھے مدد دی جائے گی، یا جس طور سے تیری عزت اور شرف کے اظہار کے لئے کوئی نمونہ قدرت ظاہر کیا جائے گا، یا اگر انعامات خاصہ کا بطور پیش گوئی تجھے وعدہ دیا جائے گا، یا اگر تیرے کسی موذی مخالف پر کسی تنبیہہ کے نزول کی خبر دی جائے گی تو اُن سب باتوں میں جو کچھ تجھ سے ظہور میں آئیگا اور جو کچھ تو دکھائے گا، وہ میں بھی دکھلاؤں گا۔ تو ایسا معارضہ کسی مخالف سے ہرگز ممکن نہیں اور ہرگز مقابل پر نہیں آئیں گے کیونکہ اُن کے دل شہادت دے رہے ہیں کہ وہ کذاب ہیں۔ انہیں اس سچے خدا سے کچھ بھی تعلق نہیں کہ جو راستبازوں کا مددگار اور صدیقوں کا دوست دار ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے بھی کسی قدر بیان کر

اُترتے ہیں (یعنی الہام یا رؤیائے صالحہ کے ذریعہ سے انہیں بشارتیں ملتی ہیں) کہ دنیا اور آخرت میں ہم تمہارے دوست اور متولی اور متکفل ہیں اور آخرت میں جو کچھ تمہارے جی چاہیں گے وہ سب تمہیں ملے گا۔ یعنی اگر دنیا میں کچھ مکروہات بھی پیش آویں تو کوئی اندیشہ کی بات نہیں کیونکہ آخرت میں تمام غم دور ہو جائیں گے اور سب مرادیں حاصل ہوں گی۔ اگر کوئی کہے کہ یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ آخرت میں جو کچھ انسان کا نفس چاہے اس کو ملے میں کہتا ہوں کہ یہ ہونا نہایت ضروری ہے اور اسی بات کا نام نجات ہے ورنہ اگر انسان نجات پا کر بعض چیزوں کو چاہتا رہا اور ان کے غم میں کباب ہوتا اور جلتا رہا مگر وہ چیزیں اس کو نہ ملیں تو پھر نجات کاہے کی ہوئی۔ ایک قسم کا عذاب تو ساتھ ہی رہا۔ لہٰذا ضرور ہے کہ جنت یا بہشت یا مکتی خانہ یا سُرگ جو نام اس مقام کا رکھا جائے جو انتہا سعادت پانے کا گھر ہے وہ ایسا گھر چاہیئے کہ انسان کو من کل الوجوہ اس میں مصفا خوشی حاصل ہو اور کوئی ظاہری یا باطنی رنج کی بات درمیان نہ ہو اور کسی ناکامی کی سوزش دل پر غالب نہ ہو۔ ایک قسم کا عذاب تو ساتھ ہی رہا۔ لہٰذا ضرور ہے کہ جنت یا بہشت یا مکتی خانہ یا سُرگ جو نام اس مقام کا رکھا جائے جو انتہا سعادت پانے کا گھر ہے وہ ایسا گھر چاہیئے کہ انسان کو من کل الوجوہ اس میں مصفا خوشی حاصل ہو اور کوئی ظاہری یا باطنی رنج کی بات درمیان نہ ہو اور کسی ناکامی کی سوزش دل پر غالب نہ ہو۔

چکے ہیں۔ وَھٰذَا اٰخِرُ کَلَامِنَا وَالْحَمْدُلِلّٰہِ اَوَّلًا وَّ اٰخِرًا وَّ ظَاھِرًا وَّ بَاطِنًا۔ ھُوَمَوْلَانَا نِعْمَ الْمَوْلٰی وَنِعْمَ الْوَکِیْل۔

(ایک عیسائی کے تین سوال اور ان کے جوابات، روحانی خزائن جلد نمبر ۴ صفحہ ۴۵۳ تا ۴۸۲)

☆

اسی سوال کے جواب میں حضرت حکیم مولانا نورالدین صاحب فرماتے ہیں:

''میں نے قرآن کریم کو اس سوال کے خیال پر بہت بار دیکھا مگر باہمہ تامل وتفکر مجھے کچھ معلوم نہ ہؤا کہ سائل نے قرآن مجید کی کون سی آیت سے ایسا سوال نکالا۔ خاکسار سائل کے سوال کو بغرض سہولت بیان تین حصوں پر تقسیم کرتا ہے۔

حصہ **اوّل** سوال کا یہ ہے۔ اگر محمد پیغمبر ہوتے تو اس وقت کے سوالوں کے جواب میں لاچار ہو کر یہ نہ کہتے کہ خدا کو معلوم ہے یعنی مجھے معلوم نہیں۔

خاکسار عرض پرداز ہے۔ مخالف اور موافق لوگوں نے حضور علیہ السلام سے جس قدر سوال کئے اُن کا جواب اگر ممکن تھا تو حضور علیہ السلام نے ضرور دیا ہے۔ قرآن میں حسب ذیل سوالات کا تذکرہ موجود ہے منصف غور کریں۔ **اوّل** رمضان کے مہینہ اور روزوں کے چاند کا تذکرہ جب قرآن کریم نے کیا تو لوگوں نے رمضان کے اور اَور چاندوں کا حال دریافت کیا۔ جیسے قرآن کہتا ہے۔ اور ماہ رمضان کے تذکرہ کے بعد اس سوال کا تذکرہ کرتا ہے:۔

یَسْـَٔلُوْنَکَ عَنِ الْاَھِلَّۃِ (البقرۃ:۱۹۰) پوچھتے ہیں تجھ سے رمضان کے سوا اور چاندوں کا حال یعنی ان میں کیا کرنا ہے اس سوال کا جواب سوال کے بعد ہی بیان کیا گیا اور جواب دیا۔ قُلْ ھِیَ مَوَاقِیْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ تو اس سوال کے جواب میں کہہ دے یہ چاند لوگوں کے فائدہ اٹھانے کے وقت ہیں اور بعضے چاندوں میں حج کے اعمال ادا کئے جاتے ہیں۔

دوسرا سوال یہ ہے۔ یَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ (البقرۃ:۲۱۶)سوال کرتے ہیں کیا خرچ کریں۔ اس کا جواب قرآن نے دیا ہے قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَیْرٍ فَلِلْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰكِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ جو کچھ خرچ کرو مال سے تو چاہیئے کہ وہ تمہارا دیا اور خرچ کیا تمہارے والدین اور تمہارے رشتہ داروں اور یتیموں اور غریبوں اور مسافروں کے لئے ہو۔

تیسرا سوال۔ یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ (البقرۃ:۲۱۸) پوچھتے ہیں تجھ سے حرمت والے مہینہ کے متعلق کہ اس میں جنگ کا کیا حکم ہے ؟ تو جواب دیا قُلْ قِتَالٌ فِیْهِ كَبِیْرٌ وَصَدٌّ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ تو جواب دے۔اس مہینہ میں لڑائی کرنا بُری بات ہے اور اس سے حج وعمرہ کیسی عبادت سے روکنا لازم آتا ہے۔

چوتھا سوال۔ یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ (البقرۃ:۲۲۰) پوچھتے ہیں تجھ سے شراب اور جوئے کی بابت۔ تو جواب دے فِیْهِمَآ اِثْمٌ كَبِیْرٌ شراب خوری اور قمار بازی نہایت بڑی اور بری بدکاری ہے۔

پانچواں سوال۔ یَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ (البقرۃ:۲۲۰)پوچھتے ہیں کیا خرچ کریں تو جواب دے اَلْعَفْوَ اپنی حاجت سے زیادہ مال کو خرچ کرو۔

چھٹا سوال۔ یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِیْضِ (البقرۃ:۲۲۳) پوچھتے ہیں حیض میں عورت سے صحبت جائز ہے یا نہیں تو جواب دے قُلْ هُوَ اَذًى فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِی الْمَحِیْضِ حیض کے دنوں میں جماع کرنا دکھ دیتا ہے۔حیض کے دنوں میں عورتوں کی صحبت سے الگ رہو۔

ساتواں سوال۔ یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْیَتٰمٰی (البقرۃ:۲۲۱) پوچھتے ہیں یتیموں کے متعلق۔ جواب دے اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَیْرٌ یتیموں کے مال، عزت، پرورش غرض ہر طرح ان کی اصلاح اور سنوار عمدہ بات ہے۔

آٹھواں سوال۔ یَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَآ اُحِلَّ لَهُمْ (المائدۃ:۵)پوچھتے ہیں کیا کچھ کھانے میں حلال ہے۔جواب دے اُحِلَّ لَكُمُ الطَّیِّبٰتُ تمہارے لئے تمام وہ چیزیں جو غالب عمرانات کے

سلیم الفطرتوں میں ستھرے اور پسندیدہ ہیں وہ تو حلال کر دی گئیں۔

نواں سوال۔ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ (الانفال:۲) تجھ سے پوچھتے ہیں غنیمت کی تقسیم کا مسئلہ۔تو جواب دے اَلْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ ۔غنیمت کی تقسیم اللہ پھر رسول کے اختیار میں ہے۔

دسواں سوال۔ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ (الکھف:۸۴) ذوالقرنین کا قصہ تجھ سے پوچھتے ہیں۔تو جواب میں قصہ سنا دے اِنَّا مَكَّنَّا لَهٗ فِي الْاَرْضِ (الکھف:۸۵) سے ذوالقرنین کا قصہ شروع کر دیا اور بقدر ضرورت اسے تمام کیا۔یہ ذوالقرنین وہ ہے جس کا ذکر دانیال ۸ باب ۸ میں ہے۔

گیارھواں سوال۔ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْجِبَالِ (طٰہٰ:۱۰۶) تجھ سے پوچھتے ہیں ایسے مضبوط پہاڑ کیا ہمیشہ رہیں گے ۔تو جواب دے يَنْسِفُهَا رَبِّيْ نَسْفًا اڑا دے گا اور پہاڑوں کو پاش پاش کر دے گا میرا رب۔

بارھواں سوال۔ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ (بنی اسرائیل:۸۶) تجھ سے سوال کرتے ہیں قرآن کس کا بنایا ہوا ہے۔تو جواب دے مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ یہ قرآن میرے رب کا حکم اور اسی کا کلام ہے۔

یاد رکھو میں نے روح کا ترجمہ قرآن کیا ہے۔اس کے کئی باعث ہیں۔

اوّل قرآن میں خود اس وحی اور کلام الٰہی کو روح کہا گیا۔**وَالْقُرْاٰنُ يُفَسِّرُ بَعْضُهٗ بَعْضًا** دیکھو وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا (الشوریٰ:۵۳) اور اس طرح وحی کی ہم نے تیری طرف روح اپنے حکم سے۔

دوم يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ (بنی اسرائیل:۸۶) کے ماقبل اور مابعد صرف قرآن کریم کا تذکرہ ہے ہاں ممکن ہے کہ ہم اس آیت میں روح کے معنے اُس فرشتہ کے لیں جو وحی لاتا تھا اور جس کا نام اسلامیوں میں جبرئیل ہے۔یا یوں کہیں کہ روح کے مخلوق اور غیر مخلوق ہونے کا سوال ہوا' جواب دیا گیا روح حادث اور رب کے حکم سے ہوا ہے۔

تیرھواں سوال۔ یَسْـَٔلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ (النساء:۱۵۴) مانگتے ہیں تجھ سے یہودی اور عیسائی اہل کتاب اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ کہ اُن پر اُتار دے تُو ایک کتاب آسمان سے۔ یہ سوال اہل کتاب نے اس لئے کیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دعویٰ کیا ہے کہ میں موسیٰ کی مانند نبی ہوں اور وہی ہوں جس کی بابت توریت استثنا کے ۱۸ باب ۱۸ میں پیشگوئی موجود ہے اور اس نبی کی پیش گوئی توریت میں اس طرح لکھی تھی:۔

تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا۔ استثنا ۱۸ باب ۱۸۔

پس لامحالہ اس نبی کے واسطے کوئی ایسی کتاب آسمان سے نہ اترے گی جو لکھی لکھائی آجاوے کیونکہ توریت میں تو لکھا ہے ''اپنا کلام اس کے منہ میں دوں گا'' پس ایسے سوال کے جواب میں فرمایا فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰۤى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَقَالُوْۤا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً

باقی پانچ سوال یہ ہیں جن کے جواب میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ فرمایا ہے۔ میرا رب جانتا ہے:۔

اوّل يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰهَا (الاعراف:۱۸۸) پوچھتے ہیں قیامت کی گھڑی کب ہوگی۔ جواب دیا۔ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ تو کہہ اس کا علم میرے رب ہی کے پاس ہے۔

دوسرا يَسْـَٔلُوْنَ اَيَّانَ يَوْمُ الدِّيْنِ (الذّٰریٰت:۱۳) پوچھتے ہیں جزا کا دن کب ہوگا۔ جس کا جواب کچھ نہیں دیا۔ سپارہ ۲۶ سورۃ ذاریات۔ غالباً اس لئے کہ وہ ہمیشہ ہی یا کہ اس لئے کہ ان کی مراد قیامت سے ہے۔

تیسرا يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰهَا (النازعات:۴۳) پوچھتے ہیں وہ گھڑی کب ہوگی۔ جس کا جواب دیا فِيْمَ اَنْتَ مِنْ ذِكْرٰىهَا اِلٰى رَبِّكَ مُنْتَهٰهَا (النازعات:۴۴،۴۵) تجھے ایسے قصوں سے کیا اس کا علم رب تک ہے۔

چوتھا يَسْـَٔلُكَ النَّاسُ عَنِ السَّاعَةِ (الاحزاب:۶۴) پوچھتے ہیں اس ساعت سے۔ جس کا جواب دیا اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ اس کا علم صرف اللہ کے پاس ہے۔

پانچواں يَسْـَٔلُوْنَكَ كَاَنَّكَ حَفِيٌّ عَنْهَا (الاعراف:۱۸۸) جس کا جواب دیا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ تجھ سے پوچھتے ہیں کیا تو ایسی باتوں کے پیچھے پڑا ہوا ہے اس کا علم اللہ کے پاس ہے۔

لاکن اس سوال کا جواب نہ دینے سے نبوت میں کوئی نقص نہیں آتا **کیونکہ** حضرت مسیح فرماتے ہیں اس دن اور اس گھڑی کو میرے باپ کے سوا آسمان کے فرشتہ تک کوئی نہیں جانتا۔ متی ۲۴ باب ۳۶۔ اور جگہ فرماتے ہیں:۔ اس دن اور اس گھڑی کی بابت سوا باپ کے نہ تو فرشتے جو آسمان پر ہیں اور نہ بیٹا **کوئی نہیں جانتا** ہے۔ مرقس ۱۳ باب ۳۲۔

سائل اور اس کے ہم خیال غور کریں اس گھڑی کی بابت حضرت مسیح کیا فتویٰ۔ ایسی گھڑی کا وقت نہ بتانا اگر نبوت اور رسالت میں خلل انداز ہے تو حضرت مسیح کی نبوت اور رسالت بلکہ عیسائیوں کی مانی ہوئی مسیح کی الوہیت میں خلل پڑے گا۔

سائل کے سوال کا دوسرا حصہ

اور اصحاب کہف کی بابت ان کی تعداد میں غلط بیانی نہ کرتے۔

جواب۔ نہ قرآن کریم نے اصحاب کہف کی تعداد بیان فرمائی اور نہ رسول کریم نے۔ معلوم نہیں ہوسکتا کہ سائل نے غلط بیانی کا اتہام کیونکر لگایا۔ جب حضرت رسالت مآب نے تعداد کو بتایا ہی نہیں اور اس کا بیان ہی نہیں کیا تو غلط بیانی کہاں سے آ گئی۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے سائل کسی کے دھوکہ میں آ کر یہ سوال کر بیٹھا ہے کیونکہ قرآن مجید میں جہاں اصحاب کہف کا قصہ لکھا ہے وہاں تعداد کے متعلق یہ آیت ہے:۔

سَيَقُوْلُوْنَ ثَلٰثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ رَجْمًا بِالْغَيْبِ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ سَبْعَةٌ وَّثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ ۚ قُلْ رَّبِّيْٓ اَعْلَمُ بِعِدَّتِهِمْ مَّا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا قَلِيْلٌ (الکہف:۲۳)

ترجمہ۔ لوگ کہیں گے تین ہیں چوتھا اُن کا کتا اور کہتے ہیں پانچ ہیں چھٹا اُن کا کتا ہے۔ بے نشانہ تیر چلاتے ہیں اور کہتے ہیں سات ہیں اور آٹھواں کتا ہے۔ تُو کہہ دے (اے **محمد**) میرا رب ہی اُن کی تعداد جانتا ہے اور اُن کو تھوڑے ہی جانتے ہیں۔

اس آیت شریف سے صاف صاف واضح ہے کہ لوگ ایسا ایسا کہیں گے۔ اور لوگ فلاں فلاں تعداد اصحاب کہف کی بیان کریں گے۔ لاکن ان لوگوں کا کہنا ''بن نشانہ تیر چلانا ہے'' اعتبار کے قابل نہیں۔

غرض حضرت نبی عرب نے کوئی تعداد اصحاب کہف کی نہیں بتائی۔

اور سائل کے سوال کا تیسرا حصہ یہ ہے

اور یہ نہ کہتے کہ سورج چشمۂ دلدل میں چھپتا ہے یا غرق ہوتا ہے حالانکہ سورج زمین سے نو ۹ کروڑ حصے بڑا ہے وہ کس طرح دلدل میں چھپ سکتا ہے۔

الجواب

سائل صاحب! تمام قرآن کریم میں کہیں نہیں لکھا کہ سورج چشمہ دلدل میں چھپتا یا غرق ہوتا ہے پادریوں کو مدت سے یہ دھوکا لگا ہے کہ قرآن میں ایسا لکھا ہے حالانکہ قرآن میں نہیں لکھا۔ بات یہ ہے کہ اس ذوالقرنین کا قصہ جس کا ذکر دانیال نبی کی کتاب ۸ باب ۴ میں ہے قرآن کریم نے ایک جگہ بیان فرمایا ہے اور اس میں کہا ہے جب وہ مادہ اور فارس کا بادشاہ اپنے فتوحات کرتا ہوا بلاد شام کے مغرب کو پہنچا تو اس خاص زمین کے مغرب میں ایک جگہ ''سورج دلدل میں ڈوبتا'' ذوالقرنین کو معلوم ہوا۔ غالباً جب ذوالقرنین بلیک سی وبحیرہ اسود یا ڈینیوب کے کنارے پہنچا تو اس وقت ذوالقرنین کو اس نظارہ کا موقع ملا۔

ہم نے مانا کہ سورج زمین سے بہت بڑا ہے لاکن چونکہ ہم سے بہت ہی دور ہے اس واسطے ہم کو چھوٹا سا دکھائی دیتا ہے اور زمین چونکہ کروی الشکل ہے اس واسطے غروب کے وقت ہم کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زمین کے فلاں حصہ یا پہاڑ کے فلانے چوٹی کے پیچھے یا ناظر کے افق کے فلاں درخت کے پیچھے یا اگر ہمارے مغرب میں پانی اور دلدل ہو جیسے ذوالقرین کو موقع لگا تو ہم کو مغرب کے وقت سورج اس پانی اور دلدل میں غروب ہوتا ہوا معلوم دے گا۔

(ایک عیسائی کے تین سوال اور ان کے جوابات از حضرت حکیم نورالدینؓ)

غزوہ خندق میں نمازیں قضا ہونے کا اعتراض

پادری فتح مسیح نے ایک یہ اعتراض کیا کہ غزوہ خندق میں نمازیں قضا ہو گئیں۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام اس کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:۔

''اور آپ کا یہ شیطانی وسوسہ کہ خندق کھودنے کے وقت چاروں نمازیں قضا کی گئیں اول آپ لوگوں کی علمیت تو یہ ہے کہ قضا کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اے نادان قضا نماز ادا کرنے کو کہتے ہیں۔ ترک نماز کا نام قضا ہرگز نہیں ہوتا۔ اگر کسی کی نماز ترک ہو جاوے تو اس کا نام فوت ہے اسی لئے ہم نے **پانچ ہزار روپے کا اشتہار دیا تھا** کہ ایسے بے وقوف بھی **اسلام** پر اعتراض کرتے ہیں جن کو ابھی تک قضا کے معنی بھی معلوم نہیں جو شخص لفظوں کو بھی اپنے محل پر استعمال نہیں کر سکتا وہ نادان کب یہ لیاقت رکھتا ہے کہ امور دقیقہ پر نکتہ چینی کر سکے۔ باقی رہا یہ کہ خندق کھودنے کے وقت چار نمازیں جمع کی گئیں اس احمقانہ وسوسہ کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ دین میں حرج نہیں ہے یعنی ایسی سختی نہیں جو انسان کی تباہی کا موجب ہو اس لئے اس نے ضرورتوں کے وقت اور بلاؤں کی حالت میں نمازوں کے جمع کرنے اور قصر کرنے کا حکم دیا ہے مگر اس مقام میں ہماری کسی معتبر حدیث میں چار جمع کرنے کا ذکر نہیں بلکہ **فتح الباری شرح صحیح بخاری** میں لکھا ہے کہ واقعہ صرف یہ ہوا تھا کہ ایک نماز یعنی **صلوۃ العصر** معمول سے تنگ وقت میں ادا کی گئی۔ اگر آپ اس وقت ہمارے سامنے ہوتے تو ہم آپ کو ذرہ بٹھا کر پوچھتے کہ کیا یہ **متفق علیہ** روایت ہے کہ چار نمازیں فوت ہو گئی تھیں۔ **چار نمازیں تو خود شرع کی رو سے جمع ہو سکتی ہیں** یعنی ظہر اور عصر۔ اور مغرب اور عشاء۔ ہاں ایک روایت ضعیف میں ہے کہ ظہر اور عصر اور مغرب اور عشاء اکٹھی کر کے پڑھی گئی تھیں لیکن دوسری **صحیح حدیثیں** اس کو رد کرتی ہیں اور صرف یہی ثابت ہوتا ہے کہ **عصر تنگ وقت** میں پڑھی گئی تھی۔ آپ **عربی علم** سے محض بے نصیب اور سخت جاہل ہیں **ذرا قادیان کی طرف آؤ اور ہمیں ملو** تو پھر آپ کے آگے کتابیں رکھی جائیں گی تا جھوٹے مفتری کو کچھ سزا تو ہو **ندامت کی سزا ہی سہی اگرچہ ایسے لوگ شرمندہ بھی نہیں ہوا کرتے۔**

مال مسروقہ کو آپ کے مسیح کے روبرو بزرگ حواریوں کا کھانا یعنی بیگانے کھیتوں کی بالیاں توڑنا کیا یہ درست تھا۔ اگر کسی جنگ میں کفار کے بلوے اور خطرناک حالت کے وقت نماز عصر تنگ وقت پر پڑھی گئی تو اس میں صرف یہ بات تھی کہ دو عبادتوں کے جمع ہونے کے وقت اس عبادت کو مقدم سمجھا گیا جس میں کفار کے خطرناک حملہ کی روک اور اپنے حقوق نفس اور قوم اور ملک کی جائز اور بجا محافظت تھی اور یہ تمام کارروائی اس شخص کی تھی جو شریعت لایا اور یہ بالکل قرآن کریم کے منشاء کے مطابق تھی خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۔(النجم:۴،۵) یعنی نبی کی ہر یک بات خدا تعالیٰ کے حکم سے ہوتی ہے نبی کا زمانہ نزول شریعت کا زمانہ ہوتا ہے اور شریعت وہی ٹھہر جاتی ہے جو نبی عمل کرتا ہے ورنہ جو جو کارروائیاں مسیح نے توریت کے برخلاف کی ہیں یہاں تک کہ سبت کی بھی پرواہ نہ رکھی اور کھانے پر ہاتھ نہ دھوئے وہ سب مسیح کو مجرم ٹھہراتے ہیں ذرا توریت سے ان سب کا ثبوت تو دو مسیح پطرس کو شیطان کہہ چکا تھا پھر اپنی بات کیوں بھول گیا۔ اور شیطان کو حواریوں میں کیوں داخل رکھا''۔

(نور القرآن نمبر۲، روحانی خزائن جلد نمبر ۹ صفحہ ۳۸۹ تا ۳۹۱)

اعتراض کہ آپؐ نے تین جگہ جھوٹ بولنے کی اجازت دی ہے

پادری فتح مسیح نے آنحضورؐ کے بارہ میں یہ اعتراض اٹھایا کہ آپؐ نے تین جگہ جھوٹ بولنے کی اجازت دی ہے اس کے جواب میں حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام تحریر فرماتے ہیں:

''ایک یہ اعتراض ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین جگہ جھوٹ بولنے کی اجازت دی ہے اور اپنے دین کو چھپا لینے کے واسطے قرآن میں صاف حکم دے دیا ہے مگر انجیل نے ایمان کو پوشیدہ رکھنے کی اجازت نہیں دی اما الجواب ۔ پس واضح ہو کہ جس قدر راستی کے التزام کے لئے قرآن شریف میں تاکید ہے میں ہرگز باور نہیں کرسکتا کہ انجیل میں اس کا عشر عشیر بھی تاکید ہو بیں

برس کے قریب عرصہ ہوگیا کہ میں نے اسی بارہ میں ایک اشتہار دیا تھا اور قرآنی آیات لکھ کر اور عیسائیوں وغیرہ کو ایک رقم کثیر بطور انعام دینا کر کے اس بات کا وعدہ کیا تھا کہ جیسے ان آیات میں راست گوئی کی تاکید ہے اگر کوئی عیسائی اس زور و شور کی تاکید انجیل میں سے نکال کر دکھلا دے تو اس قدر انعام اس کو دیا جائے گا مگر پادری صاحبان اب تک ایسے چپ رہے کہ گویا ان میں جان نہیں اب مدت کے بعد فتح مسیح صاحب کفن میں سے بولے شاید بوجہ امتداد زمانہ ہمارا وہ **اشتہار** ان کو یاد نہیں رہا۔ پادری صاحب آپ خس و خاشاک کو سونا بنانا چاہتے ہیں اور سونے کی کان سے منہ مروڑ کر اِدھر اُدھر بھاگتے ہیں اگر یہ بدقسمتی نہیں تو اور کیا ہے۔ **قرآن شریف** نے دروغ گوئی کو بُت پرستی کے برابر ٹھہرایا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْأَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوا قَوْلَ الزُّورِ (الحج:۳۱)

یعنی بتوں کی پلیدی اور جھوٹ کی پلیدی سے پرہیز کرو۔ اور پھر ایک جگہ فرماتا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ وَلَوْ عَلَىٰ أَنْفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ (النساء:۱۳۶)

یعنی اے ایمان والو انصاف اور راستی پر قائم ہو جاؤ اور سچی گواہیوں کو للہ ادا کرو اگرچہ تمہاری جانوں پر ان کا ضرر پہنچے یا تمہارے ماں باپ اور تمہارے اقارب ان گواہیوں سے نقصان اٹھاویں۔

اب اے **ناخداترس** ذرا **انجیل** کو کھول اور ہمیں بتلا کہ راست گوئی کے لئے ایسی تاکید انجیل میں کہاں ہے اور اگر ایسی تاکید ہوتی تو **پطرس** اول درجہ کا حواری کیوں جھوٹ بولتا اور کیوں **جھوٹی قسم** کھا کر اور **حضرت مسیح** پر **لعنت** بھیج کر صاف منکر ہو جاتا کہ میں اس کو نہیں جانتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے **صحابہ رضی اللہ عنہم** محض راست گوئی کی وجہ سے شہید ہوتے رہے اور الٰہی گواہی کو انہوں نے ہرگز مخفی نہ رکھا گو ان کے خون سے زمین سرخ ہوگئی مگر انجیل سے ثابت ہے کہ خود آپ کے یسوع صاحب اس شہادت (نوٹ: دیکھو متی ۱۶ باب آیت ۲۰) کو مخفی رکھتے رہے ہیں جس کا ظاہر کرنا ان پر واجب تھا اور وہ ایمان بھی دکھلا نہ سکے جو مکہ میں مصائب کے

وقت آنحضرت ﷺ کے صحابہ نے دکھلایا تھا۔ امید کہ آپ اس سے منکر نہیں ہوں گے اور اگر خیانت کے طور پر منکر بھی ہو گئے تو وہ تمام مقام ہم دکھلا دیں گے بالفعل صرف نمونہ کے طور پر ثبوت میں لکھا گیا۔

اور پھر آپ لکھتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے تین جگہ جھوٹ بولنے کی اجازت دی ہے مگر یہ آپ کو اپنی جہالت کی وجہ سے غلطی لگی ہے اور اصل بات یہی ہے کہ کسی حدیث میں جھوٹ بولنے کی ہرگز اجازت نہیں بلکہ حدیث میں تو یہ لفظ ہیں کہ ان قتلت واحرقت یعنی سچ کو مت چھوڑ اگرچہ تو قتل کیا جائے اور جلایا جائے۔ پھر جس حالت میں قرآن کہتا ہے کہ تم انصاف اور سچ مت چھوڑو اگرچہ تمہاری جانیں بھی اس سے ضائع ہوں اور حدیث کہتی ہے کہ اگرچہ تم جلائے جاؤ اور قتل کئے جاؤ مگر سچ ہی بولو۔ تو پھر اگر فرض کے طور پر کوئی حدیث **قرآن اور احادیث صحیحہ کی مخالف** ہو تو وہ **قابل سماعت نہیں ہوگی** کیونکہ ہم لوگ اُسی حدیث کو قبول کرتے ہیں جو احادیث صحیحہ اور قرآن کریم کے مخالف نہ ہو۔ ہاں بعض احادیث میں توریہ کے جواز کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے۔ اور اُسی کو نفرت دلانے کی غرض سے کذب کے نام سے موسوم کیا گیا ہے اور ایک جاہل اور احمق جب ایسا لفظ کسی حدیث میں بطور تسامح کے لکھا ہوا پاوے تو شاید اس کو حقیقی کذب ہی سمجھ لے کیونکہ وہ اس قطعی فیصلہ سے بے خبر ہے کہ حقیقی کذب اسلام میں پلید اور حرام اور شرک کے برابر ہے مگر توریہ جو درحقیقت کذب نہیں گو کذب کے رنگ میں ہے اضطرار کے وقت عوام کے واسطے اس کا جواز حدیث سے پایا جاتا ہے مگر پھر بھی لکھا ہے کہ افضل وہی لوگ ہیں جو توریہ سے بھی پرہیز کریں اور توریہ اسلامی اصطلاح میں اس کو کہتے ہیں کہ فتنہ کے خوف سے ایک بات کو چھپانے کے لئے یا کسی اور مصلحت پر ایک راز کی بات مخفی رکھنے کی غرض سے ایسی مثالوں اور پیرایوں میں اس کو بیان کیا جائے کہ عقلمند تو اس بات کو سمجھ جائے اور نادان کی سمجھ میں نہ آئے اور اس کا خیال دوسری طرف چلا جائے جو متکلم کا مقصود نہیں اور غور کرنے کے بعد معلوم ہو کہ جو کچھ متکلم نے کہا ہے وہ جھوٹ نہیں بلکہ حق محض ہے اور کچھ بھی کذب کی اس میں آمیزش نہ ہو اور نہ دل نے ایک ذرہ بھی کذب کی طرف میل کیا ہو جیسا کہ بعض احادیث میں دو مسلمانوں میں صلح

کرانے کے لئے یا اپنی بیوی کو کسی فتنہ اور خانگی ناراضگی اور جھگڑے سے بچانے کے لئے یا جنگ میں اپنے مصالح دشمن سے مخفی رکھنے کی غرض سے اور دشمن کو اور طرف جھکا دینے کی نیت سے توریہ کا جواز پایا جاتا ہے مگر باوصف اس کے بہت سی حدیثیں دوسری بھی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ توریہ اعلیٰ درجہ کے تقویٰ کے برخلاف ہے اور بہر حال کھلی کھلی سچائی بہتر ہے اگرچہ اس کی وجہ سے قتل کیا جائے اور جلایا جائے مگر افسوس کہ یہ توریہ آپ کے یسوع صاحب کے کلام میں بہت ہی پایا جاتا ہے تمام انجیلیں اس سے بھری پڑی ہیں اس لئے ہمیں ماننا پڑتا ہے کہ اگر توریہ کذب ہے تو یسوع سے زیادہ دنیا میں کوئی بھی کذاب نہیں گذرا۔ یسوع صاحب کا یہ قول کہ میں خدا کی ہیکل کو ڈھا سکتا ہوں اور پھر میں تین دن میں اسے بنا سکتا ہوں یہی وہ قول ہے جس کو توریہ کہتے ہیں۔ اور ایسا ہی وہ قول کہ ایک گھر کا مالک تھا جس نے انگورستان لگایا یہ سب توریہ کی قسمیں ہیں اور یسوع صاحب کے کلام میں اس کے بہت سے نمونے ہیں کیونکہ وہ ہمیشہ چباچبا کرباتیں کرتا تھا اور اس کی باتوں میں دورنگی پائی جاتی تھی۔

اور ہمارے سید و مولیٰ جناب مقدس نبوی کی تعلیم کا ایک اعلیٰ نمونہ اس جگہ ثابت ہوتا ہے اور وہ یہ کہ جس توریہ کو آپ کا یسوع شیر مادر کی طرح تمام عمر استعمال کرتا رہا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حتی الوسع اس سے مجتنب رہنے کا حکم کیا ہے تا مفہوم کلام کا اپنی ظاہری صورت میں بھی کذب سے مشابہ نہ ہو مگر کیا کہیں اور کیا لکھیں کہ آپ کے یسوع صاحب اس قدر التزام سچائی کا نہ کر سکے جو شخص خدائی کا دعویٰ کرے وہ تو شیر ببر کی طرح دنیا میں آنا چاہئے تھا نہ کہ ساری عمر توریہ اختیار کرکے اور تمام باتیں کذب کے ہمرنگ کہہ کر یہ ثابت کردیوے کہ وہ ان افراد کاملہ میں سے نہیں ہے جو مرنے سے لاپرواہ ہو کر دشمنوں کے مقابل پر اپنے تئیں ظاہر کرتے ہیں اور خدا تعالیٰ پر پورا بھروسہ رکھتے ہیں۔ اور کسی مقام میں بزدلی نہیں دکھلاتے مجھے تو ان باتوں کو یاد کرکے رونا آتا ہے کہ اگر کوئی ایسے ضعیف القلب یسوع کی اس ضعف حالت اور توریہ پر جو ایک قسم کا کذب ہے اعتراض کرے تو ہم کیا جواب دیں۔ جب میں دیکھتا ہوں کہ جناب سید المرسلینؐ جنگ (حنین) میں اکیلے ہونے کی حالت میں برہنہ تلواروں کے سامنے کہہ رہے تھے

میں محمدؐ ہوں۔میں نبی اللہ ہوں۔میں ابن **عبد المطلب** ہوں اور پھر دوسری طرف دیکھتا ہوں۔کہ آپ کا یسوع کانپ کانپ کر اپنے شاگردوں کو یہ خلاف واقعہ **تعلیم** دیتا ہے کہ **کسی سے نہ کہنا کہ میں یسوع مسیح ہوں** حالانکہ اس کلمہ سے کوئی اس کو قتل نہیں کرتا تو میں دریائے حیرت میں غرق ہو جاتا ہوں کہ یاالٰہی یہ شخص بھی نبی ہی کہلاتا ہے جس کی شجاعت کا خدا کی راہ میں یہ حال ہے۔

الغرض فتح مسیح نے اپنی جہالت کا خوب پردہ کھولا بلکہ اپنے یسوع صاحب پر بھی وار کیا کہ بعض ان احادیث کو پیش کر دیا جن میں توریہ کے جواز کا ذکر ہے اگر کسی حدیث میں توریہ کو بطور تسامح کذب کے لفظ سے بیان بھی کیا گیا ہو تو یہ سخت جہالت ہے کہ کوئی شخص اس کو حقیقی کذب پر محمول کرے جبکہ قرآن اور احادیث صحیحہ بالاتفاق کذب حقیقی کو سخت حرام اور پلید ٹھہراتے ہیں اور اعلیٰ درجہ کی حدیثیں توریہ کے مسئلہ کو کھول کر بیان کر رہی ہیں تو پھر اگر فرض بھی کر لیں کہ کسی حدیث میں بجائے توریہ کے کذب کا لفظ آ گیا ہو تو **نعوذ باللہ** اس سے مراد حقیقی کذب کیونکر ہو سکتا ہے بلکہ اس کے قائل کے نہایت باریک تقویٰ کا یہ نشان ہو گا کہ جس نے توریہ کو کذب کی صورت میں سمجھ کر بطور تسامح کذب کا لفظ استعمال کیا ہو ہمیں **قرآن اور احادیث صحیحہ** کی پیروی کرنا ضروری ہے اگر کوئی امر اس کے مخالف ہو گا تو ہم اس کے وہ معنے ہرگز قبول نہیں کریں گے جو مخالف ہوں احادیث پر نظر ڈالنے کے وقت یہ بات ضروری ہوتی ہے کہ ایسی حدیثوں پر بھروسہ نہ کریں جو ان احادیث سے مناقض اور مخالف ہوں۔جن کی صحت اعلیٰ درجہ پر پہنچ چکی ہو اور نہ ایسی حدیثوں پر جو قرآن کی نصوص صریحہ بینہ محکمہ سے صریح مخالف اور مغائر اور مبائن واقع ہوں پھر ایک ایسا مسئلہ جو قرآن اور احادیث صحیحہ نے اس پر اتفاق کر لیا ہے اور کتب دین میں صراحت سے اس کا ذکر ہے اس کے مخالف کسی بے ہودہ قول یا کسی مغشوش اور غیر ثابت حدیث یا مشتبہ اثر سے تمسک کر کے اعتراض کرنا یہ خیانت اور شرارت کا کام ہے۔ درحقیقت عیسائیوں کو ایسی شرارتوں نے ہی ہلاک کیا ہے ان لوگوں کو خود بخود حدیث دیکھنے کا مادہ نہیں۔غایت کار مشکوٰۃ کا کوئی ترجمہ دیکھ کر جس بات پر اپنے فہم ناقص سے عیب لگا سکتے ہیں وہی

بات لے لیتے ہیں حالانکہ کتب احادیث میں رطب ویابس سب کچھ ہوتا ہے اور عامل بالحدیث کو تنقید کی ضرورت پڑتی ہے اور یہ ایک نہایت نازک کام ہے کہ ہر یک قسم کی احادیث میں سے احادیث صحیحہ تلاش کریں اور پھر اس کے صحیح معنی معلوم کریں اور پھر اس کے لئے صحیح محمل تلاش کریں۔

قرآن نے جھوٹوں پر **لعنت کی** ہے۔اور نیز فرمایا ہے کہ جھوٹے شیطان کے مصاحب ہوتے ہیں اور جھوٹے بے ایمان ہوتے ہیں اور جھوٹوں پر شیاطین نازل ہوتے ہیں اور صرف یہی نہیں فرمایا کہ تم جھوٹ مت بولو بلکہ یہ بھی فرمایا ہے کہ تم جھوٹوں کی صحبت بھی چھوڑ دو اور ان کو اپنا یار دوست مت بناؤ اور خدا سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ رہو۔اور ایک جگہ فرماتا ہے کہ جب تو کوئی کلام کرے تو تیری کلام محض صدق ہو ٹھٹھے کے طور پر بھی اس میں جھوٹ نہ ہو۔اب بتلاؤ یہ تعلیمیں انجیل میں کہاں ہیں۔اگر ایسی تعلیمیں ہوتیں تو **عیسائیوں میں اپریل فول کی گندی رسمیں** اب تک کیوں جاری رہتیں۔دیکھو اپریل فول کیسی بُری رسم ہے کہ ناحق جھوٹ بولنا اس میں تہذیب کی بات سمجھی جاتی ہے یہ **عیسائی تہذیب** اور **انجیلی تعلیم** ہے۔معلوم ہوتا ہے کہ عیسائی لوگ جھوٹ سے بہت ہی پیار کرتے ہیں۔چنانچہ عملی حالت اس پر شاہد ہے۔مثلاً قرآن تو تمام **مسلمانوں** کے ہاتھ میں ایک ہی ہے۔مگر سنا گیا ہے کہ **انجیلیں** ساٹھ سے بھی کچھ زیادہ ہیں۔ شاباش اے **پادریان** جھوٹ کی **مشق** بھی اسے کہتے ہیں۔شاید آپ نے اپنے ایک مقدس بزرگ کا قول سنا ہے۔کہ جھوٹ بولنا نہ صرف جائز بلکہ ثواب کی بات ہے خدا تعالیٰ نے عدل کے بارے میں جو بغیر سچائی پر پورا قدم مارنے کے حاصل نہیں ہوسکتی۔فرمایا ہے۔

لَا یَجۡرِمَنَّکُمۡ شَنَاٰنُ قَوۡمٍ عَلٰۤی اَلَّا تَعۡدِلُوۡا ؕ اِعۡدِلُوۡا ۟ ہُوَ اَقۡرَبُ لِلتَّقۡوٰی (المائدۃ:۹) دشمن قوموں کی دشمنی تمہیں انصاف سے مانع نہ ہو۔ انصاف پر قائم رہو کہ تقویٰ اسی میں ہے۔اب آپ کو معلوم ہے کہ جو قومیں ناحق ستاویں اور دکھ دیویں اور خونریزیاں کریں اور تعاقب کریں اور بچوں اور عورتوں کو قتل کریں جیسا کہ مکہ والے کافروں نے کیا تھا اور پھر لڑائیوں سے باز نہ آویں ایسے لوگوں کے ساتھ معاملات میں انصاف

کے ساتھ برتاؤ کرنا کس قدر مشکل ہوتا ہے مگر **قرآنی تعلیم** نے ایسے جانی دشمنوں کے حقوق کو بھی **ضائع نہیں کیا** اور انصاف اور راستی کے لئے وصیت کی مگر آپ تو تعصب کے گڑھے میں گرے ہیں ان پاک باتوں کو کیونکر سمجھیں۔ **انجیل** میں اگرچہ لکھا ہے کہ اپنے دشمنوں سے پیار کرو مگر یہ نہیں لکھا کہ دشمن قوموں کی دشمنی اور ظلم تمہیں انصاف اور سچائی سے مانع نہ ہو۔ میں سچ سچ کہتا ہوں کہ دشمن سے **مدارات** سے پیش آنا آسان ہے مگر دشمن کے حقوق کی حفاظت کرنا اور مقدمات میں عدل اور انصاف کو ہاتھ سے نہ دینا یہ بہت مشکل اور فقط جوانمردوں کا کام ہے اکثر لوگ اپنے شریک دشمنوں سے محبت تو کرتے ہیں اور میٹھی میٹھی باتوں سے پیش آتے ہیں مگر ان کے حقوق دبا لیتے ہیں ایک بھائی دوسرے بھائی سے محبت کرتا ہے۔ اور محبت کے پردہ میں دھوکا دے کر اس کے حقوق دبالیتا ہے مثلاً اگر زمیندار ہے تو چالاکی سے اس کا نام کاغذات بندوبست میں نہیں لکھواتا اور یوں اتنی محبت کہ اس پر قربان ہوا جاتا ہے پس خدا تعالیٰ نے اس آیت میں محبت کا ذکر نہ کیا بلکہ معیار محبت کا ذکر کیا۔ کیونکہ جو شخص اپنے جانی دشمن سے عدل کرے گا۔ اور سچائی اور انصاف سے درگذر نہیں کرے گا وہی ہے جو سچی محبت بھی کرتا ہے مگر آپ کے خدا کو یہ تعلیم یاد نہ رہی کہ ظالم دشمنوں کے ساتھ عدل کرنے پر ایسا زور دیتا جو قرآن نے دیا اور دشمن کے ساتھ سچا معاملہ کرنے کے لئے اور سچائی کو لازم پکڑنے کے لئے وہ تاکید کرتا جو قرآن نے تاکید کی اور تقویٰ کی باریک راہیں سکھاتا مگر افسوس کہ جو بات سکھلائی دھوکے کی سکھلائی اور پرہیز گاری کی سیدھی راہ پر قائم نہ کر سکا یہ آپ کے فرضی **یسُوع** کی نسبت ہم کہتے ہیں جس کے چند پریشان ورق آپ کے ہاتھ میں ہیں اور جو خدائی کا دعویٰ کرتا کرتا آخر **مصلوب** ہو گیا اور ساری رات **رو رو کر دعا کی** کہ کسی طرح **بچ جاؤں** مگر بچ نہ سکا۔

ہمارے سید و مولیٰ **نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم** نے تو آپ دنیا سے جانے کے لئے دعا کی کہ **الحقنی بالرفیق الاعلیٰ** مگر آپ کے خدا صاحب نے دنیا کی چند روزہ زندگی سے ایسا پیار کیا کہ ساری رات زندہ رہنے کے لئے دعائیں کرتا رہا بلکہ **سولی** پر بھی رضا اور تسلیم کا کلمہ منہ سے نہ نکلا اور اگر نکلا تو یہ نکلا کہ **ایلی ایلی لما سبقتنی** اے میرے خدا اے میرے خدا تو

نے مجھے کیوں ترک کر دیا اور خدا نے کچھ جواب نہ دیا کہ اس نے ترک کر دیا مگر بات تو ظاہر ہے کہ خدائی کا دعویٰ کیا۔ تکبر کیا ترک کیا گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا تعالیٰ نے آخر وقت میں مخیّر کیا کہ اگر چاہو تو دنیا میں رہو اور اگر چاہو تو میری طرف آ جاؤ۔ آپ نے عرض کیا کہ اے میرے رب اب میں یہی چاہتا ہوں کہ تیری طرف آؤں اور آخری کلمہ آپ کا جس پر آپ کی جان مطہر رخصت ہوگئی۔ یہی تھا کہ **بالرفیق الاعلیٰ** یعنی اب میں اس جگہ رہنا نہیں چاہتا۔ میں اپنے خدا کے پاس جانا چاہتا ہوں۔ اب دونوں کلموں کو وزن کرو۔ آپ کے خدا صاحب نے نہ فقط ساری رات زندہ رہنے کے لئے دعا کی بلکہ صلیب پر بھی **چلّا چلّا کر روئے** کہ مجھے موت سے بچالے مگر کون سنتا تھا۔ لیکن ہمارے **مولیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم** نے زندگی کے لئے ہرگز دعا نہیں کی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ مختار کیا کہ اگر زندگی کی خواہش ہے تو یہی ہوگا۔ مگر آپ نے فرمایا کہ اب میں اس دنیا میں رہنا نہیں چاہتا **کیا یہ خدا ہے جس پر بھروسہ ہے ڈوب جاؤ!!!**"

(نور القرآن نمبر ۲، روحانی خزائن جلد نمبر ۹ صفحہ ۴۱۰ تا ۴۱۱)

تمام انبیاء پر فضیلت کلی نہ ہونے کا اعتقاد

نادان موحدوں کے اس غلط اعتقاد کے ردّ میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام آئینہ کمالات اسلام میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

"خود خدا قرآن کریم میں فرماتا ہے قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ لَا شَرِيكَ لَهُ وَبِذَٰلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ۔

(الانعام: ۱۶۳، ۱۶۴)

وَأَنَّ هَٰذَا صِرَاطِي مُسْتَقِيمًا فَاتَّبِعُوهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيلِهِ ذَٰلِكُمْ وَصَّاكُمْ بِهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ (الانعام: ۱۵۴)

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ (آل عمران: ۳۲)

قُلۡ اَسۡلَمۡتُ وَجۡهِیَ لِلّٰهِ (آل عمران:۲۱) وَ اُمِرۡتُ اَنۡ اُسۡلِمَ لِرَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ (المؤمن:۶۷)
یعنی ان کو کہہ دے کہ میری نماز اور میری پرستش میں جدوجہد اور میری قربانیاں اور میرا زندہ رہنا اور میرا مرنا سب خدا کے لئے اور اس کی راہ میں ہے۔ وہی خدا جو تمام عالموں کا رب ہے جس کا کوئی شریک نہیں اور مجھے اس بات کا حکم دیا گیا ہے اور میں **اوّل المسلمین** ہوں یعنی دنیا کی ابتداء سے اس کے اخیر تک میرے جیسا اور کوئی کامل انسان نہیں جو ایسا اعلیٰ درجہ کا فنا فی اللہ ہو جو خدا تعالیٰ کی ساری امانتیں اس کو واپس دینے والا ہو۔ اس آیت میں ان نادان موحدوں کا ردّ ہے جو یہ اعتقاد رکھتے ہیں جو ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دوسرے انبیاء پر فضیلت کلی ثابت نہیں اور ضعیف حدیثوں کو پیش کر کے کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات سے منع فرمایا ہے کہ مجھ کو یونس بن متّیؑ سے بھی زیادہ فضیلت دی جائے۔ یہ نادان نہیں سمجھتے کہ اگر وہ حدیث صحیح بھی ہو تب بھی وہ بطور انکسار اور تذلل ہے جو ہمیشہ ہمارے سیّد صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت تھی ہر ایک بات کا ایک موقع اور محل ہوتا ہے اگر کوئی صالح اپنے خط میں احقر عباد اللہ لکھے تو اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ یہ شخص درحقیقت تمام دنیا یہاں تک کہ بت پرستوں اور تمام فاسقوں سے بدتر ہے اور خود اقرار کرتا ہے کہ وہ احقر عباد اللہ ہے کس قدر نادانی اور شرارت نفس ہے۔

غور سے دیکھنا چاہئے کہ جس حالت میں اللہ جلّ شانہٗ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نام اول المسلمین رکھتا ہے اور تمام مطیعوں اور فرمانبرداروں کا سردار ٹھہراتا ہے **اور سب سے پہلے امانت کو واپس دینے والا آنحضرت صلعم کو قرار دیتا ہے تو پھر کیا بعد اس کے کسی قرآن کریم کے ماننے والے کو گنجائش ہے** کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اعلیٰ میں کسی طرح کا جرح کر سکے۔ خدا تعالیٰ نے آیت موصوفہ بالا میں اسلام کے لئے کئی مراتب رکھ کر سب مدارج سے اعلیٰ درجہ وہی ٹھہرایا ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فطرت کو عنایت فرمایا۔ **سبحان اللہ ما اعظم شانک یا رسول اللہ۔**

موسیٰ و عیسیٰ ہمہ خیلِ تواند جملہ دریں راہ طفیلِ تواند

(آئینہ کمالات اسلام، روحانی خزائن جلد نمبر ۵ صفحہ ۱۶۲ تا ۱۶۴)

اعتراض کہ آپؐ صرف عرب قوم کے لئے نبی تھے

سورۃ ابراہیم کی آیت ۵ کی تفسیر میں اس اعتراض کے جواب میں حضرت مصلح موعود بیان کرتے ہیں:

''عیسائیوں نے اور بالخصوص ویری نے اس آیت سے رسول کریم صلعم کی ذات پر اعتراض کیا ہے۔ویری صاحب کہتے ہیں کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے۔محمد رسول اللہ صلعم صرف عرب کے لئے تھے۔مگر ساتھ ہی یہ بھی لکھتے ہیں کہ اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کریم کا ترجمہ کرنا جائز ہے۔ان کی یہ دونوں باتیں آپس میں متضاد ہیں۔اگر نبی کریم ﷺ صرف عرب کے لئے تھے تو ترجمہ کا سوال ہی کہاں رہا۔جب دوسری قوموں کا اس سے تعلق ہی نہیں تو ترجمہ کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔اور اگر اس آیت سے ترجمہ کرنا جائز ثابت ہوتا ہے تو معلوم ہوا کہ آپ کی رسالت دوسری قوموں کے لئے بھی تھی۔حقیقی جواب اس سوال کا یہ ہے کہ یہ مفہوم اس آیت کا ہو ہی نہیں سکتا کہ آنحضرت صلعم عرب کے لئے ہیں۔کیونکہ قرآن کریم کے دوسرے مقامات سے صاف ثابت ہے کہ آپ سب دنیا کی طرف مبعوث ہوئے تھے۔چنانچہ سورۃ اعراف ۱۵۷ تا ۱۵۹ میں فرماتا ہے۔

یعنی میری رحمت ہر چیز پر حاوی ہے اور اب میں خاص طور پر اس کو ان لوگوں کے لئے لکھ دوں گا جو تقویٰ اختیار کریں گے اور زکوۃ دیں گے اور جو لوگ پورے طور پر ہماری آیات پر ایمان لائیں گے۔ نیز جو کامل طور پر ہمارے اس موعود رسول کی اطاعت کریں گے جس کی بعثت کی بشارات کو وہ اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔ وہ رسول وقت پر مبعوث ہو کر انہیں نیک کاموں کی تلقین کر رہا ہے اور ناپاک چیزوں کو ان پر حرام قرار دیتا ہے اور وہ ان سے سخت حکموں کے بوجھوں کو اور رسومات کے پھندوں کو جو ان کی گردنوں میں پڑے ہوئے تھے دور کرتا ہے۔ پس جو لوگ اس پر کامل طور پر ایمان لائے اور پھر انہوں نے اس کی حمایت اور مدد کے لئے ہر ممکن کوشش سے کام لیا۔ اور اس نور کی انہوں نے اتباع کی جو اس رسول کے ساتھ اتارا گیا۔ صرف ایسے لوگ ہی کامیاب ہوں گے۔ اے ہمارے رسول تو یہ اعلان کر کہ اے بنی نوع انسان میں تم سب کی طرف اس خدا کی طرف سے رسول ہو کر آیا ہوں کہ زمین و آسمان کی بادشاہت اسی کی ہے۔ اس کے سوا کوئی اور معبود قابل پرستش نہیں۔ وہ زندگی بخشتا اور موت دیتا ہے۔ پس اے لوگوں اللہ پر اور اس کے موعود بھیجے ہوئے نبی پر ایمان لاؤ۔ جو خود اللہ کی ذات پر اور اس کے کلمات پر پورا ایمان رکھتا ہے اور اس کی کامل پیروی کی راہوں پر چلو۔ تا کہ تم ہدایت پاؤ۔

اس میں پانچ دلیلیں اس امر کی دی گئی ہیں کہ نبی کریم صلعم ساری دنیا کے لئے ہیں۔

اول۔ اہل کتاب کو حکم دیا گیا ہے کہ اس کو تسلیم کریں فرمایا: اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ یعنی اہل کتاب میں سے ان لوگوں کو خدا تعالیٰ کی رحمت کا انعام دیا جائے گا۔ جو آنحضرت صلعم کو مانیں گے اگر آپ صرف عرب کے لئے تھے تو اہل کتاب کو رحمت کا انعام حاصل کرنے کے لئے آپ کی اتباع کا کیوں حکم دیا گیا۔

دوم۔ اس آیت میں ذکر ہے کہ تورات و انجیل میں آنحضرت صلعم کی پیشگوئی ہے اگر آپ ان کی طرف مبعوث ہی نہ تھے تو ان کے لئے پیشگوئی کی کیا ضرورت تھی کیونکہ جن کو فائدہ ہو سکتا ہے وہ مکہ والے تھے۔ اور وہ تورات و انجیل کو نہیں مانتے تھے۔ اور پیشگوئی اس لئے کی جاتی ہے کہ لوگوں کو اس کے ذریعہ سے ہدایت ہو۔ پس تورات اور انجیل میں اسی لئے پیشگوئیاں کی گئی تھیں

کہ یہود اور مسیحیوں کے لئے آنحضرت صلعم کا ماننا ضروری تھا اور قرآن کریم ان پیشگوئیوں کی طرف اسی لئے اشارہ کرتا ہے کہ اس کے نزدیک ان کتب کے ماننے والوں کے لئے بھی آپ کا ماننا ضروری تھا۔

سوم۔اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ آنحضرت صلعم انہیں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے ہیں۔اگر وہ مخاطب نہ تھے تو پھر ان کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی کیا ضرورت تھی۔

چہارم۔اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ جو یہود و نصاریٰ میں سے آپ پر ایمان لائیں گے وہ کامیاب و مظفر ہوں گے۔اگر آپ صرف عرب کی طرف تھے تو پھر تو یہود و نصاریٰ کو ایمان لانے پر سزا ملنی چاہئے تھی نہ کہ انعام ملنا چاہئے تھا۔پس ان چاروں دلیلوں سے ثابت ہے کہ اور کسی قوم کی طرف آپ مبعوث تھے یا نہ تھے۔یہود و نصاریٰ کی طرف تو ضرور تھے۔لیکن پانچویں دلیل نے تو بات کو بالکل ہی کھول دیا ہے۔

پنجم۔دلیل پنجم یہ ہے کہ قرآن کریم نے اوپر کے دلائل کا نتیجہ نکال کر خود ہی فرما دیا ہے۔قُلْ يَآ أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللّٰهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا کہہ دے کہ اے بنی نوع انسان میں تم سب کی طرف رسول ہو کر آیا ہوں۔اس دعویٰ نے تو بات کو بالکل صاف کر دیا۔اور یہود و نصاریٰ کے علاوہ دوسری اقوام کو بھی آپؐ کا مخاطب بنا دیا۔

ایک اور آیت میں فرماتا ہے۔وَمَآ أَرْسَلْنٰكَ إِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيرًا وَّ نَذِيرًا (سبا:۲۹) کہ ہم نے تجھے تمام جہان کی طرف بشیر و نذیر کر کے بھیجا ہے پھر حدیث میں بھی آتا ہے بُعِثْتُ إِلَى الْأَسْوَدِ وَالْأَحْمَرِ۔میں ہر کالے گورے کی طرف بھیجا گیا ہوں۔عرب کبھی بھی اپنے آپ کو اسود نہیں کہتے۔بلکہ ہمیشہ احمر کہتے ہیں اب اسود قوم کوئی اور نکالنی پڑے گی۔عربی زبان میں محاورہ کے مطابق وہ عجم ہی ہیں۔لغت میں بھی اَلْأَسْوَدُ وَالْأَحْمَرُ کے معنے اَلْعَجَمُ وَالْعَرَبُ لکھے ہیں۔(مجمع البحار) پھر ایک اور حدیث میں آتا ہے۔بُعِثْتُ إِلَى النَّاسِ عَامَّةً میں سب انسانوں کی طرف مبعوث ہوا ہوں۔ (مسند احمد بروایت حضرت جابر)

ایک اور روایت میں ان کی جگہ یہ الفاظ ہیں: أُرْسِلْتُ إِلَى الْخَلْقِ كَافَّةً۔میں سب

لوگوں کی طرف بھیجا گیا ہوں ۔(مشکوۃ المصابیح)

ان تمام آیات واحادیث سے ثابت ہوا کہ آنحضرت صلعم کی بعثت تمام دنیا کے لئے تھی اور مسیحی مصنفین کا اعتراض باطل ہے۔اسی طرح ان آیات واحادیث سے یہ بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ جس قوم کو نبی پہلے مخاطب کرتا ہے اس کی زبان میں اس کو الہام ہوتا ہے ۔اور پھر وہ لوگ بات کو سمجھ کر دوسروں تک پہنچاتے ہیں ۔

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عربی ام الالسنہ ہے کیونکہ جو رسول عرب میں آیا۔ اسی کے سپرد سب دنیا کی اصلاح کی گئی ۔پس عربی میں نازل ہونے والی وحی کو سب دنیا کے لئے ہدایت قرار دینے سے یہ امر ثابت ہوتا ہے کہ عربی کسی نہ کسی رنگ میں ساری زبانوں کی ماں ہے اور دوسری زبانیں اس کی بیٹیوں کی طرح ہیں۔

اس آیت میں آریوں کے اس اعتراض کا بھی رد ہو جاتا ہے جو وہ یوں کرتے ہیں کہ کلام الٰہی ایسی زبان میں آنا چاہئے جسے کوئی بولتا نہ ہوتا کہ سب میں برابری رہے۔مگر قرآن کریم کہتا ہے کہ ایسی زبان میں وحی نہیں ہونی چاہئے جس کو لوگ بولتے ہوں ۔تا کہ نبی ان کو سمجھا سکے اور وہ سمجھ سکیں جس زبان کو دنیا نہ بول سکتی ہے۔نہ سمجھ سکتی ہے اس میں کلام الٰہی آنے کا فائدہ کیا ہوا۔آریوں کا یہ عقیدہ اس طرح بھی غلط ہے کہ جب وید نازل ہوئے اگر اسی وقت رشیوں نے اسے نہیں سمجھا تو ان کا نزول بے فائدہ ہو جاتا ہے اور اگر ان کو وید سمجھا دیا گیا تھا تو پھر برابری نہ رہی اور اگر اس وقت لوگ موجود تھے اور انہیں بھی سمجھا دیا گیا تھا تو گو اس وقت کے لوگوں کے لئے برابری ہو گئی ۔مگر جو لوگ بعد میں پیدا ہوئے ان کے لئے برابری کہاں رہی ۔اب تو پنڈت تک ویدوں کی زبان سے ناواقف ہو رہے ہیں۔ (تفسیر کبیر جلد ۴ ص ۴۴۲ تا ۴۴۴)

حسب ضرورت قرآن تصنیف کرنے کا الزام

حضرت مصلح موعودؓ نے اس اعتراض کا جواب سورۃ النحل آیت نمبر ۳ کی تشریح میں یوں دیا ہے:

یُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِکَۃَ ۔تنزیل کے ایک معنے آہستہ آہستہ اتارنے کے ہوتے ہیں ۔اس جگہ

یہی معنے مراد ہیں اور بتایا ہے کہ کلام الٰہی ہمیشہ اور ہر نبی پر آہستہ آہستہ اترتا ہے۔ پس یہ اعتراض جو رسول کریم ﷺ پر بعض لوگوں کی طرف سے خصوصاً مسیحیوں کی طرف سے کیا جاتا ہے کہ اس کا تھوڑا تھوڑا کر کے اترنا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ انسانی کلام ہے اور ضرورت کے مطابق تصنیف کر لیا جاتا تھا۔ ان کی سنت الٰہیہ سے ناواقفیت کی علامت ہے کیونکہ کونسا نبی ہے جس نے ایک وقت میں ہی ساری کتاب لا کر دنیا کو دے دی ہے۔ موسیٰؑ کے صحف، حضرت عیسیٰؑ کے واقعات سب اس امر پر شاہد ہیں کہ تعلیم آہستہ آہستہ ایک لمبے عرصہ میں دنیا کو دی گئی۔ اگر اس طرح تعلیم کا دنیا کے سامنے پیش کرنا قابل اعتراض ہو تو یہ اعتراض حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ پر بھی وارد ہوتا ہے۔

لیکن حق یہ ہے کہ یہ اعتراض ہی غلط ہے جو تعلیم دنیا کے رائج الوقت خیال کے خلاف ہو اور اس کو مٹا کر اور امر الٰہی کو رائج کرنے کے لئے آئے اس کا آہستہ آہستہ اترنا ضروری ہے۔ تا لوگ اس پر اچھی طرح عمل کر سکیں اور تا وہ ان کے دماغوں میں راسخ ہو جائے۔ اسی کی طرف اشارہ ہے سورۃ فرقان کی اس آیت میں کہ:

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۚ كَذٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ　(الفرقان:۳۳)

یعنی کافر کہتے ہیں کہ کیوں سب قرآن اس پر ایک ہی دفعہ نہیں اترا۔ یعنی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خدا کا کلام نہیں بلکہ محمدؐ رسول اللہ حسب موقع اسے تصنیف کر لیتے ہیں۔ فرماتا ہے یہ ٹھیک ہے کہ یہ قرآن ایک ہی دفعہ نہیں اترا مگر اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم اس طرح تیرے دل کو ثبات اور ایمان بخشنا چاہتے ہیں۔ یعنی تُو اور تیرے مومن اس کے مطالب کو عملی جامہ پہنا کر اس کے معانی سے خوب آگاہ ہوتے جاؤ اور اس لئے بھی کہ اگر پہلے ایک پیشگوئی بیان کی جائے پھر جب وہ پوری ہو جائے اور اس کا ذکر بعد کی وحی میں کیا جائے تو ایمان بہت زیادہ مضبوط ہو جاتا ہے اور یہ طریق بیان بعد میں آنے والے لوگوں کے ایمان کی زیادتی کا بھی موجب ہوتا ہے۔ لیکن اگر کلام الٰہی میں پیشگوئیوں کا تو ذکر ہو لیکن ان کے پورا ہونے کی طرف کوئی اشارہ نہ ہو تو

اس وقت کے لوگ بھی اتنا فائدہ نہیں اٹھاتے اور بعد کے لوگوں کے لئے بھی وہ کلام کافی نہیں ہوتا بلکہ دوسری کتب کے وہ محتاج رہتے ہیں۔

مِنْ اَمْرِہٖ میں مِنْ تبعیضیہ بھی ہوسکتا ہے اور مطلب یہ ہے کہ ہم نے سارے حکم ایک ہی وقت میں کسی ایک نبی پر نازل نہیں کئے۔ بلکہ ہر زمانہ میں ضرورت کے مطابق اپنے احکام مختلف انبیاء کی معرفت نازل کئے ہیں۔ پس یہ اعتراض کہ پہلے نبیوں کے بعد اس کی کیا ضرورت ہے، غلط ہے۔ جس طرح پہلے نبی کے بعد دوسرے نبی کی ضرورت تھی اسی طرح سابق نبیوں کے بعد اس نبی کی ضرورت ہے۔

اَنْ اَنْذِرُوْا اَنَّہٗ لَا اِلٰہَ اِلَّآ اَنَا فَاتَّقُوْنِ ۔ یہ تمام دینی تعلیمات کا خلاصہ ہے۔ نبیوں کی تعلیم جزئیات میں مختلف رہی ہے۔ مگر ایک ہی اصل سب کی تعلیم میں کرفرما تھا کہ اللہ تعالیٰ ایک ہے اور دین کا خلاصہ یہی تعلیم ہے۔ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے حضرت ابو ہریرہؓ سے فرمایا کہ: ''جا جو ملے اس سے کہہ دے مَنْ قَالَ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ دَخَلَ الْجَنَّۃَ ۔ جس نے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کہا داخل جنت ہوگیا۔ (مسلم کتاب الایمان) انہیں سب سے پہلے حضرت عمرؓ ملے اور انہوں نے انہیں روکا اور آنحضرت صلعم کی خدمت میں لائے اور آپؐ سے پوچھا کہ کیا ابو ہریرہؓ جو کہتے ہیں وہ درست ہے؟ آپؐ نے فرمایا ہاں درست ہے آپ نے فرمایا یا رسول اللہ اگر اس طرح اعلان ہوا تو فَاِنِّیْ اَخْشٰی اَنْ یَّتَّکِلَ النَّاسُ عَلَیْھَا یعنی لوگ یہ کہنے لگ جائیں گے کہ بس لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کہہ لیا اب کسی عمل کی ضرورت نہیں۔ اس پر رسول کریم ﷺ نے فرمایا بہت اچھا رہنے دو۔ اس سے یہ مطلب نہیں کہ آپؐ نے اس کو ضروری نہ سمجھا بلکہ مطلب یہ ہے کہ جو اعلان کرنا تھا ہو چکا۔ جو اس کا مفہوم سمجھتے تھے ان کو معلوم ہوگیا نا اہلوں تک پہنچانے کی ضرورت نہیں۔ اس حکم کے اہل جو سمجھتے ہیں کہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ میں سب احکام شامل ہیں وہ خود اس کی مناسب تشریح کے ساتھ سب کو پہنچا دیں گے۔'' (تفسیر کبیر جلد ۴ صفحہ ۱۲۶ و ۱۲۷)

قومی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کا الزام

انبیاء پر مخالفین نے قومی وحدت پارہ پارہ کرنے کے الزام لگائے ہیں ۔ یہ الزام آپؐ پر بھی لگا۔اس کا جواب حضرت مصلح موعودؓ تفسیر سورۃ النمل میں یوں ارشاد فرماتے ہیں:۔

''چونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اللہ تعالیٰ نے توحید کے قیام کے لئے کھڑا کیا تھا۔اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ جس طرح حضرت صالح علیہ السلام کو ان کی قوم نے تفرقہ انداز قرار دیا تھا۔اسی طرح کفار نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی قومی وحدت کو پارہ پارہ کرنے والا قرار دیا۔ بلکہ وہ ایک دفعہ حضرت ابو طالب کے پاس محض اس لئے آئے کہ وہ اپنے بھتیجے کو سمجھائیں اور انہیں توحید کو اشاعت سے روکنے کی کوشش کریں۔کفار مکہ کی یہ گھبراہٹ بالکل ویسی ہی تھی جیسے حضرت صالحؑ کے زمانے میں ان کے مخالفین نے جب انہیں توحید کی تعلیم دیتے دیکھا تو انہوں نے بگڑ کر حضرت صالحؑ کو منحوس اور سبز قدم کہنا شروع کر دیا۔مگر نہ حضرت صالحؑ نے خدائے واحد کا پیغام پہنچانا ترک کیا اور نہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے توحید کی تعلیم ترک کی ۔اور آخر اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ ایک دن مردہ عرب زندہ ہو گیا۔آخر ایک زندہ اور مردہ میں کیا فرق ہوتا ہے ۔یہی فرق ہوتا ہے کہ مردہ کو کسی چیز کا احساس نہیں ہوتا ۔اس کے سامنے اس کے کسی عزیز ترین وجود کو گالی دی جائے یا اسے قتل کر دیا جائے وہ دفاع کے لئے کوئی حرکت نہیں کرسکتا۔ نہ اس ظلم کا اسے کچھ احساس ہوتا ہے لیکن زندہ انسان اپنے نفع و نقصان کو بھی سمجھتا ہے اور دوسروں کے حقوق کے لئے بھی جدوجہد کرتا ہے ۔یہی کیفیت روحانی مردوں میں بھی پائی جاتی ہے وہ اپنی آنکھوں کے سامنے ہر قسم کے مظالم دیکھتے ہیں لوگ ان کے سامنے جھوٹ بولتے ہیں ان کی موجودگی میں دھوکہ بازیاں کرتے ہیں ۔مگر انہیں پرواہ تک نہیں ہوتی مگر جب اللہ تعالیٰ کا کوئی نبی دنیا میں آتا ہے تو وہ کہتا ہے اگر تم کسی کو جھوٹ بولتے دیکھو تو اسے منع کرو۔اگر کوئی ظلم کر رہا ہو تو اسے ظلم سے روکو۔ بلکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تو یہاں تک فرمایا کہ ایمان کی علامت یہ ہے کہ جب مومن کوئی بری بات دیکھے تو ہاتھ سے اس کا ازالہ کرے ۔اور اگر ہاتھ سے ازالہ نہ

کرسکتا ہو تو زبان سے روکنے کی کوشش کرے۔اور اگر زبان سے بھی نہ روک سکتا ہو تو اپنے دل میں ہی برا منائے۔مگر روحانی مردوں میں یہ تینوں باتیں نہیں پائی جاتیں۔وہ برائی ظلم اور جھوٹ کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں مگر نہ تو وہ ہاتھ سے اس کا ازالہ کرتے ہیں نہ زبان سے کسی کو منع کرتے ہیں اور نہ ہی کسی کے برے فعل پر اپنے دل میں ہی برا مناتے ہیں۔بے شک بعض دفعہ وہ دکھاوے کے طور پر زبان سے کہہ بھی دیتے ہیں۔مگر کہتے وقت ان کے چہرے پر غیرت کے آثار نہیں پائے جاتے۔مگر زندہ ان تینوں باتوں میں سے ایک بات ضرور ہوگی وہ بری بات کو دیکھ کر یا تو ہاتھ سے اس کا ازالہ کرے گا یا زبان سے دوسرے کو روکے گا اور یا پھر دل میں ہی برا منائے گا۔ (تفسیر کبیر جلد ۷ ص ۴۰۰)

اموال غنیمت کی تقسیم میں عدل سے کام نہ لینے کا اعتراض

منافقین نے آنحضورؐ پر غنائم میں عدل سے کام نہ لینے کا اعتراض کیا ہے۔اس اعتراض کا پس منظر اور اس کی حقیقت بیان کرتے ہوئے حضرت مصلح موعودؓ بیان فرماتے ہیں:

"آنحضرت ﷺ ہوازن پر فتح پا کے واپس آ رہے تھے اور اس جنگ میں جو اموال مسلمانوں کے ہاتھ آئے ان کی تقسیم کا سوال درپیش تھا۔آپ کا منشا تھا کہ اگر ہوازن تائب ہو کر آجائیں اور معافی کے خواستگار ہوں تو ان کے اموال اور قیدی انہیں واپس کر دئے جائیں۔لیکن دن پر دن گزرتے چلے گئے اور ہوازن کی طرف سے کوئی وفد طلب گارِ معافی ہو کر نہ آیا۔بہت دن تک آپ نے تقسیم اموال کے کام کو تعویق میں رکھا۔لیکن آخر اس بات کو مناسب سمجھا کہ اموال تقسیم کر دئے جائیں۔چنانچہ جعرانہ پہنچ کر آپؐ نے ان اموال کو تقسیم کرنا شروع کیا۔منافق تو ہمیشہ اس تاک میں لگے رہتے تھے کہ کوئی موقع ملے تو ہم آپ پر اعتراض کریں۔کوئی نہ کوئی راہ نکال کر ذوالخویصرہ التمیمی نے عین تقسیم کے وقت بڑھ کر کہا کہ آپؐ اس تقسیم میں عدل کو مدنظر رکھیں۔جس سے اس کی مراد یہ تھی کہ آپ اس وقت عدل سے کام نہیں لے رہے۔امام

بخاری صاحب نے اس واقعہ کو حضرت جابرؓ سے یوں روایت کیا ہے کہ:

حَدَّثَنَا مُسْلِمُ بْنُ اِبْرَاهِيْمَ : حَدَّثَنَا قُرَّةُ: حَدَّثَنَا عَمْرُو بْنُ دِيْنَارٍ عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ : بَيْنَمَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقْسِمُ غَنِيْمَةً بِالْجِعْرَانَةِ ، اِذْ قَالَ لَهُ رَجُلٌ : اِعْدِلْ فَقَالَ لَهُ: لَقَدْ شَقِيْتَ اِنْ لَمْ اَعْدِلْ .

(كتاب الجهاد باب ومن الدليل على ان الخمس لنوائب المسلمين)

یعنی آنحضرت ﷺ اموالِ غنیمت کو جعرانہ کے مقام پر تقسیم فرما رہے تھے کہ ایک شخص نے آپ کو کہا کہ آپ عدل سے کام لیں ۔ آپؐ نے جواب دیا کہ اگر میں نے عدل نہیں کیا تو تُو بڑی بے برکتی اور بدبختی میں مبتلا ہو گیا ۔ اللہ اللہ کیسے خطرناک حملہ کا جواب وہ پاک رسولؐ کس نرمی سے دیتا ہے، کس حلم سے اسے سمجھاتا ہے ۔ آنحضرت ﷺ سے جو عشق صحابہ کو تھا وہ ایسا نہ تھا کہ ایسی باتیں برداشت کر سکتے ۔ بلکہ حضرت عمرؓ اور خالد بن ولیدؓ تو ہمیشہ ایسے موقع پر تلوار کھینچ کر کھڑے ہو جاتے تھے ۔ مگر آنحضرت ﷺ ان کو ہمیشہ روکتے رہتے تھے کہ ان لوگوں سے اعراض کرو ۔ پس ایسے وقت میں جبکہ مکہ کے حدیث العہد مسلمان جو ابھی ان آداب سے بالکل ناواقف تھے جو ایک رسول کے حضور بجا لانے ایک مومن کا فرض ہوتا ہے اور جو ایک ذرہ سے اشارہ سے صراطِ مستقیم سے ہٹ کر کہیں کے کہیں پہنچ سکتے تھے آپ کے اردگرد کھڑے تھے اور وہی وقت تھا جب انہوں نے یہ سبق سیکھنا تھا کہ رسول کریم ﷺ کے ساتھ ہمیں کس طرح عمل کرنا چاہئے ۔ ایک شخص کا آگے بڑھ کر نہایت بے حیائی سے آپ سے کہنا کہ حضور ذرا عدل مدنظر رکھیں اور بے انصافی اور حق تلفی نہ کریں ایک خطرناک فعل تھا ۔ جس سے ایک طرف تو ان قوانین کی خلاف ورزی ہوتی تھی جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کے ساتھ کلام کرنے کے متعلق بیان فرمائے ہیں ۔ دوسرے ان تمام مواعید پر پانی پھر جاتا تھا جو اس شخص نے آنحضرت ﷺ کے حضور کیئے تھے اور جو ہر ایک مسلمان کو مسلمان ہونے کے لئے کرنے پڑتے ہیں ۔ تیسرے سیاسی لحاظ سے آپؐ کے رعب کو ایک خطرناک نقصان پہنچانے والے تھے ۔ اور

چوتھے نومسلموں اور کے لئے ایک نہایت بدنظیر قائم کرنے والے تھے۔ جن کے دل ابھی اس عزت کا خیال بھی نہیں کر سکتے تھے جو صحابہؓ کے دلوں میں بھری ہوئی تھی۔ پس وہ الفاظ جو ذوالخویصرہ کے منہ سے اس وقت نکلے ایک دنیاوی دربار میں خطرناک سے خطرناک سزا کا فتویٰ دلانے کے لئے کافی تھے۔ اور اگر زمانہ قدیم کے درباروں میں ایسا انسان قتل کا مستوجب خیال کیا جاتا تو موجودہ دورِ دستوریت میں بھی ایسا آدمی سزا سے محفوظ نہ رہ سکتا۔ لیکن وہ بادشاہ ہر دو جہاں اس کے گستاخانہ کلام کے جواب میں کیا کہتا ہے؟ کیا اسے سزا کا حکم دیتا ہے؟ کہ تا ان نومسلموں پر آپ کا رعب بیٹھ جائے جو نہایت نگران نگاہوں سے صحابہ اور آنحضرت ﷺ کے تعلقات کو اس لئے دیکھ رہے تھے کہ ان سے اندازہ لگا سکیں کہ یہ تعلقات مصنوعی یا حقیقی، عارضی ہیں یا مستقل، سطحی ہیں یا ان کی جڑیں دل کے تمام کونوں میں مضبوطی سے گڑی ہوئی ہیں۔ کیا وہ میرا پیارا اگر اسے کسی بدنی سزا کا مستحق قرار نہیں دیتا تو کم سے کم زبانی طور پر ہی اسے سخت تہدید کرتا ہے کہ اگر ایسے الفاظ پھر تمہارے منہ سے نکلے تو تم کو سخت سزا دی جائے گی؟ نہیں وہ بھی نہیں کرتا۔ کیا وہ اسے اپنے سامنے سے دور ہو جانے کا حکم دیتا ہے؟ نہیں وہ اس سے بھی اجتناب کرتا ہے۔ پھر اس مجرم کے لئے وہ کیا سزا تجویز کرتا ہے۔ وہ باوجود صحابہ کی چڑھی ہوئی تیوری کے اور باوجود ان کے ہاتھوں کے بار بار دستہ تلوار کی طرف جانے کے اسے نہایت پُر حکمت اور پُر معنی جواب دیتا ہے جس سے بہتر جواب کوئی انسانی دماغ تجویز کر ہی نہیں سکتا۔ وہ اسے خود اسی کے فعل سے ملزم کرتا ہے، خود اسی کے اقوال سے قائل کرتا ہے، خود اسی کے اعمال سے شرمندہ کرتا ہے وہ کہتا ہے تو یہ کہ لَقَدْ شَقِيتَ اِنْ لَمْ اَعْدِلْ اگر میں نے عدل نہ کیا تو تُو بدبختی کے گڑھے میں گر گیا۔ کیونکہ تو نے تو مجھے خدا کا رسول سمجھ کر بیعت کی ہے اور دعویٰ کرتا ہے کہ میں آپ کو خدا کی طرف سے یقین کرتا ہوں اور مجھے اپنا رہنما اور پیشوا قرار دیتا ہے تو ان خیالات کے باوجود اے نادان! جب تُو مجھے انصاف سے دور اور عدل سے خالی خیال کرتا ہے تو تجھ سے زیادہ بدبخت اور کون ہو سکتا ہے۔ جو اپنے آپ کو ایک ایسے شخص کے پیچھے لگاتا ہے جو اتباع کے قابل نہیں اور

اس آدمی سے ہدایت چاہتا ہے جو خود گمراہ ہے اور اس سے صداقت طلب کرتا ہے جو جھوٹ بولنے میں کوئی عیب نہیں دیکھتا اور اگر تو مجھے نبی نہیں خیال کرتا بلکہ جھوٹا خیال کرتا ہے تو پھر بھی تُو نہایت شقی ہے کیونکہ باوجود مجھے جھوٹا سمجھنے کے پھر میرے ساتھ رہتا ہے اور ظاہر کرتا ہے کہ میں آپ کو سچا خیال کرتا ہوں۔

اللہ اللہ کیسا پاک جواب ہے کیسا مسکت اور مبکت جواب ہے جسے سن کر ایک حیادار سوائے اس کے کہ زندہ ہی مر جائے اور کوئی جواب نہیں دے سکتا۔ یہ تھا آپؐ کا تحمل، یہ تھی آپؐ کی بردباری جو آپؐ کو دنیا کے تمام انسانوں سے افضل ثابت کرتی ہے۔ بہت ہیں جو اشتعال انگیز الفاظ کو سن کر خاموشی سے اپنے حلم کا ثبوت دیتے ہیں۔ لیکن میرے آقا کا تحمل بھی لغو نہ تھا اگر آپؐ خاموش رہتے تو اس کے اعتراض کا جواب کیا ہوتا۔ آپ نے تحمل کا ایک اعلیٰ نمونہ دکھایا اور ایسا نمونہ جو اپنے اندر ایک عظیم الشان سبق بھی رکھتا تھا اور معترضین کے لئے ہدایت تھا۔ کاش! اس حدیث سے وہ لوگ کچھ نصیحت حاصل کریں جو ایک شخص کے ہاتھ پر بیعت کر کے پھر اعتراضات سے نہیں رکتے کیونکہ ان کو یاد رکھنا چاہئے کہ ان کا یہ فعل خود ان کی شقاوت پر دال ہے۔" (انوار العلوم جلد ۱ صفحہ ۵۹۰ تا ۵۹۳)

فرشتے آپ کا وہم اور شاعرانہ نازک خیالی تھی

پروفیسر رام دیو نے سید امیر علی صاحب کی کتاب "سپرٹ آف اسلام" کے حوالہ سے لکھا ہے کہ فرشتے آنحضور ﷺ کا وہم اور شاعرانہ نازک خیالی تھی۔ اس اعتراض کا جواب حضرت مصلح موعودؓ ان الفاظ میں دیتے ہیں:۔

"پروفیسر رام دیو صاحب فرماتے ہیں کہ سید امیر علی صاحب نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ قرآن میں فرشتوں کا جو ذکر ہے وہ صرف محمد صاحب کا وہم اور شاعرانہ نازک خیالی تھی۔ ورنہ فرشتے درحقیقت کوئی چیز نہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ اس حوالہ کے بیان کرنے میں بھی پروفیسر

صاحب نے غلطی کی ہے اور جلد بازی سے کام لیا ہے۔ سید امیر علی صاحب نے اپنی کتاب ''سپرٹ آف اسلام'' میں ہرگز نہیں لکھا کہ فرشتوں کے متعلق جو کچھ قرآن میں ہے وہ صرف محمد صاحب کا وہم تھا۔ اور نہ یہ لکھا ہے کہ فرشتے درحقیقت کوئی چیز نہیں ہیں۔ خود پروفیسر صاحب نے جو فقرہ سید امیر علی صاحب کی طرف منسوب کیا ہے وہی اپنی غلطی کا آپ مظہر ہے۔ پروفیسر صاحب سید امیر علی صاحب کی طرف یہ فقرہ منسوب کرتے ہیں کہ فرشتے محمد صاحب کا وہم اور شاعرانہ نازک خیالی کا نتیجہ ہیں۔ اب ہر عقل مند انسان سمجھ سکتا ہے کہ وہم اور شاعرانہ نازک خیالی دو مخالف باتیں ہیں۔ کیونکہ وہم کسی ایسی چیز کے خیال کو کہتے ہیں جس کا وجود نہ پایا جائے۔ لیکن کوئی شخص غلطی سے اس کے وجود کا قائل ہو۔ اور شاعرانہ نازک خیالی اسے کہتے ہیں کہ ایک چیز تو موجود ہو لیکن اس کا ذکر استعارہ اور مجاز میں نظم یا کلام کو خوبصورت بنانے کے لئے کر دیا جائے۔ اور یہ دونوں باتیں ایسی متضاد ہیں کہ جس چیز کو ہم وہم کہیں اسے شاعرانہ نازک خیالی نہیں کہہ سکتے۔ اور جس کو شاعرانہ نازک خیالی کہیں اسے وہم نہیں کہہ سکتے۔ وہم یہ ہے کہ ایک چیز موجود نہیں اور ہم اس کو موجود خیال کرتے ہیں اور شاعرانہ نازک خیالی یہ ہے کہ ہمیں علم تو ہے کہ فلاں بات کس طرح ہے لیکن کلام کو مؤثر بنانے کے لئے ہم ایک خاص رنگ میں اسے بیان کر دیتے ہیں۔ اس کی مثال یہ ہے کہ جیسے ایک شخص چھلاوہ کے وجود کا قائل ہو۔ جس کی نسبت بیان کرتے ہیں کہ کبھی آدمی بن جاتا ہے، کبھی گھوڑا، کبھی بکرا، کبھی نیولا، کبھی کوئی بے جان شے۔ غرض منٹ منٹ میں وہ کئی شکلیں بدل لیتا ہے۔ اس شخص کے اس خیال کو تو ہم وہم کہیں گے۔ کیونکہ جو شے واقعہ میں موجود نہیں ہے اسے بلا کسی ثبوت کے یہ خیال کر لیتا ہے کہ اسی طرح ہے لیکن ایک شاعر جب شمع کی نسبت بیان کرتا ہے کہ وہ ساری رات روتی ہے تو اسے ہرگز وہم نہیں کہیں گے کیونکہ شاعر یہ یقین نہیں رکھتا کہ شمع واقع میں روتی ہے بلکہ اپنے قلب کے نقشہ کو اس رنگ میں بیان کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ میرا عشق اس قدر بڑھا ہوا ہے کہ ہر ایک شئے جو گھل رہی ہو مجھے یہی معلوم ہوتا ہے کہ گویا میری طرح محبوب کے عشق میں رو رہی ہے اور گھلتی جا رہی ہے۔ اگر کوئی شخص واقعہ میں یہ سمجھ لے کہ شمع روتی ہے تو پھر یہ شاعرانہ نازک خیالی نہ رہے گی۔ بلکہ وہم

ہو جائے گا۔پس شاعرانہ نازک خیالی اور وہم دو مخالف چیزیں ہیں اور ایک شخص کا وہم اسی شخص کی شاعرانہ نازک خیالی نہیں کہلا سکتا۔نہ کسی کی نازک خیالی وہم کہلا سکتی ہے۔پس پروفیسر رام دیو صاحب کا یہ فقرہ کہ سید امیر علی صاحب کے نزدیک فرشتوں کا وجود محمد صاحب کا وہم اور شاعرانہ نازک خیالی ہے اپنی آپ ہی تردید کر دیتا ہے۔جیسا کہ میں نے اوپر بیان کیا ہے کہ سید صاحب نے ہرگز یہ نہیں لکھا کہ فرشتوں کا ذکر جو قرآن میں آتا ہے رسول کریم ﷺ کا وہم تھا انہوں نے صرف یہ لکھا ہے کہ بدر کی جنگ میں فرشتوں کے اترنے کا جو واقعہ قرآن کریم میں مذکور ہے اس کی عبارت شاعرانہ رنگ کی ہے۔

وہ لکھتے ہیں:''قرآن کریم کے وہ چند سادہ بیان جو اس شاعرانہ رنگینی کو ظاہر کرتے ہیں جو فرشتوں کے خدا کی طرف سے لڑنے کے خیال میں پوشیدہ ہے۔اپنی شان اور دلآویزی میں زبور کے فصیح ترین حصوں سے بھی کم نہیں ہیں۔یقیناً ان دونوں بیانوں میں شاعرانہ رنگ نظر آتا ہے۔''

ان فقرات سے ایک تو یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ مسٹر سید امیر علی صاحب فرشتوں کے وجود کے متعلق نہیں بلکہ ان کی لڑائی میں شامل ہونے کے متعلق یہ خیال کرتے ہیں کہ اس میں شاعرانہ رنگینی پائی جاتی ہے۔دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ فرشتوں کے وجود کو رسول کریم ﷺ کا وہم نہیں بتاتے بلکہ فرشتوں کی لڑائی میں شامل ہونے کے ذکر کو شاعرانہ رنگ کا کلام ظاہر کرتے ہیں۔جس کے دو معنے ہو سکتے ہیں۔یہ بھی کہ وہ فرشتوں کی لڑائی میں شامل ہونے کے منکر نہیں بلکہ اس عبارت کی رنگینی اور فصاحت کا اظہار کرتے ہیں۔اور زبور جس پر مسیحیوں کو ناز ہے اس کا مقابلہ کر کے اس کی خوبی مسیحیوں پر ظاہر کرتے ہیں اور یہ بھی کہ وہ سمجھتے ہیں کہ اس جگہ فرشتوں کے لڑنے سے قرآن کریم کی مراد واقع میں لڑنا نہیں ہے بلکہ خدا تعالیٰ کی نصرت کو اس شاعرانہ کلام کے ذریعہ سے بیان کیا گیا ہے اور مجاز اور استعارہ کو استعمال کیا گیا ہے۔اور کیا پروفیسر صاحب اس امر کے قائل نہیں کہ خود ان کی اپنی مذہبی کتب میں مجاز اور استعارہ کا استعمال کیا گیا ہے اور کیا کوئی شخص اگر اہلِ ہنود کے اس کلام کے کہ ان کی مذہبی کتب میں مجاز اور استعارہ

کا جو حسنِ کلام کی اعلیٰ صفتوں میں سے ہیں استعمال کیا گیا ہے یہ معنے کرے کہ اہلِ ہنود کے نزدیک ان کی مذہبی کتب میں بہت سی وہمی باتیں بیان ہو گئی ہیں تو اہل ہنود اس کی عقل پر ہنسیں گے یا نہیں۔ اسی طرح اہل دانش پروفیسر صاحب کے اس بیان پر کہ مسٹر امیر علی صاحب کے نزدیک قرآن کریم میں جو فرشتوں کا ذکر آیا ہے وہ محمد صاحب کا وہم ہے۔ زیرِ لب متبسم ہیں اور پروفیسر صاحب کی اس جلد بازی پر حیران ہیں۔ جس سے انہوں نے اس حوالہ کے درج کرنے میں کام لیا ہے۔ اگر پروفیسر صاحب اس فقرہ کے ساتھ کے اگلے فقرات پڑھتے تو ان کو معلوم ہو جاتا کہ مسٹر امیر علی صاحب نہ صرف یہ کہ فرشتوں کے ذکر کو رسول کریم ﷺ کا وہم اور خیال نہیں بتاتے بلکہ ان کو اس امر میں بھی شک ہے کہ فرشتوں کا ذکر مجازی ہے یا واقع میں بھی کوئی ایسا وجود ہے۔ غرض وہ فرشتوں کو رسول کریم ﷺ کا وہم نہیں بتاتے بلکہ ان کے متعلق جو اس زمانہ کے خیالات ہیں ان کے غیر یقینی ہونے کا خیال ظاہر کرتے ہیں وہ اس فقرہ کے معاً بعد جس سے پروفیسر صاحب نے غلط نتیجہ اخذ کیا ہے تحریر کرتے ہیں:

”غالباً محمد (ﷺ) مسیح اور دوسرے انبیاء علیہ السلام کی طرح ایسی درمیانی ارواح کے جو خدا اور بندہ کے درمیان پیغام رساں ہوں قائل تھے۔ اس زمانہ میں فرشتوں کا جو انکار کیا جاتا ہے وہ کوئی دلیل نہیں ہے کہ اس کی وجہ سے ہمارے آباء کے جو خیالات فرشتوں کے متعلق تھے ان کی ہنسی اڑائی جائے۔ ہمارا انکار اسی طرح وہم کہلا سکتا ہے جس طرح ان کا یقین۔ فرق صرف یہ ہے کہ ایک میں نفی کا پہلو ہے تو دوسرے میں اثبات کا۔ جس چیز کو ہم اس زمانہ میں اصول طبعی خیال کرتے ہیں وہ ان کو فرشتہ اور آسمانی کارپرداز خیال کرتے تھے یا جس طرح فاک کا خیال ہے خدا اور بندے کے درمیان کوئی اور وجود بھی ہیں۔ جس طرح انسان اور ادنیٰ حیوانات کے درمیان اور وجود ہیں؟ یہ ایک ایسا باریک سوال ہے کہ انسانی عقل اس کی تہ تک نہیں پہنچ سکتی۔“

ان فقرات سے صاف ثابت ہے کہ مسٹر امیر علی صاحب فرشتوں کے وجود کو محض استعارہ قرار دینے کو بھی جائز نہیں سمجھتے۔ اور ان کا خیال ہے کہ فرشتوں کا انکار کرنے والے اگر فرشتوں کے وجود کو ماننے کا نام وہم رکھتے ہیں تو ان کے فرشتوں کو نہ ماننے کا نام بھی وہم

رکھا جا سکتا ہے۔اور یہ کہ فرشتوں کے وجود کا مسئلہ ایسا باریک مسئلہ ہے کہ انسانی عقل اس کی تہ تک نہیں پہنچ سکتی۔جس کے معنے دوسرے لفظوں میں یہ ہیں کہ ان کے متعلق ہم بحث نہیں کر سکتے۔ان کے متعلق بحث کرنا آسمانی کتب کا کام ہے۔پس باوجود مسٹر امیر علی صاحب کے ایسے صریح بیان کے پروفیسر رام دیو صاحب کا یہ بیان فرمانا کہ مسٹر امیر علی صاحب قرآن میں جو فرشتوں کا ذکر ہے اسے محمد صاحب کا وہم قرار دیتے ہیں ایک نہایت ہی حیرت انگیز بات ہے۔''

(انوار العلوم جلد۵ صفحہ ۳۸۵ تا ۳۸۹)

غلامی کی تعلیم پر اعتراض

ولیم میور نے آنحضورؐ کی غلامی کے بارہ میں تعلیم پر اعتراض کیا ہے۔اس اعتراض کا مدلل اور مسکت جواب حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ نے ارشاد فرمایا ہے۔آپ فرماتے ہیں:

''باقی رہا غلامی کا اعتراض۔اس کے متعلق مجھے کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں۔کیونکہ یہ ایک علمی مسئلہ ہے اور بہت سے پہلوؤں پر بحث کا محتاج ہے۔پس میں ایک صاف اور سیدھا طریق اس مسئلہ کے حل کرنے کے لئے اختیار کرتا ہوں۔کہا جاتا ہے کہ آپ نے غلامی کو رائج کر کے دنیا پر بہت بڑا ظلم کیا ہے۔میں کہتا ہوں کہ آؤ آپ کی زندگی پر غور کر کے دیکھ لیں کہ کیا آپ غلاموں کے حامی تھے یا غلامی کے حامی۔اور یہ بھی کہ غلام آپ کے دوست تھے یا آپ کے دشمن۔کیونکہ ہر ایک قوم اپنے فوائد کو دوسروں کی نسبت زیادہ سمجھ سکتی ہے۔پہلی بات کو معلوم کرنے کے لئے میں آپ کی جوانی کا ایک واقعہ بیان کرتا ہوں۔جب آپ کی شادی حضرت خدیجہؓ سے ہوئی ہے اس وقت آپ کی عمر پچیس سال کی تھی اور اس عمر میں انسان کا دماغ حکومت کے خیالات سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔حضرت خدیجہؓ نے شادی کے بعد اپنا سب مال اور اپنے سب غلام آپ کے سپرد کر دیئے اور آپ نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے سب غلاموں کو آزاد کر دیا۔اب بتاؤ کہ یہ شخص جس نے جوانی کے ایام میں دولت ہاتھ آتے ہی یہ کام کیا ہے غلامی کا

حامی کہلا سکتا ہے یا غلاموں کا۔"

غلاموں کی رائے

پھر ایک مثل مشہور ہے کہ ماں سے زیادہ چاہنے والی کٹنی کہلائے۔ اب سیدھی بات ہے کہ غلاموں سے زیادہ کسی کو ان کی آزادی کا خیال نہیں ہو سکتا۔ دیکھنا یہ چاہئے کہ غلاموں کی رسول کریم ﷺ کے متعلق کیا رائے تھی۔ اگر غلام آپ کو اپنا محسن سمجھتے ہیں تو ماننا پڑے گا کہ آپ غلاموں کے محسن تھے نہ کہ غلامی کے حامی۔

اس کے متعلق میں ایک واقعہ پیش کرتا ہوں جس سے ظاہر ہے کہ غلام آپ کے کیسے دلدادہ تھے۔ نبوت کی زندگی کے پہلے سات سال میں کُل چالیس آدمی آپ پر ایمان لائے تھے۔ ان میں سے کم سے کم پندرہ غلام تھے یا غلاموں کی اولاد تھے۔ گویا کُل مومنوں کی تعداد میں تینتیس فیصدی غلام تھے اور مکہ کی آبادی کا لحاظ رکھا جائے تو یوں کہا جا سکتا ہے کہ ابتدائی مومنوں سے نوّے فیصدی غلام تھے۔ مکہ کی آبادی دس بارہ ہزار کی تھی جس میں چالیس پچاس آدمی ایمان لائے تھے اور زیادہ سے زیادہ پانچ چھ سو غلام وہاں ہوگا۔ پس کیا یہ عجیب بات نہیں کہ دس بارہ ہزار میں سے تیس پینتیس آدمی ایمان لائے اور پانچ چھ سو آدمیوں میں سے پندرہ سولہ آدمی۔ کیا غلاموں کا اس کثرت سے آپ پر ایمان لانا اس امر پر دلالت نہیں کرتا کہ غلام آپ کو اپنا رہائی دہندہ سمجھتے تھے۔

غلاموں کا تکلیفیں اٹھانا

یاد رکھنا چاہئے کہ رسول کریم ﷺ پر ایمان لا کر جن لوگوں نے سب سے زیادہ تکلیفیں اٹھائیں وہ غلام ہی تھے۔

خبابؓ: چنانچہ خباب بن الارت ایک غلام تھے جو لوہار کا کام کرتے تھے۔ وہ نہایت ابتدائی ایام میں آپ پر ایمان لائے۔ لوگ انہیں سخت تکالیف دیتے تھے۔ حتیٰ کہ انہی کی بھٹی کے کوئلے نکال کر ان پر انہیں لٹا دیتے تھے اور اوپر سے چھاتی پر پتھر رکھ دیتے تھے تا کہ آپ کمر نہ ہلا سکیں۔ ان کی مزدوری کا روپیہ جن لوگوں کے ذمہ تھا وہ روپیہ ادا کرنے سے منکر ہو گئے۔ مگر باوجود ان مالی اور

جانی نقصانوں کے آپ ایک منٹ کے لئے بھی متذبذب نہ ہوئے اور ایمان پر ثابت قدم رہے۔ آپ کی پیٹھ کے نشان آخر عمر تک قائم رہے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ کی حکومت کے ایام میں انہوں نے اپنے گزشتہ مصائب کا ذکر کیا تو انہوں نے ان سے پیٹھ دکھانے کو کہا۔ جب انہوں نے پیٹھ پر سے کپڑا اٹھایا تو تمام پیٹھ پر ایسے سفید داغ نظر آئے جیسے کہ برص کے داغ ہوتے ہیں۔

اب غور کرو کہ اگر محمد ﷺ غلامی قائم کرنے کے لئے آتے تو چاہئے تھا کہ خباب آپ کی گردن کاٹنے کے لئے جاتا، نہ یہ کہ آپ کی خاطر گرم کوئلوں پر لوٹتا۔

زیدؓ: پھر ایک اور غلام زید ابن حارثہ تھے جو ایک عیسائی قبیلہ میں سے تھے۔ ان کو کسی جنگ میں قید کر کے غلام بنایا گیا تھا۔ وہ بکتے بکتے حضرت خدیجہ کے قبضہ میں آئے اور انہوں نے شادی پر سب جائیداد سمیت انہیں آنحضرت ﷺ کے سپرد کر دیا اور آپ نے انہیں آزاد کر دیا۔ جب ان کے رشتہ داروں کو پتہ لگا کہ وہ مکہ میں ہیں تو ان کا باپ اور چچا آئے اور رسول کریمؐ سے کہا ان کو آزاد کر دیں۔ آپ نے فرمایا میں نے آزاد کیا ہوا ہے جہاں چاہے چلا جائے۔ اس پر اس کے باپ نے کہا چلو بیٹا۔ مگر انہوں نے کہا آپ کی میرے حال پر بڑی مہربانی ہے۔ مگر بات یہ ہے کہ محمد ﷺ سے پیارا مجھے کوئی نہیں ہے۔ اس لئے میں انہیں چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔

اب غور کرو ایک نوجوان پکڑا ہوا آتا ہے۔ ماں باپ کی یاد کے نقش اس کے دل پر جمے ہوئے ہوتے ہیں۔ مگر جب باپ آ کر اسے کہتا ہے کہ ہمارے ساتھ چل تو وہ کہتا ہے مجھے محمد ﷺ کی صحبت سے اور کوئی چیز اچھی نہیں لگتی۔ اس کے بعد وہ آپ کے دعویٰ کے وقت آپ پر ایمان لاتا ہے اور آخر ایک دن اپنے خون سے حقِ رفاقت ادا کرتا ہے۔ اب بتاؤ کہ کیا یہ فدائیت اور محبت ایک غلام کو اس شخص سے ہو سکتی تھی جو غلامی کا حامی تھا۔

بلالؓ: ایک اور غلام تھے جن کا نام بلال تھا اور جو رسول کریم ﷺ کے جانی دشمن امیہ بن خلف کے غلام تھے۔ وہ ابتدائی ایام میں ہی رسول کریم ﷺ پر ایمان لے آئے۔ امیہ انہیں جلتی ریت پر لٹا دیتا تھا اور توبہ کے لئے کہتا تھا۔ مگر وہ ایمان سے باز نہ آتے تھے۔ اب خدارا کوئی غور کرے کہ اگر رسول کریم ﷺ غلاموں پر ظلم کرنے والے ہوتے تو بلال امیہ جیسے دشمنِ رسول کے گھر

میں رہ کر آپ کے خلاف کیا کیا شوخیاں نہ کرتے۔ وہ ایسے دشمن کے گھر میں ہو کر اور ہر قسم کی مخالف باتیں سن کر بھی آپ پر ایمان لاتے ہیں اور بڑی بڑی تکالیف اٹھاتے ہیں۔ ان کا آقا اسی وجہ سے انہیں گرم ریت پر لٹا دیا کرتا۔ اور وہ چونکہ عربی زبان زیادہ نہ جانتے تھے اس لئے وہ زیادہ تو کچھ نہ کہہ سکتے مگر احد احد کہتے رہتے تھے۔ یعنی اللہ ایک ہے، اللہ ایک ہے۔ اس پر ناراض ہو کر ان کا آقا انہیں اور تکالیف دیتا اور رسی ان کے پاؤں سے باندھ کر لڑکوں کے سپرد کر دیتا تھا۔ وہ انہیں گلیوں میں گھسیٹتے پھرتے تھے حتیٰ کہ بلال کی پیٹھ کا چمڑا اتر جاتا تھا۔ مگر رسول کریم کی محبت کا نشہ پھر بھی نہ اترتا تھا اور جس ایمان کی حالت میں ان پر مار پڑنی شروع ہوتی تھی اس سے بھی زیادہ ایمان پر اس مار کا خاتمہ ہوا کرتا تھا۔

اب غور کرو یہ محبت اس کے دل میں کس طرح پڑ سکتی تھی۔ اگر وہ محمد ﷺ کو غلاموں کا حامی اور آزاد کرنے والا نہ سمجھتا۔ اس کے سوا وہ کون سی چیز تھی جو اسے آپ کے دشمن کے گھر میں رہ کر بھی آپ کی طرف مائل کر رہی تھی۔

سمیہؓ: چوتھا شخص ایک عورت لونڈی تھی جس کا نام سمیہ تھا۔ ابوجہل ان کو سخت دکھ دیا کرتا تھا تا کہ وہ ایمان چھوڑ دیں لیکن جب ان کے پائے ثبات کو لغزش نہ ہوئی تو ایک دن ناراض ہو کر اس نے شرمگاہ میں نیزہ مار کر ان کو مار دیا۔ انہوں نے جان دے دی مگر محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان کو نہ چھوڑا۔ اب سوچو کہ مرد تو مرد عورت لونڈیاں جو شدید ترین دشمنوں کے گھر میں تھیں انہوں نے کس قربانی کے ساتھ آپ کا ساتھ دیا ہے۔ اگر وہ یہ دیکھتیں کہ رسول کریم ﷺ غلامی کے دشمن نہیں اس کے حامی ہیں تو کیا صنفِ نازک میں سے ہوتے ہوئے وہ اس طرح آپ کے لئے اپنی جان قربان کر سکتی تھیں؟

عمارؓ: پانچویں مثال عمار کی ہے جو سمیہ کے بیٹے تھے۔ انہیں جلتی ریت پر لٹایا جاتا تھا۔

صہیبؓ: ایک غلام صہیب تھے جو روم سے پکڑے آئے۔ عبداللہ بن جدعان کے غلام تھے جنہوں نے ان کو آزاد کر دیا تھا۔ وہ بھی رسول کریم ﷺ پر ایمان لائے اور آپ کے لئے بہت سی تکالیف اٹھائیں۔

ابوفکیہہؓ: ابوفکیہہ ایک غلام تھے۔وہ بھی رسول کریم ﷺ پر ابتدائی ایام میں ایمان لائے۔انہیں بھی گرم ریت پر لٹایا جاتا۔ایک دفعہ رسی باندھ کر انہیں کھینچا جا رہا تھا کہ پاس سے کوئی جانور گزرا۔ان کے آقا نے اس کی طرف اشارہ کر کے انہیں کہا یہ تمہارا خدا ہے۔انہوں نے کہا میرا اور تمہارا خدا ایک ہی ہے۔اس پر اس ظالم نے ان کا گلا گھونٹا اور پھر بھاری پتھر ان کے سینہ پر رکھ دیا۔جس سے ان کی زبان باہر نکل آئی اور لوگوں نے سمجھا کہ مر گئے ہیں۔دیر تک ملنے ملانے سے انہیں ہوش آئی۔

لبینہؓ: لبینہ ایک کنیز تھیں یہ بھی نہایت ابتدائی ایام میں اسلام لائیں۔حضرت عمرؓ اپنے اسلام لانے سے پہلے انہیں اسلام کی وجہ سے تکلیف دیا کرتے تھے مگر یہ اپنے اسلام پر قائم رہیں۔

زنیرہؓ: زنیرہؓ بھی ایک کنیز تھیں اور ابتدائی ایام میں ہی ایمان لائیں۔حضرت عمرؓ اپنے اسلام لانے سے پہلے انہیں ستایا کرتے۔ابوجہل نے مار مار کر ان کی آنکھیں پھوڑ دیں مگر باوجود اس کے انہوں نے رسول کریم ﷺ کی رسالت کا انکار نہ کیا۔ابوجہل اسے دیکھ کر غصہ سے کہا کرتا تھا کہ کیا ہم اتنے حقیر ہو گئے ہیں کہ زنیرہ نے تو سچا دین مان لیا اور ہم نے نہ مانا۔

نہدیہؓ اور ام عبیسؓ: اسی طرح نہدیہؓ اور ام عبیسؓ دو کنیزیں تھیں جو مکی زندگی میں اسلام لائیں اور دونوں نے اسلام لانے کی وجہ سے سخت مصائب برداشت کئے۔

عامرؓ: عامرؓ بن فہیرہ بھی ایک غلام تھے۔جنہیں حضرت ابوبکرؓ نے آزاد کر دیا۔انہیں بھی اسلام لانے کی وجہ سے سخت تکالیف دی گئیں۔

حمامہؓ: حمامہؓ بلالؓ کی والدہ تھیں۔یہ بھی اسلام لائیں اور اسلام کی خاطر انہوں نے تکالیف اٹھائیں۔ان کے علاوہ اور غلام اور لونڈیاں بھی تھیں جو آپ پر ایمان لائیں اور اس کی وجہ سے انہوں نے سخت تکلیفیں اٹھائیں۔

غرض رسول کریم ﷺ کی نبوت کے ابتدائی سات سالوں میں کل چالیس افراد نے آپ کو مانا جن میں سے کم سے کم ۱۴، ۱۵ غلام تھے اور انہوں نے آزاد لوگوں سے زیادہ تکالیف اٹھائیں۔اگر رسول کریم ﷺ غلامی قائم کرنے والے ہوتے تو یہ لوگ آپ کے دشمن ہوتے نہ

کہ آپ پر ایمان لاتے۔

غیر مسلم غلاموں کی ہمدردی

علاوہ ان غلاموں اور لونڈیوں کے جو آپ پر ایمان لائے مکہ کے اکثر غلام اور لونڈیاں آپ سے ہمدردی رکھتے تھے۔ چنانچہ حضرت حمزہؓ کے ایمان لانے کی موجب بھی ان کی ایک غیر مسلمہ لونڈی ہی تھی۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ ایک دفعہ ابوجہل نے رسول کریم ﷺ کو گالیاں دیں اور مارنے کے لئے اٹھا اور آپ کو بہت تکلیف دی۔ حضرت حمزہؓ جو رسول کریم کے چچا تھے اور ابھی ایمان نہ لائے تھے ان کی ایک لونڈی دیکھ رہی تھی۔ اسے بہت صدمہ ہوا اور سارا دن کڑھتی رہی۔ جب حضرت حمزہؓ گھر آئے تو کس بات کا بہانہ ڈھونڈ کر اس نے طعنہ دیا کہ بڑے بہادر بنے پھرتے ہو۔ دیکھتے نہیں تمہارے بھتیجے کو ابوجہل نے کس طرح دکھ دیا ہے۔ حضرت حمزہؓ شکار کے شائق تھے اور اِدھر اُدھر پھرنے میں وقت گزارتے تھے۔ اور ان حالات سے زیادہ واقف نہ تھے لونڈی سے یہ بات سن کر ان کا دل اندر ہی اندر گھائل ہو گیا۔ واقعہ کی تفصیل سنی اور غیرت سے بے تاب ہو کر باہر نکل آئے۔ مجلس کفار میں آئے۔ ہاتھ میں تیر کمان تھا۔ لونڈی نے کچھ اس طرح واقعہ بیان کیا تھا کہ درد اور غصہ دونوں جذبات بے طرح جوش میں تھے اور بات کرنے کی طاقت نہ تھی۔ مجلس میں آکر ایک دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑے ہو گئے اور کمان پر سہارا لگا لیا۔ بار بار بات کرنا چاہتے تھے مگر شدت غم سے منہ سے بات نہ نکلتی تھی۔ اسی طرح کھڑے تھے کہ ابوجہل کی نگاہ پڑ گئی اور وہ بولا خیر ہے حمزہ تم تو اس طرح کھڑے ہو جس طرح انسان لڑائی پر آمادہ ہوتا ہے۔ اس کا یہ کہنا تھا کہ یہ ٹوٹ پڑے، اس کے منہ پر تھپڑ مارا اور کہا کہ ظالم تیرے ظلموں کی کوئی انتہا بھی ہے۔ تو نے محمد (ﷺ) کو حد سے بڑھ کر ستایا ہے۔ لے میں بھی مسلمان ہوتا ہوں اگر طاقت ہے تو آ مجھ سے لڑ لے۔ ابوجہل بھی مکہ کا سردار تھا اٹھ کر چمٹ گیا۔ لیکن ارد گرد کے لوگوں نے دیکھا کہ یہ جھگڑا مکہ کو بھسم کر دے گا، صلح کرا دی۔ اور اس دن سے حضرت حمزہؓ کو اسلام کی طرف توجہ ہو گئی۔ ایک دو دن کے غور کے بعد فیصلہ کر لیا کہ اسلام سچا ہے اور اپنے ایمان کا اعلان کر دیا۔

اسی طرح جب رسول کریم ﷺ طائف گئے اور وہاں سے زخمی ہو کر واپس آئے تو ایک غلام نے ہی آپ سے ہمدردی کی اور آپ کی حالت کو دیکھ کر روتا رہا۔

بات یہ ہے کہ سب غلام جانتے تھے کہ آپ ان کو آزاد کرانے کے لئے آئے ہیں نہ کہ ان کی غلامی کی زنجیروں کو اور مضبوط کرنے کے لئے۔ اس لئے وہ سب آپ سے محبت رکھتے تھے اور ان کا شروع زمانہ میں ایمان لانا اور سخت تکالیف اٹھانا اور آخر تک ساتھ دینا اس امر کا ثبوت ہے کہ مکہ کے تمام غلام اور تمام لونڈیاں اس امر کو سمجھتے تھے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم غلاموں کو آزاد کرانے والی ہے۔ تبھی ان میں سے سب کے سب جو سمجھ دار تھے آپ پر ایمان لائے۔ یا اگر اس کی جرأت نہ کر سکے تو آپ کی مدد کرتے رہے اور آپ سے اظہار ہمدردی کرتے رہے۔ اور کیا یہ عجیب بات نہیں کہ جن لوگوں کا معاملہ ہے وہ تو رسول کریم ﷺ کو غلاموں کا آزاد کرانے والا اقرار دیتے ہیں اور جو لوگ نہ اس وقت تھے اور نہ ان کو غلامی سے کچھ تعلق ہے اور نہ انہوں نے غلاموں کے آزاد کرانے میں کبھی کوئی حصہ لیا ہے وہ غلامی کے متعلق آپ پر اعتراض کرتے ہیں۔

اس عملی کام کے علاوہ اس امر پر بھی غور کرنا چاہئے کہ رسول کریم ﷺ کے زمانہ سے پہلے غلامی کا رواج تھا۔ اور کوئی ملک غلامی سے پاک نہ تھا۔ ہندوستان میں مجھے نہیں معلوم دوسری قسم کی غلامی تھی یا نہ تھی مگر اچھوت اقوام سب کی سب غلام ہی ہیں۔ وہ اعلیٰ پیشوں سے محروم ہیں اور ان کا فرض ہی برہمنوں کی خدمت مقرر کیا گیا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ دوسرے لوگوں میں غلاموں کو کھانا، کپڑا دینے کا رواج تھا۔ یہاں جن لوگوں نے غلامی کا رواج دیا تھا انہوں نے کھانے کپڑے سے بھی دستبرداری دے دی تھی۔ اور غلام کا فرض مقرر کیا تھا کہ وہ اپنے لئے بھی کمائے اور برہمنوں کی بھی خدمت کرے۔ ایران اور روم بھی غلامی میں ایک دوسرے سے بڑھے ہوئے تھے۔ ان ممالک کے لوگوں نے غلامی کے دور کرنے کا کیا علاج مقرر کیا تھا، کچھ بھی نہیں۔ یہ صرف محمد رسول اللہ ﷺ کا لایا ہوا دین تھا جس نے یہ قانون بنایا کہ ہر آزاد کو قید کرنے والا قتل کا مجرم سمجھا جائے گا۔ پھر یہ شرط لگائی کہ غلام بنانا صرف اس جنگ میں جائز ہے

جو جنگ کہ دشمن اسلام صرف اس لئے کریں کہ مسلمانوں سے تلوار کے زور سے اسلام چھڑوائیں۔حالانکہ اس تعلیم سے پہلے تمام ممالک میں سیاسی جنگوں کے قیدیوں کو بھی غلام بنایا جاتا تھا۔پھر یہ شرط لگادی کہ ایسی مذہبی جنگ میں بھی جو قید ہو اس کے ساتھ وہی سلوک کرو جو اپنے گھر کے لوگوں سے کرتے ہو۔جو کھاتے ہو وہ کھلاؤ، جو پیتے ہو وہ پلاؤ، جو پہنتے ہو وہ پہناؤ۔ پھر یہ شرط کی کہ باوجود اس خاطر کے ہر اک غلام کو یہ حق دیا جاتا ہے کہ جب وہ چاہے آزاد ہو جائے ۔ہاں چونکہ وہ ایک ظالمانہ جنگ میں شریک ہوا ہے اس لئے اس کا فرض ہے کہ وہ اپنی لیاقت کے مطابق خرچِ جنگ ادا کردے یا اس کے رشتہ دار کردیں ۔پھر یہ شرط لگادی کہ اگر غلام کے رشتہ دار یا اہلِ ملک اس کو نہ چھڑوا سکیں اور اس کے پاس روپیہ نہ ہو تو ہر غلام کا حق ہے کہ وہ کہہ دے کہ میں آزاد ہونا چاہتا ہوں اور اس کا آقا مجبور ہوگا کہ اس کی طاقت کے مطابق خرچ جنگ اس پر ڈال دے اور اسے نیم آزاد کردے کہ وہ اپنی کمائی سے قسط وار روپیہ ادا کر کے اپنے آپ کو آزاد کرائے ۔اور جس وقت یہ قسط مقرر ہو اسی وقت سے غلام کو عملاً آزادی حاصل ہو جائے ۔پھر یہ حکم دیا کہ جو غلام کو مارے اس کی سزا یہ ہے کہ اس کا غلام آزاد سمجھا جائے ۔پھر کئی گناہوں کا کفارہ غلاموں کا آزاد کرنا مقرر کیا تا کہ جو کوئی غلام رہ جائے وہ اس طرح آزاد ہو جائے ۔اور پھر اسی پر بس نہیں کی ۔آخر یہ بھی حکم دے دیا کہ حکومت کے مال میں غلاموں کا بھی حق ہے ۔حکومت کو چاہئے کہ ایک رقم ایسی مقرر کرے جس سے وہ غلام آزاد کراتی رہے ۔اب سوچو کہ غلامی تو ہر ملک میں رسول کریم ﷺ سے پہلے ہی پائی جاتی تھی ۔آپ نے تو جاری نہیں کی ۔آپ نے جو کچھ کیا وہ یہ کیا کہ اس کا دائرہ محدود کردیا اور پھر ایسے سامان پیدا کردئے کہ عملاً غلام آزاد ہی ہو جائیں ۔مگر باوجود اس کے اگر اسلام کے ابتدائی زمانہ میں غلام باقی رہ گئے تھے تو اس کی صرف اور صرف یہ وجہ تھی کہ اسلامی احکام کے ماتحت ان سے آقا ویسا ہی سلوک کرنے پر مجبور تھا جیسے کہ وہ اپنے نفس یا اپنے عزیزوں سے وہ کرتا تھا ۔اور غریب غلام جانتے تھے کہ ایک مسلمان کا غلام رہ کر اگر ان پر سو دو سو یا ہزار دو ہزار روپیہ خرچ ہوتا ہے تو آزاد رہ کر وہ سات آٹھ روپیہ سے زیادہ نہ کما سکیں گے اور اس میں انہیں اپنا کنبہ پالنا پڑے گا ۔پس بہت سے تھے جو اس

غلامی میں آزادی سے زیادہ آسائش پاتے تھے اور اسلامی احکام سے فائدہ اٹھا کر وہ اپنی تنگ حالت کو بدلنا نہیں چاہتے تھے۔ پس رسول کریم ﷺ غلامی کے قائم کرنے والے نہیں تھے بلکہ غلامی کے مٹانے والے تھے۔ اور آپ سے بڑھ کر غلامی کے مٹانے میں اور کسی نے حصہ نہیں لیا۔ بلکہ آپ کے کام سے ہزارواں حصہ کم بھی کسی نے کام نہیں کیا۔

(انوار العلوم جلد ۱۰ صفحہ ۲۷۷ تا صفحہ ۲۷۹)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ہتک کا الزام

کفار مکہ اور عیسائیوں کی طرف سے آنحضورؐ پر حضرت عیسیٰؑ علیہ السلام کی ہتک کا الزام لگایا جاتا رہا ہے۔ اس الزام اور اس کا رد کرتے ہوئے حضرت مصلح موعودؓ بیان فرماتے ہیں:

''یہ کہا جاتا ہے کہ رسول کریم ﷺ درحقیقت حضرت عیسیٰؑ کے منکر تھے اور آپ ان کی ہتک کرتے تھے۔ اسی بناء پر رسول کریم ﷺ کا انہوں نے ایک ایسا نام رکھا ہوا تھا جس کا لینا بھی ہماری حدِ برداشت سے باہر ہے۔ اور جس کے لفظی معنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مخالف کے ہیں۔ حالانکہ یہ ساری باتیں بالکل جھوٹ ہیں۔ جن لوگوں نے اسلامی تاریخ کو پڑھا ہے وہ جانتے ہیں کہ جس وقت صحابہ کفار کے مظالم سے تنگ آ کر حبشہ کی طرف ہجرت کر کے چلے گئے اور انہوں نے نجاشی شاہِ حبش کی پناہ لی تو اس وقت مکہ کے لوگوں نے عمرو بن العاص اور ابن ربیعہ پر مشتمل ایک وفد حبشہ کو بھیجا اور نجاشی کو اس کے ذریعہ کہلا بھیجا کہ ہمارے آدمیوں کو واپس کر دیا جائے کیونکہ اس طرح ہماری ہتک ہوتی ہے۔ جب یہ لوگ وہاں گئے اور نجاشی کے سامنے معاملہ پیش ہوا تو اس نے کہا کہ جب تک ان لوگوں کا کوئی جرم ثابت نہیں ہوگا میں انہیں واپس کرنے کو تیار نہیں۔ میرا ملک آزاد ہے جو چاہے اس میں رہے۔ ہاں اگر ان کا مجرم ہونا ثابت کر دو تو انہیں تمہارے ساتھ بھیجا جا سکتا ہے۔ انہوں نے رسول کریم ﷺ کے صحابہ کا جرم یہی بیان کیا کہ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ہتک کرتے ہیں۔ ان کا یہ کہنا ہی بتا رہا تھا کہ صحابہ نے ان کا کوئی

جرم نہیں کیا تھا۔ کیونکہ اگر واقعہ میں انہوں نے کوئی جرم کیا ہوتا تو وہ اسے کیوں پیش نہ کرتے۔ ان کا یہ قول کہ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ہتک کرتے ہیں بتاتا ہے کہ وہ صحابہ کا کوئی حقیقی جرم پکڑ نہیں سکتے۔ نجاشی نے یہ سن کر صحابہ کو بلوایا اور پوچھا کہ آپ لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق کیا عقیدہ رکھتے ہیں؟ انہوں نے قرآن کریم کی بعض آیات پڑھ کر سنائیں جن میں ذکر آتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا تعالیٰ کے برگزیدہ رسول تھے۔ انہیں خدا تعالیٰ کی طرف سے روح ملی تھی اور ان کے ہاتھ پر معجزات ظاہر ہوتے تھے۔ جب وہ آیتیں نجاشی کے سامنے پڑھی گئیں تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ کہنے لگا اب میں سمجھ گیا کہ تم پر ظلم کیا جاتا ہے۔ پھر اس نے کہا کہ میں اس خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کا جو درجہ تم نے بیان کیا ہے، وہی میں سمجھتا ہوں اس سے ایک تنکے کے برابر بھی زیادہ نہیں سمجھتا۔ میں تمہیں قریشِ مکہ کے حوالے نہیں کر سکتا۔ تم آزادی سے میرے ملک میں رہو کوئی شخص تم پر ظلم نہیں کر سکتا۔ بہرحال مکہ والوں نے یہی طریق اختیار کیا تھا کہ کہا صحابہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ہتک کرتے ہیں۔'' (خطبات محمود جلد ۱۶ صفحہ ۵۲۷ تا ۵۲۸)

سختی کرنے کے اعتراض کا جواب

حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز اس اعتراض کے جواب میں فرماتے ہیں:

''آج یہ لوگ آزادی اظہار کا شور مچاتے ہیں۔ شور مچاتے ہیں کہ اسلام میں تو آزادیٔ رائے اور بولنے کا اختیار ہی نہیں ہے اور مثالیں آج کل کی مسلمان دنیا کی دیتے ہیں کہ مسلمان ممالک میں وہاں کے لوگوں کو، شہریوں کو آزادی نہیں ملتی۔ اگر نہیں ملتی تو ان ملکوں کی بدقسمتی ہے کہ اسلامی تعلیم پر عمل نہیں کر رہے۔ اسلامی تعلیم کا تو اس سے کوئی تعلق نہیں۔ ہمیں تو تاریخ میں لوگوں کے بے دھڑک آنحضرت ﷺ سے مخاطب ہونے بلکہ ادب واحترام کو پامال

کرنے اور اس کے باوجود آنحضرت ﷺ کے صبر اور حوصلے اور برداشت کے ایسے ایسے واقعات ملتے ہیں کہ دنیا میں اس کی کوئی مثال نہیں مل سکتی۔ میں چند مثالیں پیش کرتا ہوں گو اس کو آنحضرت ﷺ کی جودوسخا کے واقعات میں بیان کیا جاتا ہے لیکن یہی واقعات جو ہیں ان میں بے باکی کی حد کا اور پھر آپ ﷺ کے حوصلہ کا بھی اظہار ہوتا ہے۔

حضرت جبیرؓ بن مطعم کی یہ روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک بار وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے اور آپؐ کے ساتھ اور لوگ بھی تھے۔ آپ حنین سے آرہے تھے کہ بدوی لوگ آپ سے لپٹ گئے۔ وہ آپ سے مانگتے تھے یہاں تک کہ انہوں نے آپ کو ببول کے ایک درخت کی طرف ہٹنے کے لئے مجبور کر دیا جس کے کانٹوں میں آپؐ کی چادر اٹک گئی۔ رسول اللہ ﷺ ٹھہر گئے اور آپ نے فرمایا میری چادر مجھے دے دو۔ اگر میرے پاس ان جنگلی درختوں کی تعداد کے برابر اونٹ ہوتے تو میں انہیں تم میں بانٹ دیتا اور پھر تم مجھے بخیل نہ پاتے اور نہ جھوٹا اور نہ بزدل

(صحیح بخاری کتاب فرض الخمس باب ما کان النبی ﷺ یعطی المؤلفة قلوبھم و غیر ھم ......3148)

پھر ایک روایت حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ہے۔ بیان کرتے ہیں کہ میں نبی کریم ﷺ کی معیت میں تھا اور آپؐ نے ایک موٹے کنارے والی چادر زیب تن کی ہوئی تھی۔ ایک بدّو نے اس چادر کو اتنے زور سے کھینچا کہ اس کے کناروں کے نشان آپؐ کی گردن پر پڑ گئے۔ پھر اس نے کہا اے محمد! (ﷺ) اللہ کے اس مال میں سے جو اس نے آپ کو عنایت فرمایا ہے میرے ان دو اونٹوں پر لاد دیں کیونکہ آپ مجھے نہ تو اپنے مال میں سے اور نہ ہی اپنے والد کے مال میں سے دیں گے۔ پہلے تو نبی کریم ﷺ خاموش رہے پھر فرمایا۔ اَلْمَالُ مَالُ اللّٰہِ وَ اَنَا عَبْدُہٗ کہ مال تو اللہ ہی کا ہے اور میں اس کا بندہ ہوں۔ پھر آپؐ نے فرمایا۔ مجھے جو تکلیف پہنچائی ہے اس کا بدلہ تم سے لیا جائے گا۔ اس بدّو نے کہا نہیں۔ آپ ﷺ نے پوچھا تم سے بدلہ کیوں نہیں لیا جائے گا؟ اس بدّو نے کہا اس لئے کہ آپ برائی کا بدلہ برائی سے نہیں لیتے۔ اس پر نبی کریم ﷺ ہنس پڑے۔ پھر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اس کے ایک اونٹ پر جو اور دوسرے

پر کھجوریں لادوی جائیں۔

(الشفاء القاضی عیاض جزء اول صفحہ 74 الباب الثانی فی تکمیل اللہ تعالیٰ

...... الفصل و اما الحلم ...... دارالکتب العلمیۃ بیروت 2002ء)

تو یہ ہے وہ صبر و برداشت کا مقام جو آنحضرت ﷺ کا تھا اور جو اپنوں سے نہیں دشمنوں سے بھی تھا۔ یہ ہیں وہ اعلیٰ اخلاق ان میں جود و سخا بھی ہے اور صبر و برداشت بھی اور وسعتِ حوصلہ کا اظہار بھی ہے۔ یہ اعتراض کرنے والے جاہل بغیر علم کے اٹھتے ہیں اور اُس رحمۃ للعالمین پر اعتراض کر دیتے ہیں کہ انہوں نے یہ سختی کی تھی اور فلاں تھا اور فلاں تھا۔

(خطباتِ مسرور جلد ۱۰ صفحہ ۵۷)

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَعَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ۔ اَللّٰھُمَّ بَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَعَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ کَمَا بَارَکْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ۔

اشاریہ

مرتبہ
محمد محمود طاہر

آیاتِ قرآنی

القمر

الواقعة

المجادله

الطلاق

القلم

الحاقة

المزمل

النازعات

التکویر

المطففین

الطارق

الضحیٰ

اسماء

آ،ا،ب،پ،ٹ

ج، ح، خ

د، ڈ، ر، ز

ف، ق، ک

مقامات

کتابیات

آ،ا،ب،پ،ت،ٹ

ج، چ، ح، خ